گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نومبر 2013

عیدالاضحیٰ مبارک

نگران اعلیٰ
معراج رسول

رفعت سراج اور عنیزہ سید کی چونکا دینے والی اقساط

پڑھیے نمرہ احمد کی دل پذیرہ ناول 'پارس' ۔۔۔ رائٹرز کی کہکشاں کا احوال و دیگر دلچسپ سلسلے

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار .... معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی۔



مستقل عنوانات

★★★

شعبہ اشتہارات



منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528

ماڈل: ماریہ .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹوگرافر: موسیٰ رضا

جلد 41 • شمارہ 08 • **نومبر** 2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



مجھے کچھ کہنا ہے......!

قدرتی آفات تو ہمیشہ سے ہی انسان کے مقدر کا حصہ رہی ہیں مگر قصداً آگ اور خون کا کھیل...... کسی بھی ذی ہوش کا پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ آج ہر مسلمان صرف ایک ہی بات پوچھ رہا ہے کہ یہ خوفناک کھیل آخر کون کھیل رہا ہے اور یہ کب تک جاری رہے گا۔ حیرت سے زیادہ یہ شدید دکھ کی بات ہے کہ دہشت گرد جو بھی ہوں، وہ جہاں چاہے، بم رکھ سکتے ہیں۔ نہ وہ کسی کو دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی انہیں پکڑا جا سکتا ہے، وہ خودکش بمباروں کو اپنی جان دینے اور بے حساب لوگوں کی جانیں لینے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔

انسانی جانیں اتنی غیر محفوظ کیوں ہو گئی ہیں...... اس کا جواب کس سے لیا جائے۔

اس وقت پورا معاشرہ دہشت گردوں کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا ہے، اب کسی ٹائر کے پھٹنے کی آواز آتی ہے تو یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ کہیں بم پھٹا ہے۔

یوں تو دہشت گردی...... اس وقت عالمی سطح پر ہو رہی ہے اور اس میں ملوث عناصر کا آپس میں ربط وضبط ہے، یہ بے چہرہ دشمن پوری انسانیت کے خلاف کام کر رہا ہے مگر اس وقت اس نے مسلمانوں کو اپنا خاص ہدف بنایا ہوا ہے۔

پاکستان میں دینی اجتماعات اس کا خصوصی نشانہ ہیں، کبھی امام بارگاہیں اس کی زد میں آتی ہیں تو کبھی چرچ اور کبھی مساجد...... اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ انتہائی خطرناک ہے، اس کے پس منظر میں یقیناً منظم قوتیں ہیں جن کے پاس وسائل بے حساب اور منصوبے بے پایاں ہیں، وہ بہت سوچ سمجھ کر یہ وار کر رہی ہیں۔

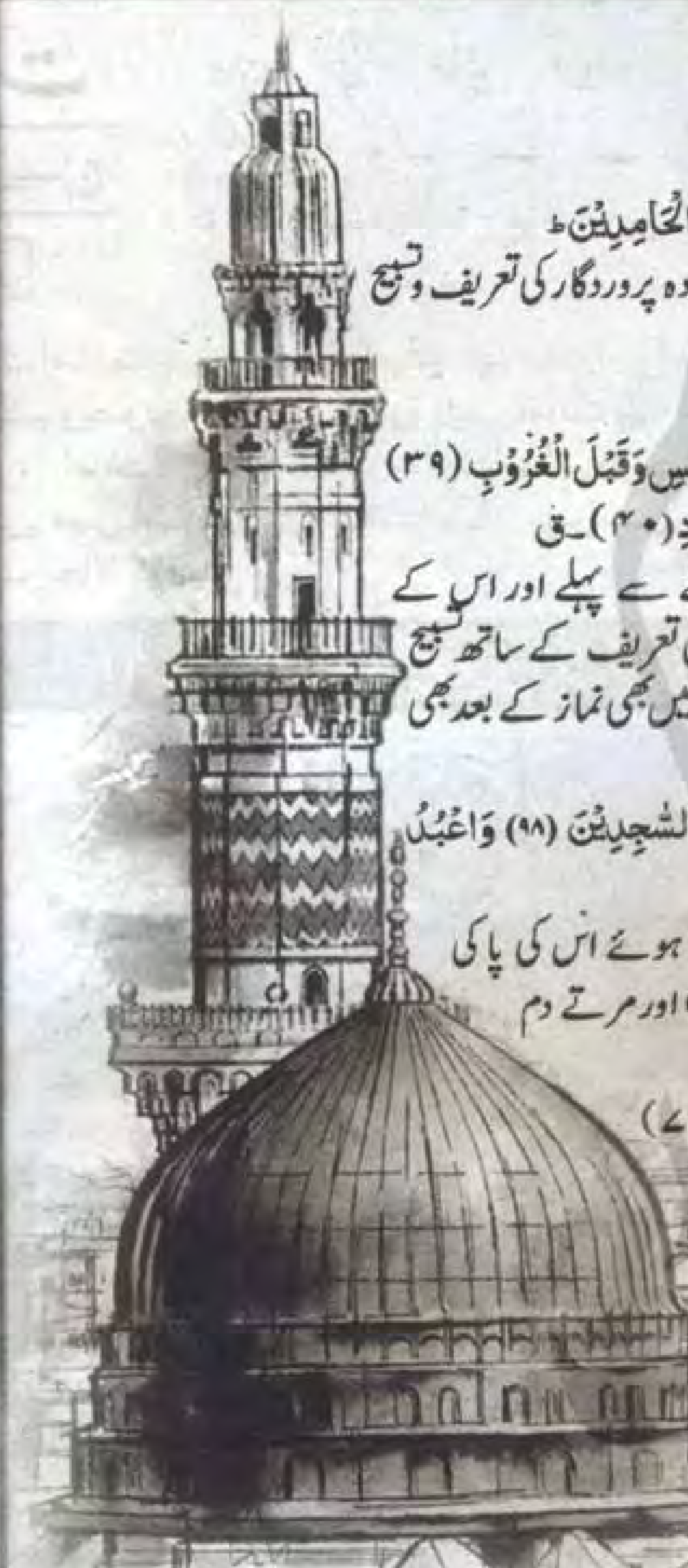
کیا کہیں اور کس سے کہیں کہ اب بکھرا ہوا خون اور جوان لاشے دیکھے نہیں جاتے۔ ہوا، پانی، غذا، علاج، مہنگائی، بجٹ کی باتیں تو بہت بعد کی ہیں۔ انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی کوئی شے وجود میں ہی نہیں آئی تو اس کی حفاظت کی ذمے داری کس کی ہے؟ یا کسی کی بھی نہیں...... کوئی بتلائے کہ...... ہم بتلائیں کیا؟

مدیرہ
انجم انصار

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا (انہیں عذاب الہیٰ سے کسی طرح نجات نہ ہوگی) اگر ان کے پاس زمین کی تمام چیزیں ہوں اور اسی کے برابر اس کے ساتھ (انہیں اور مال بھی مل جائے) تاکہ وہ اسے روز قیامت کے عذاب سے فدیہ دیں (تب بھی وہ مال) ان سے نہ قبول کیا جائے گا اور ان کے لیے درد دینے والا عذاب (جو تیار) ہے (اس سے نہ بچ سکیں گے) (۳۶) چاہیں گے کہ (کسی طرح) آتش (جہنم) سے نکل جائیں حالانکہ وہ اس سے (کبھی) نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے (وہاں) دائمی عذاب ہے (۳۷) اور (اے مسلمانو) چور مرد اور چور عورت (اگر تمہیں مل جائیں) تو اس (برے فعل) کی سزا میں جو انہوں نے کیا ہے ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو (یہ) اللہ کی طرف سے (ان کے لیے) عذاب ہے اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے (۳۸) پھر جو کوئی اپنے گناہ کے بعد توبہ کرلے اور اچھے کام کرنے لگے تو بے شک اللہ اس پر مہربانی کرے گا (کیونکہ) یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۳۹) (اے شخص) کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت، جسے چاہتا ہے عذاب کرتا ہے اور جسے چاہتا بخشتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۴۰) اے رسول ﷺ تمہیں وہ لوگ رنجیدہ نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے منہ سے (تو) کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے دل بے ایمان ہیں اور وہ لوگ جو یہودی ہو گئے یہ لوگ جھوٹ (بات) کے بہت (شوق سے) سننے والے ہیں ان (کافروں کے) دوسرے گروہ (سے بیان کرنے) کے لیے جو (ابھی تک) تمہارے پاس نہیں آئے (تمہاری باتیں) سنتے ہیں (توریت کے) کلمات ان کے (اصلی) معانی (معلوم ہوجانے) کے بعد تحریف کرتے ہیں (اور لوگوں سے) کہتے ہیں کہ (یہ توریت کا حکم ہے) اگر (محمد ﷺ کی طرف سے) تمہیں یہ (حکم) دیا جائے تو اسے قبول کرلینا اگر یہ حکم تمہیں نہ دیا جائے تو اس سے بچنا یہ لوگ سخت گمراہ ہیں اور جسے اللہ گمراہ کرنا چاہے تو تم اس کی (ہدایت کے) لیے اللہ کی طرف سے کچھ اختیار نہیں رکھتے یہی لوگ ہیں اللہ جن کے دلوں کو (نجاست کفر سے) پاک کرنا نہیں چاہتا ان کے لیے دنیا میں (بھی) ذلت ہے اور آخرت میں (تو) ان کے لیے بڑا (ہی سخت) عذاب ہے (۴۱)



(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۳۶ تا ۴۱)



سیدنا حامد ﷺ

صفاتی اسم مبارک

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْحَامِدِیْنَ ط

مفہوم: سراہنے والے، سب سے زیادہ پروردگار کی تعریف و تسبیح بیان کرنے والے۔

۱۔ القرآن:

۱۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (۳۹) وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۴۰) ۔ق

ترجمہ: اور آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو ○ اور رات کے بعض اوقات میں بھی نماز کے بعد بھی اس کے نام کی تنزیہہ کیا کرو ○

۲۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ (۹۸) وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰی یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ (۹۹) الحجر

ترجمہ: پس اپنے پروردگار کو سراہتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو اور سجدہ کرنے والوں میں ہوجاؤ ○ اور مرتے دم تک اپنے پروردگار کی عبادت میں رہو ○

۳۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ (۷۴)

الواقعة

ترجمہ: پس اپنے عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کرو۔

۴۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا (۲۶) ۔ الدھر

ترجمہ: اور رات کو بڑی دیر اس کے آگے سجدے کرو اور اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

امانت

رفعت سراج

قسط 11

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہارسو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت وخیانت کو واضح کرتی ایک پُر درد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیوروسرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے ہمیشہ رزقِ حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبینہ اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو ناقابلِ قبول ہوتا ہے۔ مہر جان کو کمرے میں بے ہوش دیکھ کر گل جان، اصیل خان کے ساتھ انہیں اسپتال لے کر جاتی ہے، جابر علی، برہان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو برہان گھر سے چلا جاتا ہے۔ رابی گھر چھوڑ کر مری چلی جاتی ہے۔ مہر جان کا آپریشن ہوگیا لیکن انہیں ہوش نہیں آتا تو گل جان بہت پریشان ہوتی ہے لیکن نرس اسے تسلی دیتی ہے۔ برہان اخبار میں اشتہار دیکھ کر شاہ عالم کے پاس انٹرویو کے لیے جاتا ہے اور وہ اسے کائناز کو پڑھانے کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ اصیل خان ماضی کے دنوں میں اپنے اور مہر جان کے گزرے یادگار لمحات میں گم ہوتا ہے کہ گل جان اسے مہر جان کے ہوش میں آنے کی اطلاع دیتی ہے۔ اصیل خان، گل جان کو بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو کراچی لے کر آرہی ہے۔ برہان اپنا موبائل شاہ عالم کے گھر بھول جاتا ہے۔ صابرہ، برہان کو فون کرتی ہے تو اس کی بات کائناز سے ہوتی ہے۔ صابرہ فون پر بات کر رہی تھی کہ جابر علی اٹھ جاتا ہے اور وہ صابرہ پر چیختا ہے۔ گل جان، مہر جان کے پاس اسپتال میں ہوتی ہے تو اصیل خان فون پر بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو مری سے گرفتار کر کے لے آئی ہے اب اسے گھر لاتا ہے۔ وارث علی اور ایس پی شاہ زمان اپنی فتح اور کامرانی پر خوش ہوتے ہیں۔ مہر جان فون پر اصیل خان کو کہتی ہے کہ رابی کو پہلے اسپتال لے کر آئے۔ فائزہ، احمر کے ساتھ شبینہ سے ملنے آتی ہے تو اس کے جانے سے پہلے ہی جابر علی آجاتا ہے اور وہ اس کے آنے پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ مہر جان، سہراب خان کو فون کرتی ہے کہ نکاح ہر صورت میں آج ہی کرنا ہے۔ شبینہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ ستارہ کو بتادے کہ شادی اس کی نہیں بلکہ ستارہ کی ہو رہی ہے۔ گل جان نے روما کو بتایا کہ رابی کی شادی ہو رہی ہے تو روما بھی پریشان ہوگئی۔ رابی اپنا کمرا بند کر کے بیٹھی تھی یہ بات گل جان کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ برہان، شاہ عالم کے ہاں پہنچا تو اسے پتا چلا کہ وہ اپنا موبائل وہاں بھول گیا تھا۔ روما، گل جان سے پوچھتی ہے کہ وہ کائناز کو شادی میں بلالے تو گل جان منع کر دیتی ہے۔ کائناز بخار کی شدت سے نڈھال تھی وہ دل بہلانے کے لیے روما کو فون کرتی ہے تو کوئی فون ریسیو نہیں کرتا۔ گل جان، رابی کو مہر جان کی دی ہوئی ساڑی دیتی ہے کہ وہ تیار ہوجائے۔ رابی نے ساڑی پہن کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور پھر بے ترتیبی سے اپنے بال کاٹ لیے اس کے بعد اس نے تیزاب میں روئی بھگو کر اس سے اپنے چہرے پر لائنیں کھینچنا شروع کر دیں۔ اندر کی جلن نے ہر تکلیف کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ کائناز کہتی ہے تو شاہ عالم اسے روما کے گھر لے جاتا ہے۔ صابرہ کی برہان سے بات ہوتی ہے تو وہ کائناز کے بارے میں پوچھتی ہے۔ کائناز اور شاہ عالم، مہر جان کے گھر پہنچتے ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے کہ رابی کی شادی ہو رہی ہے۔ رابی اپنے کمرے کا دروازہ نہیں کھول رہی تھی تو مہر جان سمجھیں کہ اس نے بالآخر اپنا کام تمام کر لیا لیکن سب کے بہت کہنے پر اس نے دروازہ کھولا تو سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مہر جان، اصیل خان سے کہتی ہے کہ وہ رابی کو یہاں سے کہیں بھی لے جائے کیونکہ رابی نے ان کو شکست دی ہے اور انہیں سر جھکا کر جینا نہیں آتا۔ سہراب خان رابی کی شکل دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان ایک بار پھر آئی سی یو میں داخل ہوگئی تھیں۔ رابی کو شاہ عالم ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات دیتے ہیں تاکہ وہ آرام محسوس کرے۔ شائستہ بیگم اور فائزہ شبینہ کے گھر آتی ہیں تو وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے شائستہ بیگم کو اس خبر سے تسلی ہوتی ہے کہ شبینہ کی شادی ہو رہی ہے لیکن صابرہ، ستارہ کی اس بات کی نفی کرتی ہے۔ شبینہ، صابرہ سے کہتی ہے کہ وہ ستارہ کو بتادے کہ شادی اسی کی ہو رہی ہے۔ صابرہ بالآخر ستارہ کو بتاتی ہے کہ شادی اس کی ہو رہی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے کہ گل جان کو پتا چلتا کہ... ان کا ذہن ماضی کی باتیں یاد کر رہا ہے اور وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ روما، رابی اور کائناز کو گل جان کے بارے میں بتاتی ہے۔ ستارہ کا وارث علی سے نکاح ہو جاتا ہے۔

اب آگے پڑھیں

بیٹی کو رخصت کرنے کی قیامت خیز گھڑی بالآخر آگئی تھی۔ صابرہ، ستارہ کو سینے سے لپٹائے کھڑی تھی۔ اس وقت کمرے میں ستارہ، صابرہ اور شبینہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"اس وقت تم نے اپنی ماں پر جو احسان کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ ہو سکے تو ماں کی مجبوریاں سمجھنے کی کوشش کرنا اور معاف کر دینا۔" بولتے بولتے صابرہ سسک پڑی۔

"کوئی بات نہیں امی، عزت تو بچ گئی مگر آپ کی بیٹی بک گئی۔" ستارہ نے بالکل سپاٹ لہجے میں ماں کو جواب دیا تھا۔ شبینہ جو چپ چپ کھڑی تھی تڑپ کر رہ گئی اس نے بے اختیار ستارہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ایسے مت بولو ستارہ...... چار عزت دار لوگوں کے سامنے تمہارا نکاح ہوا ہے۔" صابرہ نے سسکتے ہوئے کہا اور ستارہ کو زور سے بھینچا۔

"امی آپ کی خاطر یہ سب کچھ کر تو لیا ہے مگر اب آپ میری ایک بات سن لیجیے۔" ستارہ اسی طرح بے تاثر، سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

"بولو بیٹا...... ماں صدقے، ماں واری......" صابرہ نے بے قرار ہو کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"آج میں اس گھر سے رخصت ہو رہی ہوں...... ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔" ستارہ کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ صابرہ رونا بھول کر بیٹی کی شکل دیکھنے لگی۔ شبینہ کی بھی سانسیں رکنے لگیں۔

"ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے......؟" شبینہ نے حق دق ہو کر ستارہ کی طرف دیکھا۔

"آج کے بعد میں کبھی اس گھر میں نہیں آؤں گی۔ کبھی بھول کر بھی قدم نہیں رکھوں گی۔ فرض کریں مجھ پر کبھی بہت برا وقت آیا اور مجھے اُس گھر سے بھی نکال دیا گیا...... تب بھی میں یہاں نہیں آؤں گی۔ ابا جان کی زیادتیوں کا یہ جواب عمر بھر کے لیے ہے۔"

"نہیں، نہیں...... ایسا مت بولو بیٹا...... اللہ تمہیں اُس گھر میں ہر طرح کی خوشیاں دے، پھلو پھولو...... شاد و آباد رہو...... یہ تو تم اپنی ماں کو سزا دو گی...... کسی اور کو نہیں......" صابرہ بری طرح روتے ہوئے بولی۔

اسی وقت جابر علی کی آواز آئی۔

"ارے بھئی ستارہ کو لے کر آجاؤ...... انتظار ہو رہا ہے۔" یہ سنتے ہی صابرہ نے پھر بیٹی کو سینے سے لگا کر زور سے بھینچا۔

"اچھا آپا...... خدا حافظ...... ابا جان اجازت دیں تو کبھی کبھی ملنے آجایا کرنا......" ستارہ نے شبینہ کی طرف ہاتھ بڑھایا، شبینہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بے قراری سے چوم لیا...... آنسو ایک تواتر سے گالوں پر پھسل رہے تھے جبکہ ستارہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کا بھی شائبہ نہ تھا۔

اسی وقت جابر علی اندر آگیا تھا۔ شبینہ تو باپ کو دیکھتے ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور جلدی جلدی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

"ارے بھئی دیر ہو رہی ہے، بند کرو یہ رونا دھونا......" وہ اپنے مخصوص خشک انداز میں گویا ہوا۔

صابرہ نے طوفان سینے میں دبا کر سر پر آنچل درست کیا اور ستارہ کو لے کر باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ شبینہ کی آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی وہ اپنی جگہ سنگِ میل کی طرح گڑی تھی۔ جبکہ ستارہ کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی ضروری کام سے گھر سے باہر جا رہی ہو...... اسے ساتھ لے کر چلتی ہوئی صابرہ خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ جابر علی پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔

باہر وارث علی اپنی ذاتی لگژری کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اپنی دلہن کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔
جابر علی نے ستارہ کی طرف دیکھا اور میکانکی انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
"بہت اچھا گھر ملا ہے تمہیں...... یاد کرو گی باپ کو...... خاندان میں آج تک کسی لڑکی کی شادی اتنے بڑے رئیس سے نہیں ہوئی...... بہت نیک، نمازی، پرہیزگار بندہ ہے...... تمہارا بہت خیال رکھے گا۔" وہ خلافِ معمول بہت آہستہ، دبے ہوئے لہجے میں بیٹی سے ہمکلام تھا۔ ستارہ نے صرف ایک لمحے کے لیے نظر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔
"بہت شکریہ ابا جان......"
شاید ہی کسی دلہن نے بوقتِ رخصت باپ سے اس طرح کلام کیا ہوگا۔ شادی کرنے پر باپ کا شکریہ ادا کیا ہوگا...... اس نے ایک لمحے کے لیے تو جیسے جابر علی کو بھی گڑبڑا کر رکھ دیا تھا کہ وہ مزید کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں رہا...... بس ہاتھ بڑھا کر ستارہ کو کندھوں سے تھام لیا...... اور اسے لے کر گیٹ کی طرف چلا۔ صابرہ کو اب جنبش محال تھی۔

☆☆☆

مہر جان ٹرنکولائزر کے زیرِ اثر گہری نیند سوئیں تو گل جان کے دل میں رابی کو دیکھنے کی تڑپ جاگی۔ وہ بے اختیار سی ہو کر شاہ عالم کے گھر چلی آئی ابھی وہ شاہ عالم کے گھر کے لاؤنج سے باہر ہی تھی کہ اس نے رابی کی آواز سنی...... وہ آگے بڑھنے کے بجائے رک گئی۔
"میں نے آپ کی ہر بات ماننے کا وعدہ کیا ہے دادا جان...... مگر آپ بھی مجھ سے ایک وعدہ کریں۔"
"بولو بیٹا...... ماننے والی بات ہوئی تو بغیر وعدہ کیے بھی مان لوں گا۔"
"آپ کبھی مجھے ڈاکٹر صاحبہ کے گھر جانے کے لیے نہیں کہیں گے۔" رابی کے لہجے میں اتنی نفرت تھی کہ گل جان کو جھرجھری سی آ گئی۔
"بیٹا...... وہ گھر آپ کا بھی تو ہے۔" شاہ عالم نے بڑی شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی۔
"ہوم سویٹ ہوم......؟" رابی کی طنزیہ آواز گل جان کی سماعت سے ٹکرائی۔
"گھر اور مکان میں جو فرق ہے دادا جان وہ آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ زمین یا مکان خریدتے ہیں، گھر بناتے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ اس کوٹھی کو میں نے کبھی سویٹ ہوم فیل کیا ہو......" بولتے بولتے رابی کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔ گل جان تڑپ کر اندر داخل ہوگئی۔
"السلام علیکم...... شاہ صاحب......" اس نے بہت مؤدبانہ شاہ عالم کو سلام کیا...... جو اس پر نظر پڑتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔
"دیکھا...... آپ کی خالہ کو آپ سے کتنا پیار ہے خود آپ سے ملنے آ گئیں۔"
"وہ ماں نہیں ہیں، یہ خالہ نہیں ہیں جو ظالم کو سپورٹ کرتا ہے وہ بھی ظالم ہی ہوتا ہے۔" رابی، گل جان کو نہایت نفرت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
عموماً ایسا ہوتا ہے جب جسمانی تکلیف انتہا کو چھوتی ہے تو روح کے زخم بھی تازہ ہو جاتے ہیں۔ تکلیف، بے بسی کی کیفیت میں دفن شدہ ناگوار و تلخ واقعات ذہن کی اسکرین پر اتنے واضح ہو کر چمکتے ہیں جیسے فلم کا نیا فیتہ جو پریمیئر کے لیے پیش کیا جاتا ہے...... صاف، شفاف، ہر رنگ نمایاں، ہر منظر جاندار......

رابی کے چہرے کے زخموں سے جتنی آنچ آتی تھی اتنا ہی ماضی کا ہر منظر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا تھا...... اس لیے کہ ان زخموں کی بنیاد ماضی کے مرتب تلخ واقعات و یادیں تھیں۔
لوہے کو کاٹنے کے لیے ایک خاص طے شدہ نشان پر مسلسل ضربیں لگائی جاتی ہیں...... مگر کام تو وہ آخری ضرب کرتی ہے۔ جس کا اندازہ خود ضرب لگانے والے کو بھی نہیں ہوتا کہ یہی آخری ضرب ہوگی۔
گل جان، رابی کی زہرآلود نظروں کو سہتی خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔
"میں تو خود یہی کہنے آئی تھی کہ رابی کو فی الحال یہیں رہنا چاہیے۔ ویسے تو اب اُن کی پہچاننے کی حس بالکل ختم ہو چکی ہے مگر احتیاط ضروری ہے۔"
"اوہو...... اچھا...... اس کا مطلب ہے معاملہ بہت سیریس ہے، بہت افسوس ہوا سن کر...... اس کا مطلب ہے لمبا ٹریٹ منٹ چلے گا!" شاہ عالم کو تو یہ سن کر جیسے دلی صدمہ ہوا۔
"ڈاکٹرز کیا وجہ بتا رہے ہیں؟" وہ سابقہ موضوع سے یکسر ہٹ کر بڑی فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔
رابی بھی اب اپنی بات بھول کر گل جان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
"ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کے دماغ کے اندر کوئی چوٹ آئی ہے اور ٹشوز dead ہونے کی وجہ سے انہیں dementia ہو گیا ہے۔" گل جان ذہن پر زور ڈال، ڈال کر یوں بتا رہی تھی جیسے کوئی سبق یاد کرنے کے بعد سنا رہی ہو۔
"یہ کیا بیماری ہوتی ہے بھئی؟" شاہ عالم حیران ہو کر پوچھ رہے تھے۔
"یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے...... جسے یہ بیماری ہوتی ہے اس کا ذہن آگے کی طرف دیکھنا، سوچنا چھوڑ دیتا ہے، سب کچھ بھول جاتا ہے اسے پچھلی باتیں یاد رہتی ہیں۔" گل جان کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ رابی بھی اب جیسے اپنے زخموں کی تکلیف بھول چکی تھی۔ ایک ٹک گل جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"کیا ڈاکٹر صاحبہ کہیں گر گئی تھیں؟" شاہ عالم کے لہجے میں بلا کی ہمدردی تھی۔ بڑی دل گرفتگی سے پوچھ رہے تھے۔
"جب میں اُن کے کمرے میں گئی تھی تو وہ بے ہوش تھیں۔ دیکھنے سے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ گرنے کے بعد بے ہوش ہوئی تھیں۔"
"یا اللہ رحم......!" ان کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔
"شاہ صاحب...... میری بہن نے اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھیں...... دو سال لندن میں پڑھائی کی...... مگر اب اُن کا دماغ بالکل خالی برتن ہے۔" گل جان نے اتنا کہا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔
"حوصلہ کریں گل جان بی بی...... اس بیماری کا علاج تو ہوگا ناں...... جب اس بیماری کا نام طے ہو چکا تو اس کی دوا بھی ملتی ہوگی۔" شاہ عالم نے گل جان کی گویا ہمت بندھانے کی اخلاقی ذمے داری نبھائی۔
"شاہ صاحب میں ان کا علاج کیوں کراؤں......؟ یہ بیماری تو اُن کے لیے اللہ کا انعام ہے، اپنی زندگی ہی میں دکھ کے احساس سے فارغ ہو گئیں۔" گل جان نے برجستہ و بے ساختہ انداز میں کہا تو شاہ عالم دم بخود ہو کر اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں گل جان کی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہو۔
"ارے نہیں...... یوں نہ کہیں مریض کا علاج معالجہ کرانا لواحقین کی اخلاقی ذمے داری ہوتی ہے بلکہ فرض ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے وسائل بھی موجود ہیں تو کیوں نہ علاج کرایا جائے؟" شاہ صاحب کی نرم طبع گل جان

کے جواب سے بوجھل ہوگئی۔

''شاہ صاحب قدرت نے خود ہی اُن کا علاج کردیا...... اب وہ اتنی خوش اور پُرسکون ہیں کہ میری اپنی زندگی میں سکون آگیا ہے۔ میں اپنی بہن کی مسکراہٹ کو ترس گئی تھی اب وہ بات، بات پر ہنستی ہیں تو اتنی اچھی لگتی ہیں کہ میں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔'' گل جان کے لہجے میں دکھ اُبل رہے تھے اور وہ اپنے پُرسکون ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھی۔

شاہ عالم دم بخود سے نظریں نیچی کیے گل جان کی گل فشانیاں سن رہے تھے۔ رابی بھی چند لمحے کے لیے سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔

''وہ...... بچیوں کے بارے میں بھی کوئی بات ہوئی...... میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحبہ اپنی اولاد کو تو نہیں بھولی ہوں گی......؟'' وہ کچھ دیر بعد گلا کھنکھار کر بولے۔

گل جان کے ہونٹوں پر اداسی کا تاثر پھیلاتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اُن کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی...... ہمارے علاقے کے ڈی سی حشمت یار خان کی بیٹی ٹوٹو سے بی بی جان کی بہت دوستی تھی فی الحال تو انہیں ٹوٹو یاد آرہی ہے۔''

''ٹوٹو...... یہ کیا نام ہے؟'' رابی نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''بیٹا نام تو اس کا شمس النسا تھا مگر وہ باہر پڑھی تھی ناں تو اسے یہ نام پرانے زمانے کا لگتا تھا۔ اپنی جنت مکانی دادی کو برا بھلا کہتی تھی جنہوں نے آوٹ آف فیشن نام رکھا تھا۔ کپڑے بھی لڑکوں والے پہنتی تھی۔ بی بی جان کی سب سے زیادہ اسی سے دوستی تھی۔''

''اوہ میرے مالک...... رحم کرنا ہم سب پر......'' شاہ عالم تڑپ کر رہ گئے۔ بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ ان کے ظلم کی وجہ سے کتنی زندگیاں برباد ہوگئیں......'' رابی کے انداز میں مایوسی اور غم و غصے کا تاثر غالب تھا۔

''بری بات ہے بیٹا...... کچھ بھی سہی...... ماں ہیں، اس وقت آپ سب کی ہمدردی کی مستحق ہیں۔'' شاہ عالم کی نرم طبع رابی کے بے رحم الفاظ کی تاب نہ لا پائی...... سو فوراً ٹوک دیا اور نرم لہجے میں کہنے لگے۔

''ہاں بیٹا...... ہر انسان اپنے کیے پر جواب دہ ہے۔ جو اچھا کرتا ہے تو اپنے لیے ہی اچھا کرتا ہے۔ برائی کرنے کا عذاب بھی خود ہی برداشت کرتا ہے۔''

''تم فی الحال شاہ صاحب کے پاس رہ کر اپنا علاج کراؤ...... کسی کا نہیں صرف اپنا خیال کرو...... اب میں چلوں گی صبح پھر آجاؤں گی۔'' پھر گل جان شاہ عالم کی طرف مڑی۔

''شاہ صاحب آپ اجازت دیں تو روما بھی چند دن یہاں بہن کے پاس رہ جائے؟''

''سر آنکھوں پر گل جان بی بی...... یہ بھی میری بچیاں ہیں...... کائنات تو یہ سن کر خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ لاکھ مرتبہ آپ کا شکریہ ادا کرے گی۔ بچیوں کی طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ان کا خیال رکھنا میری ذمے داری ہے۔ آپ بس ڈاکٹر صاحبہ کی دیکھ بھال کریں۔ اللہ انہیں شفا دے، آمین۔'' گل جان چادر سر پر ٹکاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کا احسان میں اتار سکتی ہوں نہ بھول سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں جذبۂ تشکر کسی مغنی کے میٹھے سُر

کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

صابرہ، شبینہ کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ شبینہ ماں کی طرف بڑی دل گرفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''امی بس کریں ناں، یہ لیں پانی پی لیں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس صابرہ کی طرف بڑھایا۔

''بیٹا کیا کروں دل پر قابو نہیں ہے، دیکھتے ہی دیکھتے دو بچے آنکھوں سے دور ہو گئے، ہائے میرے کالے نصیب۔''

''امی بس بھی کریں، کہیں ابا جان نہ سن لیں پھر ایک نیا ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔ اچھا یہ پانی تو پی لیں۔'' شبینہ ماں کے برابر میں بیٹھ کر اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''مجھے اب کسی کی پروا نہیں شبینہ...... میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ میرے دکھ کو تم نہیں سمجھ سکتیں۔ اللہ تمہیں خوشیاں دکھائے، اپنے گھر بار کا کرے۔ جب تم خود ماں بنو گی تو ماں کے دکھ کو سمجھو گی۔'' صابرہ اسی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے بولی تھی۔

شبینہ پانی کا گلاس اس کے سامنے کیے ہوئے ششدر سی بیٹھی تھی۔ چند لمحے ماں کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

''امی آپ کے صرف دو ہی بچے ہیں، میں کیا آپ کی بیٹی نہیں ہوں، میری طرف تو دیکھیں۔'' بولتے بولتے اس کی آواز پر آنسو غالب آگئے۔

''بیٹا اب نہیں سہا جاتا...... ہمت جواب دے گئی ہے میری۔''

وہ پہلے سے زیادہ سسکنے لگی۔

''امی آخر آپ کو ایک نہ ایک دن ستارہ کی شادی تو کرنا ہی تھی۔ وہ اسی شہر میں ہے، ملک سے باہر تو نہیں چلی گئی اور ابا جان نے آپ پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی۔ آپ اس سے مل سکتی ہیں پھر کیوں رو رہی ہیں؟'' شبینہ، ماں کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر بہت ہمدردی اور پیار سے کہہ رہی تھی۔

''وہ تو سمجھو ہمیشہ کے لیے ہم سے دور ہوگئی شبینہ...... کہہ کر تو گئی ہے اب کبھی اس گھر میں نہیں آئے گی۔'' صابرہ روتے ہوئے بولی۔

''امی وہ کہہ کر گئی ہے کہ نہیں آئے گی۔ اس نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ بھی اس سے ملنے نہ آئیں۔ آپ تو جا سکتی ہیں ناں......''

''لیکن...... لیکن میں اس کے پاس ہر وقت تو منہ اٹھا کر نہیں جا سکتی۔ شادی شدہ بیٹی کا ماں انتظار کرتی ہے۔ خاص طور پر خوشی کے دنوں میں...... عید، تہوار پر...... میری بیٹی کے دل پر کیا بیتے گی۔ جب وہ اکیلے عید منایا کرے گی اور میرا تمہارا انتظار کرے گی۔'' صابرہ آنسو پونچھتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

''امی اس نے کہا ہے ناں...... ابھی وقت ہی ایسا تھا اور اس کی تو عادت ہے جو اس کے دل میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔ کچھ دن گزریں گے تو اس کا خود دل چاہے گا آپ سے ملنے کے لیے۔ وہ خود منع کر کے گئی ہے۔ ابا جان نے تو اسے نہیں کہا ناں کہ یہاں نہ آئے......'' شبینہ پھر دلائل کے ساتھ ماں کو سمجھانے لگی۔

''نہیں بیٹا، وہ بھی جابر علی کی بیٹی ہے جو کہے گی کر کے دکھائے گی۔ خون کا اثر تو ہوتا ہے ناں اسی کو تو

شجرۂ نسب کہتے ہیں۔ انسان اپنے شجرے سے پہچانا جاتا ہے۔ جیسے درخت اپنے پھل سے۔" صابرہ سسک رہی تھی۔

"امی، ابا جان مرد ہیں اور ستارہ لڑکی...... مردوں کی تو عادت ہوتی ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کر کے بھی دکھاتے ہیں لیکن ستارہ میں ابا جان جتنی ہمت نہیں ہوگی...... وہ ہار مان لے گی۔ جس دن اسے آپ کی یاد بہت ستائے گی۔ خود آجائے گی آپ کے پاس۔ پلیز اب آپ مت روئیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ اگر ابا جان نے دیکھ لیا تو...... امی میرا تو خیال کریں ناں۔"

صابرہ نے ایک دم شبینہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بہت پیار سے اس کی پیشانی چومی۔

"اچھا میری بیٹی...... اچھا...... ہاں تو، تو میری بہت نیک بچی ہے، تیرا تو خیال کرنا چاہیے۔ مجھے معاف کردے بیٹا۔ پاگل ہوگئی ہے تیری ماں۔" یہ کہہ کر صابرہ نے شبینہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور یوں آنکھیں بند کرلیں جیسے بیٹی کو سینے سے لگا کر کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی ہو۔

☆☆☆

"خالہ جانی میں کب تک اماں جان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ کب تک آپ مجھے چھپاتی رہیں گی ان سے...... اور کیوں چھپا رہی ہیں......؟" روما، گل جان کے کمرے میں تھی۔ اس کے زانو پر سر رکھے بہت الجھی الجھی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔ گل جان کے سینے پر ایک برچھی سی لگی تھی۔ اس نے جھک کر روما کی پیشانی چوم لی۔

"بیٹا بس میں اُن کے سوالوں سے تنگ آجاتی ہوں۔ مم...... میرے دل پر چوٹ پڑتی ہے، جب وہ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ یہ لڑکی کون ہے۔" گل جان کو یہی ایک جواب سوجھا تھا۔

"لیکن خالہ جانی...... اماں جان ٹھیک تو ہو جائیں گی ناں...... آج کل تو ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ آپ...... آپ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں ناں......"

گل جان نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر روما کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لگتا تھا جیسے اس کے کچھ پرانے زخم ہرے ہوگئے ہوں۔ بہ مشکل گویا ہوئی تھی۔

"بیٹا میں تمہاری اماں جان کا علاج نہیں کرانا چاہتی۔" یہ سن کر تو روما حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ کر گل جان کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہیں خالہ جان؟"

"ہاں بیٹا...... اگر مجھے علاج کرانا ہوتا تو میں انہیں گھر کیوں لے کر آتی۔ کسی نفسیاتی اسپتال میں لے جاتی...... مگر میں اُن کا علاج نہیں کرانا چاہتی۔ اس لیے آئندہ تم مجھے ان کا علاج کرانے کے لیے مت کہنا۔"

روما حیران حیران آنکھیں پھاڑے گل جان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں خالہ جانی آپ......؟ کیوں...... کیوں نہیں علاج کرائیں گی آپ اماں جان کا...... کیا وہ اب ایسے ہی رہیں گی؟"

"ہاں ایسے ہی رہیں گی۔" گل جان نے فوراً ہی روما کی بات کاٹ دی تھی۔

"لیکن...... لیکن اس طرح سے کیسے رہیں گی۔ کب تک رہیں گی۔" روما کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اٹک اٹک کر پوچھنے لگی۔

"تمہاری ماں زندگی میں ہی جنت میں آ کر بیٹھ گئی ہے۔ پہلے یہ گھر ایک جہنم تھا اور اب یہی گھر تمہاری ماں کے لیے جنت بن چکا ہے۔ تم کیوں چاہتی ہو کہ وہ آخری سانس تک تڑپ، تڑپ کر جیتی رہے۔ وہ ہنس رہی ہیں، مسکرا رہی ہیں۔ کیا تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔" گل جان ایک خواب کی سی کیفیت میں بولتی جا رہی تھی اور روما اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

"خالہ جانی آپ اچھا لگنے کی بات کر رہی ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جب اماں جان زور زور سے ہنستی ہیں تو خوف سے میری بری حالت ہو جاتی ہے۔"

"خالہ کی جان میں اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ تمہیں بھی کچھ دنوں کے لیے رابی کے پاس چھوڑ دوں۔ تم دونوں کائناز کے ساتھ رہو۔ جب تمہیں محسوس ہو کہ یہاں آجانا چاہیے تو چلی آنا۔ یہ تمہارا گھر ہے تمہیں یہاں آنے سے کوئی روکے گا نہ پابندی لگائے گا لیکن تم اب مجھے بی بی جان کا علاج کرانے کے لیے مت کہنا اور یہ بات اپنے ذہن میں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے بٹھا لو۔ بی بی جان اب ایسے ہی رہیں گی۔ کوئی مجھے کتنا ہی کہے میں اُن کا علاج نہیں کراؤں گی۔ ہاں اگر میں مر جاؤں تو پھر تم لوگوں کی مرضی...... جہاں مرضی اُن کا علاج کرانا...... مگر میں اب اپنی بہن کی خوشیوں کو ملیا میٹ نہیں کروں گی۔ وہ خوش ہیں، مجھے بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" گل جان بول رہی تھی اور روما اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ گل جان کا ذہنی توازن بگڑ رہا ہے۔

"جاؤ تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ کل میں تمہیں کائناز کے پاس چھوڑ آؤں گی۔ تمہیں تو ویسے بھی کائناز کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔ شاید اللہ نے تمہاری سن لی...... جاؤ بیٹا اب جا کر سو جاؤ...... میں بھی بیس سال سے جاگ رہی ہوں۔ اب تو اللہ، اللہ کر کے مجھے نیند آنے لگی ہے۔ جاؤ بیٹا...... جاؤ...... جا کر سو جاؤ۔ دیکھو تو سہی اب اس گھر میں کتنا سکون ہے اور تمہیں پتا ہے کہ سکون کس لیے ہے کہ تمہاری ماں کو جہنم سے نجات مل گئی ہے۔ تمہاری ماں اب ہنستے بولنے لگی ہے۔ تمہاری ماں کا غصہ ختم ہوگیا ہے۔"

"خالہ جانی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" روما خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور مجھے سارے ڈر و خوف سے نجات مل چکی ہے۔ بیٹا اپنی خالہ پر رحم کرو، کیوں میری نیند خراب کر رہی ہو۔ تمہیں تو میرا احساس کرنا چاہیے۔ خالہ سارا دن مصروف رہی ہے۔ تمہاری ماں کی دیکھ بھال کرتی ہے، جاؤ بیٹا...... خدا کے لیے...... مجھے بھی تھوڑی دیر سکون کی نیند سونے دو۔" گل جان کا لہجہ دیکھتے ہی دیکھتے اجنبی لگنے لگا تھا۔ یوں جیسے روما سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہو۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی کہ اس دنیا تک کا سفر کرنا روما کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے پر اس ماورائی دنیا تک اڑان بھرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

☆☆☆

ستارہ کے انداز میں کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جیسا اعتماد تھا۔ کوئی جھجک یا گھبراہٹ جو پہلی بار اپنے دولہا سے تنہائی میں ملنے والی دلہن کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ اس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ وہ وارث علی کے سامنے یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی اپنی شرائط پر بات چیت کرنے بیٹھتا ہو۔

وارث علی کو اتنی کم عمر لڑکی کے یہ انداز چونکا رہے تھے...... ستارہ کے اعتماد نے تو وہ سب کچھ بھلا دیا تھا جو وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔ ستارہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑے آرام سے بیٹھی تھی اور جیسے وارث علی کی لب کشائی کا انتظار کر رہی تھی۔

وارث علی جو ایک نمبر کا شاطر تھا۔ اس کم عمر لڑکی کے اعتماد نے اسے ایک لمحے کے لیے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ستارہ کی آنکھوں میں اس جرنیل کی سی خود اعتمادی اور شدت تھی جو آخری معرکہ لڑنے کے لیے میدان میں اترتا ہے۔

"بندہ حُسنِ معصوم کے حضور آداب بجا لاتا ہے۔" آخر کار وارث علی الفاظ موزوں کر کے ہمکلام ہوا۔

ستارہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ایسے دیکھنے کے انداز سے ہی وارث علی گڑبڑا رہا تھا۔ ستارہ نے اس کا آداب یوں سنا جیسے اپنا حق وصول کر رہی ہو مگر خاموش رہی۔

"آپ بات نہیں کرتیں...... میں آپ کی آواز سننے کے لیے بے تاب ہو رہا ہوں۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ناں...... کہ میں تیرا حسن ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں...... کچھ تو بولیے...... حالانکہ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کی آواز بھی بہت خوب صورت ہوگی۔"

ستارہ نے اسی طرح بڑے اعتماد سے وارث علی کی آنکھوں میں دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"پہلی رات کی دلہن بہت خوب صورت ہوتی ہے، اس کی آواز بھی بہت خوب صورت ہوتی ہے، اس کی ہنسی بھی بہت پیاری ہوتی ہے۔ اس میں کوئی عیب ہی نہیں ہوتا، سر سے لے کر پاؤں تک وہ حسن کا شاہکار ہوتی ہے۔ پھر چند دن گزرنے کے بعد پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی بدصورت ترین عورت، بھیانک آواز رکھنے والی عورت...... ڈراؤنی باتیں کرنے والی عورت...... ایک بیوی ہی تو ہوتی ہے۔" وارث علی ستارہ کی یہ بات سن کر بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا اور حیرت آمیز خوشی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ارے واہ...... آپ تو بات بھی کمال کرتی ہیں...... واقعی کسی پولیس افسر کی بیٹی دکھائی دے رہی ہیں۔"

"تو پہلے کیا آپ کو شک تھا کہ میں پولیس افسر کی بیٹی نہیں ہوں؟ یوں تو آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔"

وارث علی تو یہ سن کر گھبرا گیا... جیسے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔ درحقیقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی کم عمر دلہن اس کے ساتھ یوں ترکی بہ ترکی مکالمہ کرے گی۔

ستارہ نے وارث علی کی حواس باختگی دیکھی تو بہت لطف اندوز ہوئی پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ جیسے اسے وارث علی سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

لیکن وارث علی ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا...... ستارہ کی نظر وارث علی کے خوب صورت بلیک بیری پر پڑی۔ اسے اچانک کوئی خیال آیا۔

"وہ کیا میں اس فون سے ایک کال کر سکتی ہوں؟" وارث علی کے دل میں ایک نہیں بہت سے چور تھے۔ وہ بری طرح گھبرا گیا کہ رات کے اس پہر یہ نئی دلہن کس سے بات کرنا چاہ رہی ہے لیکن بہرحال وہ انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔

"جی ضرور...... یہ میرا نہیں آپ کا بلیک بیری ہے لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی رات کو آپ کس سے بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"اپنے بھائی سے......" ستارہ نے فوراً ہی جواب دیا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر۔

"بھائی...... اوہ...... ہاں یاد آیا...... آپ کے ایک بھائی سے آپ کے گھر پر میری ایک ملاقات تو

ہوئی ہے لیکن آج وہ دکھائی نہیں دیے۔ خیریت کیا وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں؟" وارث علی بری طرح چونک پڑا تھا۔

"جی، یوں سمجھ لیں کہ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔" ستارہ نے ہاتھ بڑھا کر بلیک بیری اٹھایا اور وارث علی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"سمجھ لیں......؟" وارث علی پھر الجھا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے بھائی کا نمبر ملاؤں؟" وارث علی پھر سٹپٹا گیا۔ ستارہ کے اعتماد نے اس جیسے شاطر کو اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"جی...... جی...... سوری...... آپ بالکل ملائیں اگر آپ چاہیں تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں تاکہ آپ آرام سے کھل کر اپنے بھائی سے جو بات کرنا چاہتی ہیں کر لیں۔"

"مجھے کوئی خفیہ بات نہیں کرنی اور نہ ہی میں ایسی کوئی غلط بات کرتی ہوں کہ مجھے ڈر لگے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ کر بھی اسی طرح بات کر سکتی ہوں جس طرح آپ کی غیر موجودگی میں۔ آپ کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ستارہ کے لہجے میں ایک تندی تھی۔ اس شعلہ بیانی پر تو جیسے وارث علی کے چھکے ہی چھوٹ گئے۔ اس نے ستارہ کے سامنے سے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ وہ اپنے بھائی سے کوئی ایسی بات نہ کہہ ڈالے جو اس کی استطاعت سے زیادہ ہو اور ستارہ پر کھل جائے کہ وہ اپنے نئے نویلے دولہا پر بغیر کسی وجہ کے حاوی ہو رہی ہے۔

جابر علی کی پولیس افسری ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کی بیٹی کا غالب آنا کیسے سہا جا سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا...... ستارہ نے برہان کا نمبر ملایا اور کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ نظریں اس کی دروازے کی طرف تھیں۔ جس دروازے سے وارث علی نکل کر باہر گیا تھا۔ چند لمحے انتظار کے بعد آخر کار کال ریسیو ہو گئی۔ برہان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"ہیلو......" برہان کی آواز سنتے ہی جیسے ستارہ کے اندر ایک ولولہ ایک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

"السلام علیکم...... بھائی...... ستارہ بات کر رہی ہوں، شبینہ اور امی تو آپ سے بات کرتی رہتی ہیں، جب سے آپ گئے ہیں میری آپ سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ سوچا زندگی کے اس اہم موقع پر تو اپنے بھائی کی دعا لینی چاہیے۔"

برہان جس جگہ لیٹا ہوا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے چھت اس پر آ رہی ہو، وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ستارہ...... کیا واقعی تم ستارہ بات کر رہی ہو، تم کس نمبر سے بات کر رہی ہو؟"

"بھائی یہ میرے شوہر کا نمبر ہے، آپ سیو کر لیجیے کیونکہ فی الحال میرے اپنے پاس تو موبائل نہیں ہے۔" ستارہ بہت اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

"شوہر......؟" برہان پر پھر ایک قیامت نازل ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے نیند یوں اُڑ گئی تھی جیسے وہ برسوں سے سویا ہی نہیں تھا۔

"جی بھائی...... آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ رشتہ آپا کے لیے آیا تھا...... شادی میری ہو گئی۔"

"کیا کہہ رہی ہو ستارہ...... مذاق مت کرو...... اس طرح کے مذاق نہیں کرتے......"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی......؟" ستارہ نے فوراً بات کاٹ کر کہا تھا۔ "آپ کے پاس نمبر تو آ گیا ہے ناں! آپ خود سوچیے یہ نمبر میرے پاس کہاں سے آیا ہے، ابا جان نے تو ہمیں کبھی موبائل فون رکھنے کی اجازت دی ہی نہیں۔"

"ستارہ تم کہاں سے بات کر رہی ہو، امی کہاں ہیں؟"

"بھائی میں اپنے شوہر کے گھر سے بات کر رہی ہوں، امی ظاہر ہے گھر پر ہوں گی، آج ہی تو میری شادی ہوئی ہے اور میں اپنے شوہر کی اجازت سے آپ سے بات کر رہی ہوں۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا ستارہ...... میں تو یہ سوچ کر گھر سے نکلا تھا کہ میں شبینہ سے نظریں نہیں ملا سکوں گا کیونکہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا لیکن تم کہہ رہی ہو......"

"بھائی آپ پوری بات تو سن لیں۔" ستارہ نے برہان کی بات کاٹ دی۔ جس کے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔

"ہاں بولو۔" برہان کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی۔

"بھائی آپا بچ گئیں، شادی میری ہوگئی اور میں جس جگہ سے فون پر بات کر رہی ہوں بس اتنی ہی کر سکتی ہوں۔ باقی جو کچھ آپ کو پوچھنا ہو آپ امی سے فون پر بات کر کے پوچھ لیجیے گا۔ میں نے تو آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ اب میں اپنے گھر میں ہوں جس طرح سے بھی شادی ہوئی ہے جس سے بھی ہوئی ہے لیکن اب یہی گھر میرا گھر ہے اور اس گھر میں آپ کا ہر وقت انتظار کروں گی، آپ کو یہاں آنے پر کوئی نہیں روکے گا اور نہ ہی کوئی روک سکتا ہے۔ ٹھیک ہے بھائی آپ سے پھر بات ہوگی۔"

"ایک منٹ ستارہ...... ایک منٹ میری بات سنو۔" برہان جیسے بڑی بے تابی سے تڑپ کر بولا تھا۔

"جی بھائی......؟"

"ستارہ...... وہ بندہ کیسا ہے؟ جس سے تمہاری شادی ہوئی ہے، تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟ میں تم سے یہ تو کبھی نہیں پوچھوں گا کہ تم خوش ہو یا اداس...... اس بندے میں تم نے ایسی کوئی بات محسوس کی جس سے اندازہ ہو کہ تم اس کے ساتھ اچھی طرح گزار سکتی ہو؟" برہان پریشانی اور روحانی اذیت کی وجہ سے بہت غیر مناسب و بے ترتیب الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ جو اس کے الجھے ہوئے ذہن کے غماز تھے۔

"بھائی میرا خیال ہے کہ میرے لیے یہی بہت ہے میں اپنے گھر میں ہوں اور اب اپنی مرضی سے سو سکتی ہوں اور جاگ سکتی ہوں۔ اپنے ہونے کو محسوس کر سکتی ہوں خود کو یقین دلا سکتی ہوں کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ میرا اپنا ایک الگ دماغ اور دل ہے اور میرے لیے یہ اطمینان بھی بہت ہے کہ اپنی زندگی کو میں خود استعمال کروں گی۔ میں شبینہ آپا نہیں ہوں برہان بھائی، مجھے سمجھوتے کرنے نہیں آتے۔ انسپکٹر جابر علی کی بیٹی ہوں، کوئی مذاق نہیں ہے، خدا حافظ...... آپ گھر آئیں گے تو سامنے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔" اس کے ساتھ ہی ستارہ نے فون بند کر دیا تھا لیکن برہان کی نیندیں اڑا کر رکھ دی تھیں۔

ستارہ بلیک بیری سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اب بیڈ پر دراز ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی۔

"مجھے خود نہیں پتا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ میری منزل کہاں ہے؟ وارث علی تم نے کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری کنیز بن کر اس گھر میں رہوں گی، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......

جب میں اپنے باپ کے گھر میں باپ کی مرضی کی بن کر نہیں رہی تو تم تو پھر میری نظروں سے گرے ہوئے انسان ہو۔ ایسا انسان جس نے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ جیسے موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔" ابھی وہ یہیں تک سوچ پائی تھی کہ وارث علی اپنے خضاب سے رنگے ہوئے بڑے بڑے اسٹائل سے سنوارے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا نوجوانوں کے انداز میں چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ستارہ کو لیٹا ہوا دیکھ کر وہ جیسے پُرسکون ہوگیا کہ شکر ہے بھائی سے بات ہو چکی۔ دروازہ لاک کر کے ستارہ کی طرف بڑھا اور بہت لاڈ سے گویا ہوا۔

"تھک گئیں......؟ ہاں رات بھی تو بہت ہوگئی ہے۔ میں نے اپنی ملازمہ سے کہا ہے کہ تمہارے لیے گرم، گرم دودھ میں شہد ڈال کر لائے، بالکل خالص شہد ہے۔"

ستارہ، وارث علی کو ایک دم سامنے پا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ بھی سہی وہ ایک کم عمر لڑکی تھی۔ اتنا تو سمجھتی تھی کہ وارث علی اب اس کا شوہر ہے اور اس پر تمام اختیارات حاصل کر چکا ہے۔

"یعنی آپ مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ اس گھر میں میرے لیے دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔"

وارث علی نے حیرت، تعجب اور خاصی سرخوشی کی کیفیت میں ستارہ کی طرف دیکھا۔ اتنی بولڈ، پُراعتماد، برجستہ جملے بولنے والی اسے یقین نہیں آیا کہ یہ جابر علی کی بیٹی ہے۔ اس نے وقتی طور پر اسے بھلا دیا کہ ستارہ اس کی بیوی نہیں' ایک خاص ٹارگٹ کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، آلۂ کار ہے...... ستارہ کی خوب صورتی، کم عمری اور برجستگی نے جیسے اسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"آپ تو کمال شے ہیں۔" ستارہ نے بڑی گہری نظروں سے اب اس کے چہرے کا جائزہ لیا، بہت اہتمام سے سنوارے ہوئے بال اور کلین شیو...... کلین شیو شاید اس وجہ سے تھا تاکہ داڑھی مونچھوں کے سفید بال اس کی عمر کا پول نہ کھول دیں جبکہ اس کی آنکھوں کے کناروں پر کھنچی ہوئی باریک' باریک بے شمار لکیریں اس کی عمر کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"آپ کو یہ گھر پسند آیا؟ اوہو...... ہو...... آپ نے گھر دیکھا ہی کہاں ہے۔ آپ تو بس پورچ سے لاؤنج میں آئیں اور لاؤنج سے اس بیڈ روم میں...... چلیں آئیں میں آپ کو آپ کا گھر دکھاتا ہوں۔"

"رہنے دیں، یہ میرا گھر ہے، کبھی بھی وقت دیکھ سکتی ہوں۔ میں نے کوئی سروے رپورٹ تو نہیں بنانی......" وارث علی نے برجستہ قہقہہ لگایا تھا۔ وہ واقعی ستارہ کے اس جملے سے بہت لطف اندوز ہوا تھا۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جابر علی کی بیٹی میں اتنے اسٹائل ہوں گے۔"

"اسٹائلش تو میں بہت ہوں، اس لیے ذرا خیال رکھیے گا۔" ستارہ نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور وارث علی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"کیا مطلب......؟" وارث علی جیسے کچھ سمجھا نہیں...... الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مطلب یہ ہے کہ اتنی اسٹائلش بیوی کے ساتھ میاں کو بھی اسٹائلش ہی نظر آنا چاہیے۔"

"کوئی فکر ہی نہیں ہے جی...... اللہ کا دیا بہت ہے، آپ کی پسند کے کپڑے پہنیں گے جیسے آپ بولو...... بندہ تو بس یوں سمجھو...... بے دام غلام ہے جو آپ کا حکم سرکار...... یوں سمجھیں وارث علی موم کی ناک ہے جدھر پکڑ کر گھماؤ گی گھوم جائے گا۔ اللہ اللہ کر کے تو گھر بسا ہے، اتنی پیاری، اتنی معصوم بیوی اللہ نے دے دی ہے، مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی خزانہ ملا ہو چھپر پھاڑ کر......"

"میں خزانہ ہی ہوں وارث علی صاحب۔" ستارہ مسکرائی۔

"یہ صاحب واب نہیں لگانا، اب میاں بیوی کی عمر میں بھلے کتنا فرق ہو لیکن ہوتی تو برابری ہے ناں۔ بھئی اگر بیوی، میاں سے عمر میں بہت چھوٹی ہے تو اسے اپنے میاں کی عمر کا بن جانا چاہیے اگر اسے مسئلہ ہے اس کے لیے مشکل ہے تو شوہر کو اپنی بیوی کی عمر کا بن جانا چاہیے۔ او بھئی ایک پہیہ ٹرک کا اور ایک بچے کی سائیکل کا اس طرح تو گاڑی نہیں چلے گی ناں...... دونوں پہیے برابر کرنا ہوں گے یا تو تم کرو گی یا میں کروں گا۔"

ستارہ، وارث علی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جوان بیوی کے چونچلے کرتا ہوا اچھا خاصا مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ پتا نہیں اسے کیا سوجھی...... انتہائی پھکڑپن سے سوال کر ڈالا۔

"وہ...... کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کی اس وقت کیا عمر ہے؟" عمر کا سوال وہ بھی شادی کی پہلی رات جوان بیوی کر رہی تھی۔ وارث علی ایک دم چکرا کر بغلیں جھانکنے لگا پھر دانت نکوس کر بولا۔

"میں تو اپنی ماں کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں اور میری ماں پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ وہ تو میں نے بہت کم عمری سے محنت مشقت شروع کر دی تھی۔ بہت غیرت تھی مجھ میں...... باپ کی روٹیاں توڑتے ہوئے شرم آتی تھی۔ بس شروع سے ہی کاروبار میں لگ گیا۔ اس لیے زیادہ پڑھ بھی نہیں سکا۔" پڑھائی کے ذکر پر ستارہ چونک پڑی۔

"اوہ.... کہاں تک پڑھا ہے آپ نے؟"

"بھئی بیوی سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے، وہ تو میں بڑے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں اس لیے کسی کو پتا نہیں چلتا کہ میں صرف چھ سات جماعت پڑھا ہوا ہوں۔"

ستارہ نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ واقعی اسے شدید دھچکا پہنچا تھا کہ اس کا اتنا امیر و کبیر رئیس شوہر صرف چھ جماعت پڑھا ہوا تھا۔

"چھٹی جماعت پاس بھی کر لی تھی یا کوئی پیپر رہ گیا تھا۔" ستارہ کی اندر سے جان جل رہی تھی۔ بظاہر اس کا انداز اتنا دل موہ لینے والا اور خوشگوار تھا کہ وارث علی جیسے شاطر کا اس نے دماغ گھما کر رکھ دیا۔ اسے اس کے مشن سے ہی ہٹا دیا۔ وہ تو بس جیسے ستارہ کے آگے بچھا جا رہا تھا کیونکہ نئی کم عمر بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی دکھائی دے رہی تھی اور گفتگو میں تو جیسے اسے کمال حاصل تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے وارث علی کو جیسے اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ ستارہ کا سوال سن کر وہ ذرا شرما کر بولا۔

"بس جی چھٹی میں چلا گیا تھا، امتحان وامتحان نہیں دیا میں نے۔"

"اوہ...... تو یہ کہیں ناں کہ آپ صرف پرائمری پاس ہیں، آپ نے سکستھ کلاس تو پڑھی ہی نہیں۔ یعنی سیکنڈری سیکشن سے آپ کا دور دور کا واسطہ ہے نہ تعلق......" در پردہ ستارہ طنز کر رہی تھی لیکن اس کی خوب صورت مسکراہٹ وارث علی کو اس کے اندر جھانکنے سے روک رہی تھی۔ وہ تو بس یہ دیکھ کر ہی خوش ہو رہا تھا کہ اس کی نئی نویلی دلہن اس سے اس طرح باتیں کر رہی ہے جیسے ان کی لو میرج ہو اور وہ برسوں ایک دوسرے سے ملتے رہے ہوں۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں گویا ستارہ کی بلائیں لیں اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ تنکے میں ہی سہی کیا غضب کی بیوی مل گئی۔

"اجی چھوڑیں...... گولی ماریں پڑھائی وڑھائی کو...... ایم اے پاس اور ایم بی اے کیے ہوئے لڑکے میرے دفتر میں بیس، بیس ہزار کی تنخواہ پر کام کر رہے ہیں۔"

"آپ کا بینک بیلنس اس کا مطلب ہے کہ اچھا خاصا ہے کیونکہ آپ تو بزنس مین ہیں۔"

"میرا کہاں سے...... اب تو سب کچھ آپ کا ہے، کروڑ پتی نہ سمجھیں، ارب پتی ہوں، u k میں میرے دو اکاؤنٹ ہیں۔"

ستارہ اب سچ مچ حیران ہو کر وارث علی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"اور ان دونوں اکاؤنٹس میں پاکستانی روپے نہیں ہیں، پاؤنڈز، ڈالرز اور یورو ہیں۔" ستارہ کے چہرے پر سنجیدگی جھلکنے لگی۔ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"آپ سیلف میڈ ہیں۔" وارث علی فوراً تو نہیں سمجھا لیکن ذرا غور کرنے پر سنے سنائے مانوس الفاظ سمجھ آ گئے۔

"ہاں، ہاں ایک پائی نہیں لی باپ سے۔" بڑے فخریہ انداز میں ستارہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

ستارہ نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے وارث علی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور بہت پیار سے بڑے زور کا پتھر دے مارا۔

"اچھا...... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری حرام کی کمائی ہے۔" اتنا سننا تھا کہ وارث علی کا دماغ تو ہوا میں معلق ہو گیا۔ اتنی پیاری، پیاری باتیں کرنے والی ایک دم گالیوں پر اتر آئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے شک ہو رہا ہو کہ شاید یہ لڑکی پاگل ہے کیونکہ ابھی تک اس نے دلہنوں والی تو کوئی ادا ظاہر نہیں کی تھی۔ بہر حال اس نے بڑی ذہانت اور مہارت سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔

"آپ کو کسی نے غلط مخبری کی ہوگی۔ خون پسینے کی گاڑھی کمائی ہے میری...... ہاں...... جن لوگوں کے پاس بے تحاشا دولت ہوتی ہے ان لوگوں کے بارے میں اکثر غریب لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

"اچھا یہ تو بتائیں بلکہ سچ، سچ بتائیں آپ بھی غریب تھے، ظاہر ہے بندہ بعض اوقات بہت غریب ہوتا ہے، اس غربت سے تنگ آ کر پھر وہ زور شور سے دولت کمانے لگتا ہے اور کامیاب بھی ہو جاتا ہے جیسے کہ آپ، لگتا تو یہی ہے کہ کبھی آپ بہت غریب تھے۔" ستارہ کو پھر گدگدی ہوئی۔

"نفرت ہے مجھے غربت سے بلکہ غربت کے نام سے، یہ ساری دولت میں نے ان لوگوں کے حساب چکانے کے لیے ہی تو حاصل کی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ زندگی پیسے والوں کے لیے ہی بنی ہے کیونکہ جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہی لائف انجوائے کرتا ہے۔ غریب بیچاروں کو تو کیڑے مکوڑے سمجھا جاتا ہے کہ بس یہ چار دن کے لیے زمین پر رینگنے کے لیے آتے ہیں اور انہیں ادھر اُدھر سے بچا کھچا اناج کھا کر جلد سے جلد مر جانا چاہیے۔"

وارث علی کی آنکھوں میں جیسے ایک دم خون اتر آیا۔ اس کی ٹون بدل گئی۔ لہجے میں جیسے کوئی درندہ اتر آیا۔

ستارہ جو ابھی تک بہت اعتماد سے، بے خوفی سے اور اپنی مرضی سے وارث علی سے باتیں کر رہی تھی، وارث علی کا آناً فاناً بدلا ہوا انداز ایک لمحے کے لیے تو اسے سہمانے لگا۔ وہ جو باپ کی گرج دار آواز سے بھی

خوف زدہ نہیں ہوتی تھی وارث علی کی آنکھوں میں دہشت دیکھ کر خوف سے تھرانے لگی لیکن وہ جابر علی کی بیٹی تھی۔ انتہائی مضبوط اور آہنی اعصاب کی مالک اس نے بڑی مہارت سے اپنے اندر کی کیفیت کو چہرے تک آنے سے روک دیا تھا۔

''اچھا...... چھوڑیں آپ تو ایک دم غصے میں آگئے۔ اللہ توبہ۔ میں نے تو ویسے ہی مذاق، مذاق میں آپ سے بات کی تھی۔ اب کیا آپ ساری رات اسی طرح غریبوں پر لیکچر دیتے رہیں گے اور میں سنتی رہوں گی۔ وہ آپ کی ملازمہ ابھی تک دودھ ہی لے کر نہیں آئی۔'' اس نے اپنے ناز و ادا سے وارث علی سے بات کی کہ وارث علی ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ جیسے اسے خود بھی اپنے بدلے ہوئے انداز پر شرمندگی محسوس ہوئی ہو کہ یہ ایک دم سے اسے کیا ہو گیا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... میں اسے دیکھتا ہوں، ارے بھئی اب تو تھوڑی دیر بعد صبح ہو جائے گی۔ ہم نے تو ابھی اپنی دلہن سے وہ پیاری، پیاری باتیں بھی نہیں کیں، دیکھتا ہوں یہ صغریٰ آخر کر کیا رہی ہے؟'' وہ اس طرح سے دروازے کی طرف لپکا تھا جیسے اگر معمولی سی تاخیر ہوئی تو اس کی خوب صورت نئی نویلی اور ایک ہی لمحے میں دل میں اتر جانے والی بیوی ناراض ہو جائے گی۔

اس کے باہر نکلتے ہی ستارہ نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''میرا تو اب سارا حساب کتاب تمہارے ہی ساتھ ہے وارث علی۔ میں نے جیتے جی خود کو یتیم کر لیا ہے، آپ نے میری شادی نہیں کی ابا جان...... آپ نے تو میرا سودا کیا ہے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ آپ کی کوئی بیٹی ستارہ بھی تھی۔'' اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ دل تو پیمانہ بن کر چھلک ہی رہا تھا۔

☆☆☆

اصیل خان بڑے سے ویران گھر میں رات کے پچھلے پہر تہجد کے نوافل پڑھ رہا تھا۔ قلب میں اتنی رقّت تھی کہ قرآنی آیت پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہہ رہے تھے یعنی نماز کیا تھی آنسوؤں کا غسل بھی ساتھ ساتھ تھا۔ وہ اس لمحے اللہ سے اتنا قریب تھا کہ بس اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کو کہیں کھو چکا ہے اور چاروں طرف اللہ کی ذات کے سوا کچھ نہیں۔ پھول نہ پودے، چاند نہ ستارے کچھ بھی نہیں بس صرف اور صرف اللہ ہے، پوری کائنات میں اس کی رحم کی اپیل کسی بازگشت کی طرح گونج رہی ہے۔ دنیا کے سارے الفاظ مٹ گئے، ساری آوازیں گم ہو گئیں، بس پوری کائنات میں اصیل خان کی اپنی آواز گونج رہی ہے اور اس آواز میں صرف ایک لفظ سنائی دے رہا ہے۔ رحم...... رحم...... چاروں طرف لفظ رحم کی گردش ہے، رحم...... کا طلسم ہے...... رحم کی فریاد ہے۔ رحم کے لیے پکار ہے، رحم کی درخواست ہے، رحم کے لیے خوشامد ہے منت ہے، بس ایک لفظ رحم سارے لفظوں پر غالب آ گیا۔ وہ تمام حروف وہ تمام الفاظ جو روزِ اوّل سے لے کر ابد تک اپنا کوئی نشان اپنا کوئی اثر رکھتے تھے۔ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ کائنات میں تو صرف ایک ہی آواز تھی...... رحم...... رحم...... اور اللہ صرف اسی آواز پر توجہ دیے ہوئے تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے قلب سے فلک شگاف نعرہ رحم کی صورت میں بلند ہوتا ہے اور اللہ اسے جواب دیتا ہے کہ سن لیا...... سن لیا...... سن لیا...... اتنا اونچا بولنے...... اتنی بلند آواز میں نعرے لگانے کی ضرورت نہیں اے بندے! ہم تو تیری شہ رگ سے قریب ہیں، تیری نیت کو تجھ سے پہلے پڑھتے ہیں تو صفائیاں پیش کر رہا ہوتا ہے، وضاحتیں کر رہا ہوتا ہے، حیلے ڈھونڈ رہا

ہوتا ہے اور ہمارے فرشتے حقیقت لکھ کر فارغ بھی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اے بندے! تو آئے گا ہمارے پاس...... دکھا دیں گے تیرا ریکارڈ، کیوں زور سے چلّاتا ہے، اللہ...... سب سنتا ہے وہ جو تیرا دل سرگوشیاں کرتا ہے وہ بھی اور وہ جو سرِ عام تو شیطان کے بہکاوے میں آ کر منصوبے بناتا ہے۔ وہ منصوبے جو صرف اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ صرف تو زندہ رہے باقی سب مر جائیں...... تو نہیں مگر اللہ سب جانتا ہے...... سب سنتا ہے...... تو نے آخر اللہ کو سمجھا کیا ہے؟ دیکھ تو بول نہیں پا رہا مگر اللہ سن رہا ہے...... اصیل خان سجدے میں جا چکا تھا...... تڑپ تڑپ کر، بلک بلک کر سبحان ربی الاعلیٰ پڑھ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود اس طرح سے لرز رہا تھا جیسے وہ زمین پر نہ ہو، کسی بھنور میں پھنسا ہوا ہو، سرکش لہریں، اپنا سارا غصہ اس پر اتار رہی ہوں، اس کے قلب سے پھر صدائے ندامت بلند ہوئی۔ رحم...... رحم...... رحم...... ہفت آسمان کے صدور شق ہونے لگے۔

☆☆☆

گل جان نیم وا دروازے سے سر اندر کیے مہر جان کے کمرے میں جھانک رہی تھی۔

مہر جان تیز ٹرنکولائزر کے زیرِ اثر گہری نیند میں تھیں...... گل جان ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے مہر جان کے سیکڑوں روپ گزر رہے تھے۔ کبھی مہر جان لان میں ڈی سی کی بیٹی ٹوٹو کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہوئی دکھائی دیں...... کسی منظر میں وہ اپنی لگژری کار ڈرائیو کر رہی تھیں...... اور ایک بہت بھرپور منظر جب ایم بی بی ایس پاس کیا تھا اور مارے خوشی کے اپنے بابا سے لپٹ گئی تھیں۔ کتنے روپ دیکھے تھے اس نے مہر جان کے...... اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بی بی جان جو اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتی تھیں انگریزوں سے زیادہ اچھی انگریزی بولتی تھیں وہ اس حالت' بے بسی میں اس کے سامنے پڑی ہیں۔ اس کے کلیجے سے ایک ہُوک اٹھی...... یہ ہوک ایسی اٹھی کہ اس نے تیزی سے پرواز کی اور پایۂ عرش کو چھونے کے لیے بے قرار ہو گئی۔

☆☆☆

''شکر ہے دادا جان رابی آپا گہری نیند سو گئی ہیں۔'' کائناز نے شاہ عالم کو اُن کے کمرے میں آ کر اطلاع بہم پہنچائی۔

شاہ عالم اپنے معمول کے مطابق کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے، جو اُن کا نیند کی وادیوں میں اترنے سے پہلے کا آخری معمول تھا۔

''شکر ہے خدا کا کہ وہ سو گئی۔ پین کلر بھی لے رہی ہے، ڈاکٹر نے ٹرنکولائزر بھی دی تھی کیونکہ ابھی زخم ٹیسیں دیں گے۔ زخم نیا نیا ہوتا ہے تو اتنا درد نہیں ہوتا۔''

''دادا جان! رابی آپا کو درد بھلا کہاں ہوتا ہے، بتا تو رہی تھیں وہ کہ انہیں کوئی درد، ورد نہیں ہوتا۔ میں نے بھی پوچھا تھا کہ رابی آپا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے گہرے زخم ہیں آپ کے اور آپ کو درد نہیں ہوتا۔ تو پتا ہے دادا جان کیا بولیں؟'' شاہ عالم نے ہاتھ اٹھا کر کائناز کو بولنے سے روک دیا اور بہت نرم لہجے میں بولے۔

''بیٹا جو کچھ وہ کہتی ہے اور جو سوچ کر کہتی ہے، مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ سب کچھ جو اس نے کہہ دیا اور وہ سب کچھ بھی جو اس نے ابھی نہیں کہا۔'' کائناز گومگو کیفیت میں اپنے دادا کی طرف دیکھنے لگی۔ شاہ عالم اس کی کیفیت دیکھ کر مسکرا دیے۔

''بیٹا تم اپنی اسٹڈیز پر توجہ دو...... دیکھو حادثے ہماری زندگی میں آتے رہتے ہیں اور یہ ہماری زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں...... ہماری پوری زندگی نہیں ہوتے۔ انہیں اپنے اوپر اس طرح طاری نہیں کرتے کہ آگے

کا سفر رک جائے...... سفر جاری رہنا چاہیے یہ بتاؤ آج تمہارے سر آئے تھے...... تم نے کیا پڑھا؟''

''دادا جان اتنی رات کو اب آپ پڑھائی کی بات نہ کریں، کچی ویسے میرا اکیلے پڑھنے کا دل بھی نہیں چاہتا۔ روما سے میں نے کہا ہے اور اب تو کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ دادا جان کل سے روما میرے ساتھ ہی رہے گی، ہم ساتھ رہیں گے اور ساتھ پڑھیں گے۔''

''تمہاری تو مراد پوری ہوگئی مگر کیا ستم ظریفی ہے کہ کس راستے سے پوری ہوئی۔ اللہ سب پر اپنا رحم کرے۔ جاؤ بیٹا اب جا کر سو جاؤ۔''

☆☆☆

گل جان، مہر جان کے کمرے میں کارپٹ پر تکیہ رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے میں نہیں سو سکتی تھی۔ مہر جان کی حالت ایسی تھی کہ انہیں تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ لیٹ گئی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن ماضی کے دھندلکوں میں کھو رہا تھا۔ گزرا ہوا وقت جیسے کسی خوب صورت رنگین فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلنے لگا۔

☆☆☆

مہر جان لان میں چیئر پر بیٹھی نوٹس بنانے میں مصروف تھیں۔ گل جان بالکونی سے کافی دیر اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے مہر جان بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ آج تو مہر جان نے ڈریسنگ بھی غضب کی کی ہوئی تھی۔ جبھی گل جان کو خیال آیا۔ ''کہیں اصیل خان تو نہیں آ رہا۔ اس نے یقیناً بی بی جان کو تو بتایا ہوگا۔ اسی لیے وہ اتنی اچھی طرح تیار ہو کر باہر لان میں پڑھ رہی ہیں۔'' وہ مسکراتی ہوئی بالکونی سے ہٹ گئی اور کسی معصوم بچی کی طرح دوڑتی ہوئی زینہ اتر کر نیچے آ گئی۔

مہر جان نے گل جان کے قدموں کی آہٹ پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''بی بی جان اگر میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں تو آپ ڈسٹرب تو نہیں ہوں گی؟''

''بالکل بھی نہیں...... ارے بھئی میرا نروس سسٹم بڑا اسٹرونگ ہے، اسی لیے تو میں نے نیورو سرجن بننے کا فیصلہ کیا۔'' بی بی جان کی اس بات پر گل جان انہیں بڑی رشک آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو......؟''

''کچھ بھی نہیں...... میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ آپ کتنی اسٹرونگ ہیں، بالکل مردوں کی طرح...... اسی لیے شاید آپ کو عورت کی طرح محبت کرنا نہیں آتی۔''

''یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟ تمہیں کیا پتا میرے سینے میں کتنا محبت بھرا دل دھڑکتا ہے۔''

''لگتا نہیں ہے ناں......؟'' اس کی بات پر مہر جان ہنس پڑیں۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ کیا میں تم سے محبت نہیں کرتی؟''

''بھئی میں تو آپ کی بہن ہوں، مجھ سے تو آپ محبت کریں گی ہی۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''بس ویسے ہی مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ اصیل خان سے محبت نہیں کرتیں اور بابا کی کی ہوئی منگنی کو بس چلا رہی ہیں۔'' گل جان کی اس بات پر مہر جان نے بہن کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا تھا پھر ایک گہری سانس لے کر وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں۔

''گل جان جو سچ مچ محبت کرتے ہیں، وہ اپنی محبت کے اشتہار نہیں چھپواتے، اصیل خان میرے بچپن کا منگیتر ہے، میری رگ رگ میں خون بن کر دوڑتا ہے اگر مجھے پتا چلا ناں کہ وہ میرے علاوہ کسی اور کو سوچتا ہے تو اسے شوٹ کر دوں۔''

''اللہ نہ کرے بی بی جان، کیسی باتیں کرتی ہیں۔'' گل جان نے ایک دم گھبرا کر کہا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ آپ دونوں جب ساتھ ہوتے ہیں، میں تو نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں ہوں کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے آپ دونوں کو......''

''نہیں لگتی نظر وظر کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سنسیئر ہیں، بس وہ تھوڑا سا کچھ کمپلیکسڈ ہو گیا ہے اپنے بزنس کو بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ پتا ہے کیوں؟ تاکہ مجھ پر رعب جما سکے کہ وہ بہت بڑا بزنس مین ہے۔ میں ڈاکٹر بن رہی ہوں تو آخر وہ بھی تو کچھ بن کر دکھائے۔'' یہ کہہ کر مہر جان ہنس دی۔

گل جان نے بی بی جان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو دل ہی دل میں ڈھیروں بلائیں لے ڈالیں۔

''بی بی جان آپ بس ہنستی رہا کریں، بہت اچھی لگتی ہیں آپ ہنستی ہوئی۔''

''آج کیوں میری اتنی خوشامد کر رہی ہو، کیا چاہیے، شہر سے کوئی چیز منگوانی ہے؟'' گل جان زور سے ہنس دیں۔

''وہ تو میں ویسے بھی منگوا سکتی ہوں اس کے لیے آپ کی خوشامد کرنا ضروری تو نہیں اور بی بی جان آپ تو میرے لیے اتنا کچھ اٹھا کر لے آتی ہیں شہر سے...... مجھ سے تو وہ استعمال بھی نہیں ہوتا اور نئی چیزیں آ جاتی ہیں۔ بی بی جان...... میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں اب آپ اس کو خوشامد کہیں یا کچھ اور لیکن میں آپ کو دیکھ دیکھ کر اتنا خوش ہوتی ہوں...... اتنا خوش ہوتی ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔''

''تو بہنیں ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں، یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں۔'' مہر جان نے اب نظریں اٹھا کر بہت محبت سے گل جان کی طرف دیکھا۔

''لیکن میں اور بہنوں سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہوں، پتا ہے کیوں؟'' وہ گل جان کو دیکھتے ہوئے پھر دھیرے سے مسکرائیں۔

''میں سوال کروں گی تمہی جواب دو گی، خود بتا دو۔''

''وہ اس لیے بی بی جان کہ آپ ناں بہت پڑھی ہوئی ہیں میری تو آج تک گرامر ہی ٹھیک نہیں ہوئی، کچی کبھی کبھی سوچتی ہوں اگر میری شادی کسی بہت بڑے پڑھے ہوئے آدمی سے ہوگئی اور مجھے اس کے ساتھ لندن جانا پڑ گیا تو میں انگریزی کیسے بولوں گی؟'' گل جان کی اس معصومانہ بات پر مہر جان نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

''بھئی ہم پاگل نہیں ہیں کہ کسی ایسے بندے سے تمہاری شادی کر دیں جو تمہیں لے کر سیدھا انگریزوں کے پاس پہنچے اور تمہیں انگریزی بولنے پر مجبور کرے۔ ہم تو تمہاری شادی یہیں کسی فیوڈل لارڈ سے کریں گے کوئی پیارا سا جاگیردار صرف آٹھ جماعت پاس نہ خود انگریزی بولے نہ تمہیں انگریزی بولنے پر مجبور کرے۔'' اپنی بات کے اختتام پر مہر جان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ گل جان جھینپی جھینپی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے میرے لیے ایسا سوچا ہے صرف آٹھ جماعت پاس......؟''

""بھئی یہ عجیب مشکل ہے، انگریزی تم سے بولی نہیں جاتی، بندہ تمہیں پڑھا لکھا چاہیے، بابا کچھ زیادہ پڑھے لوگ ہوتے ہیں ناں وہ گھر میں بھی انگریزی بولتے ہیں۔ کیسے نبھے گی تمہاری۔ اصل میں میاں، بیوی کی انڈر اسٹینڈنگ میں، آئی کیو لیول کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ دونوں کے آئی کیو لیول میں بہت ڈفرنس ہو تو انڈر اسٹینڈنگ بہت مشکل ہوتی ہے۔'' گل جان ہکا بکا بی بی جان کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''یہ آئی کیو کیا ہوتا ہے بی بی جان؟'' مہر جان کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئیں۔ جلدی سے بولیں۔

''بابا کچھ نہیں ہوتا یہ آئی کیو...... پڑھے لکھے لوگ ایک دوسرے پر رعب ڈالنے کے لیے ایسے الفاظ بولتے ہیں۔''

''لیکن بی بی جان کوئی مطلب تو ہوگا ناں......؟'' مہر جان جیسے اب عاجز ہو کر دیکھ رہی تھیں۔

''جس راہ چلنا نہیں اس کے کوس کیا گننا...... بے وقوف تم ہر بات میں دلچسپی لیتی ہو اور اگلے دن بھول بھی جاتی ہو۔''

''یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہیں، کوڑھ مغز ہوں ناں لیکن بی بی جان یہ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ناں...... کوئی انسان خود کو تو نہیں بناتا ناں۔''

''تم بہت اچھی ہو گل جان، تم جتنی پڑھی ہوئی ہو اور جس جگہ ہو بالکل صحیح ہو، دیکھو ناں سب کچھ ہے تمہارے پاس، ایک دن شادی بھی ہو جائے گی۔ میرا دل کہتا ہے جو بھی تمہیں لینے آئے گا وہ تم سے بہت پیار کرے گا کیونکہ تمہارے اندر وہ سب کچھ ہے جس کی وجہ سے کسی لڑکی کو چاہا جاتا ہے، محبت کی جاتی ہے کم از کم مجھ سے تو لاکھ درجے اچھی ہو۔ سیدھی سادی ہو، بے وقوف ہو اور عورت کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ زیادہ جاگ جاتی ہے ناں تو زیادہ تھکتی ہے۔ زیادہ کام کرتی ہے، زیادہ سوچتی ہے اور......'' مہر جان بولتے بولتے رک گئی تھیں۔

''اور......؟'' گل جان کی نظروں میں سوال تھا۔

''اور یہ کہ گل جان میں بھی ایک زندہ وجود ہوں، یہ صدا لگاتے لگاتے بعض اوقات ایک پڑھی لکھی عورت کی آواز بیٹھ جاتی ہے۔''

''تو بی بی جان آپ اتنا کیوں پڑھ رہی ہیں؟ جب مجھے پڑھائی کی ضرورت نہیں تھی تو آپ کو بھی نہیں تھی۔ ہم نے کیا کرنا اتنا سارا پڑھ لکھ کر۔''

''تم اندر سے ابھی بالکل ایک چھوٹی بچی کی طرح ہو جبکہ میں احساس ذمے داری کی وجہ سے وقت سے پہلے بڑی ہو گئی ہوں۔ بلکہ اندر سے بوڑھی ہو گئی ہوں، اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتی ہوں، میرے بابا نے ہم دونوں بہنوں کی خاطر دوسری شادی نہیں کی ہماری ماں تو بچپن میں فوت ہو گئی تھی، بابا چاہتے تو دوسری شادی کر لیتے...... شاید انہیں بیٹا بھی مل جاتا...... لیکن انہوں نے بس ہم دونوں بہنوں کو سارا وقت دیا۔ اپنے لیے کچھ نہیں بچایا۔ میں اپنے بابا کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے بابا جب دوسرے جاگیر داروں کے ساتھ، نیک ناموں کے ساتھ بیٹھیں...... تو کوئی کمی انہیں محسوس نہ ہو...... اور پھر یہ کہ بچپن میں ہی انہوں نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ مجھے کچھ کرنا ہے...... صرف کھا کر، سو کر زندگی نہیں گزارنی ہے۔'' مہر جان بول رہی تھیں اور گل جان مبہوت سی بہن کی صورت تک رہی تھی۔

☆☆☆

''بابا...... بابا۔'' گل جان اپنے خیال سے چونک پڑی۔ کمرے میں مہر جان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''بابا...... بابا آپ کہاں ہیں بابا...... اِدھر تو بہت اندھیرا ہے، آپ بتائیں میں کہاں جاؤں۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ یہ سننا تھا کہ گل جان تو جیسے تڑپ ہی گئی۔

''شاید بی بی جان خواب میں بابا جان کو دیکھ رہی ہیں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''بابا...... پلیز بابا میرا ہاتھ پکڑ لیں، میں گر جاؤں گی۔'' گل جان اب ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس نے فوراً لائٹ جلائی تاکہ تسلی کر لے کہ مہر جان سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔ مہر جان گہری نیند میں تھیں، اُن کی آنکھیں بند تھیں لیکن ہونٹ لرزاں تھے۔ مہر جان اب اِدھر اُدھر سر پٹخ رہی تھیں۔

''بابا...... بابا پلیز آپ یہیں بیٹھے رہیں، میرے پاس سے نہیں جائیں۔ آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے، بابا آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں۔ آپ یہاں سے نہ جائیں اگر آپ چلے گئے تو میں ڈر جاؤں گی اور ڈر کے مارے مر جاؤں گی۔''

مہر جان نیند میں بڑبڑا رہی تھیں۔ گل جان کے کلیجے پر برچھیاں چل رہی تھیں۔ وہ لائٹ بند کر کے بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پوری قوت سے چیخیں مار مار کر روئے، ضبط کرنے کی حد ہو گئی تھی۔ کب سے کونا تلاش کر رہی تھی کہ جہاں بیٹھ کر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ چیخ چیخ کر روئے، اتنی بلند آواز سے چیخ کر کہ پایۂ عرش تک کانپ جائے۔ دنیا اس کی غم گساری کے لیے نہ آئے۔ وہ چھت کی طرف یوں دوڑی جیسے وہ اس کی جائے پناہ ہو، بھاگ بھاگ کر زینہ چڑھنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ کھلی چھت پر آ کر جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی۔ دور دور تک انسانی چہرہ تھا نہ کوئی آواز...... گل جان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ موت کا سفر طے کر کے ایک نئی جگہ...... ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئی ہو۔ اس نے ایک عجیب سا سکون اپنے وجود میں اترتا ہوا محسوس کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تنہائی اتنی بھرپور ہوتی ہے کہ اپنے علاوہ کسی اور وجود کا احساس انتہائی روحانی اذیت دیتا ہے۔ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، لامحدود بیکراں تنہائی انسان کو ماں کی آغوش کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ وہ چھت پر پڑے، بہت پرانے ٹوٹے پھوٹے تخت کے کونے پر دھپ سے بیٹھ گئی تھی۔ تاریکی کے اندر ایک عجیب سی روشنی تھی۔ صبح کاذب کی تاریکی...... جس کے اندر دودھیا روشنی کی ملاوٹ یوں محسوس ہوتی ہے جیسے زمان و مکاں کی قید سے نجات مل گئی ہو اور ایک نئی دنیا، ایک نیا جہاں، کائنات کا ایک خفیہ گوشہ یوں سامنے آ گیا ہو جیسے خزانے کی تلاش مکمل ہوئی...... سفر تمام ہوا...... منزل سامنے آ گئی۔ روح اپنے اصل سے جڑ گئی۔ چاروں طرف سے محبت اور سلامتی کی صدائیں آنے لگیں۔ اس نے بے کراں آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اسے اپنے چاروں طرف ایسی قوت کا ادراک ہوا جو اس کو بہت صاف، صاف بتا رہی تھی کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ درد کی ہوائیں چلنے لگیں۔ کتابِ زندگی کے ورق اس ہوا میں پھڑپھڑانے لگے...... اور پھڑ پھڑاتے ہوئے اوراق جان لیوا سماع خراشی کرنے لگے۔ نوائے دل سوزِ دل سے بدل گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور ایک دم زمین پر سجدہ ریز ہو گئی۔ اس کا پورا وجود ہچکولوں کی زد میں تھا۔

''بی بی جان...... مجھے معاف کر دیں۔ میں...... میں آپ کو دوبارہ ڈاکٹر مہر جان نہیں بننے دوں گی۔ آپ ہنس تو رہی ہیں، مسکرا تو رہی ہیں، مجھے پہچان تو رہی ہیں، بس کافی ہے ناں...... کیا مل گیا آپ کو ڈاکٹر بن کر......

کیا مل گیا آپ کو بابا کا بیٹا بن کر؟" وہ اب چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر جانے کب تک اسی طرح روتی رہی۔ وقفے وقفے سے چیخیں بلند ہوتی رہیں اور جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا کہ اس نے اپنے دائیں کندھے پر ایک بھاری ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ آہیں گھٹ گئیں۔ آنسو تھم گئے، دل بڑے زور سے دھڑکا۔

"ڈریں نہیں گل جان بی بی، میں اصیل خان ہوں، بہت معذرت کہ اوپر تنہائی میں آپ کے پاس چلا آیا۔ آپ کی چیخیں پورے گھر میں اس طرح سے گونج رہی ہیں کہ نوکر، گارڈز وغیرہ اس آواز کی تلاش میں چھت تک آسکتے ہیں، خود کو سنبھالیں۔" گل جان نے سر اٹھایا مگر اصیل خان کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"تم جاؤ اصیل خان میں اب انہیں روؤں گی، نہیں چیخیں ماروں گی مگر تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ، تمہیں پتا ہے ناں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ تو اس وقت بھی دیکھ رہا تھا۔ جس وقت ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ شیطان نے ہمارے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ تانگ دیا ہے، چلے جاؤ اصیل خان فوراً چلے جاؤ یہاں سے۔" اصیل خان بِنا کچھ کہے سر جھکائے چپ چاپ زینہ اترنے لگا۔

"یا اللہ اگر تو رحمان ورحیم نہ ہوتا تو ہم کہاں جاتے؟ تُو تو جانتا ہے کہ ہماری توبہ توبتہ النصوح ہے، سچی توبہ...... تو جانتا ہے کہ سچی توبہ وہ ہوتی ہے جب ایک بار ہونے والی غلطی کو دُہرایا نہیں جاتا...... بہت احتیاط کی جاتی ہے اور غفور الرحیم تو جانتا ہے...... کہ صرف ایک ٹھوکر نے منہ کے بل گرایا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک چلتے ہوئے چونکتی ہوں۔ راستہ دیکھتی ہوں، ٹھوکر کے تصور سے یوں کانپتی ہوں جیسے کوئی آخری پونجی لُٹ جانے کے خوف سے کانپتا ہے۔" گل جان نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور آسمان کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

وارث علی بہترین سوٹ پہن کر قیمتی پرفیوم لگا کر ستارہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اچھا بیگم صاحبہ...... اب آپ کے شوہرِ نامدار...... فضلِ ربی کی تلاش میں نکل رہے ہیں، پیار سے خدا حافظ کہیں۔"

ستارہ نے جو اس وقت خود بھی بہت خوب صورت اور قیمتی ملبوس میں تھی، تیز میک اپ بھاری جیولری بھی کچھ اس کے وجود کا حصہ تھا۔ شادی کے بعد اس گھر میں یہ اس کی پہلی صبح تھی...... وارث علی نے تو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ صبح آٹھ بجے ہی آفس جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ بے شمار سوالات ستارہ کے ذہن میں کلبلا رہے تھے مگر اس کی انا اسے سوال کرنے سے روک رہی تھی...... خدا حافظ اس نے بڑے ناز وادا کے انداز میں کہا تھا بلکہ بڑی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وارث علی نے خدا حافظ کہنے کی فرمائش کی...... اور اس نے دیر نہیں لگائی۔ ایک لمحے کے لیے تو وارث علی بھی چکرا کر رہ گیا۔ درحقیقت ستارہ کا اعتماد اس پر غالب آ رہا تھا۔

"آپ شام کو کتنے بجے آتے ہیں......؟"

"بھئی میں کوئی سرکاری ملازم نہیں ہوں جو پانچ بجے آ کر پلنگ توڑنے لگوں۔ بہت بڑا بزنس ہے میرا اور جو بڑا بزنس مین ہوتا ہے اس کا دن چوبیس گھنٹے کا نہیں ہوتا بلکہ اگر چھتیس گھنٹے میں اس کا کام ختم ہوتا ہے تو گویا اس کا ایک دن چھتیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔" ستارہ نے بہ مشکل استہزائیہ مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں تک آنے

سے روکا۔

"اچھا، آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ چھتیس گھنٹے تک گھر نہ آئیں تو مجھے فرض کرنا چاہیے کہ ابھی ایک دن ہوا ہے۔ اس لیے مجھے کبھی پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ صرف ایک ہی دن تو ہوا ہے، پریشانی کی کیا بات ہے۔"

اس کا انداز اتنا مزاحیہ اور پُراعتماد تھا کہ وارث علی اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کے سائے لہرائے۔ یہ جابر علی کی بیٹی تھی۔ جابر علی جس کے ذریعے سے اس نے بڑا مال بنا تا تھا۔ یہ جابر علی کی صرف بیٹی نہیں تھی...... کاروبار کو پھیلانے کا لائسنس تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس لڑکی میں کچھ ایسی بات ہے کہ وہ اس کے اوپر حاوی ہوسکتی ہے اور وہ جابر علی کی بیٹی کو خود پر حاوی ہونے کی اگر اجازت دیتا تو پھر کاروبار کیسے کرتا...... مسئلہ تو کاروبار کا ہے...... وارث علی کو لڑکیوں کی کوئی کمی تو نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزاروں ملتی ہیں بقول اس کے...... پھر بھی اس نے کمالِ مہارت سے اپنے اندرونی خیالات کا عکس اپنے چہرے کے آئینے پر جھلکنے نہیں دیا تھا۔ بڑے پیار سے ستارہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر قریب کیا۔

ستارہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خوب صورت باغ سے گزرتے گزرتے ایک دم لوہار کی بھٹی کے قریب جا کھڑی ہوئی ہو۔ ایک کڑی گزر گئی تھی دل وجاں پر......

"ارے بھئی آپ تو میری جان ہیں، حکم تو کریں، نہیں جاتے کام پر...... بیٹھ جاتے ہیں آپ کے سامنے۔"

"ارے یہ غضب مت کیجیے گا، آپ اگر کام پر نہیں جائیں گے تو یہ سارے لش پش ماند پڑ جائیں گے اور

دیکھیں ناں اس سارے لش پش سے تو آپ کے لشکارے ہیں، دنیا آپ کو جانتی ہے، میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ شوہر کو کہوں کہ وہ میرے پاس بیٹھا رہے اور کمانا چھوڑ دے۔ مجھے ایسا شوہر چاہیے بھی نہیں جو آٹھ گھنٹے نوکری کرے اور بارہ گھنٹے بیٹھ کر بجٹ بنائے۔'' ستارہ کے انداز میں اتنی بے ساختگی تھی کہ وارث علی اپنے قہقہے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اب اس نے بڑی دلچسپی سے ستارہ کی طرف دیکھا تھا۔

''بہت شارپ ہو، بہت تیز، تمہیں سنبھالنے میں بہت وقت لگے گا۔''

''ارے نہیں، نہیں فکر نہ کریں، اب اس گھر میں آ کر بیٹھ گئی ہوں ناں اب تو اللہ ہی اٹھائے۔'' ستارہ کے انداز میں اتنے بے ساختگی اور برجستگی تھی کہ وہ اپنا قہقہہ روکے بِنا نہ رہ سکا۔ اس نے بڑی دلچسپی سے ستارہ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''تم سے تو اس گھر میں بہت رونق ہو گئی ہے، کمال یہ ہے کہ تمہاری بات چیت سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ہماری شادی کو صرف چند گھنٹے ہوئے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ہم برسوں سے مل رہے تھے۔'' ستارہ نے اپنے عمر دار شوہر کو چونچال ہوتے ہوئے دیکھا تو اندر سے بری طرح کھول گئی لیکن بڑی ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''وارث علی صاحب آپ کے لیے ہو گی یہ چند گھنٹوں کی ملاقات۔ میں نے تو تین سال پہلے ایک خواب میں آپ کو دیکھا تھا...... مگر مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ آپ کو خواب میں دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے میری شادی ہو گی۔ بڑا سچا خواب تھا۔''

''سچ کہہ رہی ہو؟ تم نے مجھے خواب میں دیکھا تھا؟'' وارث علی اب ایک دم ستارہ کے ہاتھوں جیسے بے وقوف بن ہی گیا تھا۔ بڑے پھکڑ پن سے بولا۔

''ایک دفعہ نہیں پتا نہیں دس مرتبہ...... حالانکہ جب میں نے دس مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ آپ بار بار خواب میں اسی لیے آ رہے ہیں کہ اللہ میاں اشارے کر رہا ہے کہ یہ میرا ہونے والا شوہر ہے۔ اس لیے تو آپ مجھے بالکل بھی اجنبی نہیں لگے۔''

وارث علی آنکھیں پھاڑ کر ستارہ کو دیکھتا رہ گیا۔ اپنی تیاری، اپنی رئیسی، اپنا مشن ایک لمحے کے لیے تو سبھی کچھ بھول گیا۔ اتنی خوب صورت کم عمر بیوی سو جان سے نثار ہوتی ہوئی...... بڑے سے بڑے افلاطون کا دماغ گھما سکتی ہے اور مالِ حرام کھانے والوں کے تو دو چار ضروری نٹس، اسکرو ویسے ہی ڈھیلے ہوتے ہیں جو بات عام بندے کو آسانی سے سمجھ آ جائے ان کے سر سے گزر جائے گی کیونکہ کچھ حقائق ضمیر کے راستے سے ہو کر گزرتے ہیں اور ضمیر کبھی مُردہ نہیں ہوتا۔ کبھی سویا ہوا نہیں ہوتا، ظلم اور خود غرضی کے بوجھ تلے دبا ہوا سسک رہا ہوتا ہے...... سگنل میں error ہونے کی وجہ سے ایکٹو نہیں ہوتا۔

''ابھی ہم نہیں جاتے کہیں، آج تو بس آپ کے ساتھ سارا دن پوری شام۔''

''یا اللہ یہ تو اب گوند لگا کر چپک کر بیٹھ گیا۔ میرے تو سارے کے سارے کام، سارے کے سارے منصوبے دھرے رہ جائیں گے۔ ابھی امی سے بات کرنی ہے، شبینہ سے باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکالنی ہے، برہان بھائی سے پوچھنا ہے کہ وہ کس وقت آئیں گے اور اس امیر آدمی کی کار لے کر آج تو جشنِ آزادی منانا ہے۔'' ستارہ ایک دم پریشان ہو گئی...... دل ہی دل میں سوچا۔

وارث علی اب بہت والہانہ نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیوں نہ دیکھتا...... نکاح کر کے لایا

تھا۔ اتنی خوب صورت کم عمر بیوی سامنے کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھنے سے خود کو کیونکر روکتا!
"نہیں، نہیں آپ کام پر جائیں، کیا ہے کہ میں صبح اٹھ کر پورے گھر کا جائزہ لے چکی ہوں۔ مجھے بہت کام نظر آرہے ہیں گھر میں، آپ اپنے کام پر جائیں، مجھے گاڑی اور ڈرائیور دے جائیں اور کچھ پیسے بھی...... میں اپنی مرضی کی کچھ چیزیں اس گھر میں لا کر سجانا چاہتی ہوں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟" ستارہ نے اب بہت لاڈ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"گاڑی اور ڈرائیور تمہیں دے دوں؟ کیا تم اپنی امی کے گھر جانا چاہتی ہو؟" وارث علی جیسے ایک دم بدک گیا۔ ستاہ کے چہرے پر ایک دم سایہ سا لہرا گیا تھا۔ دل پر کہیں کوئی کاری ضرب لگی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔
"نہیں، نہیں میں گھر نہیں جاؤں گی اگر کبھی وہاں گئی تو آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی، اکیلی کبھی نہیں جاؤں گی۔"
وارث علی یہ سن کر انتہا سے زیادہ حیران ہوا تھا کیونکہ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ شاید صبح ہوتے ہی وہ تو اس سے کہے گی کہ گھر چلیں۔
"اگر مجھے ایک سال تک فرصت نہ ملی تو......؟"
"تو میں ایک سال تک نہیں جاؤں گی۔" ستارہ نے فوراً ہی کہہ دیا۔
وارث علی اب ذرا ٹھٹک کر ستارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں، بھئی امی نے کہا تھا جیسے تمہارا شوہر کہے ویسے کرنا...... وہ دن کہے تو دن کہنا...... وہ رات کہے تو رات کہنا...... وہ تمہیں ہمارے ہاں لے کر آئے تو آ جانا...... نہیں لائے تو مت آنا۔"
وہ ایک سانس میں اتنا سارا بول گئی جیسے اس نے وارث علی کے چھکے چھڑا دیے تھے۔
"اچھا بابا...... گاڑی بھی آپ کی...... ڈرائیور بھی آپ کا...... جب یہ بندہ آپ کا......" اس نے اپنے دونوں ہاتھ ستارہ کے سامنے جوڑ دیے۔ ستارہ اس کی طرف دیکھ کر بڑے دلربا انداز میں مسکرائی۔
"خدا حافظ...... اب جا بھی چکیں۔"
وارث علی اس کے ساتھ اپنائیت کا مظاہر کر کے پورچ کی طرف بڑھنے لگا۔ پورچ کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
"مجھے تو ذرا سی بھی محنت نہیں کرنا پڑی کم عمر ہے...... یہ میرے راستے میں نہیں آئے گی بلکہ لگ رہا ہے کہ میرا بھرپور ساتھ دے گی۔" ستارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
"شکر خدا کا یہ گھر بہت خوب صورت ہے، اس گھر میں ہر چیز بہت خوب صورت ہے، سوائے اس بڈھے کے۔" جیسے ہی اس نے وارث علی کی پراڈو گیٹ سے باہر نکلنے کی آواز سنی، فوراً گھر کا نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف کال ریسیو کرنے والی شبینہ تھی۔ وہ بہت مغموم اور اداس تھی۔ اس نے اس خیال سے ریسیور اٹھایا تھا کہ یا تو ستارہ کا فون ہوگا یا برہان کا...... کیونکہ ستارہ اسے کہہ کر گئی تھی کہ جب وہ وارث علی کے گھر پہنچے گی تو سب سے پہلے برہان کو فون کرے گی اور اسے سب کچھ بتا دے گی اور واقعی دوسری طرف ستارہ ہی تھی۔
"ہیلو......" ستارہ کی آواز شبینہ کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کی آواز میں بوجھل پن یا تھکاوٹ کا کوئی عنصر محسوس نہیں ہوا بلکہ ستارہ کی آواز میں تو بڑی تروتازگی تھی۔ شبینہ کو ایک گونا سکون محسوس ہوا۔

"کیسی ہو ستارہ......؟" ستارہ جواب میں کھلکھلائی تھی۔

"میری آواز سے کیسا لگ رہا ہے...... ابھی ابھی اس بڈھے کو روانہ کیا ہے، ہائے شبینہ تم میرا گھر تو دیکھو...... سمجھو میری لاٹری نکلی ہے۔" ستارہ بول رہی تھی اور حیرت سے شبینہ کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

"تم اسے بڈھا بھی کہہ رہی ہو اور اس کے گھر کی تعریف بھی کر رہی ہو؟"

"تو...... کیا غلط کر رہی ہوں، بڈھا بھی میرا ہے اور اس کا گھر بھی میرا ہے۔" ستارہ اِدھر اُدھر دیک بڑے شرمائے شرمائے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

"بری بات ہے ستارہ اب جو بھی ہے تمہارا شوہر ہے وہ...... تم نے خود اسے قبول کیا ہے اور اب تم خو بھی بہت محسوس ہو رہی ہو، چلو شکر تمہیں گھر پسند آ گیا......"

"گھر واقعی بہت خوب صورت ہے، اتنا سجا ہوا ہے، شبینہ آپا اتنا سجا ہوا ہے کہ تم دیکھو گی تو حیران جاؤ گی۔ یا تو یہ سمندری ڈاکو ہے یا واقعی اس کے اپنے جہاز چلتے ہیں۔" ستارہ نے بلند بانگ طنزیہ قہق لگایا تھا۔

"واقعی ستارہ......؟" شبینہ یہ سن کر واقعی بہت متاثر ہوئی تھی۔

"ارے آکر دیکھ لینا، تم اور امی تو آ سکتے ہو ناں میرے گھر...... میں نے خود پر پابندی لگائی ہے کہ ا اپنے باپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی گھر کی تعریف کر رہی ہو، خوش نظر آ رہی ہو اور اپنی ضد پر اَڑی ہوئی ہو، اب چھوڑو بھ یوں سمجھو کہ قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

"ارے واہ...... کیوں سمجھ لوں...... ٹھیک ہے میری قسمت میں لکھا تھا لیکن میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ سب کچھ سزا کے طور پر دیا گیا ہے کالے پانی بھیجا گیا ہے، بہت بڑا جرم تھا میرا...... ایک بلاسٹ میں ایک ہز بندے مارے تھے میں نے تو...... ظاہر ہے ایک ہزار مرتبہ تو پھانسی کی سزا ہو گی ناں......"

شبینہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں ماں تو آس پاس نظر نہیں آ رہی اور اس کی بات سن کر فکر من ہو جائے۔ سوال کرنے لگے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ صابرہ کچھ سنے...... کیونکہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی دیکھ کر آ ر تھی کہ وہ تو بالکل بستر پر یوں دراز تھیں جیسے اُن میں خود سے اٹھ کر بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو۔

"امی کیا کر رہی ہیں شبینہ آپا...... بات نہیں کریں گی مجھ سے کیا؟" ستارہ کو معاً ماں کا خیال آیا۔

"امی آرام کر رہی ہیں ستارہ...... بس آہستہ، آہستہ ٹھیک ہوں گی، ظاہر ہے جو کچھ ہوا سب سے زیادہ د تو امی کو ہو گا ناں......"

"امی کو سمجھانے کی کوشش کرنا...... میں تو یہ فرض کر کے بیٹھ گئی ہوں، میری شادی ہی نہیں ہوئی ایک سز سے گزر رہی ہوں، کسی بھی دن یہ سزا پوری ہو جائے گی اور میں رہا ہو جاؤں گی۔"

"کیا مطلب......؟" شبینہ کے سر پر تو ستارہ نے جیسے کوئی بم پھوڑ دیا تھا۔

"ابھی تو میں آرام کرنے جا رہی ہوں، ساری رات کی جاگی ہوئی ہوں، شام کو موقع ملا تو مطلب بتاؤ گی۔ اور ہاں...... میں نے برہان بھائی کو فون کر دیا تھا وہ بھی ہو سکتا ہے دوپہر تک آ جائیں، اپنے بھائی ک لیے اپنے ہاتھوں سے بہت اچھا کھانا بناؤں گی، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے شبینہ آپا کہ مجھے پر لگ گئے ہیں، م خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں، بڈھا ہے تو کیا ہوا...... آزادی ہے، خوشی ہے اور اپنے گھر کا احساس

...... یہ تو بہت خوب صورت احساس ہے۔ اللہ کرے ابا جان اب تمہاری بھی بہت جلد شادی کر دیں۔ جان چھوٹے تمہاری اس گھر سے...... اللہ حافظ۔"

ستارہ نے آدمی تیل کی آدھی گھی کی کر کے اپنی طرف سے فون بھی بند کر دیا تھا۔ شبینہ اپنی جگہ پر سوچ میں گم کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"یار میں یونیورسٹی تو آ گیا ہوں مگر مجھے ایک پل کے لیے چین نہیں آ رہا۔" برہان کیفے ٹیریا میں چائے کی پیالی پر نظریں جمائے بہت دور پہنچا ہوا تھا۔

"کیوں کیا ہوا...... خیر تو ہے حالانکہ مجھے تم سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ خیر مجھے تو یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تم پر رحم کرے لیکن یار تم روٹین سے زیادہ ڈسٹرب نظر آ رہے ہو، کیا مسئلہ ہے، شیئر کرو، شیئر کرنے سے بھی بندہ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"نعمان یار تم مجھے اپنی بائیک پر دوتلوار تک ڈراپ کر دو گے؟" برہان چائے کا کپ اٹھا کر سپ لیتے ہوئے بڑے بڑے تکلف سے کہہ رہا تھا۔

"کم...... آن...... یار آج کیسے اجنبی، اجنبی لگ رہے ہو، تم جہاں کہو گے میں ڈراپ کر دوں گا...... خیریت؟ کہیں جاب وغیرہ کے لیے انٹرویو دینے جانا ہے؟"

"نہیں یار...... اپنی بہن سے ملنے جانا ہے۔"

"بہن سے......؟ تمہاری تو دو ہی بہنیں ہیں، دونوں ہی ان میرڈ ہیں۔" نعمان نے الجھن بھری نظروں سے برہان کی طرف دیکھا۔

"یار ایک کی شادی ہو گئی ہے۔" برہان نے چائے کا سپ لینے کے بعد کپ واپس رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار بہت واضح تھے۔

"اوہ...... اچھا اسی بہن کی جس کا تم بتا رہے تھے کہ تم نہیں چاہتے کہ اس کی شادی وہاں ہو۔" نعمان کو سب کچھ یاد آ گیا۔

"نہیں یار وہ والی نہیں، اس سے چھوٹی والی......"

"اوہ...... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹی والی کے لیے بھی کوئی اچھا رشتہ آ گیا تھا تو بڑی سے پہلے چھوٹی کی کر دی۔"

"نہیں یار جس بندے کا رشتہ بڑی کے لیے آیا تھا اسی سے چھوٹی کی شادی ہوئی ہے۔" نعمان ایک لمحے کے لیے کچھ سمجھ نہیں پایا تھا، الجھ کر رہ گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو، بڑی کی شادی جہاں ہونی تھی وہاں چھوٹی کی ہوئی ہے، یہی مطلب ہے تمہاری بات کا ناں......"

"ہاں...... ہاں تو اور کیا...... میری ایک بات کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے، دس مطلب نہیں نکالے جا سکتے...... میں بہت سیدھی سیدھی بات کرتا ہوں۔" برہان نے اتنا کہا، کپ اٹھا کر چائے کے دو تین گھونٹ بھرے، نعمان کی چائے کب کی ختم ہو گئی تھی لیکن سوچ بچار کے طویل دورانیے نے برہان کی چائے بالکل ٹھنڈی پانی کر دی تھی مگر وہ یوں پی رہا تھا جیسے بہت تیز گرم چائے پی رہا ہو کیونکہ اس کا ذہن مرتکز نہیں تھا۔

''اوہ......تو تم شاید اسی وجہ سے ڈسٹرب ہو؟''

''ہاں، ظاہری بات لیکن اب کمپرومائز تو کرنا ہوگا کیونکہ شادی تو ہوگئی ہے۔''

''obviously دیکھو برہان اب خود کو اس طرح سے سمجھاؤ کہ بہت زیادہ برا ہوسکتا تھا، ہوسکتا ہے بہت کم برا ہوا ہو، بندہ عمر کا زیادہ ہے لیکن ہوسکتا ہے اچھا آدمی ہو، تمہاری بہن کا خیال رکھے۔ اس کی خوشیوں کا احترام کرے۔'' نعمان سمجھانے لگا۔

''اب وہاں جائیں گے تو پتا چلا گا کہ دریا کا بہاؤ کیسا ہے، سیلابی ہے یا کھیتوں میں سبزہ اگائے گا۔ باغوں میں پھل پھول کھلائے گا۔''

''اچھا چلو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں، اس ڈپریشن کی کیفیت میں پیریڈ اٹینڈ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' برہان چائے کا خالی کپ رکھ کر نعمان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بے معنی سا مسکرایا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ فی الحال تو میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ چلو چلتے ہیں۔''

☆☆☆

''تمہیں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے روما......! پتا ہے دادا جان، تمہارا اور رابی آپا کا ایسے ہی خیال رکھتے ہیں جیسے میرا۔ وہ تم لوگوں کو ایسے ہی پریشان تو نہیں رہنے دیں گے ناں، مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ٹھیک ہے۔ خالہ جان نے آنٹی کا علاج کرانے سے منع کردیا ہے مگر وہ خالہ جان کو سمجھائیں گے اور آنٹی کا پراپر ٹریٹ منٹ کروائیں گے۔ وہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔''

''میں خالہ جان کے ساتھ ہوں، میرا مطلب یہ ہے کہ جو وہ سوچ رہی ہیں میں اس سے ایگری کرتی ہوں۔'' کائناز ایک دم ہکابکا ہوکر روما کی طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت دونوں کالج میں پہلا پیریڈ لینے کے بعد کلاس سے باہر آرہی تھیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''مطلب......دیکھو ناں اماں جان ہر وقت ٹینس رہتی تھیں، ہر وقت چیختی تھیں، ڈانٹتی تھیں، یقین کرو میں حیران ہوتی تھی کہ وہ انسان ہیں آخر کبھی تو ہنسیں۔ کبھی تو بولیں۔ جب دیکھو انہیں غصہ آیا رہتا تھا۔ کائناز جب میں نے اماں جان کو زور زور سے ہنستے دیکھا تو یقین کرو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ ہنسی اماں جان کی ہے۔ اتنی خوب صورت ہنسی ہنس رہی تھیں۔ تم سنتی تو بس حیران ہی رہ جاتیں۔ اماں جان ہنستی ہوئی بہت اچھی لگ رہی ہیں اگر ان کا ٹریٹمنٹ ہوگیا، وہ ٹھیک ہوگئیں تو پھر ان کی ہنسی غائب ہوجائے گی۔'' وہ کچھ توقف کرکے بولی۔

''نہیں......نہیں اب مجھے ہنستی ہوئی اماں جان چاہئیں، چاہے وہ مجھے پہچانیں یا نہ پہچانیں......لیکن وہ خوش نظر آئیں۔ کائناز وہ میری ماں ہیں اور میں انہیں بہت پیار کرتی ہوں، دل سے چاہتی ہوں کہ وہ ہنسیں لیکن وہ میری مرضی یا میری خواہش سے کبھی نہیں ہنسیں۔ مجھے دکھ ہوتا تھا کہ میری ماں ہر وقت اتنے تناؤ کا شکار کیوں رہتی ہیں، اتنا کام کیوں کرتی ہیں، بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے ہی تو وہ چڑچڑی ہوگئی تھیں اور انہیں بہت غصہ آیا کرتا تھا۔ اب نہ وہ کام کریں گی نہ غصہ آئے گا۔ کم از کم خوش تو رہیں گی ناں۔'' روما بولتی جارہی تھی اور کائناز اس کی طرف دیکھتی جارہی تھی۔

''میں تو تمہارے خیال سے کہہ رہی تھی روما......ورنہ مجھے تو تمہیں اس طرح اپنے گھر میں دیکھ کر اتنی خوشی

ہو رہی ہے، اتنی خوشی ہو رہی ہے لگتا ہے جیسے خوشی کے مارے میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

''خالہ جان نے کہا ہے کہ جب تک وہ نہیں کہیں گی تم ہمارے گھر ہی رہوگی۔'' کائناز کی خوشی دیدنی تھی۔

''روما اب ہم دونوں ساتھ کالج آیا جایا کریں گے، ایک ہی گاڑی میں باہر جایا کریں گے، ساتھ ہی کھانا کھائیں گے، ہر جگہ ساتھ ساتھ ہوں گے۔ روما میری لائف تو ایک دم چینج ہوگئی ہے، sorry for that ایک ایکسیڈنٹ نے تو میری لائف ہی چینج کرکے رکھ دی ہے لیکن پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔ میں تو تمہیں اپنے گھر میں دیکھ کر اتنی خوش ہوں کہ پتا نہیں کیا الٹا سیدھا بول گئی ہوں۔'' کائناز نے اس کی طرف دیکھا۔ اداسی کے بیچ مسکراہٹ یوں ابھری جیسے گھنے بادلوں کی اوٹ سے لمحے بھر کے لیے چاند جھانکتا ہے۔

''کوئی بات نہیں کائناز......! تم خوش ہو تو تمہیں خوش نظر آنا چاہیے، میرا دل رکھنے کے لیے تمہیں اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے کائناز کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''تم بہت اچھی ہو کائناز......جتنا پیار تم مجھ سے کرتی ہو، شاید میں تم سے اتنا نہیں کرتی۔'' کائناز نے بھی اسے زور سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''بے وقوف ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ کوئی کسی کو زیادہ نمبر نہیں دے سکتا۔'' کائناز کے اس برجستہ جواب نے روما کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرنیں بکھیر دی تھیں۔

☆☆☆

ایس پی اور وارث علی کے فلک شگاف قہقہے آفس کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے بلکہ اَن دیکھے سوراخوں سے پار ہوکر باہر چلتے پھرتے لوگوں کو بھی متوجہ کررہے تھے۔

''بہت خوش نظر آرہے ہو؟'' ایس پی نے وارث علی کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر واقعی فی الحال میں بہت خوش ہوں، تھوڑی دیر کے لیے تو بھول گیا ہوں کہ وہ جابر علی کی بیٹی ہے، سر جی وہ تو ایک نئی بنائی تھانیدارنی ہے۔''

''ایسی باتیں کرکے ڈراؤ نہ یار......'' ایس پی نے برجستہ کہا تھا۔

''سر کیا......کانفیڈنس ہے اس چھوٹی سی لڑکی میں......لگتا ہی نہیں کہ کل رات ہماری شادی ہوئی ہے، میں تو آپ سے بات کرنے کے لیے کل سے اتنا بے تاب تھا کہ بس صبح ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔''

''بات سنو......وارث علی وہ کم عمر خوب صورت لڑکی تمہیں تمہارے مقصد سے نہ ہٹا دے۔ یہ مت بھولنا کہ یہ شادی نہیں ہے ایک کاروباری سمجھوتا ہے، کہیں پیادہ شہ مات نہ دے دے۔'' ایس پی اب ذرا سنجیدہ ہو کر گویا ہوا۔

''سر جی کچھ دن تو موج کرنے دیں، کام تو کرنا ہی کرنا ہے۔'' وارث علی اپنا سر کھجا کر بولا۔

''یہی کہہ رہا ہوں موج مستی میں کہیں مشن نہ بھول جانا۔''

''جابر علی ہمارا کچھ نہیں لگتا......اور نہ ہی اس کی بیٹی......مجھے یاد ہے، میں تو آپ سے مذاق کررہا تھا اب تو کھل کر کھیلیں گے، کوئی ڈر ہی نہیں......ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کرے گا تو اس کے سامنے اس کی بیٹی کو کھڑا کردیں گے پھر دیکھیں کہاں جاتا ہے۔''

''ظاہر ہے ہمارا منصوبہ بھی یہی تھا اور ہمیں اپنے اس منصوبے پر کام کرنا ہے، یار یہ زندگی بار بار نہیں ملے گی۔ پیسہ ہو تو عورتوں کی کیا کمی ہے، تمہاری بیوی تو اٹھارہ، انیس سال کی لڑکی ہے تمہیں تو اس سے بھی

چھوٹی مل سکتی ہے۔ پیسے سے سب کچھ مل جاتا ہے۔'' ایس پی سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ وارث علی کی برین واشنگ کر رہا تھا۔

''مانتا ہوں سر جی...... مانتا ہوں، پیسے سے سب کچھ مل جاتا ہے لیکن پیسہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ ایس پی کی جیسے جان میں جان آ گئی۔

وارث علی بہت بڑا شاطر تھا، ستارہ وقتی طور پر تو اس پر غالب آ سکتی تھی لیکن اس کے اندر چھپی ہوئی دولت کی خوفناک بھوک کو مٹانا آسان نہیں تھا۔

''سر جی آپ اپنا کام کریں اور میں اپنے کام پہ جاتا ہوں، اب مجھے اجازت۔'' اس نے ایس پی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت اس کے موبائل پر رنگ ہوئی تھی۔ اس نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچا اور جلدی سے جیب سے اپنا موبائل نکالا۔ سامنے ایک un known نمبر بلنک ہو رہا تھا۔

وارث علی نے الجھی ہوئی کیفیت میں بہر حال کال ریسیو کی تھی۔

''ہیلو......؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ دوسری طرف سے برہان کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''برہان بات کر رہا ہوں، ستارہ کا بڑا بھائی...... آپ سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی ہے، شاید آپ کو یاد ہو۔'' برہان کی آواز سن کر وارث علی چونک پڑا تھا۔ اس نے ایس پی کی طرف دیکھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''او...... اچھا...... اچھا کیسے ہیں آپ......؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، اصل میں، میں آپ کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ آپ تھوڑا سا مجھے گائڈ کریں گے؟'' وارث علی شاید اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر بالکل بھی تیار نہیں تھا کہ برہان اس کی غیر موجودگی میں ستارہ سے ملنے جا سکتا ہے مگر اسے یہ سمجھ نہیں آئی کہ وہ اسے ستارہ سے ملنے سے کیسے روکے...... آخر اس نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھانا شروع کر دیا۔ وہ برہان کو ایڈریس سمجھا رہا تھا اور ایس پی بہت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا ایک، ایک انداز جیسے تول رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئے ہیں، آپ کو مشکل نہیں ہوگی۔''

''جی بالکل یہ تو بہت آسان ایڈریس ہے، میں آپ کے گھر کے تقریباً قریب ہی ہوں، زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ...... انشاء اللہ اب آپ کے گھر پر آپ سے باتیں ہوں گی۔''

''میں گھر پر نہیں ہوں۔'' وارث علی نے فوراً ہی کہا تھا۔

''کیا مطلب......؟'' برہان ایک لمحے کے لیے پریشان سا ہو گیا۔

''مطلب یہ کہ میں اپنے آفس آ گیا ہوں لیکن ستارہ سے آپ مل سکتے ہیں۔''

''او کے تھینک یو......'' برہان کی آواز آنا بند ہو گئی۔

''جابر علی کا بیٹا......؟'' وارث علی نے ایس پی کی طرف دیکھا۔ ایس پی کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئیں۔

جاری ہے

ہم کچھ اور سمجھے تھے

شبانہ شوکت



سگنل پر گاڑی روک کر پریشے نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑا اور سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا لی۔

''باجی یہ گجرے لے لیں۔'' نو دس سالہ بچہ کھڑکی کا شیشہ بجا کر اسے کھولنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

وہ بے ساختہ مسکرائی اور پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے، شیشہ واپس اوپر پش کرتے ہوئے اس کی نظر دائیں جانب سے تیسری قطار میں موجود صائم کی بگرے سوک پر پڑی۔ جس میں صائم کے ساتھ

فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی غیر معمولی حسین لڑکی نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ صائم بہت ہی سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والا بندہ تھا، وہ تو پریشے کے ساتھ بھی اتنا نپا تلا بولتا تھا جیسے ایک لفظ زائد ادا ہوگیا تو اسے ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔ بچوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ نارمل سا ہوتا تھا۔ اب اس لڑکی کے ساتھ ہنستے مسکراتے باتیں کرنا پریشے سے ہضم نہیں ہورہا تھا۔ گاڑیاں آگے بڑھ گئی تھیں، وہ گم صم سی کیفیت میں گھری گھر آگئی تھی، وہ شکی مزاج تو کبھی نہیں تھی اور یہاں تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حقیقت کیا تھی اور وہ لڑکی کون تھی۔

وہ رات گیارہ بجے تک گھر آیا۔ ڈریس چینج کر کے وہ باہر آیا تو اس نے کھانے کا پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''صرف دودھ لا دیں۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں آگئی جہاں شاہدہ منتظر کھڑی تھی۔

''شاہدہ صرف دودھ دے دو، کھانا کوئی نہیں کھا رہا۔''

''جی میڈم۔'' اس نے پھرتی سے دو گلاس دودھ گرم کر کے ٹرے میں رکھ دیے۔

''بچوں نے دودھ پی لیا؟''

''اُن کو تو میں نے دس بجے ہی دودھ پلا کر سلا دیا تھا۔''

''او کے۔'' وہ ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ صائم لیپ ٹاپ سامنے رکھے مصروف تھا۔ اس نے ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھی اور خود گھوم کر دوسری طرف آبیٹھی۔

''آپ نے کھانا کھا لیا؟'' صائم نے پوچھا۔ نظریں بدستور لیپ ٹاپ پر تھیں۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا، اب کے وہ ساکت ہوگیا تھا۔ حرکت کرتی انگلیاں رک گئیں اور پوری گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''کیوں، اتنا ٹائم ہوگیا ہے آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟''

''مجھے بھوک نہیں تھی۔'' پریشے نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر دوبارہ سے مصروف ہوگیا۔ پریشے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ کب، کب کھانا گھر میں نہیں کھاتا اور وہ اسے بزنس لنچ و ڈنر سمجھ کر اگنور کرتی رہی تھی۔

☆☆☆

شادی سے پہلے پریشے باقاعدگی سے آفس جایا کرتی تھی، پاپا کی کاٹن فیکٹریاں تھیں، آڑھتیوں سے ڈیلنگ اور فیکٹری کے دیگر امور میں اسے مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ اب جبکہ سارے معاملات کو صائم ہی ڈیل کرتا تھا۔ وہ دن میں ایک چکر لگا لیتی تھی آج بھی وہ صائم کے ساتھ بزنس میٹنگ میں شریک تھی۔ جب صائم کے سیل پر لگاتار بیلز ہونے لگیں، نمبر پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک گیا تھا۔ اس کے چہرے کا بدلتا رنگ پریشے سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

''پری آپ پلیز میٹنگ جاری رکھیں، میں یہ فون سن کر آتا ہوں۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ پریشے اپنے دل میں اٹھتے اندیشوں کو جھٹک کر حسن صاحب سے دوبارہ گفتگو کرنے لگی لیکن وہ چند ہی منٹوں میں پھر سے اندر آگیا تھا۔

''ایکسکیوز می حسن صاحب، عامر اور علی مجھے بہت ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے، پریشے آپ سے ڈیلنگ کر رہی ہیں، میں انشاء اللہ فون پر کانٹیکٹ رکھوں گا۔ پلیز پریشے مجھے ابھی جانا ہے، اٹس ارجنٹ۔'' اسے اپنے تاثرات پر پورا کنٹرول تھا، اس کے چہرے سے اس کے اندرونی تاثرات کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا مگر وہ پریشے کو بہت مضطرب اور پریشان محسوس ہوا، معذرت کرتا ہوا وہ فوراً وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ کتنی ہی دیر گم صم سی بیٹھی رہی۔

☆☆☆

''پری تمہیں معلوم ہے، یامین انکل کو سیریس اٹیک ہوا ہے؟''

''اوہ کب......'' وہ بری طرح چونکی تھی، یامین انکل اس کے پھوپا تھے۔ اس کی کزن نریمان نے اسے بتایا۔

''تم اسی دنیا میں رہتی ہو یا نہیں؟'' اس نے اسے بہت لتاڑا۔

''بس یار...... کچھ دنوں سے میں واقعی بہت بزی رہی ہوں۔''

''بزی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سب سے لاتعلق ہو جائیں، بہرحال ان کو CCU میں ایڈمٹ کر لیا گیا ہے۔ ہی از ویری سیریس یار، سارے فیملی ممبرز اسپتال میں پہنچے ہوئے ہیں، تم بھی آجاؤ، ہری اپ۔''

''او کے، میں آرہی ہوں۔'' وہ تیزی سے ڈریسنگ روم میں گئی اور چینج کر کے باہر نکلی، شاہدہ کو اپنے جانے کا بتایا۔

''ماما!'' عرصم دوڑتا ہوا آیا۔ ''میں بھی چلوں گا۔''

''بچوں کا اسپتال میں کیا کام...... آپ کے ٹیوٹر آنے والے ہیں، جائیں صارم بھائی کے ساتھ اپنا بیگ لے کر بیٹھیں اور ہوم ورک کریں۔''

''تو...... میں بھی جاؤں گا۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''عرصم پلیز، ماما کسی بات سے منع کرتی ہیں تو وہ مان لیتے ہیں۔''

''پاپا بھی سارا دن گھر نہیں آتے، آپ بھی ہمیں باہر نہیں لے کر جاتیں۔'' وہ سخت ناراض تھا، وہ مسکرا دی۔

''ابھی تو میں انکل کو دیکھنے اسپتال جا رہی ہوں، آپ بھی ان کے لیے دعا کریں، کل ہم انشاء اللہ باہر چلیں گے پرامس۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ماما آپ اسے لے جائیں، میں اکیلا ہی پڑھ لوں گا۔'' صارم بڑی بردباری سے بولا تو وہ ہنس دی۔ اسپتال پہنچ کر وہ نریمان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اچانک عرصم چیخا۔

''پاپا......! ماما وہاں پاپا ہیں۔'' وہ سامنے کمرے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''عرصم یہاں پاپا کہاں سے آگئے؟'' نریمان نے اس کا گال چھوا۔

''کیا پتا یامین انکل کا پتا چلا ہو تو آئے ہوں۔'' پریشے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عرصم تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھا اور بے دھڑک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ جہاں صائم ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لپٹائے اس کا سر تھپک رہا تھا۔ لڑکی سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر دونوں ہی چونکے تھے، لڑکی گھبرا کر پیچھے ہٹی تو پریشے کو شاک لگا۔ وہ وہی کار والی لڑکی تھی، صائم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ پریشے کو دیکھ رہا تھا۔ جو پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔

''ہیلو صائم بھائی، کیسے ہیں آپ اور یہ لڑکی کون ہے......؟'' نریمان آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ صائم کچھ کہتا عرصم نے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا۔

''میں آپ سے ناراض ہوں پاپا، اتنے دن ہوگئے آپ مجھے آؤٹنگ پر نہیں لے کر گئے، سنڈے کو بھی نہیں۔''

صائم اتنی دیر میں خود پر قابو پا چکا تھا، جھک کر عرصم کو اٹھاتے ہوئے، اس کا گال چوم کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''ابھی آپ ماما کے ساتھ گھر جائیں پھر میں آپ......''

''نہیں!'' وہ اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ ''میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''عرصم۔'' پریشے کا سکتہ بالآخر ٹوٹ گیا۔ ''آؤ گھر چلیں۔''

''نہیں۔'' عرصم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن پریشے اسے سختی سے صائم سے الگ کر کے باہر

لے آئی۔

"یہ لڑکی کون تھی صائم بھائی کے ساتھ؟"

"پلیز نریمان۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ نریمان اس کے تاثرات کو دیکھ کر چپ ہوگئی۔

"او کے، ریلیکس......" اس نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ کچھ دیر پھپھو کے پاس بیٹھ کر گھر آگئی۔

صائم رات کو ہی آیا تھا۔ اس نے اپنا روٹین کا رویہ برقرار رکھا تو پریشے نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اپنا ضبط آزما رہی تھی۔ وہ دوبارہ اسپتال نہیں گئی تھی۔ فون پر ہی انکل کی طبیعت پوچھتی رہی تھی۔ اس دن اس نے بہت ضروری شاپنگ کرنی تھی تو وہ مال چلی آئی۔ ابھی وہ اندر داخل ہوئی تھی کہ اس نے صائم کو اسی لڑکی کے ساتھ باہر نکلتے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں شاپرز تھے۔ ہنستے مسکراتے، ایک دوسرے میں مگن، اردگرد سے بالکل بے خبر، وہ پیچھے ہوگئی۔ ایک ستون کے پیچھے چھپ کر اس نے دیکھا صائم کی گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنی گاڑی وہیں چھوڑی اور ٹیکسی ہائر کر کے اسے گرے سوک کے پیچھے چلنے کا کہہ کر اپنی نگاہیں اس پر جمائے رکھیں۔ گاڑی گلشن اقبال کی طرف مڑ گئی پھر ایک بلڈنگ کے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ گیٹ کیپر نے جس طرح صائم کو دیکھتے ہی گیٹ وا کیا تھا وہ اس کی شناسائی ظاہر کرتا تھا۔ اس نے ٹیکسی واپس... مڑوائی اور واپس مال آگئی۔

☆☆☆

شایان، نریمان کا بھائی تھا، پریشے کا خالہ زاد، اس کی پریشے سے بہت دوستی تھی، پریشے نے اسے اعتماد میں لے کر اور رازداری کا وعدہ لے کر یہ ساری معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا۔ وہ صحافی تھا، تجسس اس کی فطرت میں تھا، ایک ہفتے بعد اس نے ساری معلومات پریشے تک پہنچادی تھیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی تھیں f6 فلیٹ میں رہائش پذیر تھیں، صائم اکثر یہاں آتا تھا، ان دونوں کو وہاں آئے چند ماہ ہوئے تھے، شایان نے اس سے خاصا افسوس کیا تھا صائم کے یوں راہ سے بھٹکنے پر......

☆☆☆

"ایکسکیوزمی یہ مسٹر اکرام کا ریزیڈنس ہے ناں۔" دوسرے دن پریشے نے اسی فلیٹ پر بیل دی تھی۔ دروازہ اسی لڑکی نے کھولا تھا۔ پریشے کو دیکھتے ہی اس کا رنگ بدل گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ اسے پہچان چکی تھی۔ پریشے نے البتہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔ اس کے سوال کے جواب میں اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوہ...... ایڈریس تو یہی تھا، اب شاید فلیٹ نمبر کا مسئلہ ہو رہا ہے۔"

"انہوں نے آپ کو کیا نمبر بتایا تھا؟"

"یہی تو یاد نہیں آرہا، ان کا فون بھی بند جا رہا ہے، اب میں اتنی دور سے آئی ہوں۔" لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر فوراً ہی بھینچ بھی لیے تھے، کچھ کہتے کہتے اس نے خود کو روک لیا تھا۔

"آپ مجھے کچھ دیر بیٹھنے دیں، شاید میرا ان سے رابطہ ہوجائے۔"

"جی ضرور۔" وہ آگے سے ہٹ گئی۔ داہنے ہاتھ پر ڈرائنگ روم اور بائیں ہاتھ پر کچن، کچن کے ساتھ ہی ایک اور کمرا تھا شاید بیڈ روم، مختصر سا فلیٹ تھا۔ سرسری نظر ڈال کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں وہ لڑکی کولڈ ڈرنک لے آئی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" پریشے نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

"زونائشہ۔"

"پریٹی نیم، پڑھتی ہیں؟"

"جی، ایم ایس سی میں ایڈمیشن لیا تھا مگر امی کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ میں کلاسز جوائن نہیں کرسکی۔"

"اوہ، کیا طبیعت خراب ہے اُن کی؟"

"ہارٹ پیشنٹ ہیں، شوگر بھی ہے۔" اتنے میں اندر سے اس کی والدہ آگئیں، دبلی پتلی، صورت سے ہی بیمار نظر آنے والی۔

"کون آیا ہے زونی؟"

"السلام علیکم۔" پریشے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ واضح طور پر گڑبڑائی تھیں۔

"اوہ تو سب سے میرا تعارف کروا رکھا ہے۔" اس نے زہرخند سے سوچا۔

"یہ یہیں اسی بلڈنگ میں کسی سے ملنے آئی ہیں لیکن فلیٹ نمبر بھول گئی ہیں۔" زونی نے ماں کو متنبہ کیا کہ جتنا بتایا جا رہا ہے، اسی کو سچ سمجھا جائے، اسی اثنا میں کال بیل بجی۔ دونوں ماں، بیٹی نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیل تواتر سے ہونے لگی۔ پریشے کو ان کے تاثرات نے ہی سمجھا دیا تھا کہ آنے والا صائم تھا۔

"چلو آج ڈراپ سین ہوجائے۔" اب اندر کمرے میں سیل فون پر بیل آرہی تھی۔ زونائشہ دوڑ کر اندر گئی۔ وہ شاید فون پر صائم کو منع کرنا چاہتی تھی کہ پریشے نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے صائم ہی تھا جو اسے دیکھ کر سکتے میں چلا گیا تھا۔

"آئیں، اندر آجائیں، میں تو بس جا رہی ہوں۔" وہ باہر جانے کے لیے اس کے پاس سے گزری تو اس نے پریشے کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں ایسے مت جائیں، یہاں تک آئی ہیں تو ساری حقیقت بھی جان لیں۔"

"جاننے کو کیا باقی رہ گیا ہے؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"پلیز اندر چلیں، یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے۔" وہ بہت نرمی سے اسے تھام کر اندر لے آیا، وہ وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی لیکن جانے کیسے اتنی کمزور پڑ گئی کہ کھنچتی ہوئی اس کے ساتھ چلی آئی۔ شاید اندرونی یورش نے اسے کمزور بنادیا تھا۔

"بیٹھ جائیں۔" اسے بٹھانے کے بعد اس نے ان خاتون کو بھی جو حواس باختہ سی کھڑی تھیں، کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھادیا۔ "زونی تم بھی آؤ۔"

"زونی!" ایک زہر سا پریشے کی رگ رگ میں اترا تھا۔

"آپ دونوں تو پریشے کو جانتی ہیں لیکن پریشے آپ سے فرسٹ ٹائم مل رہی ہے۔" پھر وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"پریشے یہ میری امی ہیں اور یہ میری بہن زونائشہ۔" ایک بم تھا جو اس نے پریشے کے حواسوں پر دے مارا تھا۔ بے یقینی سے اس نے پہلے صائم کو دیکھا جو اسی کو دیکھ رہا تھا پھر باری باری ان دونوں خواتین کو جو قدرے سہمی ہوئی تھیں۔

"ماں اور بہن......؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے چکراتا ہوا سر تھاما۔

"پریشے آپ پریشان مت ہوں، کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لیں۔"

"مجھے گھر جانا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئیں، میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔"

"نہیں، میں اپنی گاڑی میں آئی ہوں۔"

"او کے، چلیں نیچے چلتے ہیں، میں آتا ہوں امی۔" وہ نیچے اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ پریشے چکراتے سر کے ساتھ گھر آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے اپنی صائم سے پہلی ملاقات یاد آئی تھی۔

☆☆☆

صائم نیا، نیا فیکٹری میں آیا تھا، پریشے ان دنوں اپنے امتحانوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے بہت دن فیکٹری نہیں جا پائی تھی۔ اس دن جب اس کا تعارف صائم سے کروایا گیا تو وہ ٹھٹک گئی۔ گندمی

رنگت، گھور سیاہ آنکھیں، دلفریب نقوش، بہت خوب صورت آواز ولہجہ، بہت دھیمے اور بہت کم بولنے والا سنجیدہ ترین نوجوان، وہ آہستہ آہستہ اس کی اسیر ہوتی جارہی تھی۔ وہ خود بھی بہت سنجیدہ مزاج کی لڑکی تھی۔ اس لیے اس کے دل کی بات کوئی نہ جان سکا۔ حتیٰ کہ پاپا بھی نہیں۔

''بیٹا میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اچانک ان کی طبیعت بگڑی تو انہوں نے اسے بلایا۔

''جی پاپا!'' اس نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''آپ کے دو بہت اچھے پرپوزلز میرے پاس آئے ہیں، میں ان سے مکمل طور پر مطمئن ہوں، آپ دونوں کو کنسیڈر کر کے مجھے جواب دیں۔'' انہوں نے اسے تفصیل بتائی۔ وہ بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

''اتنی چپ کیوں ہیں، آپ کی کہیں اور خواہش ہے تو مجھے بتادیں، ہم صرف باپ بیٹی نہیں، فرینڈز بھی تو ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''جہاں میں کہوں آپ مان جائیں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ مجھے مان جانا چاہیے۔'' وہ پھر خاموش ہوگئی۔ انہوں نے بھویں سکیڑ کر اسے بغور دیکھا تھا۔

''پریشے کیا بات ہے؟ any problem.''

''پرابلم تو نہیں پاپا مگر آپ شاید.....'' وہ ہچکچا گئی۔

''آپ مجھے نام بتائیں۔'' ان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

''صائم.....'' اس نے صرف نام بتایا تھا۔ وہ بہت بری طرح چونکے تھے۔ کچھ کہنے کو لب کھولے مگر پھر بھینچ لیے۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی پھر انہوں نے گہری سانس کھینچی۔

'' اوکے، میں اس کی رائے بھی معلوم کرلوں۔'' کوئی سرزنش نہیں، صائم کی کم تر حیثیت پر اسے تنبیہ نہیں، وہ کچھ دیر غیر یقینی سے انہیں دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''تھینک یو پاپا۔''

''اوکے...... مائے چائلڈ......'' انہوں نے اس کی پشت تھپتھپائی۔

☆☆☆

پھر ان کی اور صائم کی کیا ڈسکشن ہوئی، ان کے درمیان کیا طے پایا اسے ان معاملات کا کچھ علم نہیں تھا جبھی وہ اس کے خاندان سے بھی ناواقف رہی، بس کچھ ہی عرصے میں ان کی شادی ہوگئی۔ وہ بہت خوش تھی، کتنے دن تو اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اس کا ہوگیا ہے۔ سوتے میں سے آنکھ کھل جانے پر وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہتی۔ اس کے کھانے، پینے، لباس اور جوتوں ہر چیز کا خیال خود رکھتی تھی۔ وہ بھی اس سے بہت محبت سے پیش آتا تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی بہت زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ صائم نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی کہ جس سے معلوم ہوتا کہ وہ نچلے اسٹینڈرڈ سے ایک دم اتنے ہائی فائی اسٹینڈرڈ میں آکر آپے سے باہر ہوگیا ہے، ویسا ہی سنجیدہ، ویسا ہی اپنے معاملات میں ذمے دار، بہت سلجھا ہوا ڈیسنٹ انسان تھا۔ دونوں بیٹوں کی پیدائش پر اس نے پریشے کا بہت خیال رکھا۔ ان کی شادی کے چار سال بعد جب پاپا کی ڈیتھ ہوگئی تو صدمے سے پریشے پاگل ہوگئی ہوتی اگر صائم نے اسے نہ سنبھالا ہوتا۔

پاپا کے بعد ان دونوں پر کاروباری ذمے داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ سو مصروفیت بھی اسی حساب سے بڑھی تھی۔ بچوں کے لیے ٹائم نکالنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ اسی لیے اس نے بزنس میں اپنا حصہ کم کردیا تھا۔ اب وہ صرف ایک بار فیکٹری جاتی تھی۔ سب کچھ صائم ہی دیکھ رہا تھا کہ یہ مشکوک

معاملہ سامنے آگیا۔

''اگر وہ صائم کی ممی اور بہن ہیں تو وہ اس طرح مشکوک طریقے سے کیوں اُن سے ملتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سب گھبرا کیوں جاتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کچھ گڑبڑ تو ضرور ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لڑکی ذونائشہ جسے صائم بہن کہہ رہا ہے وہ اس کی کوئی کزن وغیرہ ہو جیسا کہ ان مڈل کلاس لوگوں میں کزنز میرج بہت عام ہوتی ہیں تو یہ بھی اس کی منگیتر وغیرہ رہ چکی ہو۔ اب بھی ان کا آپس میں کوئی چکر نہ ہو...... اُف!'' یہ خیال آتے ہی اس کی مٹھیاں بھنچنے لگی تھیں۔ ''یہ تو میں ضرور کلیئر کراؤں گی۔'' اس نے خود سے عزم کیا تھا۔

☆☆☆

رات کو سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئی، صائم کپڑے تبدیل کر کے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی قریب آکر بیٹھ گئی۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اگر آپ کے بہن، بھائی اور امی موجود ہیں تو انہیں اب تک آپ نے کیوں چھپا کر رکھا ہوا تھا؟''

''میں نے انہیں کہیں نہیں چھپایا تھا۔'' صائم نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ سے ٹی وی بند کردیا اور پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

''تو ملوایا بھی نہیں تھا۔''

''ہاں وہ......'' اس نے لب بھینچ لیے۔ ''چلیں چھوڑیں، یہ بتائیں آپ کو میری امی کیسی لگیں؟'' بات کا رخ موڑنے پر اس کا دماغ گھوم گیا۔

''کیا مطلب کیسی لگیں؟'' اس کا لہجہ اتنا تلخ تھا کہ صائم ٹھٹک گیا۔ ''لگنے لگانے کا تو تعلق ہی نہیں، میں تو انہیں جانتی تک نہیں تھی۔ یہ بھی میں آپ کا پیچھا کرتی ہوئی وہاں تک گئی تھی کیونکہ آپ جس طرح اُن سے چھپ، چھپ کر ملتے تھے مجھے یہی لگتا تھا کہ جیسے کوئی غلط تعلق ہے آپ لوگوں میں۔''

"پریشے......" صائم کی آواز قدرے بلند ہوگئی تھی۔

"آہستہ بولیں، اونچا بول کر آپ سچے نہیں ہوجائیں گے، اسپتال میں جب زونائشہ کو لپٹائے کھڑے تھے، نریمان نے بھی غلط امپریشن لیا تھا اور میں نے بھی، تب کیوں نہیں آپ نے ہمیں اپنے رشتے سے آگاہ کیا؟"

"میں دوسروں کو وضاحت دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، ہاں البتہ آپ کو ہر بات کا جواب دینے کا پابند ہوں، آپ نے بھی تو نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟ حالانکہ آپ کے تاثرات آپ کے شکوک کا پتا دے رہے تھے...... لیکن پوچھا آپ نے تب بھی نہیں اگر آپ وہیں پوچھ لیتیں تو میں ضرور بتاتا، وہ میری ماں، بہن ہیں میری ذمّے داری اور مجھے اپنی ذمّے داری نبھانی آتی ہے۔"

"ابھی مزید اور کتنے relatives ذمّے داریوں کی صورت میں ظاہر ہوں گے؟"

صائم نے خود پر قابو پانے کے لیے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اس کا چہرہ بے طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"ماں اور بہن کا رشتہ ایسا کچا تو نہیں ہوتا کہ ان سے یوں چھپ، چھپ کر اور بیوی کو بے خبر رکھ کر ملا جائے۔ میرے ساتھ آپ آج تک کس دن شاپنگ کے لیے گئے ہیں اور زونائشہ کو ساتھ لے جا کر شاپنگ کروائی جاتی ہے، کبھی آپ کے پاس میرے یا بچوں کے لیے ٹائم نہیں ہوتا، بچے سارا دن آپ کے منتظر رہ کر سو جاتے ہیں کہ کبھی آپ انہیں اپنے ساتھ آؤٹنگ پر لے جائیں، اس میڈم کے فون پر دوڑتے ہوئے میٹنگ چھوڑ کر چلے گئے...... کبھی میرے یا بچوں کے لیے ایسی بے قراری دکھائی آپ نے؟"

"تمہیں شاید نہیں معلوم کہ تمہارے پاپا اور میرے درمیان کیا باتیں طے ہوئیں بس یہی سمجھو کہ مجھے تمہارے سامنے اپنے آپ کو اکیلا ثابت کرنا تھا۔ خیر اب ان باتوں کو جانے دو...... جہاں تک میٹنگ چھوڑ کر جانے کا سوال ہے تو...... اس دن امی کا بی پی شوٹ کر گیا تھا، وہ بے ہوش ہوگئی تھیں، ان کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا، زونی بہت گھبرا گئی تھی اور مسلسل رو رہی تھی، امی کی کنڈیشن بہت سیریس تھی، وہ کیسے انہیں اسپتال لے کر جاتی، اس لیے میں میٹنگ کے دوران اٹھ گیا تھا کہ وہاں آپ موجود تھیں ورنہ تو اگر امی کو کچھ ہو بھی جاتا تو میں وہاں سے اٹھ نہیں پاتا، میں یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ باس کی بیٹی سے شادی کر کے میں ہڈ حرام ہوگیا ہوں۔" اس بار صائم کا لہجہ بھی بہت تلخ تھا۔

"یہی تو بہت بڑا احسان کیا تھا آپ نے مجھ پر کہ مجھ سے شادی کرلی۔ پاپا نے آپ سے خود جو ریکوئیسٹ کی تھی کہ آپ مجھ سے شادی کرلیں جو آپ نے برائے مہربانی قبول فرمالی اور بس، اس کے بعد آپ آزاد تھے کہ بیوی بچوں کی ذمّے داریوں سے کوئی سروکار بھی ہوتا ہے مرد کو...... بیوی بچے جائیں بھاڑ میں، ہاں ماں اور بہن کی ذمّے داریوں پر آنچ نہ آئے، وہ ماں اور بہن جو نہ جانے کہاں سے اگ آئیں، سات سال تو ان کا ذکر بھی نہیں سنا تھا۔" پریشے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور زہر خند لہجے میں بولی۔ وہ مسلسل شکوہ کناں تھی۔

"امی اتنی بیمار نہ ہوتیں تو میں انہیں اب بھی یہاں نہ لاتا۔ اسی وجہ سے کہ مجھے یہی ڈر تھا کہ آپ شاید برداشت نہ کر پائیں۔"

"جب میں اتنی کم ظرف ہوں، اتنی بری ہوں تو کیوں رہتے ہیں میرے ساتھ، کیوں اپنے آپ پر جبر کر رہے ہیں، چلے جائیں اپنی ماں اور بہن کے پاس...... نہیں ہے ضرورت مجھے آپ کی، جب آپ کو میری اور بچوں کی ضرورت نہیں ہے تو ہمیں بھی آپ کی ضرورت نہیں ہے، ہم بھی آپ کے بغیر رہ لیں گے۔ آپ کا ہونا نہ ہونا ویسے بھی ہمارے لیے برابر ہے۔" صائم کے الزام نے اسے ہسٹریک کر دیا تھا۔

صائم نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر وہ ایک دم بیڈ سے اٹھ کر باہر چلا گیا، وہ شل ہوتے وجود کے ساتھ بیٹھی رہ گئی۔ پتا نہیں یونہی بیٹھے، بیٹھے اسے کتنی دیر ہوگئی تو اسے احساس ہوا رات کے اس پہر صائم سلیپنگ سوٹ میں ملبوس گھر سے چلا گیا تھا، کیا وہ واقعی اس کے بغیر رہ لے گی اور بچے جو سارا دن باپ کی تسبیح پڑھتے رہتے کہ کب رات ہو اور اس کی شکل نظر آئے، وہ انہیں کیا بتائے گی، وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی، کتنا خالی، خالی بیڈ روم محسوس ہو رہا تھا، ہر طرف اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ سائڈ ٹیبل پر اس کی رسٹ واچ اور سیل فون پڑے ہوئے تھے، گاڑی کی چابی بھی وہیں تھی، وہ اپنی گاڑی بھی نہیں لے کر گیا، اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ گہری سانس لیتی باہر آگئی مگر لاؤنج میں آتے ہی ٹھٹک گئی۔ وہ سامنے صوفے پر آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے لمس سے وہ چونکا، آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"آئی ایم سوری صائم، مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ گہری سانس لیتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"آپ نے تو بہت کچھ کہا ہے، کیا نہیں کہنا چاہیے تھا؟"

"کچھ بھی نہیں کہنا چاہیے تھا، جو بات آپ کو بری لگی ہو، اس کے لیے میں ایکسکیوز کرتی ہوں۔"

صائم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ میرے بغیر رہ لیں گی؟ آپ اور بچے واقعی میرے بغیر رہ لیں گے؟" یعنی یہ بات زیادہ بری لگی تھی، پریشے نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"نہیں، ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔"

"تو پھر آپ نے کیوں کہا......؟"

"وہ تو میں غصے میں پتا نہیں کیا، کیا بول گئی۔" اس نے شرمندگی سے پھر سر جھکا لیا۔ صائم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا پریشے، میں آپ کو کبھی، کسی قیمت پر چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، آپ میری محبت ہیں، میں شروع دن سے آپ کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا، آپ کو پا کر آپ کی بہترین عادات نے تو مجھے مزید آپ کا گرویدہ کر دیا۔ آپ اگر مجھ سے الگ نہیں ہو سکتیں تو میں تو یہ سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں کہ پریشے اور بچوں سے دور چلا جاؤں۔"

"تو پھر آپ نے مجھے امی اور زونائشہ سے کیوں نہیں ملوایا تھا؟"

"میں نے آپ کا اور بچوں کا تعارف بہت اچھی طرح ان دونوں سے کروایا ہوا ہے، تصویروں کے ذریعے بھی اور دور سے دکھا کر بھی، میں صرف یہ سننے سے بچنے کے لیے کہ صائم اپنے سسر کے پیسے سے سارا خاندان پال رہا ہے، انہیں کبھی سامنے نہیں لایا، یہاں بھی اسی لیے نہیں لایا کہ آپ شروع سے اکیلی رہی ہیں، پتا نہیں ان کی آمد آپ کو پسند آتی ہے یا نہیں ورنہ امی کی طبیعت کے پیشِ نظر تو انہیں تنہا چھوڑنا بھی میرے لیے ایک اذیت ہے، زونی کی طرف سے بھی فکر رہتی ہے، جوان جہان بہن ہے اس کے لیے بھی میرا ساتھ ضروری ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ میں اپنے دوسرے رشتے داروں کے ساتھ کوئی برا رویّہ رکھتی ہوں، یہ تو پھر میری بھی ماں اور بہن ہیں، مجھے بہت خوشی محسوس ہوگی اگر وہ ہمارے ساتھ یہاں آکر رہیں، بچے بھی تنہائی سے تنگ رہتے ہیں، اپنی دادی اور پھپھو کے ساتھ انشاء اللہ بہت خوش رہیں گے۔"

"اوہ پریشے، یو آر ریئلی ویری گریٹ، تھینک یو مائے ڈارلنگ۔" صائم نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا، پریشے نے اس کے سینے میں سر دے کر آنکھیں موند لیں۔

⊖

ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

چودھواں حصہ



ردا سخت مایوسی کے عالم میں اپنے کمرے میں لیٹی سسکیاں لے رہی تھی اور زرینہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ردا بی بی ...... اتنی مایوسی کی باتیں مت کریں...... اللہ بہتر کرے گا۔'' زرینہ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''محبت چھن جائے تو انسان زندہ رہ سکتا ہے مگر عزت چھن جائے تو جینا کتنا مشکل ہو جاتا ہے

اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا ہے۔'' ردا نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ کیوں ایسے سوچتی ہیں۔ میری باجی! سب آپ کی اب بھی عزت کرتے ہیں۔'' زرینہ نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''کون کرتا ہے میری عزت...... روحیل؟ جس نے دھکے مار کر مجھے گھر سے باہر نکال دیا...... حاتم اور عاصم بھائی جو مجھے گھر میں رکھنے کو کیا...... مجھے دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے۔ خاندان کے لوگ...... جن کے سامنے میں رسوا ہوئی۔ زرینہ دعا کرو میں مر جاؤں۔'' ردا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز میں کہا اور اسی لمحے خدیجہ بیگم کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے لگیں مگر اس کی باتیں سن کر وہیں رک گئیں۔

''اللہ نہ کرے ردا بی بی...... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''مجھے شہزادی بنا کر میرے سر پر محبت کا تاج رکھ کر...... اب جوتوں سے ٹھوکریں لگا کر مجھے قدموں تلے روندا جا رہا ہے، اپنی اتنی ناقدری پر میں روؤں نہیں تو اور کیا کروں؟'' ردا اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی تو خدیجہ بیگم کا دل کٹنے لگا اور وہ سسکی بھر کر وہاں سے چلی گئیں۔

اپنے کمرے میں آ کر خدیجہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اسی لمحے عاصم ایک فائل پکڑے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہیں روتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''آپ رو کیوں رہی ہیں مما؟''

''کچھ نہیں بس۔'' وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''پھر یہ آنسو کیوں......؟'' عاصم نے ان کے قریب بیٹھ کر نرمی سے پوچھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو.... ان آنسوؤں کا سبب کیا ہے۔''

''مما آپ کب تک ردا کی خاطر یوں اپنی جان ہلکان کرتی رہیں گی؟'' وہ غصے سے کہنے لگا۔

''وہ بیٹی ہے میری...... میرا خون...... میری لختِ جگر ہے، کیا اس کے آنسو اور دکھ مجھے نہیں رلائیں گے۔ تم لوگوں کا دل پتھر کا ہو سکتا ہے میرا نہیں۔''

عاصم کچھ کہنے ہی لگا کہ حاتم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ماں کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''مما کل آپ کو خالہ جان کی طرف جانا ہے۔ میرا اور شمیلہ کا رشتہ پکا کرنے۔'' حاتم نے کہا تو وہ دونوں ہکا بکا اسے دیکھنے لگے۔

''ہرگز نہیں...... میں دوبارہ اس مصیبت کو اپنے گھر میں لا کر نئی آفت اپنے گلے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔'' خدیجہ بیگم نے قدرے توقف کے بعد انتہائی غصے سے کہا۔

''آپ کو یہ کرنا ہی ہوگا کیونکہ میں خالہ جان سے وعدہ کر کے آ رہا ہوں۔'' حاتم ٹھوس لہجے میں بولا۔

''تم بغیر سوچے سمجھے کیوں اتنے بڑے، بڑے فیصلے کرنے لگے ہو۔ کیا بھول گئے ہو کہ اس لڑکی نے پہلے دن سے آتے ہی کتنا فساد ڈالا تھا۔'' وہ نہایت غصے سے کہہ رہی تھیں۔

''میں سب کچھ بھول چکا ہوں اگر یاد ہے تو صرف یہ کہ وہ فہام بھائی کی بیوہ ہیں اور اس وقت تکلیف میں ہیں۔'' حاتم نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''یہاں تو اسے مجھ سے اور ردا سے تکلیف تھی، اب وہاں کیا مسئلہ ہے؟'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔ ''تم کان کھول کر سن لو...... میں یہ رشتہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔''

''اگر آپ نہیں مانیں گی تو پھر بھی میں یہ شادی کر کے رہوں گا کیونکہ میں خالہ جان کو زبان دے چکا ہوں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اس رشتے کے لیے مان جائیں ورنہ میں کورٹ میرج کر لوں گا۔'' حاتم نے ٹھوس لہجے میں کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ خدیجہ بیگم ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''عاصم...... تم ہی اسے سمجھاؤ۔ تم تو شمیلہ کے بارے میں سب جانتے ہو۔'' انہوں نے عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مما...... حاتم بھائی نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے، آپ بھی اسے مان لیں۔'' عاصم بھی کہہ کر چلا گیا تو وہ کچھ دیر پریشان ہو کر دروازے کی سمت دیکھتی رہیں پھر گھبرا کر ردا کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

''کیا ہوا بیگم صاحبہ خیر تو ہے؟'' زرینہ نے انہیں اتنا پریشان دیکھا تو فوراً پوچھ بیٹھی۔

''اس گھر پر ایک اور نئی قیامت آنے والی ہے...... حاتم، شمیلہ سے شادی کرنے جا رہا ہے۔'' انہوں نے گویا ان کے سر پر بم گرایا۔

''مما...... یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' ردا نے گھبرا کر پوچھا۔

''بیگم صاحبہ...... خدا کے لیے ایسا مت ہونے دیں...... ورنہ......'' زرینہ بھی گھبرا کر بولی۔

''میرے پاس کوئی اختیار نہیں رہا کہ اس کام کو روک سکوں...... حاتم نے اپنا حتمی فیصلہ سنا کر مجھے بے بس کر دیا ہے۔'' انہوں نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''تو کیا آپ مان جائیں گی؟'' ردا نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ سوال مجھ جیسی بے بس ماں سے مت پوچھو۔'' وہ ایک آہ بھر کے رہ گئیں۔

☆☆☆

ماں جی، روحیل سے ناراض تھیں اور اس سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے کئی بار روحیل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ردا کو منا کر لے آئے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس کی ضد کی وجہ سے ماں جی خائف ہو گئی تھیں اور انہوں نے اس کے ساتھ بات چیت ترک کر دی تھی۔ روحیل کو اس بات کا بہت قلق تھا کہ وہ ماں جی کی ناراضی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہو کر ان کے کمرے میں آیا تو انہوں نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

''ماں جی...... پلیز...... مجھ سے بات تو کریں۔'' روحیل نے ان کے قریب بیٹھ کر التجائیہ انداز میں کہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پھیرے رکھا۔

''ٹھیک ہے، آپ کی خوشی کی خاطر میں ردا کو لینے چلا جاؤں گا۔''

''سچ......!'' وہ ایک دم خوش ہو کر بولیں۔

''ہاں آپ تیار رہیے گا، شام کو ہم چلیں گے۔'' روحیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن ان لوگوں کی ایک شرط بھی ہے۔'' ماں جی نے آہستہ آواز میں کہا تو روحیل نے باہر نکلتے ہوئے فوراً مڑ کر دیکھا۔

''کیسی شرط......؟'' روحیل نے چونک کر پوچھا۔

''یہ کہ تم ان سب سے...... میرا مطلب ہے حاتم...... عاصم اور سب سے معافی بھی مانگو گے۔'' ماں جی نے آہستہ آواز میں کہا۔

''کیسی معافی...... اور کس بات کی؟'' روحیل نے غصے سے پوچھا۔

''اس بے عزتی کی جو تم نے سب کے سامنے ردا کی، کی تھی۔'' ماں جی نے اسے بتایا۔

''ہرگز نہیں، میں اب اتنا بے غیرت بھی نہیں ہوا کہ ردا کو اس کے کوافیئر پر شاباش دوں۔'' روحیل ایک دم طیش میں آ گیا۔

''بیٹا...... اسے انا کا مسئلہ مت بناؤ، اپنے گھر کو آباد کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' ماں جی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے گھر پر۔" روحیل غصے سے کہہ کر چلا گیا اور ماں جی پھر پریشان ہو کر سوچ میں پڑ گئیں۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے خدیجہ بیگم کا فون نمبر ملایا۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم لاؤنج میں داخل ہوئیں تو ریحانہ بیگم ایک دم کھل اٹھیں اور بہت تپاک سے ملیں۔ خدیجہ بیگم کے چہرے پر پریشانی اور بے بسی کے تاثرات تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر شمیلہ کے سر پر پیار دینا چاہا تو وہ قدرے اکڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"شمیلہ یہ کیا بدتمیزی ہے، آگے بڑھ کر آپا کو سلام کرو۔" ماں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" خدیجہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

"بس صدمے کی وجہ سے اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ آپ بیٹھیے' شمیلہ جاؤ آپا کے لیے چائے لے کر آؤ۔" ریحانہ جلدی جلدی بات سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"مجھے حاتم نے یہاں بھیجا ہے اور کیوں بھیجا ہے یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔" انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں، حاتم اپنے وعدے کا بہت پکا ہے، میں شمیلہ کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ شکر ہے حاتم نے میری پریشانی دور کر دی...... آپا میں نے آپ سے جو کچھ بھی کہا پلیز مجھے معاف کر دیں۔" ریحانہ بیگم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز میں کہا۔

"ریحانہ...... میرا دل تو قبرستان بن چکا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے اس میں دفن ہو جاتا ہے۔" انہوں نے آہ بھر کر نم آنکھوں سے بہن کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اللہ نہ کرے...... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" ریحانہ جلدی سے بولیں۔

"شمیلہ کی عدت تو ختم ہو چکی ہے نا؟" خدیجہ بیگم نے پوچھا۔

"جی...ہاں ... ہاں۔" ریحانہ نے بوکھلا کر جواب دیا۔

"تو پھر تم نے اور حاتم نے اس کے نکاح کے بارے میں جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ بھی بتا دو۔" انہوں نے بے بسی سے پوچھا۔

"نہیں، نہیں وہ تو آپ ہی بتائیں گی۔"

"میں کیا بتاؤں، تم بتاؤ کب نکاح کرنا چاہتی ہو؟"

"میرا خیال ہے اسی جمعے کو......" ریحانہ نے جلدی سے کہا۔

"اتنی جلدی......؟" انہوں نے چونک کر کہا۔ "ٹھیک ہے تم نے جو فیصلہ کیا ہے مجھے منظور ہے...... اب میں چلتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"آپا...... بیٹھیں، چائے تو پی لیں۔" ریحانہ بیگم نے کہا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے باہر چلی گئیں۔ ریحانہ غصے سے شمیلہ کے کمرے میں گئیں تو وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"آپا کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو تم سمیت میری وہ عزت کر کے جاتی کہ تمہارا دماغ ٹھکانے آ جاتا۔ تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟" ماں نے غصے سے شمیلہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کی بہن ہے، آپ اس کی عزت کریں، میرے ساتھ اس نے کیا اچھا کیا تھا کہ میں اس کی عزت کروں؟" شمیلہ نے قدرے بدتمیزی سے جواب دیا۔

"ارے جس سے محبت کرتے ہیں ناں اس کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے، وہ تو پھر فہام کی ماں ہیں یہی سوچ کر ان کی عزت کر لیا کرو۔" ریحانہ بیٹی کے تیور دیکھ کر مزید بگڑیں۔

"ہونہہ...... پہلے یہ تو بھلا پاؤں کہ اس عورت نے فہام کو کبھی مکمل طور پر میرا نہیں ہونے دیا تھا۔" شمیلہ نے قدرے نخوت سے جواب دیا۔

"شرم کرو شمیلہ...... یہ آپا کا ظرف ہے کہ

تمہاری ساری بدتمیزیوں کے باوجود وہ تمہیں بہو بنانے پھر سے آ گئی ہیں۔"

"وہ بھی حاتم کے مجبور کرنے پر۔" شمیلہ نے منہ بنا کر کہا۔

"دیکھو...... اب سب کچھ بھلا دو۔ صرف یہ یاد رکھو کہ وہ حاتم کی ماں ہیں اور حاتم نے اس مشکل میں میری عزت اور بات کا بھرم رکھا ہے، کچھ اسی کا خیال کر لو۔" ریحانہ نے لہجہ بدل کر اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"حاتم کا احسان آپ کے سر پر ہو گا۔ میرے سر پر نہیں۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم اس قدر احسان فراموش اور بدلحاظ ہو، مجھے آج یقین ہو گیا ہے، خدا نے تم سے فہام کو...... چھین کر کتنی بڑی آزمائش میں ڈالا ہے مگر تم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا لیکن یاد رکھو...... اب تم نے آپا کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو میں ہرگز تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔" انہوں نے باقاعدہ اسے دھمکی۔

"تو نہ دیں...... اب کی بار میں بھی اس گھر سے ساری کشتیاں جلا کر جاؤں گی۔ آپ لوگوں سے سارے تعلق ختم کر کے...... میرا کوئی کچھ نہیں لگتا...... آپ بھی نہیں۔" وہ سخت طیش کے عالم میں انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا......؟" ریحانہ نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ منہ بنا کر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ریحانہ حیرت اور پریشانی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

ماں جی گو کہ روحیل سے ناراض تھیں مگر اپنے طور پر وہ پوری کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح روحیل کو قائل کر لیں کہ وہ ردا کو گھر لے آئے۔ انہوں نے اس کے جگری دوست یاور کو بھی فون کیا۔ فضیلت کو بھی کہتی رہتیں کہ وہ اسے سمجھائے مگر روحیل کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

رات کو روحیل اپنے کمرے میں لیٹا تھا کہ ماں جی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ روحیل انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"روحیل آج میں آخری بار تم سے کہنے آئی ہوں کہ ردا کو گھر لے آؤ۔" ماں جی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"مگر میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا۔"

"دیکھو غلطیاں اور خطائیں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں اگر ایسی غلطیوں سے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے تو معافی مانگنے میں کیا حرج ہے؟" ماں جی نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے کوئی غلطی نہیں کی؟“ روحیل نے ڈھٹائی سے کہا۔

”میاں بیوی کو اللہ نے ایک دوسرے کا لباس اسی لیے کہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خامیاں اور عیب چھپاتے ہیں۔ تم کیسے شوہر نکلے کہ اپنی بیوی کو خود ہی سارے زمانے کے سامنے بے عزت کر کے رسوا کر دیا۔ سوچو اگر ردا کو تمہارے عیب کے بارے میں معلوم ہوتا اور وہ اس وقت سارے زمانے کے سامنے تمہیں بے عزت کرتی تو تمہیں کیسا لگتا؟“ ماں جی نے خفگی سے کہا۔

”اسے خبر ہوتی تو پھر ناں !“ روحیل نے نظریں چرا کر کہا۔

”بیٹا جب اللہ انسانوں کا پردہ رکھتا ہے تو وہ چاہتا ہے انسان بھی آپس میں ایک دوسرے کا پردہ رکھیں۔ تم اچھے شوہر تو ثابت نہیں ہوئے اب اچھے انسان ہونے کا ثبوت دے دو، ایک بار سب سے معافی مانگ لو، بات ختم ہو جائے گی۔“ ماں جی نے اسے سمجھاتے ہوئے۔

”ہرگز نہیں...... میں معافی مانگ کر اپنے آپ کو چھوٹا بنا لوں۔ ہرگز نہیں۔“ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔

”معافی مانگنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہو جاتا۔ انسان جب گناہوں کے انبار لے کر خدا سے معافی مانگتا ہے تو وہ بھی اس کے سارے گناہ معاف کر کے سب کچھ بھلا دیتا ہے اور اس کو پاک صاف کر دیتا ہے۔“ ماں جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”وہ خدا ہے، سب کا خالق و مالک ہے وہ سب کو معاف کر دیتا ہے مگر انسان میں اتنا حوصلہ نہیں۔“

”بیٹا جب انسان اللہ کی خاطر کوئی بے عزتی یا ذلت برداشت کرتا ہے تو اللہ اپنی نظر میں اس کا مقام اور مرتبہ بلند کر دیتا ہے تم اللہ کے لیے ردا اور اس کے گھر والوں سے معافی مانگ لو۔“ ماں جی نے پھر سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اس روز رات گئے روحیل گھر لوٹا تو گھر میں تالا لگا ہوا تھا۔ وہ چونک گیا۔

”ایسا تو کبھی نہیں ہوا اللہ خیر کرے......“ اس نے پہلے ماں جی کے موبائل پر فون کیا، فون بند جا رہا تھا پھر وہ فضیلت کے موبائل پر فون کرنے لگا وہاں سے بھی کوئی جواب نہ ملا...... اس کے پاس چابی بھی نہیں تھی وہ کچھ سوچتے ہوئے فضیلت آپا کی طرف چلا گیا۔

”ماں جی میرے پاس ہیں اور اب وہ یہیں رہیں گی۔ جب تک تم ردا کو لے کر گھر نہیں آتے نہ وہ تم سے بات کریں گی اور نہ ہی یہاں سے جائیں گی، یہ آپا کا فیصلہ ہے جو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔“ فضیلت نے اس کے پوچھنے پر بتایا۔

”کیا مطلب...... ہٹیں میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔“ وہ بپھر گیا۔

”وہ تم سے بات نہیں کریں گی اگر تم ضدی ہو تو وہ بھی اپنی ضد پر قائم ہیں۔ روحیل...... تمہاری ماں جی نے اپنی ساری زندگی تمہیں سنوارنے میں گزار دی۔ جوانی میں بڑھاپا گزارا، آپا ہارٹ پیشنٹ ہیں، نہ جانے ان کی کتنی زندگی باقی ہے ان کی زندگی کو مزید اذیت میں مت ڈالو، ردا کو گھر لے آؤ۔“ فضیلت نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا تو روحیل نے ایک نظر اسے دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

حاتم کے نکاح کی وجہ سے گھر میں کچھ گہما گہمی تھی۔ خدیجہ بیگم بھی بہت مصروف تھیں۔ چند بہت قریبی لوگوں کو انوائٹ کیا تھا اور ان کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ردا بہت محبت سے ایک گفٹ پیک کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔

حاتم لاؤنج میں بیٹھا تھا کچھ مہمان بھی ارد گرد بیٹھے تھے۔ ان کے قریبی رشتے داروں نے طرح

طرح کی باتیں کی تھیں مگر انہی میں سے چند نے حاتم کے اس فیصلے کو سراہا بھی تھا۔ خدیجہ بیگم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھولوں کا ہار پہنا کر اسے کلاہ پہنایا جیسے ہی محبت سے اس کی پیشانی چومی تو دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“ خدیجہ بیگم نے اپنی آنکھیں صاف کر کے اسے واپس بٹھاتے ہوئے کہا۔

ردا گفٹ پیک اور پھولوں کا ہار پکڑے وہاں آئی...... اور گفٹ حاتم کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر اسے پھولوں کا ہار پہناتے ہوئے بولی۔

”مبارک ہو حاتم بھائی !“ ردا نے زبردستی مسکرا کر کہا تو حاتم نے اس کا ہاتھ روک کر ہار اس کے ہاتھ سے پکڑ کر دور پھینکا۔

”سب کی زندگیوں کو برباد کر کے ان کی زندہ میتوں پر اب پھول چڑھا کر مبارک باد دینے آگئی ہو۔ جاؤ یہاں سے۔“ حاتم غصے سے بولا تو سب ہکا بکا رہ گئے۔ ردا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”حاتم آج کے دن تو اسے معاف کر دو۔“ خدیجہ بیگم نے بے چارگی سے کہا۔

”میں اسے مر کر بھی معاف نہیں کر سکتا۔ اس سے کہیے کہ یہاں سے چلی جائے۔“ حاتم نے غصے سے کہا تو وہ روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ حاتم نے غصے سے اپنا کلاہ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔

”حاتم بھائی، آج تو اتنا غصہ مت کریں۔“ عاصم نے اسے زبردستی صوفے پر بٹھایا تو خدیجہ بیگم نے پھر اسے کلاہ پہنایا اور باقی ساری رسمیں بے دلی کے ساتھ کر کے انہیں گاڑیوں میں بٹھا کر وہ ردا کے کمرے میں آئیں جو بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی بری طرح سسک رہی تھی۔ ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں، وہ انہیں صاف کر کے ردا کے پاس آئیں اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”بیٹا...... صبر کرو اور ہمت سے کام لو۔“

”مما...... کتنا صبر کروں، کیا میرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ اس کی کوئی تلافی ممکن ہی نہیں...... آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔ کیسے سب سے معافی مانگوں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

”تمہارے کسی سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“ خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”خدا تمہاری مشکل آسان کرے، میں زرینہ کو تمہارے پاس چھوڑے جا رہی ہوں۔ پریشان مت ہونا......“ خدیجہ نے رک رک کر کہا تو ردا نے چونک کر ماں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور حیرت سے بڑبڑائی۔

”کیا...... آپ لوگ......؟“ ردا بولی تو خدیجہ بیگم نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

”کوشش کرنا تم شمیلہ کے سامنے نہ آؤ......“ خدیجہ نے کہا تو ردا نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔

”بیگم صاحبہ...... سب لوگ جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ زرینہ کمرے میں داخل ہو کر جلدی جلدی بولی۔

”تم...... ردا کے پاس ہی رہنا اور......“ خدیجہ بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

”فہام بھائی کی بارات میری وجہ سے لیٹ ہوئی تھی۔ میں پارلر سے لیٹ آئی تھی اور فہام بھائی گاڑی میں نہیں بیٹھ رہے تھے اور آج...... میں اور میرا وجود سب کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ کاش...... فہام بھائی کی جگہ میں مر جاتی...... کاش......“ ردا سسکیاں بھرنے لگی۔

”ردا بی بی حوصلہ کریں، وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔“ زرینہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ...... بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

رسم نکاح کے لیے سب لوگ شمیلہ کے گھر لاؤنج میں جمع تھے۔ حاتم اور عاصم بہت خاموش تھے۔ خدیجہ بیگم کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ کسی کے چہرے پر بھی خوشی کے تاثرات نہیں تھے۔ سلمان اور نفیسہ بھی خاموشی سے ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ ریحانہ بیگم نے بہن کی طرف دیکھا تو اُن کے چہرے پر افسردگی اور مایوسی کے تاثرات دیکھ کر خود ان کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔ وہ اٹھ کر شمیلہ کے کمرے میں آگئیں جو دلہن بنی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے پر قدرے غصہ اور خشونت تھی۔ ریحانہ بیگم نے گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا...... خدا کے لیے اب اپنے دل سے تمام منفی باتیں نکال کر جانا۔ آپا کے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہ کرنا...... وہ پہلے ہی بہت دُکھی ہیں، آج میں نے ان کے چہرے پر جو دکھ اور افسردگی دیکھی ہے اس سے میرا دل کٹنے لگا ہے، اپنے دل سے تمام نفرتیں مٹا کر جانا...... عورت کی عزت اپنی سسرال اور شوہر کے ساتھ وفا کرنے میں ہے۔ حاتم کی بہت عزت کرنا اور آپا کی خدمت......" وہ کہتے کہتے رو دیں۔ شمیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی لمحے نکاح خواں سلمان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کے ساتھ خدیجہ بیگم اور نفیسہ بھی تھیں۔ نکاح خواں نے رجسٹر کھول کر شمیلہ کی طرف دیکھا اور پوچھنے لگا۔

"شمیلہ بی بی...... بنتِ صفدر حسین کیا آپ کو حاتم علی ولد امجد علی کے ساتھ بعوض دس لاکھ حق مہر مُؤجّل نکاح منظور ہے؟" مولوی صاحب نے پوچھا شمیلہ کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ مولوی نے دوبارہ پوچھا۔ شمیلہ نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ریحانہ بیگم نے گھبرا کر بیٹی کی طرف دیکھا اور اس نے مولوی کی طرف۔

"ہاں...... بیٹا بتاؤ تمہاری کیا مرضی ہے؟" مولوی نے تیسری بار پوچھا۔

"نہیں......" شمیلہ نے گہری سانس لے کر ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"کیا...... کہا......؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" ریحانہ بیگم غصے سے بولیں۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" مولوی نے نرمی سے شمیلہ سے پوچھا۔

"مجھے حق مہر میں وہ گھر چاہیے جس میں حاتم رہ رہے ہیں۔" شمیلہ نے قطعیت سے کہا تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ گھر سب کا ہے، اکیلے حاتم کا نہیں جو تمہیں لکھ کر دے۔" خدیجہ بیگم یہ سن کر فوراً بولیں۔

"شمیلہ...... کچھ تو عقل کرو، تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ریحانہ نے بھی اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"دس لاکھ روپے حق مہر کچھ کم تو نہیں۔" سلمان نے بھی خفگی سے کہا۔

"ہاں، کم ہے، مجھے اپنا گھر چاہیے، جس میں سے کوئی مجھے کبھی باہر نہ نکال سکے۔" شمیلہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور یہ ناممکن ہے۔" خدیجہ بیگم نے بھی بڑے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"آپ حاتم صاحب کو میری یہ شرط بتادیں اگر انہیں منظور ہے تو میں نکاح کے لیے تیار ہوں ورنہ نہیں۔" شمیلہ نے مولوی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے سختی سے کہا تو مولوی صاحب رجسٹر اٹھا کر کمرے سے باہر چلے گئے اُن کے پیچھے باقی لوگ بھی باہر چلے گئے۔ صرف ریحانہ وہیں رہ گئیں۔

"شمیلہ، شمیلہ کچھ تو خدا کا خوف کرو...... یہ آپا کا احسان ہے کہ وہ تمہیں بیاہنے آگئی ہیں ورنہ تم......" ریحانہ نے غصے سے کہا۔

"مجھے اپنے لیے جو ٹھیک لگے گا وہی کروں گی۔" وہ کہہ کر باہر جانے لگی تو ریحانہ بیگم نے اسے زبردستی روکا مگر وہ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ مولوی نے حاتم کو شمیلہ کی شرط کے بارے میں بتایا تو حاتم اور عاصم بری طرح چونک گئے۔

"حاتم...... میں تمہیں ہرگز یہ نہیں کرنے دوں گی، وہ ہم سے ہماری چھت بھی چھیننا چاہتی ہے۔ ہم سب رُل جائیں گے بیٹا۔" خدیجہ نے غصے سے حاتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھابی کو یہ سب کچھ پہلے ڈسکس کر لینا چاہیے تھا۔" عاصم نے بھی پریشانی سے کہا۔

"لیکن اب کیا کریں، یہ بتاؤ؟" حاتم نے عاصم سے سرگوشی میں پوچھا۔

"یہ گھر آپ کا، میرا اور مما کا ہے، ردا کا حصہ اسے پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔" عاصم نے کہا۔

"کیا مطلب...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" حاتم نے چونک کر پوچھا۔

"شمیلہ بھابی فہام بھائی کی وجہ سے پہلے ہی بہت اذیت میں ہیں اگر اب اس سچویشن میں ہم انہیں چھوڑ کر جاتے ہیں تو یہ ان کے لیے بہت انسلٹ کی بات ہوگی۔ میرا خیال ہے آپ یہ گھر اُن کے نام کر دیں۔" عاصم نے اپنی جانب سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"عاصم، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" خدیجہ بیگم اس کی بات سن کر غصے سے بولیں۔

"مما اس وقت مسئلہ اُن کی عزت کا ہے۔" عاصم نے جھنجلا کر کہا۔

"اور اسے ہماری عزت کی کوئی پروا نہیں۔" خدیجہ نے غصے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے مولوی صاحب آپ حق مہر میں گھر ہی لکھ دیجیے۔" حاتم نے مولوی صاحب کی طرف دیکھ کر ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم دونوں کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں جا رہی ہوں، تم دونوں کے جو دل میں آئے کرو۔" خدیجہ بیگم نے غصے سے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئیں۔

"مولوی صاحب آپ نکاح پڑھیں۔" حاتم نے کہا۔

"جی بہت بہتر......" مولوی صاحب رجسٹر اٹھا کر اندر چلے گئے تو شمیلہ نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بھائی اور ماں کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

جب سے حاتم کی بارات گئی تھی، ردا اپنے کمرے میں لیٹی مسلسل رو رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی ایسا ممکن تھا۔ وہ اس قدر دُھتکاری جائے گی کہ سگے رشتے بھی اس پر اعتبار نہیں کریں گے۔ بہت زیادہ رونے سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیڈ پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی جب رشنا، زرینہ کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ردا بی بی...... دیکھیے تو کون آیا ہے، رشنا بی بی آئی ہیں۔" زرینہ نے کہا تو ردا نے ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر ایک دم اس کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یوں جیسے اس مشکل وقت میں اسے کسی کے کندھے کی ضرورت تھی۔

"ردا میری جان...... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ...... مجھ سے تمہارے آنسو برداشت نہیں ہو رہے۔" رشنا نے محبت سے اسے چومتے ہوئے کہا تو ردا سسکیاں بھرنے لگی۔

"تم تو اتنی بہادر تھیں کیسے ہمت ہار بیٹھی ہو......؟" رشنا نے پُرتاسف لہجے میں کہا۔

"جب قسمت روٹھ جائے تو ہمت خود بخود ٹوٹ جاتی ہے۔ رشنا میرا سب کچھ ختم ہو گیا...... محبتیں بھی...... رشتے بھی...... عزت بھی اور اعتبار بھی......

سب کچھ۔'' ردا نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

''ایسا مت کہو...... اللہ سب ٹھیک کرے گا۔'' رشنا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''وہی تو مجھ سے روٹھ گیا ہے، اسی لیے سب مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں، کوئی بھی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔'' ردا بے انتہا رو رہی تھی۔

''سب کرتے ہیں محبت...... پلیز تم نیگیٹو مت سوچو۔'' رشنا نے اسے محبت سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' زرینہ نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

''کیا روحیل آیا......؟'' رشنا نے قدرے توقف کے بعد رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں...... اور نہ ہی آئے گا۔'' ردا نے آہ بھر کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' رشنا نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ بہت ضدی ہے اور مجھ سے شدید بدگمان ہوچکا ہے۔'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''اور تم...... کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟'' رشنا نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' ردا نے مایوس کن لہجے میں جواب دیا اور اپنے ہاتھ ملنے لگی۔ رشنا اس کی ہر کیفیت نوٹ کر رہی تھی۔

''ردا ایک بات پوچھوں...... میرے توقیر بھائی میں کیا کمی تھی جو تم نے انہیں قبول نہیں کیا؟'' رشنا نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی...... مگر میرا دل انہیں قبول نہیں کرتا تھا۔ شاید مجھے انہی کی کوئی بددعا لگ گئی ہے۔''

''ایسا مت کہو جو خود suffer کر رہے ہوں وہ دوسروں کو کیا بددعا دیں گے۔ اب بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟'' رشنا نے اس کے ہاتھ تھام کر محبت سے پوچھا۔

''میرے پاس کسی بھی بات کا کوئی اختیار نہیں...... معلوم نہیں میری قسمت میں کیا لکھا ہے...... اور کیا ہونا باقی ہے لیکن مجھ سے میرے اپنوں کی نفرتیں برداشت نہیں ہو رہیں...... میں کیا کروں رشنا؟'' وہ پھر سسکنے لگی تھی۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا...... میں پوری کوشش کروں گی کہ تمہارے حالات نارمل ہوجائیں۔'' رشنا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

زرینہ چائے کی ٹرالی لے آئی تھی وہ انہیں چائے دے کر جیسے ہی لاؤنج میں آئی تو خدیجہ بیگم انتہائی پریشان حال روتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

''بیگم صاحبہ...... آپ...... باقی سب لوگ کہاں ہیں اور آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' اس نے آگے بڑھ کر انہیں صوفے پر بٹھایا اور فکرمندی سے پوچھنے لگی۔

''زرینہ ہم اس گھر سے بے گھر ہونے والے ہیں۔ شمیلہ نے حق مہر میں یہ گھر لکھوالیا ہے۔'' انہوں نے روتے ہوئے بتایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ردا ان باتوں سے بے خبر رشنا سے حالِ دل کہتی رہی۔

☆☆☆

''اس وقت میرا دل پھٹ رہا ہے، میں نے جس مجبوری میں یہ فیصلہ کیا ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔'' شمیلہ جو بیاہ کر حاتم کے ساتھ آگئی تھی اب اس کے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔

''فہام بھائی کے جانے سے آپ کی زندگی میں جو بھی کمی آئی ہے وہ میں ساری تو دور نہیں کرسکتا مگر کوشش کروں گا آپ کو سکون اور خوشیاں دے سکوں۔'' حاتم نے بڑی مشکل سے ہمت کرکے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو حاتم...... بچپن سے میں فہام کے ساتھ منسوب تھی۔ وہ محبت کے ساتھ ساتھ میری

عادت بن چکے تھے اگر نادانستہ میری زبان سے کچھ ایسا نکل جائے جو تمہیں اچھا نہ لگے تو پلیز مائنڈ نہ کرنا۔'' شمیلہ نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''اوکے...... نو پرابلم......'' حاتم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''حاتم...... آپ سے ایک بات کہوں، پلیز وہ بات آپ کسی سے نہیں کہیں گے...... خالہ جان سے بھی نہیں......'' شمیلہ نے کہا تو حاتم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''اوکے...... میں کسی سے نہیں کہوں گا۔'' حاتم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''حق مہر میں، میں نے یہ گھر صرف اپنے بھائی اور بھابی پر رعب ڈالنے کے لیے لکھوایا ہے ورنہ مجھے کوئی لالچ ہے اور نہ ہی ہوس...... یہ گھر آپ کا ہے اور آپ کا ہی رہے گا۔'' شمیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رئیلی...... اور اگر میں اس وقت انکار کر دیتا تو......؟'' حاتم نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے آپ پر پورا یقین تھا کہ میں جو کہوں گی وہ آپ ضرور مانیں گے۔ اسی لیے تو میں نے یہ شرط لگائی تھی اور ایسا ہی ہوا۔'' شمیلہ نے مسکرا کر کہا تو حاتم بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

روحیل کے ذہن میں فضیلت کے کہے ہوئے جملے بار بار گونج رہے تھے۔

''آپا ہارٹ پیشنٹ ہیں، اب ان کی کتنی زندگی باقی ہے۔ انہیں اذیت میں نہ ڈالو۔'' روحیل سخت پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ردا کا مسکراتا ہوا چہرہ گھومنے لگا۔

''اگر میں ردا کو کسی بھی طرح کنونس کرلیتا ہوں اور وہ میرے ساتھ آنے کے لیے مان بھی جاتی

محبت

جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے لیے دل میں ایک قبرستان بھی بنا دیا جاتا ہے جس میں اپنے محبوب کی ساری خامیاں دفن کردی جاتی ہیں اور ان پر کتبے بھی نہیں لگائے جاتے۔

ہائے رے شوہر

طوفانی بارش میں ایک شخص ریسٹورنٹ میں پیزا لینے آیا۔

منیجر نے پوچھا۔ ''سر کیا آپ غیر شادی شدہ ہیں؟'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اللہ کے بندے تم خود سوچو ایسے طوفان میں کون سی ماں اپنے بیٹے کو پیزا لینے بھیجتی؟''

سفید جھوٹ

☆60 سالہ ارب پتی کافی دن بعد کلب میں اپنی اٹھارہ سالہ نئی نویلی بیوی کے ساتھ داخل ہوا تو ایک دوست نے علیحدہ لے جا کر پوچھا۔ ''یہ کیسے تم سے شادی کے لیے راضی ہوگئی؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی عمر کے بارے میں جھوٹ بولا تھا''

دوست۔ ''کیا تم نے چالیس سال بتائی تھی؟''

''آدمی، نہیں، نہیں میں نے نوّے سال بتائی تھی۔''

مرسلہ: فرحت احمد، گلشن حدید

ہے تو مجھے اس کی فیملی سے معافی نہیں مانگنی پڑے گی مگر کیا ردا مان جائے گی؟" روحیل نے سگریٹ کا گہرا کش لگاتے ہوئے سوچا۔

"ہاں، وہ بہت معصوم ہے، اب بھی مجھ پر یقین رکھتی ہوگی۔" اس نے یہ سوچتے ہوئے ردا کا نمبر ملایا۔

"اس وقت روحیل کی کال......؟" ردا حیرت اور پریشانی سے بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ موبائل پر مسلسل بیلز ہو رہی تھیں۔

"روحیل ہمیشہ مجھے ڈانٹنے کے لیے ہی فون کرتا ہے، اب نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہے، میں اس سے ہرگز بات نہیں کروں گی۔" ردا نے پریشان ہو کر سوچا اور موبائل آف کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

حاتم اور شمیلہ اگلی صبح اٹھ کر خدیجہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوئے تو زرینہ انہیں ناشتا کرنے کو کہہ رہی تھی مگر وہ انکار کر رہی تھیں۔ زرینہ کو پیچھے کر کے حاتم خود آگے بڑھا۔

"اٹھیے ناں مما...... ناشتا کرلیں۔" حاتم نے ماں کے قریب بیٹھ کر نرمی سے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں۔ تم دونوں جاؤ یہاں سے۔" خدیجہ بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے بغیر دیکھے ان دونوں سے کہا۔

"مما...... شمیلہ...... آپ سے۔" حاتم نے رک رک کر کچھ کہنا چاہا۔

"کیا اب کوئی اور ڈراما کرنا باقی رہ گیا ہے؟" مما ایک دم غصے سے چلاتے ہوئے بولیں تو حاتم نے پریشان ہو کر شمیلہ کی طرف دیکھا۔

"مما...... شمیلہ نے آپ کے بارے میں دل سے تمام نیگیٹو باتیں نکال دی ہیں...... پلیز آپ بھی سب کچھ بھلا دیں۔" حاتم نے گھبرا کر کہا۔

"کیا کچھ بھلاؤں اس کی چالاکیاں...... مکاریاں...... اور کل کی بے عزتی؟" انہوں نے ایک دم غصے سے شمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس خالہ جان میں آپ سے اپنی مزید بے عزتی کروانے نہیں آئی۔ دیکھ لیا حاتم، اب مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف آپ کے کہنے پر یہاں آئی تھی۔" شمیلہ نے غصے سے کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلی گئی۔

"مما مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے ماں ہو کر اتنی تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے۔" وہ ناراضی اور خفگی سے بولا۔

"ہاں...... جب تم جیسی اولاد ماں کو جوتی کی اہمیت دیتی ہے تو وہ تنگ دل ہی ہو جاتی ہے۔" انہوں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو وہ سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جب سے حاتم اور شمیلہ کا نکاح ہوا تھا خدیجہ بیگم کی طبیعت سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ شمیلہ کی باتوں اور رویّے نے انہیں بہت بددل کر دیا تھا۔ ردا جب ان کے کمرے میں آئی تو ان کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ وہ خاموشی سے خدیجہ بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا......؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" انہوں نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مما...... وہ...... رات کو میرے موبائل پر روحیل کا فون آ رہا تھا۔"

"اچھا...... تو کیا تم نے اس سے کوئی بات کی......؟" خدیجہ نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں...... میں نے تو موبائل ہی آف کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ پھر مجھے ڈانٹے گا اور میری بے عزتی کرے گا۔" ردا نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بیٹا...... تمہیں اس سے بات تو کرنی چاہیے تھی۔ میرا خیال ہے اس کی ماں جی نے اسے سمجھ

ہوگا...... بیٹا میں تو چاہتی ہوں کہ روحیل تمہیں لینے آ جائے اور تم اپنے گھر چلی جاؤ تو میں پرسکون ہو جاؤں ورنہ شمیلہ نہ جانے کیا کرے...... ویسے بھی وہ اب اس گھر کی مالکن بن گئی ہے۔" انہوں نے افسردگی سے اسے بتایا۔

"کیا...... مطلب......؟" ردا نے حیرت سے پوچھا۔

"شمیلہ نے حق مہر میں یہ گھر لکھوا لیا ہے۔" خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر نم آنکھوں سے اسے بتایا۔

"کک...... کیا......؟" ردا نے بری طرح چونک کر کہا۔

"ہاں...... اور اب وہ ہم سے کیا سلوک کرتی ہے معلوم نہیں۔" خدیجہ بیگم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تو ردا پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

روحیل بار بار ردا کا نمبر ملا رہا تھا مگر وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ روحیل نے لینڈ لائن نمبر ملایا تو کافی زیادہ بیلز کے بعد شمیلہ نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو...... میں روحیل بات کر رہا ہوں۔ مجھے ردا سے بات کرنی ہے۔" روحیل نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔

"کیوں اور کس ناتے سے؟" شمیلہ نے خفگی سے پوچھا۔

"میں اس کا شوہر ہوں۔" روحیل نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا...... بہت جلدی آپ کو یاد آ گیا کہ آپ اس کے شوہر ہیں۔" شمیلہ نے تلخی سے کہا۔

"پلیز...... میں آپ سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا...... آپ ردا کو بلائیں......" روحیل غصے سے بولا۔

"اس کا آپ سے اب کوئی تعلق نہیں...... اگر آپ ردا کو خود طلاق بھجوا دیتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم کورٹ کے ذریعے خود لے لیں گے...... اب دوبارہ کونٹیکٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔" شمیلہ نے غصے سے کہہ کر فون بند کر دیا اور پاؤں پٹختے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی۔

روحیل کو اپنی بہت زیادہ انسلٹ محسوس ہوئی۔

ردا کافی دیر بعد جب اپنے کمرے میں آئی، اس نے اپنے موبائل پر روحیل کی کافی مس کالز دیکھیں تو بری طرح چونک گئی۔

"روحیل کی اتنی زیادہ مس کالز......؟" اس نے حیرت سے سوچا اور اس کا نمبر ڈائل کیا مگر روحیل نے پہلی ہی بیل پر اس کی کال ریجیکٹ کر دی۔ وہ پریشان ہوگئی اور دوبارہ فون کرنے لگی۔ اب کے اس نے موبائل ہی آف کر دیا تھا۔

"اس کا کیا مطلب ہے، وہ پہلے خود ہی کال کر رہا تھا اور اب خود ہی کال ریجیکٹ کر رہا ہے۔" وہ پریشان ہو کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

روحیل نے فضیلت آپا کو فون کر کے ساری بات تفصیل سے بتائی اور شمیلہ نے اسے جو کچھ کہا تھا وہ سب سن کر وہ بھی پریشان ہوگئی۔

"روحیل تم نے اچھا کیا جو مجھے ساری بات بتا دی ہے، تم ابھی کوئی قدم نہ اٹھانا میں سوچتی ہوں ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔" فضیلت نے اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے...... لیکن اب حالات ہم نہیں وہ لوگ بگاڑ رہے ہیں۔" روحیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی پھر ایک دم اس نے خدیجہ بیگم کا نمبر ملایا۔

"السلام علیکم...... میں روحیل کی آپا فضیلت بات کر رہی ہوں۔"

"اوہ آپ......؟" خدیجہ بیگم نے چونک کر جواب دیا۔

"ہاں...... میں...... دراصل آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"جی، جی فرمائیں۔" خدیجہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

"میں اور آپا...... روحیل کو بہت قائل کر رہے ہیں کہ وہ ردا کو گھر لے آئے اور اس نے ردا سے کونٹیکٹ بھی کرنا چاہا...... ردا سے تو بات نہیں ہو سکی...... مگر......" فضیلت کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

"مگر...... کیا......؟" خدیجہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

"مگر کسی نے اس سے یہ کہا ہے کہ آپ لوگ صرف طلاق ہی چاہتے ہیں، سمجھوتا نہیں۔" فضیلت نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

"کس نے یہ بات کہی ہے؟" انہوں نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کے گھر میں کون ایسا ہے جو ردا کی خوشی نہیں چاہتا؟" فضیلت نے معنی خیز انداز میں کہا تو خدیجہ بیگم نے گہری سانس لی۔

"دیکھیے بہن...... آپ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں' دونوں کی زندگیوں کو انا اور ضد کی بھینٹ نہ چڑھائیں تو اچھا ہے۔" فضیلت نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کا گھر بسا رہے۔ میں تمام صورتِ حال دیکھ کر آپ سے رابطہ کرتی ہوں۔" خدیجہ بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"شکریہ...... آپ میری بات سمجھ گئیں۔ ہماری تو کوشش اور دعا ہے کہ دونوں کا گھر ٹوٹنے سے بچا رہے۔" فضیلت نے کہا تو خدیجہ بیگم نے اس کے جواب میں جلدی سے آمین کہا اور پُر امید انداز میں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور فون آف کر کے خدیجہ بیگم ردا کے کمرے میں آگئیں۔

"کیا بات ہے مما، آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟" ردا نے فکر مند ہو کر پوچھا تو انہوں نے اسے فضیلت کے ساتھ کی گئی تمام گفتگو بتا دی۔

"کیا شمیلہ بھابی نے خود سے ہی طلاق کی بات کہہ دی؟"

"ہاں...... بیٹا اب تو اسے موقع ملا ہے کہ اب وہ ہم سے کھُل کر دشمنی کرے۔ فہام کی زندگی اسے جو مواقع نہیں ملے تھے اب وہ حاتم کی بیوی کر ان سے بھر پور فائدے اٹھانا چاہتی ہے۔" خدیجہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیوں کر رہی ہیں...... میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔" نے جھنجلا کر کہا۔

"حسد...... بیٹا حسد سے بڑھ کر دشمنی کی وجہ اور کوئی نہیں...... تم فہام کی لاڈلی تھیں۔ اس اسے ہمیشہ کھٹکتی تھیں۔ فہام اس سے چھن گیا ہے وہ تمہیں بھی بے آسرا کرنا چاہتی ہے۔ ان حالا میں اب ضروری ہو گیا ہے کہ تم اور روحیل کہیں آپس میں بدگمانیاں دور کر لو۔ گھر میں تو یہ ممکن نہیں شمیلہ نیا فساد کھڑا کر دے گی۔" خدیجہ بیگم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں...... اور...... روحیل؟" ردا نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں...... بیٹا میں تمہاری ماں جی کو فون کے ان سے ساری بات طے کرتی ہوں۔ بیٹا اس میں اب تمہارا کوئی مستقبل نہیں۔ اپنے شوہر کے گھر آباد کرنے کی کوشش کرو۔"

خدیجہ بیگم نے اسے نرمی سے سمجھایا تو ردا بھر کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم فجر کی دعاؤں اور وظائف فارغ ہی ہوئی تھیں کہ حاتم ان کے کمرے میں آیا۔

"کیا بات ہے...... تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟" انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مما میں نے روحیل کی ماں جی سے کہا تھا روحیل، ردا اور ہم سے معافی مانگے تو پھر ہم ردا کو کے ساتھ بھیجیں گے مگر اس کی طرف سے کوئی رسپا نہیں آیا، اس کا مطلب ہے روحیل صلح نہیں چاہتا۔"

حاتم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو...... پھر؟" خدیجہ بیگم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں آج ردا کی ڈائیورس کے سلسلے میں وکیل سے بات کرنے لگا ہوں۔" حاتم نے سنجیدگی سے بتایا۔

"تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم اس کی طلاق کی باتیں کرو، میں ابھی زندہ ہوں، تم نے اپنی زندگی کا وہ فیصلہ کیا جو تم نے بہتر سمجھا اور میں اپنی ردا کے لیے وہ فیصلہ کروں گی جو میں بہتر سمجھوں گی۔" انہوں نے اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ ردا کو روحیل کے ساتھ بھیجنا چاہتی ہیں؟" حاتم نے ابرو چڑھائی۔

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" خدیجہ بیگم نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن...... یہ یاد رکھیے گا کہ میں اسے اس گھر میں تب تک برداشت نہیں کروں گا جب تک وہ معافی نہیں مانگ لیتا...... ورنہ......" حاتم غصے سے بولا۔

"ورنہ کیا......؟" خدیجہ بیگم نے بھی غصے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اگر وہ مجھے اس گھر میں نظر آیا تو پھر یہاں سے ایک نہیں دو جنازے اٹھیں گے۔" حاتم غصے سے کہہ کر باہر جانے لگا۔

"حاتم اتنے ظالم مت بنو۔" وہ غصے سے چلائیں مگر حاتم کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تو خدیجہ بیگم پریشان ہو گئیں اور موبائل اٹھا کر روحیل کی ماں جی سے ساری بات کی اور انہیں راضی کیا کہ وہ ایک بار روحیل اور ردا کی ملاقات کروا دیں۔ ماں جی نے بھر پور تعاون کا یقین دلایا اور انہیں تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ ماں جی کے کہنے پر فضیلت نے روحیل کو فون کیا اور اسے ردا سے ملنے کو کہا تو وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"ہرگز نہیں...... میں نے پہلے بھی اسے آپ لوگوں کے کہنے پر فون کیا تھا مگر نتیجہ کیا نکلا...... اگر وہ لوگ طلاق لینے پر تلے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" روحیل غصے سے بولا۔

"بیٹا...... طلاق کی بات ان کی بہو نے کی ہے اور وہ ردا سے بدلہ لینا چاہتی ہے جبکہ ردا کی مما مفاہمت چاہتی ہیں۔ انہوں نے خود تمہاری ماں جی کو فون کیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم دونوں آج شام کہیں باہر مل کر آپس کی غلط فہمیاں اور رنجشیں دور کر لو، تمہاری ماں جی کا بھی یہی حکم ہے۔ بیٹا قسمت بار بار یوں مواقع نہیں دیتی۔" فضیلت نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو روحیل خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے...... میں اب آخری بار اسے فون کروں گا اگر اب اس نے میرے ساتھ کوئی گیم کھیلنے کی کوشش کی تو پھر میں جو فیصلہ کروں گا وہ آپ کو ماننا ہوگا۔" روحیل نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے...... تم اسے فون تو کرو۔" فضیلت نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ردا اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹی تھی جب اس کے موبائل پر روحیل کا فون آنے لگا۔ وہ موبائل پر اس کی کال دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

خدیجہ بیگم قدرے پریشان اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو ردا کی طرف چونک کر دیکھنے لگیں۔

"مما...... روحیل کا فون آرہا ہے۔" ردا نے گھبرا کر انہیں بتایا۔

"بات کرو...... سنو وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔" خدیجہ بیگم نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تو ردا نے موبائل کان سے لگا لیا۔

"جی، ہیلو......"

"ماں جی نے آج مجھے تم سے ملنے کو کہا

ہے...... بتاؤ کب اور کہاں آسکتی ہو؟'' روحیل نے قدرے خشک لہجے میں اس سے پوچھا۔

''م...... م...... میں آؤں؟'' ردا نے گھبرا کر کہا تو خدیجہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اجازت دے دی۔

''آ...... آپ بتادیں؟'' ردا نے رک رک کر کہا۔

''ٹھیک ہے...... شام پانچ بجے اسی چائنیز ریسٹورنٹ میں آجانا جہاں ہم ڈنر کرنے جایا کرتے تھے۔'' روحیل نے جلدی سے کہا۔

''اوکے......'' ردا نے کہا اور ماں کی طرف پریشانی سے دیکھنے لگی۔ فون بند ہوچکا تھا۔

''کیا روحیل نے تمہیں کہیں ملاقات کرنے کے لیے بلایا ہے؟ یہ روحیل کی ماں جی کا ہی آئیڈیا ہوگا کہ تم اور روحیل آپس میں مل کر ایک دوسرے کی غلط فہمیاں دور کردو۔'' خدیجہ بیگم نے ایک گہری سانس لے کر اسے بتایا۔

''مگر...... مما......؟'' ردا نے گھبرا کر کہا۔

''بیٹا...... اب یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کیونکہ اب تمہارے گھر کو آباد نہیں...... برباد کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ ان حالات میں ہمارے پاس کوئی اور آپشن نہیں۔ جب اپنے خون کے رشتے خلاف ہوجائیں تو دوسروں پر کیا بھروسا۔'' خدیجہ بیگم نے آہ بھر کر کہا تو ردا اُن کی بات سن کر خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

''حاتم خدا کے لیے اتنی ٹینشن مت لیں...... میرا سب کچھ آپ ہیں...... میں فہام کو کھو چکی ہوں...... میکے کے در بھی بند سمجھیں آپ کو کچھ ہوا...... میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔'' شمیلہ...... انتہائی محبت اور اپنائیت سے حاتم سے کہہ رہی تھی جو دفتر سے اچانک گھر واپس آگیا تھا کہ صبح سے اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ دراصل بزنس کی ٹینشن سے حاتم کا بی پی ہائی ہونے لگا تو عاصم نے بھائی کو گھر بھیج دیا تھا۔

''کیا آپ مجھ سے اتنی محبت کرنے لگی'' حاتم نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں...... بہت زیادہ...... ڈوبتے ا جب تنکے کا سہارا ملتا ہے تو وہ ہی اس کا سب جاتا ہے۔ اس کی طاقت بھی...... اور اس کی بھی۔'' شمیلہ نے فرطِ جذبات سے کہا تو حا کے اس احساس سے مسرور ہونے لگا اور ا چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

''ٹھیک ہے...... ابھی آپ ریسٹ کری میں آپ کے لیے فریش جوس لے کر آتی ہو'' شمیلہ نے مسکرا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی کے چہرے پر بھی اطمینان سا پھیلنے لگا۔ جوس جگ اور دو گلاس ٹرے میں لیے وہ کچن سے با چونک گئی۔ ردا استری شدہ سادہ سا سوٹ پہنے لمبے بالوں کی چٹیا بنائے بیگ کندھے پر لٹکائے سر پر اوڑھے خدیجہ بیگم کے کمرے کی طرف گئی تو ش ماتھا ٹھنکا...... وہ ٹرے وہیں ٹیبل پر رکھ کر آ آہستہ چلتی ہوئی خدیجہ بیگم کے کمرے کے پاس آئی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اُن کی باتیں لگی۔ خدیجہ بیگم اسے ہدایات دے رہی تھیں۔

''میں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہے وہ ریسٹو کے باہر گاڑی میں ہی تمہارا انتظار کرے گا...... مت...... اور کھل کر اس سے ساری بات کر'' خدیجہ بیگم نے کہا تو شمیلہ کے چہرے پر حیرت تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''مما مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ردا نے کر کہا۔

''ڈر...... کس بات کا...... تم اپنے شوہر تو ملنے جارہی ہو کسی اور سے نہیں۔'' انھوں نے کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو ش کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔

"اوہ...... تو یہ روحیل سے ملنے جارہی ہے میں نے تو روحیل سے کہا تھا کہ ردا کو طلاق چاہیے اور یہ ماں، بیٹی اس سے مل کر تعلق بڑھانا چاہتی ہیں...... اگر دونوں کی صلح ہوگئی تو ردا کو طلاق دلا کر ذلیل کرنے کی میری ساری پلاننگ فیل ہوجائے گی۔"
غصے سے شمیلہ کے نتھنے پھولنے لگے۔

"ممّا...... اگر روحیل نے کوئی گڑبڑ کی تو......؟" ردا نے گھبرا کر پوچھا۔

"بیٹا...... اگر اسے غصہ آبھی جائے تو تم خاموشی سے سنتی رہنا۔ جب لڑکی کی نیت گھر بسانے کی ہوتی ہے تو اسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم جلد از جلد اپنے گھر چلی جاؤ...... جاؤ بیٹا، میں تمہارے لیے دعا کرتی رہوں گی۔" خدیجہ بیگم نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا پھر ردا جیسے ہی کمرے سے باہر نکلنے لگی شمیلہ جلدی سے وہاں سے چلی گئی اور ٹرے اٹھا کر اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ریسٹورنٹ کا نام وہ سُن چکی تھی۔

شمیلہ نے گلاس بھر کر جوس حاتم کو دیا پھر خود بھی پینے لگی۔ حاتم کا مطمئن چہرہ دیکھ کر وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"حاتم کیوں ناں کچھ دیر کے لیے ہم باہر چلیں...... آؤٹنگ بھی ہوجائے گی اور آپ فریش بھی ہوجائیں گے۔" اپنی بات کہہ کر شمیلہ نے اس کی طرف بغور دیکھا۔

"نہیں...... نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔" حاتم نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں، چلیے ناں پلیز۔" شمیلہ نے پھر اصرار کیا۔

"او کے...... آپ بہت اصرار کررہی ہیں تو ٹھیک ہے۔" حاتم نے مسکرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں ابھی چینج کر کے آتی ہوں۔" شمیلہ نے مسکرا کر کہا اور وارڈ روب سے ایک ڈریس نکال کر واش روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

شام گہری ہورہی تھی ردا ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں ٹیبل پر بیٹھی روحیل کا شدت سے انتظار کررہی تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل دروازے پر لگی تھیں۔ روحیل نے پانچ بجے آنے کو کہا تھا مگر اب چھ بج رہے تھے اور اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اس نے ایک دوبار روحیل کو کال بھی کی مگر اس نے اس کی کال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ردا انتہائی پریشان اپنی سوچ میں گم تھی کہ وہ کیا کرے، بہت سوچنے کے بعد اس نے روحیل کو موبائل پر میسج لکھا اور پھر انتظار کرنے لگی۔

روحیل ایک انتہائی مصروف سڑک پر ٹریفک جام میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ سڑک پر ایکسیڈنٹ ہونے کی وجہ سے ٹریفک بری طرح ڈسٹرب تھا۔ کوئی آگے گاڑی نکالتا تو کوئی پیچھے سے۔ روحیل بری طرح جھنجلا گیا تھا۔ ایسے میں ردا کی کال لینا بھی اس کے لیے مشکل ہورہا تھا جیسے ہی ردا کا میسج آیا تو اس نے غصے سے بغیر پڑھے ہی موبائل آف کردیا اور ٹریفک سے گاڑی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

شمیلہ گاڑی ڈرائیو کررہی تھی اور حاتم اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ شمیلہ بہت میٹھے انداز میں حاتم کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

"حاتم...... پلیز آپ اس وقت کوئی ٹینشن نہ لیں، اپنے مائنڈ کو ریلیکس رکھیں۔ میرے لیے آپ کی زندگی زیادہ اہم ہے، بزنس نہیں۔" شمیلہ نے مسکرا کر کہا۔

"کوشش تو کررہا ہوں مگر وہ ٹینشن بھی تو اپنی جگہ ایک فیکٹ ہے ناں۔" حاتم نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"فیکٹس تو اور بھی بہت ہیں، کیا آپ ہر ایک

کی ٹینشن لیں گے۔'' شمیلہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو حاتم نے چونک کراس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' حاتم نے حیرت سے پوچھا۔

''ردا گھر بیٹھی ہے، روحیل نے اس کی لائف کو کتنا miserable بنا دیا ہے۔'' شمیلہ نے مزید کچھ کہنا چاہا تو حاتم نے اسے روک دیا۔

''پلیز اس وقت اُن کا ذکر مت کریں، میں پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں۔'' حاتم نے جھنجلا کر کہا تو شمیلہ نے گہری سانس لی اور خاموش ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے گاڑی چائنیز ریسٹورنٹ کے سامنے روکی تو حاتم نے چونک کراس سے وجہ پوچھی۔

''میں آپ کو یہاں ریلیکس کرنے کے لیے لائی ہوں، چلیے اندر کچھ کھاتے ہیں اور اچھی، اچھی باتیں کرتے ہیں۔'' شمیلہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میرا موڈ نہیں......'' حاتم نے ناگواری سے کہا۔

''چلیں ناں پلیز۔'' شمیلہ نے ٹھنٹھناتے ہوئے کہا تو حاتم مجبوراً گاڑی سے اترا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہوگیا۔ شمیلہ نے اندر جا کر متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا تو اسے ردا ایک کونے میں بیٹھی دکھائی دی۔

''ردا یہاں کیا کر رہی ہے؟'' شمیلہ نے قدرے خفگی سے حاتم سے سرگوشی کی تو حاتم کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

''یہ...... یہاں کیا کر رہی ہے؟'' حاتم غصے سے بڑبڑایا۔

''لگتا ہے کسی کا انتظار کر رہی ہے۔'' شمیلہ نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھما کر کہا۔

''انتظار...... کس کا......؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''یہ تو آپ خالہ جان سے ہی پوچھیے گا جو بیٹی کے ہر عیب پر پردے ڈالتی ہیں۔'' شمیلہ نے قدرے چالاکی سے کہا۔

''ان سے کیوں، ردا سے ہی کیوں نہ پوچھوں......؟'' حاتم قدرے غصے میں جذباتی میں ردا کی طرف بڑھنے لگا تو شمیلہ نے جلدی اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

''یہاں تماشامت بنائیں، ابھی گھر چلیے۔'' زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔

ردا ان دونوں کو دیکھ کر بری طرح گھبر... تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے ماں کا نمبر... اور انہیں ساری بات بتائی۔

''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا...... مگر شمیلہ... حاتم وہاں کیسے پہنچ گئے......؟'' خدیجہ بیگم نے ج... سے کہا۔

''معلوم نہیں...... مگر حاتم بھائی مجھے بہت... سے دیکھ رہے تھے۔ مما مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ردا نے قدرے گھبراتے ہوئے کہا۔

''روحیل کہاں ہے؟'' خدیجہ بیگم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہ ابھی تک نہیں آئے...... میں انہی کا ان... کر رہی تھی کہ یہ لوگ آگئے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔ یقیناً اسے شمیلہ ہی و... لے کر گئی ہوگی۔ وہ بہت حاسد عورت ہے۔ حس... وجہ سے سب کچھ کر سکتی ہے، تم ایسا کرو فوراً واپس آجاؤ۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اور...... روحیل......؟'' ردا نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اس کی ماں جی کو فون کر کے سمجھا دو... گی، تم کوشش کرو کہ حاتم سے پہلے گھر آجاؤ، ور... بہت مسئلہ ہو جائے گا۔'' خدیجہ نے اس سے کہا تو... موبائل آف کر کے جلدی سے باہر چلی گئی اور گا... میں بیٹھ کر جلدی سے ڈرائیور کو چلنے کو کہا۔

☆☆☆

حاتم انتہائی غصے میں ریش ڈرائیونگ کر... تھا۔ شمیلہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''ہمیں دیکھ کر ردا یوں گھبرا گئی تھی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ نہ جانے کس سے ملنے آئی تھی۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ روحیل اس پر ٹھیک ہی شک کرتا تھا۔ میاں، بیوی میں جو برائی اور غلطی ہوتی ہے وہ فوراً ایک دوسرے کو پتا چل جاتی ہے۔'' شمیلہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو حاتم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں اس کا فرحان کے ساتھ بھی کوئی چکر ہی ہوگا ورنہ صرف رشتے کے انکار پر کون کسی کو اتنا تنگ کرتا ہے، توقیر کے ساتھ افیئر تو سب کے سامنے آگیا مگر اندرونِ خانہ وہ کیا کچھ کرتی رہی کسی کو کیا خبر...... آج تو آپ نے خود ہی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔'' شمیلہ نے اسے اچھی طرح بھڑکاتے ہوئے کہا۔

''میں کسی طور اب نظرانداز نہیں کر سکتا۔'' حاتم غصے سے چلّاتے ہوئے بولا۔

''آپ خالہ جان سے تو پوچھیں کہ اس وقت ردا کہاں ہے آپ کو پتا چل جائے گا کہ کون کس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔'' شمیلہ نے جان بوجھ کر اسے پمپ کرتے ہوئے کہا تو حاتم نے فوراً اپنا موبائل نکال کر ماں کا نمبر ملایا۔

''وہ...... وہ یہیں ہے۔'' خدیجہ بیگم نے گھبرا کر کہا تو حاتم نے غصے سے موبائل آف کر دیا۔

''یقیناً انہوں نے کہا ہوگا کہ وہ گھر پر ہی ہے یا پھر گول مول جواب دیا ہوگا۔ حاتم...... ردا کو خراب کرنے میں خالہ جان برابر کی شریک ہیں۔ آج تو ثابت ہوگیا۔'' شمیلہ نے غصے سے کہا تو حاتم کو اور بھی غصہ آنے لگا۔

☆☆☆

روحیل انتہائی تیزی سے ریسٹورنٹ میں داخل ہوا۔ نظریں دوڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا اسے ردا کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔ اس



گمشدہ شہزادی

سالگرہ نمبر میں آنٹی انجم نے تمام بہنوں کو اُن کی خصوصیات کے حوالے سے شہزادیوں کا ٹائٹل دیا تو ہم نے اپنے آپ کو گمشدہ شہزادی کا ٹائٹل دے ڈالا چونکہ کچھ عرصے سے پاکیزہ سے آؤٹ تھے اس لیے بہنوں کو ہم شاید یاد نہیں رہے، چلیں ہم خود ہی یاد دلا دیں جی کہ ہم وہی شہلا نواز فرام لاہور ہیں جنہوں نے ہمارا کراچی کے عنوان سے مختصر سا سفرنامہ لکھا تھا اور اپنے آپ کو ابنِ انشا کی بھتیجی سمجھتے رہے۔ پاکیزہ سے ہمارا تعلق 13 سال پرانا ہے پاکیزہ پڑھتے تو تھے مگر ایک ڈیڑھ برس تبصرہ نہ لکھا مگر کوئی بات نہیں جی اب ہم...... اپنے قلم کی جولانیوں سمیت واپس آگئے ہیں کس کس بہن کو ہماری کمی محسوس ہوئی تھی بتایئے گا ضرور اور ہاں لگ رہے ہیں نہ ہم شہزادی یہ بھی ضرور بتایئے گا۔

تمام پاکیزہ بہنوں کو ہماری جانب سے سلام قبول ہو۔

از: شہلا نواز، لاہور

نے ردا کا نمبر ملایا مگر وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں تھی۔ ڈرائیور نہایت تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا چلا جا رہا تھا خوف کے مارے ردا کا برا حال ہو رہا تھا۔ بیگ میں پڑا اس کا موبائل بجا اس نے نمبر دیکھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روحیل کو کیا کہے، روحیل اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر اس کی کال ریسیو ہی نہیں کی۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم انتہائی پریشانی میں لاؤنج میں چکر لگا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ دعائیں کر رہی تھیں۔ حاتم اور شمیلہ قدرے تیزی سے لاؤنج میں داخل ہوئے تو خدیجہ بیگم نے قدرے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

"مما...... ردا کہاں ہے؟" حاتم نے غصے سے ان کے قریب آ کر پوچھا۔

"نہیں ہے...... تمہیں اس سے کیا......؟" خدیجہ بیگم نے بوکھلا کر خفگی سے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں وہ گھر پر نہیں ہے مگر آپ ہیں کہ اس کے کرتوتوں پر پردے ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔" حاتم انتہائی غصے سے چلاتے ہوئے بولا۔

"یہ...... تم...... کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو وہ جہاں بھی گئی ہے مجھ سے پوچھ کر گئی ہے۔" خدیجہ بیگم نے غصے سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تو شمیلہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

پورچ میں گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور ردا گھبرائی ہوئی تیز تیز چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ شمیلہ اور حاتم کو دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"تم...... کس سے مل کر آ رہی ہو......؟" حاتم نے اس کے قریب آ کر انتہائی غصے سے پوچھا۔

"ک...... ک...... کسی سے نہیں۔" ردا نے گھبرا کر جواب دیا۔

"جھوٹی...... دھوکے باز...... مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔" حاتم نے اسے زور سے تھپڑ لگاتے ہوئے کہا تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ سب سکتے میں گئے۔ ردا نے اپنے گال پر ہاتھ رکھا اور اس آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حاتم نے غصے سے کے بازو کو جھنجوڑا۔

"مجھے سچ، سچ بتاؤ کہ تم کس سے ملنے گئی تھیں ورنہ میں ابھی اور اسی وقت تمہیں زندہ زمین میں دوں گا۔" حاتم نے انتہائی غصے سے اسے جھنجوڑ ہوئے پوچھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شمیلہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔

خدیجہ بیگم انتہائی طیش میں آ گئیں اور آ بڑھ کر حاتم کو پرے کیا۔

"پیچھے ہٹو...... آج تک کسی نے میری بچی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تم نے میرے سامنے اسے تھپڑ ہے۔ تمہاری اتنی جرأت......"

"مما...... آپ بیچ میں مت بولیں۔ میں آ اس سے پوچھ کر رہوں گا کہ یہ کس سے ملنے ریسٹورنٹ گئی تھی۔" حاتم غصے سے دہاڑتے ہوئے بولا۔

"ر...... روحیل سے۔" ردا نے گھبرا کر ہکلا ہوئے جواب دیا تو دونوں بھائی بری طرح چونکے۔

"بے غیرت...... گھٹیا...... اس شخص سے گئی تھی جس نے تمہیں سرِعام ذلیل و رسوا کیا...... بے حیا...... اپنی نہیں تو ہماری عزت کا کچھ خیال ہوتا۔" حاتم نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے...... مما نے کہا تھا۔" ردا نے سسکی بھر جواب دیا۔

"ہاں...... میں نے ہی اسے روحیل سے مل حالات ٹھیک کرنے کو کہا تھا...... رہی عزت کی بات تم اسے کون سی عزت دے رہے ہو۔" خدیجہ بیگم غصے سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"عزت...... عزت...... عزت...... کیا عزت کے قابل رہی ہے، میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" حاتم نے غصے سے کہا اور بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں گیا اور جلدی سے دراز سے ریوالور نکال کر باہر لایا اور جیسے ہی ردا پر گولی چلانے لگا تو عاصم نے فوری آگے بڑھ کر ریوالور کا رخ چھت کی طرف کر دیا۔ گولی چل گئی ردا سہم کر ماں کے ساتھ لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"حاتم بھائی...... یہ کیا حماقت ہے اگر مارنا ہے تو اس گھٹیا شخص کو ماریں جس کی وجہ سے اس گھر میں آگ لگی ہے۔" عاصم غصے سے اسے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے بولا۔

"میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا اور اسے بھی۔" وہ ردا کی طرف دیکھ کر غصے سے دانت کچکچا کر بولا۔

"پلیز شمیلہ بھابی...... آپ انہیں کمرے میں لے جائیں...... یہ بہت غصے میں ہیں۔"

"چلیے...... حاتم اندر کمرے میں چلیے۔ جن لوگوں کو اپنی عزت...... بے عزتی کا خود ہی خیال نہیں...... آپ انہیں کیا احساس دلانا چاہتے ہیں۔" شمیلہ نے قدرے نخوت سے ردا اور خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا اور عاصم کے ہمراہ حاتم کو زبردستی اس کے کمرے میں لے گئی۔

زرینہ بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھی...... ردا ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مما...... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے، میں تو تمہارے لیے دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں۔ خدا جانے تمہاری آزمائش کیوں ختم نہیں ہو رہی۔" خدیجہ بیگم نے روتے ہوئے کہا اور اسے اپنے ساتھ لگا کر چپ کرانے لگیں۔

"چلو بیٹا...... اپنے کمرے میں۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اسے کمرے میں لے گئیں۔

ردا کے بیگ میں پڑا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ روحیل انتہائی غصے میں اسے کال کر رہا تھا مگر ردا خود اتنی زیادہ ڈسٹرب تھی کہ اسے اپنے آپ کا ہوش تھا نہ ہی موبائل کا...... خدیجہ نے اسے بیڈ پر بٹھایا اور اس کی گیلی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگیں۔

"آج حاتم نے تم پر پہلی بار ہاتھ اٹھایا ہے، میرے دل پر جو گزر رہی ہے میں بتا نہیں سکتی مگر جس کے کہنے پر وہ یہ سب کر رہا ہے، دیکھنا اللہ اس سے ضرور حساب لے گا۔" خدیجہ بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

"اللہ...... وہ بھی تو ان کے ساتھ ہے۔ شاید میری اس ذلت پر وہ......" ردا نے روتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"نہیں بیٹا...... ایسے نہیں کہتے...... پریشانی کے عالم میں بھی کفر کا کوئی کلمہ نہیں بولنا چاہیے۔" خدیجہ بیگم نے گھبراہٹ سے کہا۔

"مما...... اللہ نے کہاں میرا ساتھ دیا...... کیا میں اتنی ہی گناہ گار تھی، میں نے ساری ساری رات رو رو کر اس سے دعائیں مانگیں مگر مجھے پہلے سے زیادہ ذلت اور رسوائی ملی۔" ردا نے ہچکی بھرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... وہ آزمائش میں انسان کا صبر دیکھتا ہے اور جب انسان کے صبر کی حد ٹوٹ جاتی ہے تو پھر وہ اپنا کرم کرتا ہے۔ وہ بھی تمہارا صبر ہی دیکھ رہا ہے۔" خدیجہ بیگم نے اسے محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"آج میرا صبر ٹوٹ گیا ہے مما......" ردا نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... وہ اپنے معصوم اور بے گناہ بندے کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی بے گناہ پاک بی بی پر کسی نے تہمت لگائی تو اللہ رب العزت نے خود اس کی عصمت کی گواہی دلوائی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس کا کوئی نیک انسان تہمت اور

بہتان کی ذلت لے کر دنیا سے چلا جائے اگر وہ آزماتا ہے تو بچاتا بھی وہی ہے، تم پُر امید رہو۔'' خدیجہ بیگم نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں...... کیا ہونا ہے؟'' ردا نے انتہائی مایوسی سے جواب دیا۔ جبھی خدیجہ بیگم کا دھیان بیگ میں بجنے والے موبائل کی طرف گیا۔ ردا نے موبائل نکالا تو اس پر روحیل کی کال آرہی تھی۔

''مما...... روحیل کی کال ہے، اب میں اسے کیا کہوں؟'' ردا نے گھبرا کر ماں سے پوچھا۔

''بات تو کرو...... دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے اسے حوصلہ دیا تو اس نے موبائل آن کر کے آہستہ آواز میں ہیلو کہا۔

''جھوٹی...... دھوکے باز...... مکار مجھے ہر بار اُلو بنانے کی کوشش کرتی ہو اگر وہاں نہیں آنا تھا تو مجھے بلانے کی کیا ضرورت تھی...... تم اور تمہاری ماں...... ہمارے ساتھ ڈرامے کرنے کی کوشش کر رہی ہو...... یہ آخری بار تھی...... جو میں ماں جی کے کہنے پر تم سے ملنے آیا...... ورنہ تمہاری اتنی اوقات ہی نہیں کہ میں تم پر ٹرسٹ کرتا، تم انتہائی بے اعتبار، جھوٹی اور دغا باز ہو بس میرے اور تمہارے تعلقات ختم...... آئندہ نہ میں تم سے ملنے آؤں گا اور نہ ہی لینے...... تم جیسی گھٹیا عورت کی مجھے کوئی ضرورت نہیں...... I hate you'' روحیل نے غصے سے کہہ کر فون آف کر دیا۔ ردا اس کی باتیں سن کر سکتے میں آگئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''روحیل نے کیا کہا ہے......؟'' خدیجہ بیگم نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں......'' اس نے آہ بھر کر آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''پھر تم اتنی خاموش کیوں ہو؟'' انہوں نے گھبرا کر اصرار کر کے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... پلیز آپ اپنے کمرے میں جائیں۔ میں کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چا ہوں۔'' ردا نے گلوگیر لہجے میں کہا تو انہوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور کمرے سے نکل آئیں۔

☆☆☆

رشنا نے سارا دن ملازمہ کے ساتھ مل کر گھر خوب صفائی ستھرائی کی تھی۔ نجمہ بار بار اس سے پوچھتیں تو وہ مسکرا کر ٹال دیتی اور اس نے خا اہتمام سے کھانے بھی پکوائے تھے۔ اب وہ تھکی ہا لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی کسی کی منتظر تھی اور بار بار کلاک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نجمہ اپنے کمرے باہر نکل کر آئیں تو اسے دیکھ کر چونک گئیں۔

''بیٹا...... اتنی رات ہو گئی، تم سو کیوں نہ رہیں......؟ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''بس یونہی......'' رشنا نے بہانہ بناتے ہو کہا۔ اسی لمحے ڈور بیل کی آواز آئی تو نجمہ بری طر چونک گئیں۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' نجمہ حیرت سے بڑبڑائیں۔

''چلیں...... باہر چل کر دیکھتے ہیں۔'' رشنا مطمئن سے لہجے میں جواب دیا۔ وہ دونوں باہر آ تو دیکھا سامنے توقیر کھڑا تھا۔ نجمہ بیگم خوش ہو کر آ بڑھیں اور اسے گلے سے لگا کر پیار کرنے لگیں۔

☆☆☆

''حاتم بھائی......! آج آپ اتنے ہائپر کیو ہو گئے تھے؟ جب آپ نے ردا کو مارا تو پہلی میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔'' دونوں لاؤنج میں بیٹھے نیوز سن رہے تھے جبھی عاصم نے حاتم کے قریب آ کر افسردگی سے کہا۔

''ہاں...... افسوس تو مجھے بھی اب ہو رہا ہے اگر فہام بھائی زندہ ہوتے تو شاید میرا ہاتھ ہی تو ڈالتے......'' حاتم نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''فہام زندہ ہوتے تو وہ خود بھی یہی کرتے

آپ نے کیا...... وہ بھی آپ کی طرح عزت دار اور غیرت مند تھے۔ جب آپ لوگ روحیل سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہ رہے تو پھر ردا اس سے ملنے کیوں گئی، آپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں؟'' شمیلہ نے تنک کر کہا۔

''اسی بات پر تو مجھے زیادہ غصہ آیا۔'' حاتم غصے سے بھڑک کر بولا۔

''حاتم بھائی وہ کسی غیر سے نہیں اپنے شوہر سے ملنے گئی تھی اس میں اتنا ہائپر ہونے کی کیا ضرورت تھی' آج آپ نے ردا کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔'' عاصم نے اسے اور شمیلہ کو خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حاتم شرمندگی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

''حاتم آپ اطمینان رکھیے اور ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں آپ نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا، کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسا ہی کرتا۔'' شمیلہ نے اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہ جانے کیوں...... میرے دل پر بوجھ سا بڑھنے لگا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ ابھی جا کر ردا سے معافی مانگ لوں۔'' حاتم نے ڈھیلے سے انداز میں اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں...... اگر ابھی معافی مانگی تو اسے اور شہ ملے گی کل کو وہ روحیل کا ہاتھ پکڑ کر لے آئی تو کیا آپ اسے برداشت کر سکیں گے؟'' شمیلہ نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بالکل نہیں۔'' حاتم جلدی سے بولا۔

''تو پھر ریلیکس کریں، مطمئن رہیں، آپ نے کچھ غلط نہیں کیا...... میں ابھی آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' شمیلہ یہ کہہ کر کچن کی طرف چل دی۔

☆☆☆

رات کافی زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ خدیجہ بیگم اپنے کمرے میں جانماز پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ سسکیاں بھر رہی تھیں۔

''یا اللہ...... مجھ سے یا میری بیٹی سے ایسی کیا خطا ہو گئی ہے کہ تو اسے آزمائش سے نکال ہی نہیں رہا...... اس کی آزمائشیں بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ پہلے ہر کوئی اس کے نصیب پر رشک کرتا تھا اور آج وہ سب سے زیادہ بدنصیب ہو گئی ہے...... اتنی محبتوں کے بعد اتنی نفرتیں...... برداشت کرنا بہت مشکل ہے اپنوں کی نفرت کے ساتھ ساتھ ذلت اور رسوائی بھی اس کے مقدر میں لکھ دی...... یا اللہ! وہ معصوم ہے، بے گناہ ہے، اسے معاف فرما دے اور ساری دنیا کے سامنے اسے تمام بہتانوں اور الزامات سے بری کر دے۔ اسے پہلی جیسی عزت اور محبت عطا کر۔'' خدیجہ بیگم دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

☆☆☆

ردا شدید ذہنی اذیت کا شکار تھی...... بھائیوں

غزل

میرے اشکوں میں روانی آگئی ہے
یاد اِک پرانی کہانی آگئی ہے
میں لاکھ اس سے چھڑاؤں دامن
محبت کو بھی آنکھ دکھانی آگئی ہے
ضبطِ گریہ سے جو آنکھ ہے لال
قلب وجاں میں اِک موجِ طوفانی آگئی ہے
کوئی تو اسے یہ جا کے بتلائے
اذیتوں کی زد میں زندگانی آگئی ہے
اداس رُتوں کے زرد موسم میں
ہمیں بھی چاہت مٹانی آگئی ہے
مبہوت سا رہ گیا وہ اچانک
ستانے جو یاد اِک سہانی آگئی ہے
زمانے کا اس پہ بھی ہوا ہے اثر
اسے بھی یارو، آنکھ چرانی آگئی ہے

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

کی محبت جانے کہاں سوگئی تھی۔ شوہر نے بھی ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ ماں اس کی وجہ سے الگ پریشان تھیں اور ایسے میں منفی خیالات کا لگاتار آنا وہ شدید کرب کے عالم میں تھی۔ جبھی کوئی فیصلہ کیا...... لیٹر پیڈ اٹھایا اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ اس نے تین لیٹرز لکھے توقیر، روحیل اور اپنے بھائیوں کے نام پھر ڈائری میں کچھ درج کرنے لگی۔ یہ عمل انجام دیتے ہوئے وہ بری طرح گریہ کررہی تھی۔ تہجد کا ٹائم تھا اس نے جانماز بچھا کر نماز ادا کی اور اپنے رب کے حضور سر رکھ کر گڑگڑانے لگی۔ بچپن سے لے کر لڑکپن اور پھر جوانی کے تمام حالاتِ زندگی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔

''میرے خدا مجھے معاف کردینا۔ میں اتنی نفرتوں اور ذلتوں کے درمیان اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرا مرجانا اگر اس گھر میں بہتری لاسکتا ہے تو میں اپنے آپ کو خود ہی ختم کردیتی ہوں، میرے رب مجھے معاف کردے۔'' وہ قدرے جذباتی انداز میں سوچتے ہوئے جانماز سے اٹھی اور سائڈ ٹیبل کی دراز میں سے ایک شیشی نکالی اور اس میں سے ساری گولیاں ایک ہی بار نکال کر کھالیں۔ شیشی سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ بیڈ پر لیٹ گئی اور چھت کو گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے۔

خدیجہ بیگم کے دل کو نہ جانے ایک دم گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ وہ تسبیح پڑھتے پڑھتے سوگئی تھیں کہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھیں۔

''نہ جانے کیوں میرا دل اتنا گھبرا رہا ہے...... خدا خیر کرے...... میرے دل کو ایسی بے چینی پہلے تو کبھی نہیں ہوئی۔'' خدیجہ بیگم پریشانی سے... بڑبڑائیں۔ ہر طرف فجر کی اذانیں بلند ہونے لگیں تو وہ واش روم میں وضو کرنے چلی گئیں۔ زرینہ بھی وضو کر کے ردا کے کمرے کی طرف آئی اور آہستہ سے دستک دے کر کمرے میں داخل ہوگئی اور لائٹ آن کر کے ردا کے پاس گئی۔

''ردا بی بی اٹھ جائیں، فجر کی نماز کا وقت ہو ہے، نماز قضا ہوگئی تو پھر آپ شکوہ کرتی ہیں کہ نے اٹھایا کیوں نہیں۔'' وہ اپنی ہی لے میں بولتی ر مگر ردا نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اس کے پا بیٹھ کر جیسے ہی اسے ہلانے لگی تو ردا اکھڑی اکھڑ سانسیں لینے لگی۔ اس نے گھبرا کر اس کے چہرے طرف دیکھا جو بہت نیلاہٹ مائل ہو رہا تھا۔ ا نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ بے جان ہو کر نیچے گر گیا۔ گھبرا کر اسے زور زور سے ہلانے لگی لیکن ردا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھبرا کر عاصم کے کمرے طرف گئی اور اس کے دروازے پر دستک دی۔ عاص آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔

''زرینہ تم...... خیریت تو ہے؟'' اس حیرت سے اس سے پوچھا۔

''وہ...... وہ ردا بی بی بات نہیں کر رہیں، م نماز کے لیے انہیں اٹھانے گئی، انہیں آوازیں د اور انہیں ہلایا بھی مگر وہ کچھ بول ہی نہیں رہیں۔'' زرینہ نے گھبرا کر اسے بتایا۔

''میں...... دیکھتا ہوں۔'' عاصم نے پریشا سے کہا اور اس کے ہمراہ ردا کے کمرے میں چلا اور اس کے پاس بیٹھ کر اسے ہلانے لگا مگر ردا... بے سُدھ پڑی تھی جبھی وہ اس کی نبض چیک کرنے لگا اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی شیشی پر پڑی، شیشی دیکھ وہ بری طرح گھبرا گیا۔

''اوہ...... نو!'' وہ پریشانی سے بڑبڑایا ا بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ زرینہ پریشا حال اسے دیکھتی رہی۔ عاصم نے گھبرا کر حاتم کمرے کا دروازہ بجایا۔

''حاتم...... بھائی دروازہ کھولیں، ردا suicide کرلی ہے۔'' عاصم کے زور سے چ پر حاتم بھی گھبرا گیا۔

''س...... ک...... کیا suicide کیسے؟'' حاتم نے گھبرا کر پوچھا۔ شمیلہ بھی اُن کے قریب آگئی۔

''اس نے تمام سلیپنگ پلز کھالی ہیں اور وہ بالکل بے حال سی ہے۔'' عاصم نے سرگوشی میں بتایا۔

''اوہ...... نو...... چلو میں دیکھتا ہوں۔'' حاتم نے پریشانی سے کہا اور تینوں بھاگتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچے۔

خدیجہ بیگم جو وضو کر کے کمرے سے باہر آرہی تھیں، تینوں کو ردا کے کمرے کی طرف یوں جاتے دیکھ کر گھبرا گئیں اور خود بھی اس کے کمرے کی طرف بڑھیں گھٹنوں کے درد کی وجہ سے وہ کراہ بھی رہی تھیں۔

''کیا ہوا تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟'' کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے پوچھا۔

''مما...... ردا نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔'' عاصم نے آہستہ آواز میں بتایا تو خدیجہ بیگم نے حیرت سے چیخ مار کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''م...... میری ردا...... نہیں...... نہیں۔'' خدیجہ بیگم پھٹی پھٹی نگاہوں سے آگے بڑھ کر ردا کو دیکھنے لگیں اور پھر یکایک بے ہوش ہوگئیں۔ عاصم پریشان ہو کر انہیں ہلانے لگا۔ حاتم نے آگے بڑھ کر ردا کی نبض چیک کی۔

''pulse بہت سلو چل رہی ہے۔ میں اسے اسپتال لے کر جاتا ہوں۔ عاصم تم مما کو دیکھو۔'' اس نے عاصم سے کہا اور خود گاڑی نکالنے چلا گیا۔ شمیلہ بھی اس کے ہمراہ چلی گئی۔ عاصم ماں کو ہوش میں لانے لگا۔

حاتم اور شمیلہ ردا کو لے کر اسپتال ایمرجنسی میں پہنچے تو ڈاکٹروں نے اسی وقت اس کا معدہ واش کیا مگر پھر بھی اس کی حالت کافی سیریس تھی وہ ہوش میں نہیں آرہی تھی۔ وہ دونوں آئی سی یو کے باہر چکر لگا رہے تھے۔ عاصم ماں کا قریبی ڈاکٹر کو بلوا کر چیک اپ کروا چکا تھا اور ڈاکٹر نے انہیں سکون آور دوا کا انجکشن لگا دیا تھا...... ان کی جانب سے تسلی ہوئی تو وہ اسپتال روانہ ہوگیا۔ عاصم نے وہاں پہنچ کر ردا کا حال دریافت کیا۔

''کافی سیریس ہے، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' حاتم نے افسوس سے کہا۔

''آپ اپنے آپ کو کیوں قصوروار ٹھہرا رہے ہیں، بڑے بھائی ہونے کے ناتے کیا آپ اسے ڈانٹ بھی نہیں سکتے اور یوں خودکشی کر کے وہ ساری دنیا کے سامنے آپ کو ذلیل اور رسوا کر کے جارہی ہے۔'' شمیلہ نے غصے سے زہر اگلتے ہوئے کہا۔

''خدا کے لیے شمیلہ بھابی...... اب تو آپ اسے بخش دیں...... بات کو بڑھانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔'' عاصم، شمیلہ کی بات پر غصے سے بولا۔

''چپ کرو...... شمیلہ۔'' حاتم نے بھی غصے سے اسے ڈانٹا۔

''مجھے چپ کرانے سے لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہوجائیں گی۔ خودکشی کر کے اس نے تم لوگوں کو کتنا بدنام کرنے کی کوشش کی ہے، تم لوگوں کو بہت جلد پتا چل جائے گا۔'' شمیلہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو...... اور دفع ہوجاؤ یہاں سے......'' حاتم نے اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''جارہی ہوں...... میری طرف سے تم سب جہنم میں جاؤ۔'' شمیلہ نے غصے سے کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اسی لمحے ایک ڈاکٹر آئی سی یو سے باہر نکلا تو دونوں نے بڑھ کر ردا کے بارے میں پوچھا۔

''ابھی وہ بے ہوش ہیں، ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا، آپ دعا کریں۔'' ڈاکٹر انہیں تسلی دے کر چلا گیا۔

''میں کیا دعا کروں...... میری ردا نے تو میری وجہ سے ہی خودکشی کی ہے۔ اس کی حالت کا تو میں ہی

ذمے دار ہوں۔" حاتم ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔
"پلیز...... حوصلہ کریں...... ہم دونوں ہی اس کے مجرم ہیں۔" عاصم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
خدیجہ بیگم کو ہوش آیا تو وہ ردا، ردا پکارتی ہوئی زور زور سے چیخنے لگیں۔ زرینہ سے انہیں قابو کرنا مشکل ہوگیا۔ جبھی اس نے پریشان ہو کر عاصم کو فون کیا۔ کچھ ہی دیر بعد عاصم، خدیجہ بیگم کو لے کر واپس اسپتال جا رہا تھا۔
"مما...... ردا اب ٹھیک ہے، بس آپ اس کے ہوش میں آنے کی دعا کریں۔" عاصم نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے ڈاکٹر آئی سی یو سے باہر نکلا تو عاصم اور خدیجہ بیگم بھاگتے ہوئے اس کی طرف گئے۔
"ڈاکٹر صاحب...... میری ردا کیسی ہے؟" خدیجہ بیگم نے مضطرب ہو کر پوچھا۔
"ابھی تو وہ بے ہوش ہیں، بس دعا کیجیے کہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں، آپ ماں ہیں آپ کی دعائیں ہی اُن کے کام آئیں گی۔" ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"میری دعائیں......؟ اگر ان میں اثر ہوتا تو میری ردا اس حال تک کبھی نہیں پہنچتی۔" خدیجہ بیگم نے سسکی بھر کر کہا۔
"آپ حوصلہ رکھیں...... ماں کی دعاؤں میں بہت اثر ہوتا ہے۔" ڈاکٹر نے تسلی دی اور آگے بڑھ گیا۔ خدیجہ بیگم روتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعائیں کرنے لگیں۔

☆☆☆

روحیل نے فضیلت آپا کے گھر جا کر خوب جھگڑا کیا تھا کہ اُن کے کہنے پر وہ ردا سے ملنے گیا تھا مگر اب کی بار ردا نے پھر اس کے ساتھ ڈراما کھیلا تھا اور اسے بے وقوف بنایا تھا۔ ماں جی اور فضیلت اس کی بات سن کر چونک گئی تھیں۔ ماں جی کو خدیجہ بیگم کی باتوں پر پورا یقین تھا کہ وہ کوئی گیم نہیں کھیل رہی تھیں پھر نہ جانے حالات کس طرف جا رہے تھے وہ بہت پریشان ہوگئی تھیں۔
"میں اب ردا کو دوبارہ کبھی ملنے نہیں جاؤں گا اب اسے صرف طلاق جائے گی۔" روحیل غصے سے کہ کر چلا گیا تو وہ دونوں بہت پریشان ہوگئیں۔ ماں جی نے ساری رات بہت پریشانی میں گزاری۔ صبح اٹھتے ہی انہوں نے فضیلت سے کہا کہ وہ ردا کے گھر فون کروے اور خدیجہ بیگم سے اُن کی بات کرائے۔ فضیلت فون کر کے قدرے پریشان اور گھبرائی ہوئی ماں جی کے کمرے میں آئی تھی۔
"آپا...... آپا...... میں نے ردا کے گھر فون کیا ہے...... ردا...... اسپتال میں ہے۔ اس نے خودکشی کرلی ہے۔ یہ اس کی ملازمہ نے بتایا ہے۔"
"ک...... کیا...... خودکشی......! میری ردا...... نہیں...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔" ماں جی بُری طرح سسکنے لگیں۔
"آپا...... اپنے آپ کو سنبھالیں...... ہمت کریں۔"
"ضرور...... روحیل نے اسے کچھ کہا ہوگا۔ فضیلت ذرا روحیل کا نمبر ملاؤ۔" ماں نے جی کہا۔ جلدی سے اس نے نمبر ملا کر موبائل ماں جی کو پکڑایا۔
"گھٹیا انسان...... تم نے میری ردا کو کیا کہا کہ اس نے تمہاری وجہ سے خودکشی کرلی ہے۔ اسے موت کے منہ میں دھکیل کر اب تو بہت خوش ہو گے تم۔" ماں جی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔
"ک...... کیا...... خودکشی......؟" روحیل بھی حیرت سے چلاتے ہوئے بولا۔
"اگر میری ردا کو کچھ ہوگیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" ماں جی نے روتے ہوئے فون بند کردیا۔ روحیل بھی پریشان ہوگیا۔
(باقی آئندہ)

ریت گھروندا

سعدیہ رئیس

اچانک اس کا دل اچاٹ ہوا اور اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر ٹی وی آف کر دیا۔ دبیز ملائم کمبل سے اپنے وجود کو آزاد کر کے اس نے اپنے گرد سیاہ شال لپیٹی اور بیڈ سے اتر کر کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ساتویں منزل سے تا حدِ نگاہ ٹمٹماتی، جگمگاتی روشنیاں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں یا پھر اصل بات یہ تھی کہ آج کل وہ خود بہت خوش تھی اس لیے اسے اردگرد کا ماحول چمکتا دمکتا لگ



رہا تھا۔ اس کے اندر جو روشنیاں پھوٹ رہی تھیں انہوں نے باہر کی دنیا کو بھی روشن کر دیا تھا۔ جب سے وہ رضا کے نام سے منسوب ہو کر اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی تو زندگی میں رنگ سے بھر گئے تھے۔ یہ سنجوگ اس کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں اور خوشیاں لایا تھا۔

کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر وہ اپنی اگلی اور پچھلی زندگی کا موازنہ کرتی رہی پھر ایک گہری طمانیت بھری سانس بھر کر دوبارہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی کہ نئی زندگی ابھی ایک کمرے اور اسی بیڈ تک ہی محدود تھی جہاں بیٹھ کر وہ سرِ شام ہی سے رضا کا انتظار کرنا شروع کر دیا کرتی۔ کمرا بے حد چھوٹا تھا بیڈ کے سائڈ کی خالی جگہ پر دو کرسیاں رکھی تھیں اور پائنتی کی طرف زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک پرانی مگر قابلِ استعمال جازم بچھی تھی، وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت مگن تھی مسرور تھی کیونکہ رضا اس کے سنہری خوابوں کی تعبیر تھا۔

آج رضا نے بہت دیر کر دی تھی اس نے وقت دیکھا چھ بج چکے تھے شام کا پنچھی پر پھیلائے آ چکا تھا اس دھندلی سی سنہری شام میں اس کے خوب صورت جذبے اس کے چہرے پر لو دینے لگے۔ اس نے آئینے میں خود کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ بالکل ٹھیک لگ رہی تھی لیکن اس نے ایک بار پھر اپنے ریشمی بالوں میں برش کیا۔ ہونٹوں پر جمی لپ اسٹک کی تہ پر شائنر لگا کر ایک بار پھر اپنا جائزہ لیا۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی وہ فوراً ہی اپنے کمرے سے ملحق چھوٹے سے لاؤنج میں چلی آئی۔ انصر کو دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ جھجک کر وہیں رک گئی۔

''رضا ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا بھابی!'' انصر کے اگلے جملے نے اسے اور بھی شرمندہ کر دیا۔

''اب ایسی بھی کیا بے تابی کہ چہرے سے ہی دل کا سارا حال ظاہر ہو جائے۔'' اس نے دل ہی دل میں خود کو سرزنش کی۔

انصر کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ اسے اور بھی خجل کر گئی وہ کچھ کھسیا کر بنا کچھ کہے پلٹ کر کمرے میں آ گئی کہ کہیں انصر مزید کوئی راز اس کی آنکھوں سے نہ پڑھ لے۔ اسی وقت اس کی چھوٹی بہن عرشیہ کا فون آ گیا اور اس سے باتوں میں آدھا گھنٹا گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

جب زندگی دل پسند لوگوں اور من پسند رفاقتوں میں خوابوں کے اونچے آسمان پر اڑتے ہوئے گزرے تو بہت سہل اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کبھی خوابوں کی دنیا کی مسافر تھی مگر پھر اسے اس کی منزل مل گئی۔ رضا کی صورت میں اسے دل و جان سے بھرپور خوشی مل گئی تھی۔ وہ اپنا سفر طے کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور عرشیہ بہت پیچھے ہی کہیں رہ گئی تھی۔ اپنے محدود اور قنوطی خیالات کے ساتھ......

ابھی وہ عرشیہ سے محوِ گفتگو تھی کہ لاؤنج میں رضا کی آمد کے آثار نمایاں ہوئے اس نے بعجلت خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ وہیں بیڈ پر اس کی منتظر بیٹھی رہی۔

''یہ انصر کب آیا...... آج کچھ جلدی نہیں آ گیا؟'' اندر آ کر اس نے ورشا سے پوچھا۔

''ہوں...... شاید......'' اس نے بوریت کا تاثر دیا تو وہ اس کی خفگی کو سمجھ گیا۔

''آج بہت کام تھا جان، کیا کرتا چھوڑ کر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی......'' اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے صفائی پیش کر دی۔

''تم جی بھر کر آج بور ہوئیں سارا دن اکیلی جو ہوتی ہو، یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا مگر تم نہ مانیں......'' اس کے جملے کے پیچھے چھپی تنبیہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس لیے موڈ ٹھیک کر لیا۔

☆☆☆

اس کے وسائل محدود تھے...... ورشا کی آمد سے مشکلات میں اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد وہ چاہتا تھا کہ ورشا کچھ عرصہ پاکستان میں ہی رہے لیکن ورشا کے لیے دبئی کا نام ہی اتنا اٹریکٹو تھا جبکہ اِدھر رضا کے پاس رہائش کا بھی بندوبست نہیں تھا۔ وہ چھ لڑکے ایک کمرے میں فی پلنگ کا کرایہ دے کر بہ مشکل رہ رہے تھے لیکن ورشا اس کے بغیر پاکستان میں رہنا نہیں چاہتی تھی اور یہ بات بھی تھی کہ رضا کے رشتے کی قابلِ توجہ بات اس کا دبئی میں ہونا بھی تھا۔ اس نے شادی سے قبل ہی رضا کے ساتھ دبئی گھومنے کے خواب دیکھ لیے تھے۔ وہ اسے وہاں بلانا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر کچھ اس کی ضد سے مجبور ہو کر اور کچھ سسرال میں ہونے والی کشیدگیوں کی وجہ سے اس نے ورشا کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس کے دوست انصر نے اپنے چھوٹے سے فلیٹ کا واحد بیڈ روم انہیں کرایہ پر دے دیا، یوں رہائش کا بندوبست ہو گیا مگر ورشا کی آمد سے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے اور اسے گھمانے پھرانے میں وقت بھی لگ رہا تھا اسی لیے وہ کئی بار اسے جتا چکا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے، ہر بار ورشا اس کی بات سن کر خاموش ہو جاتی تھی مگر اب نہ رہ سکی۔

''وہاں میری سہیلیوں اور رشتے داروں نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ میری شکل دیکھتے ہی سب پوچھنے لگتے تھے کہ کب جا رہی ہو دبئی...... اور میری ساری سہیلیاں تو مجھ سے اتنی متاثر تھیں کہ میں شادی کے بعد دبئی چلی جاؤں گی بعد میں وہی میرا مذاق اڑانے لگیں۔'' وہ بولتی چلی گئی ساتھ ہی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

''اوہو...... تم تو سیریس ہی ہو گئیں۔ میں تو ایک بات کہہ رہا تھا، سب کا کیا ہے، بولتے رہتے ہیں، تم کسی کی زبان تو نہیں پکڑ سکتیں۔ میں تو صرف تمہاری بے آرامی کی وجہ سے کہہ رہا تھا...... دن بھر تم اکیلی پریشان ہوتی ہو، اتنی سی جگہ پر تمہیں رہنا پڑ رہا ہے......'' اس نے کئی وضاحتیں دے ڈالیں مگر اس کی آنکھوں سے آنسو خشک نہ ہوئے۔

''چلو یار کہیں باہر چلتے ہیں، آج تو انصر کی بائیک بھی ہاتھ لگ گئی ہے، چلو فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔'' اس کی اداس صورت دیکھ کر اس نے جلدی سے پروگرام بنا لیا۔ اس کی تو دلی مراد بر آئی...... جھٹ پٹ تیار ہو گئی، جب وہ رضا کے سنگ لاؤنج میں آئی تو انصر لاؤنج میں ایک طرف میٹرس پر دراز تھا۔ ان دونوں کو بیڈ روم کرائے پر دے کر وہ خود لاؤنج میں ہی سویا کرتا تھا۔

''او کے انصر...... سی یو بائے......'' رضا نے اس کی بائیک کی چابی اٹھا کر لہرا کر اسے دکھائی۔

''او کے...... گو اینڈ انجوائے......'' انصر نے دونوں کو خدا حافظ کہا۔

وہ شام بڑی خوب صورت اور یادگار بن گئی۔ رضا کی سنگت میں گزرا ہر پل تو ویسے ہی قیمتی تھا اس پر دبئی جیسے ملک کی چمک دمک میں سب کچھ اور بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنی ہر تفریح کی تصویریں عرشیہ کو ضرور بھیجتی تھی۔ جس میں وہ ہر جگہ رضا کے پہلو میں فخر سے اکڑی کھڑی ہوتی تھی کیونکہ رضا کو اس نے سراسر اپنی مرضی سے اپنایا تھا اس لیے یہ ثابت کرنا بھی ضروری تھا کہ وہ کتنی خوش اور مطمئن ہے یا پھر عرشیہ پر اس کی بے وقوفی جتانا چاہتی تھی...... بہرحال کچھ بھی تھا عرشیہ ہمیشہ اس کی تصویروں کی دل کھول کر تعریف کرتی تھی۔

وہ تو ویسے بھی سدا کی بے نیاز لڑکی تھی لیکن پھر بھی ورشا اس کی تعریفوں پر چڑ جاتی۔ عرشیہ اس کی چھوٹی بہن تھی لیکن اسے کبھی اس لڑکی کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ عجیب سر پھری لڑکی تھی...... اپنے حال میں مست مگن...... جسے نہ کسی کی ٹوہ رہتی تھی اور نہ کسی کی ترقی اور پیسہ متاثر کرتا تھا اور اِدھر ورشا کا یہ حال تھا

کہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر نظر رکھتی تھی، ذرا سے نکتے کو باریکی سے دیکھتی تھی۔ رضا کے معاملے کا فیصلہ بھی اس نے خود ہی سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

گھر کے دیگر افراد کا ووٹ راشدہ خالہ کے بیٹے اسد کے حق میں تھا لیکن ورشا نے حقیقت پسندی سے کام لیا، جذبات کو ایک طرف رکھ کر اس نے ساری صورتِ حال کا بھرپور جائزہ لیا۔ ایک طرف اس کے بچپن کا انگنا اور انگنا میں شہتوت کے درخت تلے بیتے ہوئے لازوال پل تھے...... اپنائیت کی خوشبو اور محبتوں کا احساس تھا اور دوسری طرف رضا کا پُرکشش رشتہ تھا۔ اسد کے سامنے رضا کی حیثیت برتر تھی، اسی لیے اس نے رضا کے رشتے کو فوقیت دی۔ اماں نے اسے بہت راضی کرنا چاہا کہ وہ اسد کے حق میں فیصلہ دے دے مگر وہ رضا کے لیے ڈٹ گئی۔

اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے چھوٹے سے اوسط درجے کے مکان میں رضا جیسے کماؤ پوت لڑکے کا رشتہ بھی آسکتا ہے۔ وہ ایک عرصے سے دبئی میں مقیم تھا، اس نے اپنے گھر کی مالی حیثیت بہت بہتر کردی تھی۔ اب تو اُن کے دو گھر تھے۔ اسے اپنے قسمت کے دھنی ہونے پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ دراصل کچھ دن قبل وہ محلے میں میلاد شریف کی محفل میں گئی تھی۔ وہیں رضا کی کسی بہن نے اپنی جہاں دیدہ نظروں سے اس جیسی گمنام سی اندھیری گلیوں میں رہنے والی دوشیزہ ورشا کو رضا کے لیے پسند کرلیا اور اگلے چند دنوں میں ہی ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد کسی کے توسط سے اس کے گھر تک پہنچ گئیں۔ اماں تو اُن کی لش پش گاڑی اور امارت دیکھ کر متاثر ہونے سے زیادہ متردّد ہوگئی تھیں۔ اُن کے گھر کے بے رنگ گھسے پٹے صوفوں پر وہ چمکتی دمکتی خواتین جچ بھی نہیں رہی تھیں۔ اماں نے اوپرے دل سے ان کی خاطر تواضع کی لیکن ورشا نے اسی روز سے اپنی خواہشوں اور ارمانوں کے اونچے آسمانوں پر پرواز

کرنے کے لیے پر تول لیے تھے مگر اماں کچھ خو
تھیں۔ انہی دنوں راشدہ خالہ، اسد کی ایما پر اس
لیے دامن دراز کرنے آگئیں۔ اسد نہ جانے
سے اسے دل میں جگہ دے کر مناسب وقت
انتظار میں بیٹھا ہوا تھا...... شاید وہ اس کی تعبیر
ہونے کا انتظار کررہا تھا یا پھر اپنے قدم مضبوطی
جمانا چاہتا تھا بہرحال کچھ بھی تھا رضا کا رشتہ آیا تو
نے بھی اپنی درخواست بھیجنے میں دیر نہیں کی۔

اماں، اسد کے رشتے سے جتنی خوش تھیں، و
اتنی ہی چڑ گئی تھی۔ اسد میں بظاہر کوئی خامی
نہیں تھی، وہ قبول صورت، اسمارٹ اور محنتی لڑ
لیکن اس کے سامنے رضا کی پوزیشن زیادہ مض
تھی۔ اس کا سیٹ اپ اچھا تھا، گاڑی، بنگلا سب
تھا اور سب سے زیادہ متاثر کُن اور پُرکشش بات
تھی کہ وہ دبئی میں مقیم تھا اور دبئی جیسے شہر میں
سیر سپاٹے اور گھومنے پھرنے کی خواہش اس کے
میں کہیں کسی کونے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس چھو
سے گھر میں بند رہ کر وہ اکتا گئی تھی اب ملک سے
جانے کا موقع مل رہا تھا تو وہ اسے کیوں ضائع کر
اماں، رضا کے حق میں نہیں تھیں ان کا دل ا
بھانجے اسد کے لیے تھا لیکن ورشا نے ڈھیٹ بن
رضا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

"ابھی اسد کو سیٹ ہونے میں کافی ٹائم لـ
اور پھر اس کے پاس ہے ہی کیا۔ پیچھے کوئی جائداد
نہ آگے کوئی مستقبل...... خالی خولی صرف ایک نوکر
اکتفا کرنا بے وقوفی ہی ہے۔ اماں بہت ہی سادہ
ذرا سا خلوص دیکھ کر پانی ہوجاتی ہیں۔ اس کنگال
میں پتا نہیں انہیں کیا خوبی نظر آرہی ہے۔" اس
اپنی بہن عرشیہ سے صاف کہہ دیا۔ یہ بات اسد
کانوں تک بھی یقیناً پہنچ گئی تھی اس لیے اس روز
وہ راشدہ خالہ کو لینے آیا تو عجیب حسرت بھری او
بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے جانے

بعد وہ بہت دیر تک اس کی نظروں کو اپنے وجود پر محسوس کرتی رہی۔ اس کی نظروں میں شکایت بھی تھی اور ٹھکرائے جانے کا دکھ بھی تھا مگر یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں تھا اس لیے کچھ دیر کی کوشش کے بعد وہ اسد کو بالکل بھلا چکی تھی۔

رضا کے ساتھ اس کی شادی طے پا گئی اور طے یہ ہوا کہ ابھی فوری طور پر وہ ورشا کو اپنے ساتھ دبئی لے کر نہیں جائے گا جب اگلی بار آئے گا تب ورشا اس کے ساتھ دبئی چلی جائے گی۔ اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور دلہن کا روپ دھارے ورشا اپنی پلکوں پر خواب سجائے پیا دیس سدھار گئی۔ اس کا طرزِ رہائش ایک دم ہی بدل گیا۔ اس کی بری میں ایک سے ایک مہنگی کاسمیٹکس، برانڈڈ جیولری اور بوتیکس کے قیمتی کپڑے آئے تھے۔ جس نے بھی یہ سامان دیکھا اس کی قسمت پر رشک ہی کیا۔

جب شادی کی رونقیں تمام ہوئیں اور ایک ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا تو رضا اپنی نئی نویلی دلہن سے یہ وعدہ کر کے کہ وہ جلد ہی آجائے گا دبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد ورشا کو شدت سے تنہائی اور اکیلا پن محسوس ہوا۔ اس کی دو کنواری نندیں مومنہ اور دیبا تھیں اور دو نندیں شادی شدہ تھیں جنہیں بڑی آپا اور چھوٹی آپا کہا جاتا تھا وہ آس پاس ہی رہتی تھیں کہ روز ہی وہاں موجود ہوتیں، دو دیور بھی تھے لیکن بھری پُری سسرال ہونے کے باوجود وہ خود کو اکیلا سمجھ رہی تھی۔

اس کے خالی وجود میں پاگل جذبے سر ٹکراتے تو اسے گھبراہٹ ہونے لگتی، سُونے من میں بے تحاشا اداسی چھا جاتی۔ شام ڈھلتے ہی ڈھیروں اداسی کمرے میں ہر طرف پھیل جاتی اتنی کہ اسے وحشت ہونے لگتی۔ رضا اسے اپنے نام کی زنجیر پہنا کر خود اس سے دور چلا گیا تھا۔ اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے اور وہ کسی بے بس پنچھی کی طرح بند پنجرے سے سر ٹکرا رہی تھی۔

شروع میں تو سب ہی نے اس کا خیال رکھا مگر جب اس کی یہی کیفیت برقرار رہی تو سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب تو اس نے گھر کے کاموں میں بھی حصہ لینا شروع کردیا تھا مگر اوسان اتنے غائب رہتے کہ وہ کوئی نہ کوئی غلطی کردیتی۔ تب بڑی آپا اسے اس کی غلطی پر لتاڑ دیتیں۔

"اے بھئی شادی کوئی عیش آسائش نہیں بلکہ ذمّے داری کا نام ہے، اپنے حواسوں کو ٹھکانے پر لے آؤ۔" ان کے ٹوکنے پر اسے بہت غصہ آتا مگر کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے تو اسے طور طریقے سکھائے جاتے تھے۔

"ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے، ہمارے ہاں اس طرح نہیں ہوتا......" چھوٹی آپا اسے ہر وقت یاد دلاتی رہتی تھیں۔

ہر کام کا ایک وقت مقرر تھا اگر ذرا بھی دیر سویر ہوجاتی تو ساس جی بنا لگی لپٹی اسے چار باتیں سنا دیتیں۔ زندگی اتنی مشکل ہوگی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا اپنے...... میکے کے چھوٹے سے گھر میں دم گھٹتا تھا مگر یہاں اتنے وسیع گھر میں بھی بہت گھٹن تھی۔ اگر دلوں میں گنجائش ہو تو پھر گھر کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن وہاں کسی کے دل میں گنجائش نہیں تھی۔

رضا نے خاص طور پر اس کے لیے موبائل بھجوایا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس کے چھوٹے دیور نے جھپٹ لیا۔

"او سویٹ بھیا...... یہ میرے لیے بھیجا ہے انہوں نے، میں نے ان سے کہا تھا کہ میرے سب دوستوں کے پاس موبائل ہے اور میرے پاس نہیں ہے۔" وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی حالانکہ وہ اپنے جیب خرچ سے بہ آسانی موبائل خرید سکتا تھا...... بعد

میں رضا سے اس کی کوئی بات ہوئی تو اس نے والدہ سے کہہ دیا کہ وہ موبائل ورشا کے لیے ہے پھر اس موبائل کی اتنی لے دے ہوئی کہ دلوں میں کھٹاس بڑھ گئی۔ موبائل تو اس کے حوالے کردیا گیا مگر اُن سب کے طعنوں کی مار نے اسے ادھ موا کردیا۔

”شکل سے معصوم لگتی ہے مگر کرتوت گھنّیوں میسنیوں والے ہیں۔“ بڑی آپا نے بہ آواز بلند سرگوشی کرکے قصداً اسے سنایا تھا۔

وہ تو پہلے ہی بیزار تھی اب بددل بھی ہوگئی۔ زندگی اس پر تنگ ہوگئی تھی اور جب بھی اسے اپنی وہ خوشی یاد آتی جو دبئی جانے کی ہورہی تھی تو اسے اور بھی رونا آتا۔ کیا کچھ خواب نہ دیکھ ڈالے تھے اس نے اور یہاں کن حالوں میں رہنا پڑ رہا تھا پھر اس پر ستم جب کوئی ہمدردی کی آڑ لے کر زخموں پر مزید نمک چھڑک دیتا۔

”ہائے بے چاری، کیسی خوش تھی کہ دبئی جارہی ہے مگر اب خود یہاں سسرال میں پس رہی ہے اور میاں وہاں دبئی میں عیش کررہا ہے۔“

اس نے رضا سے دبئی بلانے کے لیے اصرار شروع کردیا لیکن رضا اسے منع کرتا رہا اس سے یہاں سسرال میں گزارہ نہیں ہورہا تھا۔ ہر نیا دن ایک نئی کسک کا تحفہ دیتا۔ اس کی سسرال میں بھی کوئی اسے دبئی بھیجنے پر آمادہ نہیں تھا انہیں تو ویسے بھی ایک مفت کی ملازمہ مل گئی تھی۔ ہر کوئی اس پر حکم چلانا اپنا فرض سمجھتا۔ ایسی درگت بنتی کہ وہ آٹھ آٹھ آنسو رو دیتی۔ روز کی چخ چخ الگ رہنے لگی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ میکے جاکر بیٹھ گئی۔ چند بڑوں نے رضا سے بات کی، اس پر دباؤ ڈالا تب کہیں جاکر اسے دبئی جانے کا سندیسہ ملا۔

جس روز اس نے دبئی کے لیے کوچ کیا اس روز جوش اور خوشی سے اس کا چہرہ تمتمارہا تھا۔ دبئی اس کے خوابوں کی سرزمین اور روشنیوں کا شہر تھا۔ جہاں زندگی کسی تھرکتی، مچلتی دوشیزہ کی طرح رواں تھی۔ اب اس کے خواب پورا ہونے کا وقت آگیا تھا۔

رضا نے اس کے لیے اپنے دوست انصر کے فلیٹ میں بندوبست کرتو دیا تھا مگر نیم دلی کے ساتھ۔ یہاں حالات ایسے نہ تھے کہ وہ اسے ساتھ رکھتا مگر اب جبکہ وہ زبردستی کرکے آہی گئی تھی تو کیا کرسکتا تھا۔

وہ سارا وقت وہاں اکیلی ہوتی تھی۔ رضا شام کو گھر لوٹتا تو تنہائی کی اذیت سے نجات ملتی انصر بھی گھر لوٹ کر وہیں لاؤنج میں لوٹتا رہتا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد وہ پھر کہیں باہر چلا جاتا اور رات گئے لوٹتا تھا۔ وہ رضا کا گہرا دوست نہیں تھا۔ بس یہ تھا کہ رضا کے مقابلے میں اس کی مالی حیثیت زیادہ مستحکم تھی۔ رضا کی مشکل دیکھ کر اس نے رضا کی مدد کی تھی۔ ان دونوں کے تعلقات دبئی میں رہنے کی وجہ سے بڑھ گئے تھے۔

اس روز انصر خلافِ معمول جلدی گھر لوٹ آیا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی.... چہرہ پُرحدت تھا اور آنکھوں میں سرخی...... بوجھل پپوٹے نیم وا سے تھے۔

”ارے انصر بھائی...... خیریت تو ہے....؟“ وہ فکرمندی سے پوچھنے لگی۔

”ہوں...... ہاں شاید ٹھیک نہیں، کچھ دیر لیٹوں گا تو ٹھیک ہوجاؤں گا۔“ اس کی آواز بھی بھاری ہورہی تھی۔

وہ وہیں میٹرس پر لیٹ کر غافل ہوگیا۔ ورشا نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ اسے ٹمپریچر لگ رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ نائٹ لگا رہا تھا شاید یہ اسی کی تھکن تھی۔ کچھ سوچ کر وہ انصر کے لیے چائے بنانے لگی تاکہ اسے درد کی ٹیبلیٹس کھلادے۔ جس وقت وہ اس کے سرہانے چھوٹی میز پر چائے رکھ رہی تھی تو مرکزی دروازے کا قفل گھوما اور رضا اندر داخل ہوگیا۔ اس وقت وہ خود سے غافل انصر کو آہستہ سے آواز دے رہی تھی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کررہی ہو، جاؤ اندر کمرے میں۔“ اس کے قریب آکر وہ غصے سے بولا۔ وہ کچھ حیران اور خائف سی بیڈروم کی طرف پلٹ گئی لیکن رضا کے دُرشت لہجے پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”کب آیا تھا یہ؟“ اندر آکر اس نے اسی کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

”ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی......“ اس نے آنسوؤں پر قابو پاکر دھیرے سے کہا۔

”مگر مجھے تو اس نے یہ بتایا تھا کہ رات کو دیر سے آئے گا۔“ وہ کچھ تشویش سے بڑبڑایا۔

”شاید انہیں بخار ہے، جب یہ آئے تھے تو بہت نڈھال تھے اور گر رہے تھے......“ اس نے معلومات دیں۔

”میں خود دیکھ لوں گا اسے، تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اسی سخت لہجے میں بولا۔

ورشا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں وہ اس سے بیزار تھا اور کچھ خاص خوش بھی نہیں تھا۔

”لگتا ہے کہ آپ ٹھان کر بیٹھے ہیں کہ ہر وقت مجھے میرے یہاں آنے کی غلطی جتاتے رہیں گے، وہاں آپ کے بغیر مجھے گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ میں تو جب سے یہاں آئی ہوں آپ نے مجھے قید کرکے بٹھادیا ہے نہ کسی ہوٹل لے کر گئے نہ کوئی شاپنگ پلازہ دکھایا مجھے، ورنہ وہاں تو سب کہہ رہے تھے کہ جو لڑکیاں دبئی جاتی ہیں سونے سے لد کر آتی ہیں۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔

”اسی لیے تمہیں منع کررہا تھا...... آج وہاں ہمارا جو اسٹیٹس نظر آرہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں یہاں دن رات گدھوں کی طرح محنت کرکر کے پیسہ بناتا رہا۔ کوئی فالتو خرچے نہیں بڑھائے۔ اب تم نے آکر میرے مسائل بڑھادیے ہیں، دن رات کی فکر لگادی ہے مجھے۔ اُدھر گھر سے فون آرہا ہے کہ پیسے کم کیوں بھیجے ہیں، تمہاری وجہ سے مجھے کمرے کا کرایہ بھی زیادہ دینا پڑ رہا ہے۔ تمہاری وجہ سے مجھے انصر کے فلیٹ میں رہنا پڑ رہا ہے اور اُدھر مومنہ کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی ہے، کہاں سے کروں میں یہ سب کچھ؟“ وہ اس پر برس پڑا۔

وہ شدید صدمے اور دکھ سے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ وہ مکمل طور پر اس کی ذمّے داری تھی نکاح جیسے مقدس بندھن کے بعد اس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت اور خوشیوں کا ذمّے دار وہی تھا مگر وہ اس کے لیے بوجھ تھی۔ اس انکشاف نے اسے بے دم کردیا۔

وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ سب سے ٹکر لے کر رضا کو اپنانے کے بعد اس نے ہر خوشی حاصل کرلی ہے مگر رضا کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اس کا شوہر نہیں صرف ایک پیسہ کمانے کی مشین تھا اور اس کے پیسے پر اس کا اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بھی کوئی حق نہیں تھا بلکہ الٹا وہ اس کی ذات کو اپنے لیے مسئلہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے دل برداشتہ ہوکر وہ رات گئے تک روتی رہی اور رضا نہ جانے کب تک کھڑکی میں کھڑا اسگریٹیں پھونکتا رہا۔

صبح وہ اٹھی تو رونے کی وجہ سے چہرہ متورم ہورہا تھا۔ اس نے رضا کو چائے کی پیالی تھمائی تو اس نے بے اختیار اس کی کلائی تھام لی۔ وہ اپنے گزشتہ رات کے رویّے پر نادم لگ رہا تھا۔

”رات میں بہت ڈسٹرب تھا اس لیے سوری...... دراصل وہاں کمپنی میں نیا منیجر آیا ہے اور بہت سازشی قسم کا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ میری جاب ختم نہ کروادے شاید اسی لیے میں اوور ہوگیا تھا۔“ اس نے مرد ہوکر بھی جھکنے میں پہل کی مگر اصل بات یہ تھی کہ جو تیر وہ اس پر چلا چکا تھا اس سے وہ بری طرح گھائل ہوگئی تھی۔ اپنی حقیقت پتا چلنے کے بعد ساری خوشیاں اور سارے خواب چکنا چور ہوگئے تھے۔

"اسی لیے کہتے ہیں کہ اگر کسی کی اصلیت جاننا چاہو تو غصے کی حالت میں اسے دیکھ لو، اچھا ہے آپ کے دل کی بھڑاس نکل گئی۔" اس کا چہرہ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی شکستہ سی مسکراہٹ چہرے پر بکھری گئی۔

"میں نے کہا ناں سوری!" اس نے قدرے رعب سے معذرت کی جیسے سوری کر کے اس پر احسان کر رہا ہو۔

"میں نے خواہ مخواہ ہی آپ کو تنگ کیا آ کر...... اس سے تو اچھا تھا وہاں رہ کر سب کے مذاق کا نشانہ بنتی رہتی ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں تھا دبئی آنے کا...... میں تو صرف آپ کی وجہ سے آئی تھی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ دور ہی رہتی کم از کم محبت تو قائم رہتی۔" اس نے خفا سے انداز میں کہا۔

"چلو چھوڑو، آج کے بعد ہم کبھی یہ بات نہیں کریں گے، جو ہوا سو ہوا۔ اب آگے کی سیٹنگ سوچتی ہے، بھول جاؤ سب کچھ اور ہاں شام کو تیار رہنا۔ المرحبا چلیں گے، وہاں کی کافی بہت زبردست ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ یکسر بدل کر شیریں ہو گیا۔

یہی بہت بڑی بات تھی کہ اسے اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا ورنہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔

دراصل وہ اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ایک کڑی مشقت کا دور جھیل کر بڑی مشکل سے دبئی میں پاؤں جمانے میں کامیاب ہوا تھا اور بہت کٹھن وقت گزار کر وہ اتنا کچھ کر پایا تھا کہ معاشرے میں باعزت شہری کہلانے کا حقدار تھا۔ اپنی شادی پر بھی اس نے قرضہ لیا تھا جو ابھی اترا بھی نہیں تھا کہ مومنہ کی شادی سر پر آ گئی۔ اکیلے تو اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا اخراجات محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے مگر ورشا کی آمد سے اس کا ذہن اور وقت دونوں ہی بٹ گئے تھے پھر خرچا بھی بڑھ گیا تھا۔

آج کل بھی رضا دیر سے گھر لوٹ رہا تھا اور ورشا کو سخت بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت عرشیہ کی کال آ گئی اور وہ کھل اٹھی۔ اس وقت اسے کسی اپنے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی عرشیہ نے کال کر کے اس کی ساری بوریت دور کر دی۔

"جیو میری بہنا......!" اس نے بے صبری سے کال ریسیو کی۔

"کیسی ہو عرشیہ، کیا حال ہیں، اماں، اور سب کیسے ہیں؟ یاد نہیں آتی تمہیں میری؟ اتنے دنوں بعد فون کیا ہے۔" وہ ہڑک کر بولتی چلی گئی۔

"ارے بھئی، تم تو ویسے بھی دبئی کی رنگینیوں میں گم ہو اس لیے میں نے سوچا کہ ڈسٹرب نہ کروں...... خوب انجوائے کر رہی ہو، مزے آ رہے ہیں......" عرشیہ نے انجانے میں اس کے زخم ادھیڑ دیے۔

"ہاں، یہ تو ہے لیکن اپنوں کو بھلایا تو نہیں جا سکتا میں تم سب کو بہت مس کرتی ہوں۔" ایسا کہتے ہوئے اسے اپنی رقت پر قابو پانا پڑا ورنہ جی چاہ رہا تھا کہ کسی بھی طرح عرشیہ کے گلے لگ کر رو دے۔

"اور مجھ سے پوچھو کہ میں تمہیں اس خوشی کے موقع پر کتنا مس کر رہی ہوں۔" عرشیہ نے کھنکتے لہجے میں اسے خوشخبری سناؤ۔

"کیسی خوش خبری عرشیہ؟" اس کا دل پھڑکنے لگا۔ جی چاہا کہ اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔

"میری بات طے ہو گئی ہے...... ابھی تو فی الحال انگوٹھی پہنائی ہے مگر جلد ہی شادی کا پروگرام بن رہا ہے۔" اس نے سندیسہ سنایا۔

"ہائے سچ، کیسے...... مطلب کب ہوا یہ سب اور کون ہیں وہ ذاتِ شریف۔" وہ پُرجوش ہو گئی۔ بڑے دنوں بعد خوشی کی خبر سننے کو ملی تھی۔ رضا کی لگی بندھی روٹین اور کم وسائل میں وہ جیسے تیسے گزارا کر رہی تھی یہ اس کا دل جانتا تھا۔

"ذاتِ شریف دیکھے بھالے ہیں انجان نہیں ہیں، راشدہ خالہ کے بیٹے اسد سے بات طے ہوئی ہے۔" اس کی اطلاع پر اسے زبردست جھٹکا لگا۔ جس شخص کو اس نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا اسے عرشیہ کے سر تھوپ دیا گیا تھا۔ رضا کے ساتھ وہ...... بہرحال وقتی طور پر تنگی میں رہ رہی تھی کہ اس کے اپنے مسائل اور مجبوریاں بھی تھیں۔ مومنہ کی شادی کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ رقم وہ گھر بھیج رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی ان حالات سے نکل جائے گی اور پھر وہاں پاکستان میں دونوں بنگلوں میں اس کا حصہ بھی تھا لیکن اسد کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ عرصے سے وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا۔

"یہ کیا کر دیا اماں نے...... اس چغد کو تمہارے سر منڈھ دیا۔ راشدہ خالہ کو ہمارا ہی گھر ملا ہے ساری دنیا میں، تم انکار کر دو عرشیہ، کسی زور زبردستی میں نہ آؤ، انہیں اپنے غریب بیٹے کے لیے کہیں لڑکی ہی نہیں مل رہی ہو گی۔" وہ جوشِ جذبات میں بولتی چلی گئی۔

"اس میں کوئی زبردستی نہیں ہے ورشا، میری اپنی مرضی اس میں شامل ہے۔" اس نے پُرسکون انداز میں یہ انکشاف کر کے اس کی ہستی کو ہلا ڈالا۔

"اسد تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے عرشیہ، ساری عمر سر پکڑ کر روؤ گی تم۔ ابھی وہ ترقی سے کوسوں دور ہے۔ ہم لوگوں سے ان کے گھر کے حالات ڈھکے چھپے نہیں، خالہ نے ساری عمر کپڑے سی، سی کر اپنا بھرم جمایا ہے۔ ورنہ تو اُن کے ہاں کچھ بھی ایسا قابلِ ذکر نہیں۔" اس نے تیز لہجے میں دباؤ ڈال کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنا چاہا۔

"ورشا تم جذباتی ہو رہی ہو، دیکھو سطحی انداز میں سوچنا چھوڑو، اب ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور حالات کبھی بھی ایک سے نہیں رہتے۔ راشدہ خالہ نے فلیٹ بک کرایا ہے اور اسد نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر اسٹار پلازہ میں گارمنٹس کی دکان کی ہے۔" اس نے سادگی اور سکون کے ساتھ اس کی تمام باتوں کو جھٹلا دیا۔

اس نے تپ کر کال کاٹ دی اور دیر تک بیٹھی عرشیہ کی سادہ لوحی پر کڑھتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ راشدہ خالہ نے اپنی لچھے دار باتوں سے اماں کو عرشیہ کے لیے رضامند کر لیا ہو گا اور اسد کے بارے میں تو اسے سوچ کر ہی غصہ آ رہا تھا یا تو وہ اس کے لیے مجنوں بنا پھر رہا تھا اور اب عرشیہ سے شادی پر تیار تھا۔ وہ وہی لوئر کلاس ذہنیت کا مرد نکلا جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات بدل لیتے ہیں۔ ہر مرد کی طرح وہ بھی ہرجائی نکلا تھا۔ اسے اب تک یاد تھا کہ اس کے انکار کے بعد کس کس طرح اس نے ورشا کو راضی کرنے کی کوشش کی تھی۔ کتنے ہی آنے بہانے گھر کے چکر لگائے تھے مگر ورشا کا دل اس کے لیے موم نہ ہوا اور اب عرشیہ جیسی سادہ لڑکی اس کے جال میں آ گئی تھی۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کی شادی میں شرکت کرنے جائے گی تو اسد کو چار باتیں سنا کر اس کی طبیعت صاف کر دے گی لیکن رضا نے اسے بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔

"آگے مومنہ کی شادی آ رہی ہے، اس میں اکٹھے جائیں گے، ویسے بھی خرچے بے حد بڑھ گئے ہیں۔" وہ دل مار کر رہ گئی۔ ہر دن گن، گن کر گزارا اور اس کی شادی والے دن تک شرکت کے لیے تڑپتی رہی۔ اس نے زیادہ اصرار کیا تو رضا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اکیلی جا سکتی ہے لیکن پھر اس کی واپسی مشکوک رہے گی۔ وہ جانتی تھی کہ رضا پھر دوبارہ اسے یہاں لانے کا نام نہیں لے گا اور وہ پہلے کی طرح تنہا خوار ہوتی رہے گی اس لیے چپ سادھ لی۔

☆☆☆

ان دنوں وہ بہت مصروف تھا۔ راتوں کو بھی دیر سے گھر لوٹ رہا تھا اور چھٹی والے روز بھی النصر کے ساتھ یار دوستوں میں نکل جاتا تھا۔ وہ رضا کو ایسا نہیں سمجھتی تھی وہ بہت بے پروا اور بے حس شخص تھا اور

اسے اپنی بیوی سمجھ کر صرف تسکین کا ذریعہ بنا رکھا تھا کیا اس کی ذرا بھی اہمیت نہ تھی.... یہ احساس اسے ہر لحظہ مارے دے رہا تھا۔ اس کی ضروریات سے وہ قطعاً غافل بنا رہتا۔ اس کی کیفیت و حالت سے سراسر بے خبر بنا ہوا تھا اور ورشا بے بسی کے عالم میں کھلی آنکھوں سے اپنے خوابوں کے گھروندے کو بکھرتا دیکھ رہی تھی۔ شروع میں تو پھر بھی اس نے ورشا کا تھوڑا بہت خیال رکھا مگر اب تو بالکل بھی نہیں دیکھ رہا تھا اور چند دن سے تو بے حد چڑچڑا اور غصیلا ہو رہا تھا۔ اس روز بھی وہ رات کو بہت دیر سے آیا اور اگلی صبح وہ اس سے الجھ بیٹھی۔

''آخر ایسا کب تک چلے گا رضا؟ تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو، میں تمہاری بیوی ہوں، باعزت طور پر تمہارے نکاح میں آئی ہوں تم مجھ سے اس طرح کا سلوک کیوں کر رہے ہو۔ تم مجھے کیوں اگنور کر رہے ہو۔ دیکھو اگر تم پریشان ہو تو مجھ سے شیئر کرو اگر کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے ڈسکس کرلو۔ بعض اوقات کہنے سننے سے صرف دل کا بوجھ ہی ہلکا نہیں ہوتا مسئلے کا حل بھی نکل آتا ہے۔'' اس نے تو عام سے انداز میں بہت دھیرے سے یہ کہا تھا کہ مگر وہ بھڑک اٹھا۔

''میری سب سے بڑی پرابلم تم خود ہو۔ تم کیا میرے مسئلے شیئر کرو گی۔ پچھتا رہا ہوں میں تم سے شادی کر کے..... میں تو پہلے ہی یہاں بہ مشکل رہ رہا تھا میرے اوپر پہلے ہی اتنا بوجھ تھا اب بہن کی شادی کا بھی سارا خرچا میں ہی اٹھا رہا ہوں۔ تم کیا میرے مسئلے حل کرو گی تم تو خود میرے لیے مصیبت بن کر رہ گئی ہو۔ تمہارے یہاں آنے سے میرے اخراجات الگ بڑھے اور اُدھر گھر والے بھی ناراض ہو گئے اب مجھے انہیں وہاں پہلے سے زیادہ پیسے بھیجنے پڑ رہے ہیں۔'' وہ تو جیسے اسے باتیں سنانے اور لڑنے مرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ رضا کی تکلیف دہ باتوں سے جو رنج اسے پہنچا سو پہنچا خود اپنی ذات کی بے وقعتی نے بھی اسے رُلا ڈالا۔ رضا اتنا سنگ دل اور جذ سے عاری ہوگا یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس روح میں اترا سناٹا اس کے وجود میں گونجنے لگا۔ نے تو پھولوں بھرے راستے کا انتخاب کیا تھا اس کے لیے کانٹوں بھری شاخ ثابت ہو رہا تھا۔

رضا تو گرج برس کر جا چکا تھا اس کے دل اتری اداسی اتنی گہری تھی کہ گہری ہوتی شام کا احساس نہیں ہوا۔ اس کے درد کو سمیٹنے اور آنسو پوروں پر چن لینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ انصر کب کے سامنے آکر بیٹھا اسے معلوم ہی نہیں ہوا۔ چونکہ اس فلیٹ کا تیسرا فرد تھا اس لیے ان دونوں حالات اور تعلقات سے بھی کسی حد تک آگاہ تھا۔

''کیا آج رضا نے پھر لڑائی کی ہے؟'' وہ کے قدموں میں دوزانو بیٹھ گیا۔

''پھر.....؟'' وہ طنزیہ بولی۔ ''ہر وقت لڑائی ہی ہے۔ کبھی دوستی ہی نہیں ہوتی۔'' وہ شکستہ دلی سے بولی۔

''ارے بھابی..... میاں بیوی کی لڑائی تو گھڑی بھر کی آنکھ مچولی ہوتی ہے۔ رضا ایسا ہے، وہ دل کا بہت اچھا ہے۔'' اس نے تسلی دی۔

''بس رہنے دو، رضا کی وکالت تم نہیں کرو۔''

''تو کون کرے گا۔ آخر وہ تمہارا دوست ہے، بات تو یہ ہے کہ وہ محبت سے عاری، مُردہ احساسا رکھنے والا شخص ہے۔ اسے کسی کی تکلیفوں پریشانیوں سے کوئی غرض نہیں۔'' وہ بالکل ہی بد ہوگئی تھی۔

''اچھا، ذرا اٹھ کر آئینے میں خود کو دیکھیں خراب حال ہو رہا ہے، منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو آئیں۔ رضا کی باتوں کو دل پر نہ لیں وہ یوں ہی سیدھا بول دیتا ہے پھر بعد میں پریشان ہوتا ہے۔'' اس نے سادہ سے انداز میں اسے ہدایت دی۔

نیم دلی سے کمرے میں جا کر اپنا حلیہ درست کر آئی تو انصر چائے کے ساتھ پزا اور رول لیے ا

منتظر تھا۔

''واؤ..... یہ سب کس لیے؟'' اس نے مصنوعی بشاشت سے پوچھا۔

''آپ کو خوش کرنے کے لیے۔'' اس نے اسی انداز اور لے میں جواب دیا اور اس پر دونوں ہی ہنس دیے اسی وقت رضا چلا آیا۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا جیسے اس کا ہنسنا بھی اسے برا لگ رہا ہو۔

''اوہ..... بہت خوب، میری صورت دیکھ کر رونے لگتی ہو اور اب مزے سے بیٹھی ہنس رہی ہو۔'' اس نے انصر کا بھی لحاظ نہیں کیا اور اسے باتیں سنا دیں۔ اس کی ہنسی کو فوراً بریک لگ گئے۔ ایک شاکی نظر اس پر ڈال کر وہ اس وقت چپ رہی لیکن جب بعد میں کمرے میں گئی تو رہ نہ سکی۔

''آپ کو کم از کم انصر کا خیال کرنا چاہیے۔ کیا سوچے گا وہ ہمارے بارے میں..... پھر آپ نے ساتھ بیٹھ کر چائے بھی نہیں پی۔ کتنا محسوس کیا ہوگا اس نے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''پہلے خود اپنے بارے میں سوچو پھر کسی اور کے بارے میں سوچنا۔ کیا لگتا ہے وہ تمہارا جو تم اس کے ساتھ بیٹھی گپیں مار رہی تھیں۔'' اس نے تاک کر ایسا وار کیا کہ وہ بلبلا گئی۔ یہ تو سراسر الزام تھا اس کے کردار پر اس نے ہمیشہ انصر کو بھائی سمجھا تھا۔

''رضا..... سوچ سمجھ کر بولیں ذرا۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''سوچنے سمجھنے کو اب کچھ نہیں رہا۔ خرچے پر خرچے اٹھا کر میں بالکل خالی ہو چکا ہوں اور مزید قرض دار بھی۔ ابھی تو میری ہی شادی کا قرضہ نہیں اترا تھا اور اب تو جاب سے بھی گیا۔ چار مہینے ہو گئے ہیں مجھے خوار ہوتے ہوئے مگر جاب نہیں مل رہی۔ میں تو انصر کے احسان کے بوجھ تلے دب گیا ہوں۔ پچھلے چار ماہ سے وہی ہمارے اخراجات برداشت کر رہا ہے اور میں اسے کرایہ بھی نہیں دے پایا۔ نہ ہی میں مومنہ کی شادی میں شریک ہو سکا اور اوپر سے تم اس سے میٹھی باتیں مٹھار رہی ہو، قہقہے لگا رہی ہو۔'' اس روز جیسے اس کا سارا ضبط جواب دے گیا اس کی باتوں پر ورشا تو سن بیٹھی رہ گئی۔ اسے تو آج ہی معلوم ہوا تھا کہ رضا کا کتنا برا حال ہو چکا ہے اور یہ کہ انصر بے چارہ مفت میں ان کا بوجھ ڈھو رہا ہے۔ اسے ڈھیروں شرمندگی نے آلیا۔

حالات بہت غیر یقینی اور قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ رضا رات، رات بھر گھر سے غائب رہنے لگا۔ پہلے پہل تو وہ سمجھتی رہی کہ اس نے نائٹ شفٹ میں ملازمت کرلی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ رضا تو اپنا غم غلط کرنے رات بھر گھر سے باہر رہ رہا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی ہلکان ہوتی رہتی۔ مہیب تاریکی سے اسے خوف آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خواب کیا نیندیں بھی روٹھ گئی تھیں۔ انصر صبح وقت پر آجاتا تھا اور اس کی اداسی دور کرنے کے لیے کبھی اس کے لیے آئس کریم لے آتا تھا اور کبھی کولڈ ڈرنک..... وقتی طور پر اس کا دل بہل ضرور جاتا تھا مگر رضا کا درد ٹیس بن کر جسم و جاں میں اٹھتا رہتا تھا۔

☆☆☆

اس رات بھی رضا گھر سے غائب تھا۔ وہ بڑی دیر سے اکیلی بیٹھی اپنے حالات پر کُڑھ رہی تھی۔ وہ تو ہیرا سمجھ کر رضا کی طرف بڑھی تھی مگر وہ اس کے لیے کوئلہ ثابت ہوا۔ انصر بھی ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور اکیلے بیٹھ کر اسے شدت سے میکا یاد آرہا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد دروازے کا قفل گھوما تو وہ چوکس ہوگئی لیکن انصر کو دیکھ کر کچھ مایوس ہوگئی۔ اسے تو رضا کا انتظار تھا کیونکہ آج اس کی سالگرہ تھی لیکن اسے وِش کرنے والا کوئی نہیں تھا عرشیہ نے اسے برتھ ڈے کیک کوریئر کیا تھا۔ اس کی کسک مزید بڑھ گئی تھی۔

''انصر آج تم نے بھی دیر کر دی اور رضا کا تو روز کا یہی معمول ہو گیا ہے اتنی، اتنی دیر سے آتے

ہیں۔'' اسے دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ گئی کہ دل بے حد اداس ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے شدت سے کسی مہربان دوست کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو اس کے دل کی ہر بات سن لے۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ انصر کو اپنی برتھ ڈے کے بارے میں بتائے گی تو وہ ضرور اسے مبارک دے گا۔ انصر نے خاموشی سے اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف اچھال دیا اور بغور اس کی طرف دیکھا۔ آج وہ اسے کچھ بدلی ہوئی، نئی نئی سے لگ رہی تھی لیکن ورشا ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کر پائی۔

''رضا نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم تو آ گئے ہیں ناں جان۔ آؤ میرے قریب آؤ، میرے دل کو خوش کر دو۔'' اس کی کلائی پکڑ کر وہ وارفتگی سے بولا۔

ورشا نے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر اس کی کلائی اس کی وحشیانہ گرفت میں تھی۔ اس نے حیرت و غصے سے انصر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور چہرے پر عجیب خباثت تھی۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ انصر پر کوئی آسیب ہو گیا ہے مگر جب بدبو کا ناگوار بھبکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا تو وہ سمجھ گئی کہ انصر ڈرنک کر کے آیا ہے۔ اس نے پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیلنا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا اسی وقت معجزانہ طور پر رضا چلا آیا۔ ایک لمحے کے لیے انصر کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ سرعت سے اپنی کلائی چھڑا کر روتے ہوئے رضا سے لگ گئی۔

''رضا...... رضا یہ...... یہ بے غیرت مجھے......''

اس کی آواز اتنی زیادہ کانپ رہی تھی کہ جملہ بھی پورا نہیں ہو سکا لیکن توقع کے خلاف رضا نے اس سے ہمدردی کے بجائے بے حد سرد، کٹیلی اور قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور کراہیت سے اسے اپنے وجود سے علیحدہ کر کے دور کر دیا۔

''اچھا...... بہت خوب ڈراما کرنا آتا ہے تمہیں، مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ تم ضرور کوئی گل کھلاؤ گی۔ یہ ہنس ہنس کر باتیں یونہی نہیں ہوتی تھیں اور یہ...... یہ دھوکے باز، دوستی کے پردے میں مجھ سے دشمنی کر رہا تھا۔ میری پیٹھ میں چھرا گھونپ رہا تھا۔'' وہ جیسے کف اڑا رہا تھا اور ورشا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق ایک دم سپید چہرہ لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ رضا کے رکیک الزامات نے اسے نیم جاں کر دیا تھا۔ وہ اس کے سر کا سائبان تھا مگر اسے تحفظ نہ دے پایا تھا اور نہ محبت و مان بلکہ الٹا اسے سرِ عام رسوا کر دیا تھا...... چھاؤں دینے کے بجائے کڑی دھوپ میں لا کھڑا کیا۔ اِدھر انصر کا بھی سارا نشہ جیسے ہرن ہو گیا تھا وہ چور بنا رضا کے لگائے الزامات سنتا رہا۔

''تم خود پوچھ لو اس سے...... میرا کوئی قصور نہیں رضا۔'' وہ صفائی دیتے ہوئے رو پڑی۔

''تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اب تم اتنی بھی معصوم نہیں ہو۔'' وہ سنگ دلی سے بولا اور کمرے میں جا لیٹ گیا۔ وہ ساری رات ورشا نے کرسی پر بیٹھ کر روتے بلکتے گزاری نہ جانے بیٹھے بیٹھے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح اٹھی تو سر درد سے پھٹ رہا تھا اور رضا نہ جانے کب گھر سے نکل کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے مضمحل بکھرے وجود کو سمیٹتی کمرے سے باہر آئی۔ انصر بھی وہاں نہ تھا اور چیزیں کارپٹ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پہلے وہ بے جھجک اس کی چیزیں بھی سمیٹ دیا کرتی تھی۔ اس کے کپڑے بھی ٹھکانے پر رکھ دیا کرتی تھی مگر اب اسے اس سے سخت نفرت اور کراہیت محسوس ہوئی۔ وہ بوجھل قدموں سے کچن میں چلی آئی اور چائے کا پانی چڑھا دیا جب وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی تو اسے لاؤنج میں انصر کی آہٹ محسوس ہوئی۔ بے انتہا نفرت آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر وہ چائے پیالی میں ڈالنے لگی۔

''بھابی! ایک کپ چائے میرے لیے بھی۔'' وہ بالکل اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ خوف کی سرد سی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی اور انصر کی

جرأت پر اسے سخت حیرت ہوئی۔

''تمہاری ڈھٹائی پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ تم جیسا گھٹیا انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آئندہ میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرنا۔'' اس نے کڑوے لہجے میں اسے جھڑک دیا۔

''سوری بھابی، دراصل اس وقت میں اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔'' اس نے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کیا۔ ورشا نے پیالی اٹھائی تو چائے چھلک پڑی کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''تم نے میری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رضا تو مجھے ہی غلط سمجھ رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے رضا مجھ سے بدگمان ہو گئے ہیں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''بھابی، آپ کو نہیں پتا میں...... میں تو رشتوں کا ڈسا ہوا بہت تنہا شخص ہوں۔ میرے مال کی وجہ سے ہر کسی نے مجھے استعمال کرنا چاہا۔ میں بہت ٹوٹا ہوا شخص ہوں اور اس بے اعتبار دنیا سے نالاں ہوں...... میں جینا نہیں چاہتا مگر جی رہا ہوں۔ مجھ سے کسی کا نقصان نہیں دیکھا جاتا۔ میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ کسی کے ساتھ غلط ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں تو پہلے ہی آپ کے لیے پریشان ہوں۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔

ورشا نے بے اعتباری سے اسے دیکھا وہ اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کر سکی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ رضا اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پھیلانا چاہ رہا ہے اور کچھ بعید نہیں تھی کہ اسی نے اس کے خلاف رضا کے کان بھرے ہوں۔

''مجھے تمہاری کسی بھی بات کا یقین نہیں، یہ جھوٹے آنسو مجھے مت دکھاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔'' وہ

قابلِ غور

وقت اور سمجھ دونوں ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ہی ملتی ہے۔

کیونکہ

اکثر وقت پر سمجھ نہیں آتی اور سمجھ آنے تک وقت نہیں بچتا۔

مرسلہ: ماہ نور قیصر، راول پنڈی

اس پر چیخ پڑی۔

''میرا یقین کریں وہ آپ سے کبھی مخلص نہیں تھا اور نہ ہے۔ اس نے آپ سے شادی صرف گھر والوں کے لیے کی تھی ورنہ یہاں اسے نہ شراب کی کمی تھی اور نہ شباب کی۔ آپ کے آنے سے اس کی ساری سرگرمیوں میں خلل پڑا ہے، اسے آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ مستقل اسے ورغلا رہا تھا اور ورشا کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کچھ بھی اٹھا کر اس کے اوپر دے مارے۔ وہ رضا کی بیوی تھی اور اس کے دل میں رضا کے لیے گنجائش تھی۔ بے شک رضا نے ایک ہی جملے میں اس کی ہستی کو ارزاں کر دیا تھا مگر اس کا سبب بھی انصر ہی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رضا ایسا نہیں ہے۔

''چلے جاؤ یہاں سے...... جھوٹی سچی داستانیں کسی اور کو سناؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اکیلی ہوں۔ رضا اس وقت غصے میں تھا اور اگر ابھی وہ تمہارا یہ مکر دیکھ رہا ہوتا تو تمہارا دماغ ٹھکانے لگا دیتا۔'' اس کا ضبط جواب دے گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ شام کو رضا گھر لوٹا تو اس کا دل بے قابو ہو گیا۔ وہ ساری انا کو بالائے طاق رکھ کر اس کے پاس آ گئی۔

"رضا...... وہ ایک نمبر کا آوارہ ہے۔ میرا یقین کرو میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ وہ خود ہی پاگل پن پر اترا تھا۔" اس نے آزردگی سے کہا۔ وہ چپ رہا اور عجیب بے حسی سے اپنے کام میں مگن رہا جیسے کچھ نہ سنا ہو۔ وہ اس سے پہلے سے زیادہ بدگمان اور ناراض ہوگیا تھا اور ورشا کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

"رضا...... چلو یہاں سے...... ہم اپنا کوئی دوسرا بندوبست کرلیتے ہیں۔" اس نے جذباتی ہوکر رضا کا ہاتھ تھام لیا۔

"مگر میں ابھی جاب لیس ہوں اور انصر کے اوپر پڑا ہوں۔ میں اس کا مقروض بھی ہوگیا ہوں۔ چھ ماہ سے کرایہ بھی نہیں دیا ہے اسے۔" وہ کچھ نرم پڑا تو بات کرنے پر آمادہ ہوا۔

"پھر...... پھر اب ہم کیا کریں رضا؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"ایک صورت میں میرا قرضہ اتر سکتا ہے اگر تم ساتھ دو تو۔ جب تک مجھے جاب نہیں مل رہی تم جاب کرلو۔ ایک کافی بار میں ویٹرس کی جاب ہے... فی الحال۔" اس نے جیسے پہلے سے سب کچھ سوچا ہوا تھا۔

"نن...... نہیں رضا میں اس قسم کی جاب نہیں کرسکتی۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تو پھر ان سارے حالات کو خود سنبھالو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ رہو شوق سے انصر کے ٹکڑوں پر۔ اگر اتنی انا والی اور عزت والی ہو تو پھر انصر کو کیسے برداشت کررہی ہو۔ یہ دھول کسی اور کی آنکھوں میں جھونکنا...... صاف کہو کہ تمہیں انصر کا پیسہ نظر آرہا ہے اور تمہاری اس سے کمٹمنٹ ہوچکی ہے۔" وہ اس پر پھر الزام لگا رہا تھا۔

"رضا، بس کرو...... مجھے اور کتنا میری نظروں میں گراؤ گے۔ تم جیسا مرد جو اپنی بیوی کو کافی بار میں ملازمت دلوا سکتا ہے اس میں غیرت ہوتی ہے اور نہ شرم۔" وہ چیخ پڑی۔

"ہونہہ...... غیرت اور شرم! مجھے معلوم تھا میرے لیے کچھ نہیں کرسکتیں اور یہ جو مجھے غیرت شرم کا سبق پڑھا رہی ہو ناں اسے پہلے خود پر آز شوہر کے ہوتے ہوئے اس کے دوست سے تعلق رکھتے تمہاری حیا کہاں چلی جاتی ہے۔" وہ بالکل آپے سے باہر ہوگیا تھا۔

"رضا...... چپ کرو۔" اس نے چیخنا چاہا مگر کہ جسم سے جان نکل گئی۔ رضا طیش کے عالم میں سے باہر چلا گیا۔ وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا بیٹھ گئی اور اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ رضا ایسا ہوسکتا تھا۔ نہ جانے کب تک وہ آنسو بہاتی رہی یہاں تک کہ انصر چلا آیا اسے دیکھ کر اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

"مجھے معاف کردیں بھابی۔ میری ذرا کوتاہی سے سارا کام خراب ہوگیا لیکن میں بتادوں کہ رضا جیسا شخص بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے گھر والوں نے صرف پیسہ کمانے مشین بنا کر رکھ دیا ہے اسے۔ وہ پندرہ سال یہاں رہ کر صرف پیسہ کمارہا ہے۔ بیس سال کی عمر آیا تھا اور اب پینتیس برس کا مرد ہے۔ وہ اپنے پیاروں کے رویوں سے جذبات سے عاری شخص گیا ہے۔ بھابی مجھے آپ کی مجبوری اور بے بسی احساس ہے۔ میں نے اپنے باپ کو اپنی ماں پر ہاتھ اٹھاتے اور اس کے کردار کی تذلیل کرتے بارہا ہے۔ میں سب رشتوں کے ہوتے ہوئے بالکل اکیلا ہوں لیکن رضا کی طرح نہیں ہوں۔ مجھے نفرت ایسے مردوں سے جو عورت کی تذلیل کرتے ہیں انہیں حقیر اور بے مایہ سمجھتے ہیں۔ اس روز...... اس روز میری ماں کا فون آیا میرے پاس، انہوں نے مجھے کہ میرے باپ نے انہیں طلاق دے دی ہے اس روز غم غلط کرنے کے چکر میں یہ سب ہوگیا۔ سب کچھ نادانستگی میں ہوا۔ مجھے معاف کردیں بھابی۔" وہ ایک اونچا پورا مرد اس کے سامنے بیٹھ کر شکستگی سے اپنی ٹوٹی پھوٹی شخصیت کی پرتیں کھول رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ بولی۔ بس خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے اور مٹیالی سی شام میں اس کا سراپا بہت مایوس اور شکستہ لگ رہا تھا۔ زندگی جو صرف ایک بار ملتی ہے اور اس کی زندگی ایک کھیل اور مذاق بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جو حقیقت سے کام لے کر رضا کے لیے فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ آج اس سفاک حقیقت کے ہاتھوں لٹی پٹی برباد سی بیٹھی تھی کہ اس کا شوہر اس سے محبت تو درکنار رشتے کے تقدس کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔

اب اپنے گھر والوں کو اس معاملے میں شامل کرنا ازحد ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ اب رضا کو صرف ڈنڈے کے زور پر ہی سب کی مدد سے ٹھیک کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے اسے سب کا تعاون حاصل کرنا تھا۔ وہ جلد از جلد یہ کام کرنا چاہتی تھی مگر اسی رات رضا ایک نیا امتحان بن کر چلا آیا۔ اس کے ساتھ ایک چھریرے جسم کی طرح دار لڑکی تھی اور بڑی ادا سے اپنے نیم عریاں وجود کے ساتھ سب طرف کا معائنہ کررہی تھی۔

"یہ...... یہ کون ہے؟" وہ جو سمجھ رہی تھی...... چاہتی تھی کہ رضا اس کو جھٹلا دے مگر ایسا نہ ہوا۔

"یہ ہماری نئی ساتھی ہے بلکہ میری پارٹنر ہی سمجھو۔ میں نے اسے رہائش کے لیے جگہ دی ہے اور یہ کرایے کے طور پر ہمارا خرچہ اٹھائے گی۔ اب یہ یہیں رہے گی۔" رضا کی وضاحت کے باوجود ورشا کا ذہن سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا مطلب...... یہاں جگہ کہاں ہے؟ ایک ہی تو کمرا ہے ہمارے پاس اور لاؤنج انصر کے استعمال میں ہے پھر یہ کہاں رہے گی؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔

"میری جان، یہ ہمارے ساتھ ہمارا کمرا شیئر کرے گی۔ میں نے کہا ناں کہ میں نے اس سے ڈیل کی ہے۔" وہ ساری اخلاقی حدود پار کرگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ساری بات آئی تو دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اب تو سب کچھ برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ رضا نے نہ صرف اس کے کردار کے پرخچے اڑائے تھے اور اب مزید اخلاقی پستی کا مظاہرہ کرنے پر تیار تھا۔ اس نے اپنی ذات پر تو الزامات جھیل لیے تھے مگر اس مقدس رشتے کا تقدس پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اب اس کھوکھلے رشتے میں کوئی جان نہیں رہی تھی اور نہ ہی رضا کو اس کی ضرورت تھی۔

اس برے وقت میں انصر نے اس کی مدد کرکے اس کی واپسی کا سارا انتظام کرکے اپنی نادانستہ لغزش کا ازالہ کردیا تھا۔ وہ بار بار آخر وقت تک اس سے معافی مانگتا رہا تھا۔ جب وہ لٹی پٹی، ٹوٹی بکھری سی نڈھال وجود کے ساتھ واپس پاکستان پہنچی تو اس کا دامن بالکل خالی تھا...... اسے محبت ملی نہ عزت و مان اور سکون تو جیسے اب ساری عمر کے لیے ختم ہوگیا تھا۔ پیسہ اور خوش حالی کی چکاچوند وقتی تھی۔ اپنی لالچ میں وہ اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا چکی تھی۔

اس کی آمد پر عرشیہ بھی اپنے کم حیثیت کنگال شوہر کے ساتھ اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر آسودگی کی چمک تھی اور دامن میں محبت کے بے شمار پھول...... ورشا کے ہاتھ پیسہ آیا اور نہ محبت سوائے دکھ اور پچھتاوے کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کا خزاں رسیدہ وجود دیارِ ہجر میں بھٹک رہا تھا۔ زندگی کی ٹھوکر نے اسے سکھا دیا تھا کہ صرف محبتوں اور خلوص کی بنیادوں پر بننے والے گھر مضبوط اور پائدار ہوتے ہیں اور جہاں دل میں ریا، لالچ اور مفاد پرستی ہوتی ہے وہ گھر ریت کے گھروندے کی طرح ناپختہ اور عارضی ہوتے ہیں۔ اس کا گھر بھی ٹوٹ گیا تھا اور دل بھی...... آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کا دامن بھگو رہے تھے۔



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 8

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر وشر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آ... سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے... کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی... شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر... حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیا... کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی... بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر... دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین... سے آ کر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے یہ سب اس نے دادی کی محبت میں کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ... دل پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے شدید محبت کرنے لگا تو اس نے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ جوائن کر لیا تاکہ... قیام کو بڑھا سکے۔ حمزہ جو اَب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے ایک سیمینار کے سلسلے میں ایبٹ آباد جاتا ہے اور وہاں بی اماں کی سہیلی... کلثوم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو بچپن میں باقاعدگی سے سیالکوٹ آتی تھیں اور حمزہ بھی بی اماں کے ساتھ ایبٹ آ... کرتا تھا مگر 2005ء کے زلزلے کے بعد وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں... سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی... رابعہ کلثوم بواجی کے نام سے آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں۔ امراؤ بیگم جو اپنی والدہ زبیدہ خانم کا کوٹھا آباد کیے ہو... تھیں کی آمدنی کا ذریعہ زرنگار (میرال) بن جاتی ہے مگر صرف سردار مہرزاد خان نے اس کی کئی راتوں کے حقوق بر... معاوضے کے عوض اپنے نام کر لیے تھے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے... ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ)... کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربانِ خاص بندوں میں... ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے... کر لیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پا سکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی... اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔ دانیال، بینش کو اپنے گھر لے جاتا ہے بینش اخبار میں چھپنے... زرنگار کی تصویر دکھاتی ہے تو عافیہ اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ رابعہ کلثوم کی پوتی میرال کی تصویر تھی۔ زوئی پاکستان... آتی ہے لیکن نادر اسے ائرپورٹ لینے نہیں آتا۔ وہ فون کرتی ہے تو اس سے رابطہ نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنی پرانی پڑوسن اور سہیلی... کے پاس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔... الیکشن کمپین کے دوران یشل رئیس، مہرزاد کی شخصیت کے کچھ ایسے پہلوؤں سے آشنا ہوئی جو اَب تک سب سے مخفی... مہرزاد کے الیکشن میں جیتنے کے بعد زرنگار اسے بتاتی ہے کہ وہ میرال صلاح الدین ہے۔

اب آگے پڑھ...

"کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اس قدر پریشان ہو رہی تھیں۔" اس روز واپس آنے کے بعد بینش نے سوچا۔ اسے رہ رہ کر دانیال کی ممی کا اس کال گرل کی تصویر دیکھ کر سفید پڑ جانا، پریشانی کی حالت میں بار بار ان کا نفی میں سر ہلانا، ان کی آنکھوں میں اس لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے آنسو اور دانیال سے ان کا اصرار کہ ہر حال میں اس لڑکی کا پتا لگانا ہے، یاد آ رہا تھا۔

"وہ ایسے ہی ہے جیسے میری اپنی بیٹی ہو، دانیال جس طرح بھی ممکن ہے اس کا پتا لگاؤ...... اگر یہ رابعہ کی پوتی میرال ہی ہے تو پھر اسے ڈھونڈنا اور اس جگہ سے اسے نکالنا جہاں یہ جا پھنسی ہے، ہمارا فرض، ذمے داری ہے۔" وہ بار بار دانیال سے کہہ رہی تھیں اور وہ سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا۔ وہاں بیٹھے...

اسے اس کال گرل پر رشک آ رہا تھا یا اس سے حسد محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا بینش کو اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ لڑکی جو اچانک سے ان دونوں ماں بیٹے کی گفتگو کا مرکز بن بیٹھی تھی اور جس کے تذکرے کے دوران بینش کو اپنا آپ اضافی لگنے لگا تھا۔ نہ صرف اضافی بلکہ بے جگہ بھی......

"ضروری تو نہیں کہ آنٹی جو سمجھ رہی ہیں یہ وہی لڑکی ہو۔" دانیال سے اس نے یہ بات اس وقت کی تھی جب وہ اسے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" دانیال نے ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا تھا۔ "جو لڑکی ممی کے خیال میں وہ ہے، وہ تو بہت اجلی اور قیمتی تھی۔ صوفی صاحب کے حوالے سے ہر وہ شخص جو انہیں عزیز تھا ہمارے لیے بھی بہت قیمتی ہے۔"

"صوفی صاحب کون ہیں؟" بینش کو اس انجانی شخصیت کے بار بار تذکرے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔

"ہیں نہیں تھے۔" دانیال نے موڑ مڑتے ہوئے کہا۔ "وہ، وہ تھے جو زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے میرے لیے زندگی کی نوید دے گئے، وہ جن کی وجہ سے ہم نے ایک نیا راستہ پایا، زندگی کی بھول بھلیوں میں سلامتی کے ساتھ باہر نکلنے کا صاف اور سچا راستہ، صوفی صاحب نے اپنے علم کے دریا میں سے چند قطرے ہماری طرف بڑھائے اور ہم مزید بھٹکنے سے بچ گئے۔" اس نے گردن موڑ کر بینش کی طرف دیکھا۔ "شاید میں تمہیں بتا نہ پاؤں صوفی صاحب کیا تھے اور کون تھے۔"

کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بینش نے سر ہلا دیا۔ اس کے دل میں اب بھی وہ تپش محسوس ہو رہی تھی جو ایک کال گرل کی تصویر دیکھ لینے پر دانیال کی ممی اور بعد میں دانیال کے ردِعمل پر اٹھنا شروع ہوئی تھی۔

"اچھا تو یہاں ہے تمہارا گھر!" ایک نسبتاً چوڑی اور کشادہ گلی میں گاڑی روکتے ہوئے دانیال نے دلچسپی سے اس علاقے کو دیکھا، بینش کو نہ جانے کیوں عجیب سی خجالت محسوس ہونے لگی، وہ کیا سوچ رہا ہو گا وہ اتنے گنجان آباد اور غیر ترقی یافتہ علاقے میں رہتی تھی۔

"بہت دلچسپ جگہ ہے یہ۔" وہ آنکھوں سے دھوپ کا چشمہ ہٹا کر باہر دیکھتا ہوا بولا۔ "ہو سکتا ہے میں اپنی کسی سیریز آف پینٹنگز کے لیے اس ہی علاقے کو موضوع بناؤں، میں تصور کر سکتا ہوں کہ یہاں رہنا کتنا دلچسپ تجربہ ہو گا۔"

"اس کھلی گلی سے آگے تنگ اور پُرپیچ گلیاں ہیں اور ان گلیوں میں سر اٹھا کر کھڑے تنگ ماتھے اور اونچی منزلوں والے پرانے مکان، جن کے باہر گلی کی نالیاں ابلتی ہیں اور جگہ جگہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ جہاں کے مکین ایک دوسرے کی انتہائی ذاتی زندگیوں کے بارے میں اتنے ہی متجسس اور متعلق رہتے ہیں جتنے اپنی، اپنی عمومی زندگیوں کے بارے میں، جہاں کی خواتین کا پسندیدہ مشغلہ دوسروں کی شخصیتوں اور مسئلوں کے بخیے اُدھیڑنا ہے اور اس کام کے لیے ان کے پاس بے شمار وقت ہے۔" بینش نے اس کی بات کے جواب میں صرف سوچا اور مسکراتے ہوئے دانیال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آئی۔

"میں تمہارے گھر جانا اور چائے وغیرہ پینا ضرور پسند کرتا اگر مجھے فوراً واپس نہ جانا ہوتا۔" بینش خدا حافظ کہنے کے لیے ذرا سا جھکی تو وہ مسکرا کر بولا۔ "عاصم بھائی کی جو فائل میں نے راستے میں کسی کو دی ہے اسے اسکین کروانے کے بعد فیکس کروانا ہے اسی لیے مجھے واپس جانے کی جلدی ہے، ویسے۔" وہ ذرا رکا...... اور مسکرایا۔ "مجھے امید ہے کہ میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا، تم مجھے یہ ہی روایتی سی دعوت دینا چاہ رہی تھیں ناں کہ

آئیں میرے گھر چلیں اور چائے کا ایک کپ پئیں وغیرہ وغیرہ......" ہینش نے بنا سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ بات پر شکر کی سانس لینا چاہتی تھی کہ دانیال کو واپسی کی جلدی تھی اور اس کا بھرم رہ گیا تھا۔

"چلو پھر ٹھیک ہے یہ آفر ادھار رہی۔" اس نے ہنستے ہوئے سر ہلایا اور دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگا کر گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"توبہ توبہ...... میں کہاں تمہیں اپنے گھر آنے اور چائے پینے کی دعوت دے سکتی تھی۔" ہینش نے اس کے چلے جانے کے بعد اپنے گھر کی طرف جاتی گلی کا رخ کرتے ہوئے سوچا۔ "میری اماں تو ذرا سی مروت بھی قائل نہیں، وہ تو دروازے پر ہی چلّانا شروع کر دیتیں کہ میرے دیدوں میں سے شرم نکل گئی ہے جو میں ایک جوان جہان لڑکے کو گھر کی دہلیز تک ساتھ لے آئی ہوں۔" وہ سوچ رہی تھی۔ "اور پھر کسے خبر کہ ایسا کرنے کی پاداش میں ...... میری پڑھائی وڑھائی سب ختم کر دی جاتی اور مجھے گھر بٹھا لیا جاتا۔" اس نے گلی کی اونچی نیچی اینٹوں میں سے ایک نیچی اینٹ کے بعد اونچی اینٹ پر قدم پڑنے پر لڑکھڑاتے ہوئے سوچا۔

"تم مانو یا نہ مانو...... ہمارے ہاں آج بھی یہ ہی روایتیں چل رہی ہیں، اچھی بھلی پڑھتی پڑھاتی لڑکی کو گھر بٹھا لینے کے لیے صرف ایک یہ وجہ کافی ہے۔" اس نے دانیال کا تصور کرتے ہوئے اس کے گھر اور گھر کے پُرسکون اور سادے سے ماحول کو یاد کرتے ہوئے سوچا۔ ایسا ماحول جس میں دولت، علم اور دانش وری کی فراوانی کے باوجود ایک لطیف سی عاجزی اور سادگی رچی بسی تھی۔ اسے اس گھر اور گھر کے باسیوں پر رشک آیا تھا۔ "کتنی نامحسوس، ان کہی، ان سنی مگر مضبوط ذہنی ہم آہنگی ہے وہاں جس کا احساس میرے جیسے اجنبی کو بھی وہاں جاتے ہی ہونے لگتا ہے۔" اس نے سوچا تھا اور گھر پہنچنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے، کپڑے بدلنے اور چھت پر بیٹھے رہنے کے دوران بھی وہ اس گھر اور اس کے مکینوں کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔

"تہذیب اور شائستگی کی وہ جھلک کتنی خوب صورت اور قابلِ رشک لگتی ہے، دل بے اختیار چاہتا ہے کہ کاش میں بھی وہیں کی ایک مکین ہوتی۔" اس نے سوچا اور اسی پل اسے اخبار والی کال گرل کی تصویر یاد آ گئی۔

"کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اس قدر پریشان ہو رہی تھیں۔" اس کی سوچ کے دھارے نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا اور پھر وہ اس نکتے پر سوچے بغیر کہ اگر وہ وہی لڑکی تھی جو دانیال اور اس کی ممی سمجھ رہے تھے تو کیسے برے حالات سے دوچار ہو کر وہ بن گئی تھی جس کی تصویر ایک سستے مقامی اخبار نے ایک سیاست داں کی داشتہ کے طور پر شائع کی تھی، صرف اس لڑکی کے لیے رات گئے تک وہ رشک یا شاید حسد ہی محسوس کرتی رہی تھی۔ ہینش کی دنیا اور تجربہ اتنا محدود تھا کہ وہ اس معاملے کی حساسیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

"میں بہت خوش اور تمہارے کارڈز دیکھنے کو بے چین ہوں، اگرچہ عمدہ کھیل میں یہ ڈنڈی نہیں چلتی کہ ایک دوسرے کے پتے دیکھ کر بازی آگے بڑھائی جائے مگر کھیل کے اصولوں کے عین مخالف بھی میں یہ ڈنڈی مارنے کو بے چین ہوں میر ال صلاح الدین۔" مہرزاد نے پُرہجوم پریس کانفرنس میں اِدھر اُدھر سے آتے چند تیز و تند، کچھ خوشامدانہ اور کچھ دوستانہ سوالات کے جوابات دینے کے دوران بھی اس خصوصی نمبر سے آنے والے پیغام کا جواب ٹائپ کر کے بھیج دیا تھا۔ اس شام وہ پُرجوش تھا، اپنے مزاج کے برعکس اپنی خوشی کو ظاہر ہونے دے رہا تھا اور گفتگو کے دوران ہلکے پھلکے مذاق اور طنز کا استعمال بھی کر رہا تھا۔ اس قدر گہری، نامحسوس

مگر بھرپور مخالفت کے باوجود وہ یہ چومکھی لڑائی جیت چکا تھا جس کی بنیاد پر اس کے آئندہ سیاسی کیریئر کا رخ متعین ہونے والا تھا۔

"یہ ہوا کرتی ہے ایک اچھے گھڑ سوار، ایک اچھے نشانہ باز، ایک اچھے چالباز اور ایک ماہر کھلاڑی کی نشانی۔" اس رات پارٹی سربراہ کی طرف سے دیے گئے فتح کے جشن کو منانے والے عشائیے کے دوران ولایتی شراب کے سُرور میں ڈوبے اس کے ایک سیاستداں انکل نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا، ان سیاستداں انکل کا تعلق وڈیرا کلچر سے تھا اور وہ اس کے شہید والد کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

"تم نے میدان مار لیا برخوردار...... ایک ایسا میدان جسے مارنا ناممکنات میں شمار ہونے لگا تھا ان آخری دنوں میں جب اس عیار حسینہ کے دام میں پھنسنے کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔" انہوں نے اپنی والرس جیسی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"بھلا ہو تمہارے باپ کی تربیت کا جس نے تمہیں بدترین صورتِ حال سے مکھن میں پھنسے بال کی طرح نکلنا سکھا دیا۔" انہوں نے اس کے باپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

"اب موج کرو...... میدان کھلا ہے اور تمہارے سامنے موجود ہے، جس طرح چاہو اپنے گھوڑے دوڑاؤ، پانچ میں سے ساڑھے چار سال جو باقی رہ گئے ہیں تمہیں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ عرصہ آقاؤں نے ہمارے حق میں لکھ دیا ہے۔" انہوں نے لکھنے کے سے انداز میں اپنی انگلیاں ہوا میں نچائیں۔ "بے خطر ہو کر اپنی محبوبہ بلکہ محبوباؤں کے ساتھ سرِ عام گھومو پھرو، تمہاری شہرت اور نیک نامی کو کچھ فرق نہیں پڑے گا، ہاں بس۔" انہوں نے رک کر ایک آنکھ بند کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "بڑے گھر کی حاضری اور وہاں موجود چندے کے بکس میں نذرانہ ڈالنا کبھی نہ بھولنا۔"

ان کی تعریفوں، نصیحتوں اور ترکیبوں پر دل اور دماغ میں اٹھتے غیظ کی ایک بھرپور لہر کے تحت ان پر پل پڑنے اور ان کا حلیہ بگاڑ دینے کی خواہش کو دل اور دماغ ہی میں دباتے ہوئے اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر ہلانے ہی پر اکتفا کیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے کہاں کیسا ردِعمل ظاہر کرنا تھا، جب ہی اس جشنِ فتح کے رنگ و بو میں موجود مرد و زن کی نظر آتی تمام حرکتوں سے اس نے اپنے باطن کی نظریں چرا رکھی تھیں۔ اس کی ظاہری نظریں دیکھتی تھیں، مسکراتی تھیں، دوستانہ ردِعمل ظاہر کرتی تھیں۔ آج کا دن بظاہر اس کا دن تھا، آج کی رات بظاہر اس کی رات تھی مگر حقیقت میں وہ اس صدیوں پرانے نظام کی فتح کی ایک اور رات تھی جس کی پہلے سے چلی آتی کڑیوں میں حالیہ اضافہ کرتے ہوئے وہ بھی ایک کڑی کی طرح اٹک چکا تھا، اسے اس شباب و شراب کو، عیار شکلوں، مکار آنکھوں، شیطان لہجوں اور شاطر منصوبوں کو دیکھنا، سننا بھی تھا اور برداشت بھی کرنا تھا اور برداشت کے ان بوجھل لمحوں کو گزارتے ہوئے یہ بھی سوچنا تھا کہ وہ اس کل کا حصہ رہتے ہوئے خود کو اس سے الگ کیسے رکھنے والا تھا۔

☆☆☆

اس نے بارش میں بھیگنے کے بعد خشک ہوتی زمین میں گڑے اس کائی زدہ سنگی بینچ پر بیٹھے، بیٹھے افسردگی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان صاف اور نکھرا ہوا تھا، دن کی روشنی میں اس کی نیلاہٹ قدرے مدھم پڑ رہی تھی۔ فضا میں ہلکا سا سکوت تھا جسے اردگرد بکھرے درختوں پر آ بیٹھنے اور پھر اُڑ جانے والے پرندوں کی آوازیں کبھی کبھار توڑ رہی تھیں، یہ اس فارماسوٹیکل کمپنی کا عقبی حصہ تھا جس میں وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کام کرتی رہی تھی۔

"اس ماحول کا حصہ اور اس ملک کی مستقل شہری بن جانے کی خواہش کچھ اتنی ناجائز بھی نہیں تھی کہ پاداش میں مجھے ایک نہ ختم ہونے والی سزا سنا دی جائے۔" اس نے مینوفیکچرنگ پلانٹ کی عمارت کی عقب میں گڑے لوہے کے پائپوں سے باہر آتے کیمیکلز ملے گدلے پانی پر نظریں جماتے ہوئے سوچا۔

"کہاں چلے گئے ہو نادر تم...... کدھر غائب ہو گئے ہو؟" سسکیاں اس کے حلق میں دم توڑ رہی تھیں۔ یہاں اگرچہ اس وقت کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا لیکن کسی دم بھی کوئی آ سکتا تھا کیونکہ لنچ بریک کا وقت ہونے والا تھا اور کمپنی کا کیفے اسی حصے میں واقع تھا۔ یہاں وہ آزادی سے رو سکتی تھی نہ کسی سے اپنا دکھ کہہ سکتی تھی۔ صبح سے کمپنی کے مختلف شعبوں میں پھرتے اور نادر کے متعلق مختلف لوگوں سے سوال کرتے کرتے اس کی ٹانگیں اور ذہن تھکنے لگے تھے۔

"نادر کئی روز سے غیر حاضر ہے زوئی، اس نے چھٹی کی درخواست بھی نہیں بھجوائی۔ میں تو خود بھی اس کے بارے میں متفکر ہوں۔" پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والے نادر کے قریبی دوست ذوالقرنین نے اسے بتایا تھا۔

"کیا تم مجھے نادر کے گھر کا پتا دے سکتے ہو کیونکہ اس کا فون مسلسل بند ہے، میرے پاس اس سے رابطے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔" زوئی نے روہانسی ہوتے ہوئے ذوالقرنین سے درخواست کرنے کے انداز میں کہا تھا۔

"ہاں، یہ تو میں کر سکتا ہوں۔" ذوالقرنین کو یقیناً اس کی بے چینی پر حیرت ہو رہی تھی لیکن اس نے اظہار کیے بغیر کہا تھا۔

"لیکن میرا خیال نہیں اس کے گھر کا صرف پتا پا کر تم وہاں تک پہنچ پاؤ گی، تم اس شہر کے تمام راستوں سے واقف نہیں ہو، نادر کا گھر شہر سے تقریباً باہر ایک ایسے علاقے میں ہے جو آبادی بڑھنے کے باعث شہر کا حصہ بن گیا ہے لیکن وہاں پہنچنا ایک اجنبی کے لیے یقیناً مشکل ہو گا۔" ذوالقرنین نے کہا تھا۔

"پھر بتاؤ میں کیا کروں، کیسے پہنچوں؟" زوئی بالکل ہی رونے والی ہو رہی تھی۔

"تم ایسا کرو لنچ بریک تک انتظار کرو...... میں کوشش کرتا ہوں کہ مجھے بریک کے بعد آدھی چھٹی مل جائے پھر میں تمہیں خود وہاں تک لے جاؤں گا۔" ذوالقرنین کو شاید اس کی حالت پر رحم آنے لگا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے، میں اس وقت تک انتظار کر لیتی ہوں۔" زوئی نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا اور پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر آہستہ قدموں سے چلتی اِدھر آ گئی جہاں اس وقت وہ بیٹھی تھی۔ نادر کے متعلق پریشانی اور وہم لمحہ بہ لمحہ بڑھتے جا رہے تھے اور وہ بے چینی سے ذوالقرنین کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سورج رخ بدل رہا تھا اور درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہی زوئی کی وحشت بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نادیہ کی زندگی ایک لگی بندھی روٹین کے ساتھ گزر رہی تھی۔ جس اسپتال میں انہوں نے میڈیکل کالج کے بعد ہاؤس جاب کیا تھا، اب اسی اسپتال میں وہ سینئر میڈیکل اسپیشلسٹ کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ ان کا دن اسپتال کی ڈیوٹی میں گزرتا اور شام کے وقت وہ اپنے کلینک پر مریض دیکھتی تھیں۔ اپنے شعبے میں اب تک ان کا اچھا خاصا نام بن چکا تھا اور اس شہر کے مشہور ڈاکٹرز کی فہرست میں ان کا نام بھی درج تھا۔

اس لگی بندھی روٹین سے ہٹ کر اُن کی زندگی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی بیٹی علینہ کے لیے البتہ وہ فکر مند رہا کرتی تھیں۔ علینہ کی شخصیت میں کئی قسم کی کمیاں دیکھ کر اب کبھی کبھار انہیں خیال آنے لگا تھا کہ ان کمیوں اور خامیوں کا سبب خود اُن کی اپنی ذات تھی۔ انہیں اپنی دانستہ مصروف زندگی کے کئی پرانے دن یاد آتے، ایسے دن، جن میں اگر وہ چاہتیں تو علینہ کو توجہ اور وقت دے سکتی تھیں، ان کے وقت اور ان کی توجہ کی کمی ہی وہ دو وجوہات تھیں جو علینہ کی خامیوں کا تجزیہ کرنے پر انہیں نظر آتی تھیں۔ علینہ سوشل تھی، نہ ہی گھریلو کاموں کی کوئی شُدبُد رکھتی تھی۔ اسے فیشن میں کوئی دلچسپی تھی نہ ہی دنیا کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے میں۔ نادیہ، علینہ کی شخصیت کو دیکھتی اور کڑھتی تھیں لیکن اپنے ہاتھوں وہ اسے جن خطوط پر اٹھا چکی تھیں، وہ خطوط پختہ ہوتے نظر آرہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتیں کہ وقت پر انہیں عقل آگئی تھی جو انہوں نے علینہ کو مزید پڑھنے کی اجازت دے دی تھی اور علینہ کی بدشوقی بھی کم از کم پڑھنے کے معاملے میں شوق میں ڈھل گئی تھی۔

''اب جاکر اگر میں اس کے معاملات میں دلچسپی لینے لگوں، یہ دیکھنے کی کوشش کروں کہ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد کیا کرتی رہتی ہے تو شاید اسے یہ مداخلت اچھی نہ لگے کیونکہ وہ اس کی عادی ہی نہیں۔'' کبھی انہیں یہ خیال ستاتا۔ ''اس کے بچپن سے اب تک میں نے اس کے ساتھ رعب داب، ڈسپلن پسند ماں کا سا رویہ رکھا، میرے لاشعور میں تو شاید اپنی ناکام زندگی کے اسباب کلبلاتے تھے مگر کبھی میں نے ٹھہر کر یہ کیوں نہیں سوچا کہ ان اسباب میں علینہ کا تو کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ تو خود بھی میری ناسمجھیوں اور بے عقلی کے فیصلوں کا شکار ہوئی۔ گھر والوں سے بغاوت کر کے شادی کے نتیجے میں وہ وجود میں آگئی پھر اپنے باپ کی بے وقت موت کے بعد میرے روزی روٹی کمانے کی تگ و دو میں وہ سراسر عدم توجہی کا شکار ہوئی اور پر سے میری سخت گیر طبیعت نے اسے پنپنے اور خود اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا عادی ہی نہیں بننے دیا۔'' اس شام بھی وہ اپنے کلینک میں بیٹھی مریضوں کی آمد میں وقفے کے دوران اپنا بے رحمانہ تجزیہ کرنے میں مصروف تھیں۔

''جلنے اور کڑھنے کے بجائے اب بہتر حل یہ ہے کہ کچھ دیر علینہ کو آزادی دے کر خود انحصاری کا عادی بننے دینا چاہیے اور بغور مشاہدہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے لیے کیا اور کیسے فیصلے کرتی ہے۔'' انہوں نے اپنے طور پر اپنی الجھنوں سے نکلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا۔ اسی وقت ان کے کلینک کے ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر انہیں اگلے مریض کی آمد کی اطلاع دی۔

''ہاں، بھیج دو۔'' انہوں نے خود پر پیشہ ورانہ موڈ طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جی...... فرمایئے......'' آنے والے مریض سے ریسپشنسٹ کے ہاتھ سے تیار کردہ پیشنٹ فائل لیتے ہوئے انہوں نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''السلام علیکم آنٹی...... آئی ایم سوری میں یہاں اپنا معائنہ کرانے نہیں بلکہ آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔'' جواب میں اُن کے سامنے بیٹھے نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

''آں ہاں......'' ان کے چشمے کے اوپر سے خود کو دیکھنے پر وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''بے فکر رہیے، معائنہ فیس میں نے ریسپشن پر جمع کروادی ہے، آپ کا وقت بلا معاوضہ لینے کی گستاخی نہیں کروں گا میں۔''

''معاف کرنا بیٹا، میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔'' اپنے مزاج کے خلاف وہ نرمی سے بولیں۔

''میرا نام فہد ہے، فہد رضا، مسز ناجیہ رضا کا بیٹا...... وہی جو آپ کے ہمسائے میں رہتی تھیں، کئی سال

پہلے۔ ''لڑکے نے اپنا تعارف کروایا۔

''ہاں، ہاں۔'' وہ آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے بولیں۔ ''خوب یاد آیا، ارے بھئی تم کہاں رہے اتنے سال اور تمہاری ممی کیسی ہیں؟ کہاں ہیں؟'' انہیں نہ جانے کیوں اس لڑکے کی آمد پر خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

نگین نے انتہائی بور ہوتے ہوئے اس کمرے کے در و دیوار کو بلا مبالغہ کوئی دسویں بار دیکھا، کمرے میں کسی متوسط گھرانے کے ڈرائنگ روم ہونے کے تمام لوازمات موجود تھے، یہ اور بات کہ اُن کی میزبان خاتون بار بار اس کمرے کو بیٹھک کے نام سے موسوم کر رہی تھیں۔ دو صوفہ سیٹ، تین چار میزیں، کھڑکی کے پردے دیواروں پر سجی اللہ، محمد ﷺ کے پاک ناموں سے مزین وال پینٹنگز، ایک بڑا پھولدان جس میں مصنوعی آرائشی بیلوں اور پھولوں پر دو مصنوعی چڑیاں بھی بٹھائی گئی تھیں، سستے ڈیکوریشن پیسز کی کسی دکان سے خریدے پلاسٹر آف پیرس اور شفاف شیشے کے چند گڈے گڑیاں، آئل کلرز میں پینٹ کی ہوئی ایک بھدی پینٹنگ جس میں کسی رہٹ کے چلنے اور گاؤں کے کھیتوں کا لینڈ اسکیپ پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دسویں بار ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے وہ واقعی بہت بور ہونے لگی تھی، جمائی لینے کی خواہش اس کے بند ہونٹوں سے ٹکرا کر واپس مڑ رہی تھی، نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور جسم پر تھکان سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی ساس اور میزبان خاتون ایک دوسرے سے اور ایک دوسرے کے خاندانوں سے تفصیلی تعارف حاصل کرنے میں مشغول تھیں۔

''میرے سوہرے (سسرال والے) امرتسر کے خالص کشمیری تھے، پاکستان بننے کے بعد میرے دادے سوہرے نے کپڑے کا کاروبار شروع کیا تھا بھائی میں، اللہ نے بڑی برکت ڈالی، کلیم کا پیسہ سارا جھونک دیا کاروبار میں، ریشمی اور زردوزی کے کام والے کپڑے کے خریدار دوسرے شہروں سے اِدھر آتے تھے ہماری دکان سے کپڑا خریدنے۔'' میزبان خاتون فخر سے بتا رہی تھیں۔

''ہمارے سسر تو پارٹیشن سے پہلے ہی لاہور میں سیٹل ہو چکے تھے۔'' اس کی ساس نے ٹشو پیپر سے پسینہ پونچھتے ہوئے نزاکت سے کہا۔ ''آئرن اسٹیل کا کام تھا اُن کے باوا کا، ماشاء اللہ تب سے چلتی برکت میری شادی کے بعد بھی چلی آ رہی تھی، پھر میرے بیٹے تو پڑھنے لکھنے، اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرنے میں لگ گئے، نوکریوں کی طرف چل پڑے، البتہ میرے جیٹھ کے بیٹے اب بھی باپ، دادا والا کام کر رہے ہیں اور لاہور شہر میں ہی ماشاء اللہ چار چار کوٹھیاں ہیں اُن کی۔'' نگین اس وقت اپنی ساس کے لہجے اور آواز کی چاشنی محسوس کر کے غلبہ پاتی نیند بھگانے میں مصروف ہونے لگی۔ یہ لہجہ یہ آواز کبھی کبھار ہی سننے کو ملتا تھا۔

''پیکے (میکے) میرے جموں کے مہاجر تھے۔'' میزبان خاتون نے اس کی ساس کے برعکس کھُردرے لہجے میں کہا۔ ''پہلے سیالکوٹ آئے پھر پسرور شفٹ ہو گئے، پسرور میں ماشاء اللہ میرے بھائیوں کا تھوک پرچون کا کاروبار ہے، شہر کے نام والے تاجروں میں.... شمار ہوتے ہیں وہ، یہ اونچے چوبارے ہیں سب کے وکھروں وکھ....''

''جموں کے مہاجر......؟'' ساس نے جیسے ذرا ناگواری سے دُہرایا۔ ''ہمارے خاندان میں جموں والوں سے رشتہ جوڑنے کا کم ہی رواج ہے۔''

''آئے ہائے تو یہ جو آپ کی نوں رانی ہے۔'' میزبان خاتون نے نگین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بھی تو خیر سے سیالکوٹ کی ہے، سیالکوٹ میں کشمیری آسمان سے آ کر تو نہیں ٹنگ گئے تھے۔''

''ارے کمال کرتی ہیں آپ، نگین کے میکے والے کوئی ایسے ویسے کشمیری نہیں ہیں اس کے دادا، پردادا کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے...... اس کے پردادا والیِ ریاست کے دربار میں اعلیٰ عہدے دار تھے، کئی شکاروں کے مالک، منقش لکڑی کا کاروبار کرنے والے نامور لوگ تھے، ان کے ہاں کے یخ دان اور صندوق ہندوستان کے کونے کونے میں منگوائے جاتے تھے۔'' ساس کی زبان سے اپنے خاندان کے بارے میں ایسی لن ترانیوں نے نگین کی نیند بالکل ہی اُڑا دی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے خاندان کے بارے میں غلط بیانی کر رہی تھیں لیکن اُن کی حاشیہ آرائی کا کمال تھا جو اس کی نیند یکلخت اُڑ گئی تھی۔

''ہاں جی، اِدھر پاکستان بننے کے بعد تو شاید یہاں خاک ہی اڑتی رہتی جو کشمیری برادری کے ہنرمند اِدھر نہ آتے۔'' میزبان خاتون نے نگین کے خاندان کے بارے میں اس کی ساس کی باتیں سن کر مزید اپنے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے بات لپیٹنے کی کوشش کی۔

''آپ یہ پیسٹری کھائیں ناں...... اور یہ کیا اسے کہتے ہیں۔'' انہوں نے ایک پلیٹ اس کی ساس کے سامنے رکھی۔ ''پتا نہیں کیا کر کے نام ہے اس کا۔'' انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میرے بیٹوں نے گورے والوں سے آرڈر پر تیار کروائی ہے، بیٹا جی بھلا کیا کہتے ہیں اسے؟'' انہوں نے فخریہ نظروں سے نگین کی طرف دیکھا۔

''چکن بریڈ......'' نگین نے نیچی آواز میں کہا۔

''ہاں وہی......'' وہ ہنسیں۔ ''مجھے اتنے اوکھے نام یاد نہیں ہوتے ناں!'' وہ سادگی سے بولیں۔

''آپ کے بیٹے کب آئیں گے؟'' نگین کی ساس نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''وہ خیر سے عصر کی نماز پڑھ کر آئیں گے، نماز کے ٹیم (ٹائم) وہ دکان ضرور بند کر دیتے ہیں، نماز کی بڑی پابندی ہے ہمارے گھر میں۔''

''اور آنٹی آپ کی بیٹی کب آئے گی یونیورسٹی سے؟'' نگین نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ جس مقصد کے لیے اس کی ساس اسے یہاں لائی تھیں وہ خاتون کی بیٹی کی آمد پر ہی پورا ہونا تھا۔ ان دنوں اس کی ساس اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھنے کی مہم پر تھیں اور لڑکی کو جانچنے پسند کرنے کے سلسلے میں نگین کے دیور نے صرف اور صرف نگین کی پسند پر اعتبار کرنے کا بارود بھرا اعلان کر رکھا تھا، اس کی ساس نے پہلے تو اس بارود بھرے اعلان کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر خطرہ نظر آتے دیکھ کر خاموشی سے اس مہم کے ہر حصے میں نگین کی ہمراہی قبول کر لی تھی۔ یہ تیسری لڑکی تھی جو دو ہفتوں کے اندر دیکھی جا رہی تھی اور اس تیسری لڑکی کی یونیورسٹی سے واپسی، ان دونوں کے اس کے گھر آنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی نہیں ہو رہی تھی۔

''آنے والی ہو گی بس۔'' نگین کے سوال پر میزبان خاتون نے نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دانت بھینچ کر زیرِ لب یقیناً اپنی بیٹی کو صلواتیں سنائی تھیں اور پھر نگین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''اصل میں اس کی کلاسیں بڑی لمبی ہوتی ہیں، وہ، وہ پڑھ رہی ہے ناں......'' انہوں نے چٹکی میں کوئی نادیدہ چیز پکڑ کر ہوا میں ہاتھ سے لہریں سی بناتے ہوئے کہا۔ ''آرٹشٹ پڑھ رہی ہے کیا اسے کہتے ہیں تصویریں بنانے والے، یہ جو سارے کام کرتے ہیں کاغذوں پر لکیریں کھینچ کھینچ کر۔'' انہیں وضاحت کرنی نہیں آ رہی تھی۔

''جی، جی، وہ تو آنٹی سکینہ نے بتایا تھا، فائن آرٹس پڑھ رہی ہے۔'' نگین نے اُن کی مشکل حل کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں......“ انہوں نے لفظ کو لمبا کھینچتے ہوئے یوں کہا جیسے اپنی مشکل حل کرنے پر نگین کو شاباش دے رہی ہوں۔

”نہ صبح ڈھنگ سے ناشتا کر کے جاتی ہے۔“ پھر وہ افسردگی سے نگین کی ساس کو بتانے لگیں۔ ”نہ دوپہر کا کھانا ٹیم سر (وقت پر) کبھی کھایا، کبھی نہیں کھایا، رات کو بھی تھوڑا سا کھا کے بس، چاول تو کھانے ہی نہیں نار جیسے قسم کھالی ہے۔“ ان کے لہجے کا دکھ بڑھا۔ ”کہتی ہے وزن بڑھ جاتا ہے چاولوں سے، بھلا بتاؤ وہ کشمیری ہی کیا جو چاول نہ کھائے، جو پائے نہ کھائے، ہریسے اور نہاریاں نہ کھائے، قسم لے لو آپا جی جو اس نے کبھی انگلی سے چھو کر بھی دیکھی ہوں یہ ساری چیزیں، سوکھے توس کھا کر چلی جاتی ہے، دودھ کا گلاس تک نہیں پیتی، شکل پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتی ہیں جب واپس آتی ہے، منہ اتنا سا ہو گیا ہے، رنگ کملا گیا ہے۔“ شاید وہ یہ باتیں پیش بندی کے طور پر بتا رہی تھیں تا کہ ان کی بیٹی کو دیکھ کر نگین اور اس کی ساس کو مایوسی نہ ہو۔

”پڑھنے والے بچوں کا آج کل ہر جگہ یہی حال ہے۔“ نگین کی ساس نے انہیں شاید تسلی دی تھی، اسی دم خاتون کے بیٹوں کی آمد پر یہ گفتگو اسی جگہ ختم ہو گئی۔ بیٹوں سے تعارف جاری تھا جب اس لڑکی کی آمد ہوئی جسے دیکھنے اور جس سے ملنے کے لیے وہ دونوں کب سے وہاں بیٹھی تھیں۔

وہ متناسب جسم اور روایتی کشمیری سرخ و سفید رنگت، تیکھے نین نقش کی حامل مجموعی طور پر ایک خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ نگین کو پہلی نظر میں وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اس گھر، گھر کے باقی مکینوں اور ماحول سے وہ بالکل مختلف نظر آ رہی تھی، اس نے گھر میں آئے مہمان دیکھ کر احتراماً انہیں سلام کیا اور پھر اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔ شاید اسے مہمانوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔

”بیٹھ جاؤ بینش، مہمان تمہارے انتظار میں ہی بیٹھے تھے۔“ اس کی والدہ نے اسے گھرکتے ہوئے کہا تھا۔

”کوئی بات نہیں، وہ تھکی ہوئی ہے اسے فریش ہو لینے دیں۔“ نگین نے اس کی طرف داری کرتے ہوئے کہا اور اپنے دیور کے رشتے کے سلسلے میں اپنا کردار نبھاتے ہوئے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو بینش تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں، وہیں تھوڑی گپ شپ بھی ہو جائے گی۔“

بینش مہمان کو یوں اپنے سر پر مسلط ہوتے دیکھ کر جز بز تو ہوئی لیکن مروتاً کچھ بولے بغیر اسے اپنے ساتھ لے آئی، وہ گھر اس علاقے کے روایتی گھروں سے چنداں مختلف نہ تھا، کشادہ صحن، صحن کے چاروں طرف محرابی برآمدہ اور برآمدے کے چاروں طرف کمرے، انہی قطار در قطار کمروں میں سے ایک میں بینش اسے اپنے ساتھ لے آئی، یہ کمرا نئے دور کی ایک مہذب طالبہ کا کمرا ہی لگ رہا تھا۔

”کافی لیٹ فارغ ہوتی ہو تم یونیورسٹی سے، ہے ناں......؟“ نگین نے بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بینش یقیناً ابھی تک اس کی بے تکلفی کے بارے میں تذبذب میں تھی۔

”نہیں، ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، آج کل ہم لوگ ایک خاص کمپین تیار کر رہے ہیں اس لیے دیر ہو گئی۔“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا!“ نگین مسکرائی۔ ”مجھے بھی بتاؤ گی اپنی کمپین کے بارے میں، مجھے بھی کسی زمانے میں آرٹ سے خاصا لگاؤ ہوا کرتا تھا۔“ وہ اس لڑکی سے ابتدائی تعارف حاصل کر لینا چاہتی تھی تا کہ واپس گھر جا کر اپنے دیور کو رپورٹ دے سکے۔

”نہیں، یہ آرٹ کمپین نہیں ہے۔“ لڑکی اٹھتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہم ایک دو اسٹوڈنٹس کی اپنی ذاتی کمپین ہے، کسی گمشدہ کی تلاش کے سلسلے میں۔“

''چلو جی، یہ بھی کسی گمشدہ کی تلاش میں ہیں۔'' نگین نے بینش کے کمرے سے جانے کے بعد لمبی سا[نس]
لیتے ہوئے سوچا۔ اس کے سامنے بیڈ پر وہ فائلز رکھی تھیں جو کچھ دیر پہلے بینش کے ہاتھ میں تھیں، اس نے
دھیانی میں اوپر والی فائل کا کور کھول دیا، کور کے اندر ایک سے سائز کے کتنے ہی ایسے کاغذ رکھے تھے جن پر ای[ک]
اسکین کی ہوئی تصویر پرنٹ ہوئی تھی اور نیچے موٹے حروف میں ایک عبارت درج تھی۔ ''آج کا سوال...
یہ تصویر میرال صلاح الدین نامی لڑکی کی ہے؟ اگر ہے تو کون بتائے گا اس نیک نام، باعزت لڑکی کو اس مق[ام]
تک پہنچانے والے ہاتھ کس کے ہیں جہاں آج یہ موجود ہے۔''

''میرال صلاح الدین۔'' نگین کے دماغ میں روشنی سی کوندی۔ ''یہ نام تو بہت مانوس سا ہے...... میر[ال]
صلاح الدین!'' اس نے ایک بار پھر ذہن میں دُہرایا۔

''آئی ایم سوری......'' اسی اثنا میں بینش ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے کمرے میں چلی آئی۔
''میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اس وقت مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''اوہ...... کوئی بات نہیں۔'' نگین نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''تم بے تکلفی سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔''

''آپ لیں گی۔'' اس نے چپاتی پر رکھی بھجیا کو چپاتی میں رول کر کے کھانے سے پہلے نگین کو دعوت د[یتے]
ہوئے کہا۔

''نہیں، میں چائے پی چکی ہوں۔'' نگین نے ہاتھ اٹھا کر منع کرتے ہوئے کہا اور دلچسپی سے بینش کو
رول چپاتی، چائے کے ساتھ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''ویسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔''

''یقیناً۔'' نگین مسکرا کر بولی۔ ''میں اور آنٹی میرا مطلب ہے میری ساس، پہلی بار تمہارے گھر آئے ہیں
تم سے اور تمہاری امی سے ملنے۔''

''اچھا......'' وہ ہاتھ روکتے ہوئے بولی۔ ''خیریت؟''

''ہاں خیریت...... بس یونہی ملنے چلے آئے۔'' نگین نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ''میرا خیال ہے
آنٹی اور تمہاری امی کی پہلے سے کچھ واقفیت ہے۔''

''اچھا۔'' اس نے رک کر غور کرتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے۔'' پھر وہ شانے اچکا کر بولی اور دوبارہ
کھانے میں مصروف ہوگئی۔

''بینش!'' نگین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''برا مت منانا، میں نے بے دھیانی میں تمہاری یہ فائ[ل]
کھول کر دیکھ لی۔''

''کون سی۔'' وہ ایک بار پھر رک کر بولی۔ ''اچھا یہ...... کوئی بات نہیں۔'' اس نے فائل پر نظر ڈالنے کے
بعد بے نیازی سے کہا۔

''بینش، یہ میرال صلاح الدین کون ہے؟'' نگین نے اس کے برا نہ منانے پر شکر کرتے ہوئے ا[س سے]
سوال کیا۔

''یہ...'' وہ کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولی اور ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ اور منہ صاف کر[تے]
ہوئے نگین کے سامنے آبیٹھی۔ ''یہ ایک گمشدہ لڑکی کا نام ہے۔'' اس نے فائل کھول کر ایک کاغذ نکالا اور اس[ے]
دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہمارا خیال ہے کہ یہ تصویر اس لڑکی کی ہے۔'' اس نے تصویر نگین کی نظروں کے سا[منے]

کی۔ ''لیکن آپ دیکھیں یہ تصویر دیکھ کر کسی شریف لڑکی کا نہیں بلکہ کسی طوائف کا خیال آتا ہے...... آتا ہے
ناں......؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے نگین کی طرف دیکھا۔

''ہاں شاید......'' نگین نے گھومتے دماغ کے ساتھ سر ہلایا۔

''بس ہم اسی کھوج کی مہم شروع کر رہے ہیں کہ یہ لڑکی اگر میرال صلاح الدین ہی ہے تو پھر اس جگہ کیسے
پہنچ گئی۔''

''لیکن میرال صلاح الدین کون ہے آخر......؟'' نگین نے گھومتے ہوئے ذہن میں اٹھتے خدشے کو
سوال کی شکل میں ڈھالتے ہوئے کہا۔

''میرال صلاح الدین ایک انتہائی شریف اور اعلیٰ نسب خاندان کی لڑکی تھی، اس کا تعلق آزاد کشمیر سے
تھا۔ دو ہزار پانچ کے زلزلے کے دوران یہ لڑکی اچانک غائب ہوگئی اور پھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کسی نے
اس کا سراغ لگانے کی کوشش اس لیے بھی نہیں کی کہ اس کا کوئی قریبی رشتے دار تھا نہ ہی عزیز...... صرف ایک
دادی تھیں جو زلزلے کا شکار ہوگئیں۔'' بینش نے رک کر نگین کی طرف دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش
کی کہ اس کہانی کا اس پر کیا اثر ہو رہا تھا، اس کی توقع کے برعکس اس کی سامع کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

''لوگوں کو...... میک بلیف (make belief) یقین کر لینے والی سچویشن میں لانا کتنا مشکل ہے،
اس کا تو ہمیں پچھلے دو دن میں بخوبی اندازہ ہو چکا۔'' یہ کہتے ہوئے اسے کیمپس کے در و دیوار اور درخت یاد
آرہے تھے جن پر یہ ہینڈ بلز جو دانیال نے بنائے تھے چسپاں تھے اور طلبا نے ان پر درج عبارت کی گہرائی میں
جانے کے بجائے ان پر الٹے سیدھے ریمارکس لکھے ہوئے تھے۔ کئیوں نے اس تصویر کی شکل بگاڑتے ہوئے
اس پر مارکرز سے داڑھی، مونچھیں بناتے ہوئے بے ہودہ شعر لکھ دیے تھے لیکن اس وقت جس لڑکی کو وہ میرال
صلاح الدین کی کہانی سنا رہی تھی، اس کے تو لگ رہا تھا کہ دل پر یہ کہانی ویسا ہی اثر کر رہی تھی جیسا پہلی بار یہ
تصویر دیکھنے پر دانیال کی ممی پر ہوا تھا۔

''اسی وجہ سے کئی سال تک کسی نے اس کے بارے میں یہ جاننے اور اس کا پیچھا کرنے کی زحمت نہیں کی۔''
اس نے نگین کو دوبارہ سے کہانی سنانا شروع کی۔ ''لیکن گزشتہ دنوں ایک مقامی اخبار میں اس کی یہ تصویر شائع
ہوئی اور اسے ایک نو آموز سیاست داں کی داشتہ قرار دیا گیا۔'' یہاں تک اپنی بات سناتے ہوئے بینش کی
آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ اس کی مخاطب تو لگتا تھا یہ کہانی یہیں تک سن کر بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

''وہ تصویر اتفاق سے ہمارے ایک کلاس فیلو کی مدر نے دیکھ لی، وہ میرال صلاح الدین کو کسی حوالے سے
جانتی تھیں، اس کی تصویر اور اس کا یہ کال گرل والا حوالہ دیکھ کر وہ سخت پریشان ہوئیں، انہوں نے اپنے بیٹے کو
اس کی کھوج لگانے کا کہا اور ان کے بیٹے نے اس کھوج کو ایک مہم بنا ڈالا۔ ہم چند لوگ اس مہم کا حصہ بن گئے
ہیں اور ابھی تک اس کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ میرال صلاح الدین امدادی کیمپ سے غائب ہوگئی تھی،
وہاں سے یہاں تک کا سفر کیسے طے ہوا اور اب یہ لڑکی کن ہاتھوں میں ہے، یہی جاننا ہماری جدوجہد ہے۔'' وہ
سانس لینے کو رکی۔

''بینش کیا تم چند ہینڈ آؤٹس مجھے بھی دے سکتی ہو؟'' اسے نگین کی لرزتی آواز سنائی دی۔ نگین یکایک
بھول گئی تھی کہ وہ اس گھر میں کس مقصد کے لیے آئی تھی، وہ حیران تھی قدرت کے اس اتفاق پر جس کی وجہ سے
اسے بینش کی فائل میں رکھے ان ہینڈ آؤٹس تک رسائی ملی اور پھر اس کی تفصیل جاننے کا موقع اور وہ پریشان تھی

اسے کیا سننے کو مل رہا تھا۔ اسے رہ، رہ کر حمزہ کا خیال آ رہا تھا۔ جس لڑکی کی تلاش میں وہ مارا، مارا خوار ہو رہا تھا
کہاں موجود تھی۔ "کیا کبھی اسے یہ خیال آیا ہوگا؟" کانپتے ہاتھوں سے بینش سے چند ہینڈ آوٹس جو اس
اسے بخوشی تھمائے تھے لیتے ہوئے اس کا معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑکتا دل سوچ رہا تھا۔

"آپ بھی پلیز اس کھوج کو ایک مہم بنانے میں ہماری مدد کیجیے۔" بینش نے اس سے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

"ضرور......" اس نے بدقت سر ہلایا تھا۔

"تم تو ایسا گئیں لڑکی کے ساتھ کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیا آخر تک، آخر کیا راز و نیاز ہو رہے تھے ان
سے؟" بینش کے گھر سے واپسی کے سفر میں اس کی ساس نے مشکوک ہوتے ہوئے سوال کیا تھا۔ یقیناً انہیں
خدشہ تھا کہ اس نے اپنی ممکنہ دیورانی کو ضرور اُن کے مزاج اور عادات کی کہانی سنائی ہوگی اور اسے بچ جاؤ
بورڈ بھی دکھایا ہوگا۔

"کچھ خاص نہیں۔" اس کے الجھے ہوئے ذہن میں اُن کی بات کے فوری جواب کی ہمت نہیں تھی۔

"صاحبزادے کے دماغ میں ہی خناس بھرا ہے کہ جہاں جایا جائے بھائی کو ساتھ لے کر جایا جائے۔" ا
اس کے مختصر سے جواب پر بھنا کر خود کلامی کے انداز میں بولی تھیں۔ "چاہے بھائی ہر جگہ جا کر معاملہ چوپٹ
کرتی پھرے۔" انہوں نے ناگواری سے سر جھٹک کر چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ لیکن ان کی کسی بات کے
جواب میں اپنی صفائی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی، اس کی نظروں کے سامنے رہ، رہ کر حمزہ کی وہ حالت آ رہی
تھی جو اسے وہ ہینڈ آوٹ دکھانے کے ردِعمل پر ہونے والی تھی۔

☆☆☆

"تم جانتی ہو کہ مجھے دنیا میں کسی بھی بات سے زیادہ اس بات پر خوشی ہو رہی ہے کہ تم زرنگار نہیں میرا ا
صلاح الدین ہو۔" کمرے کے خاموش ماحول میں مہرزاد کی بھاری آواز گونجی۔

"بہتر نہیں ہوگا کہ اگر آپ میرا حالیہ نام لینا پسند نہیں فرماتے تو یہ نام بھی مت لیں جو ماضی کے گورستان
میں دفن ہو چکا۔"

"ہم ماضی کے دفینوں کو ہی تو کھودنے والے ہیں۔" مہرزاد نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے سوال کر رہا
ہو کہ کیا وہ ایسا نہیں کرنے والے تھے۔

"میرے ہاتھ میں کھدائی کے اوزار ہیں نہ ہی اب یہ ہاتھ ...کھدائی کے قابل رہے ہیں لہٰذا ان دفینوں
کو دفن ہی رہنے دیا جائے۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"تم نے اپنے کارڈز میز پر رکھنے کا پیغام بھیجا تھا، بھیجا تھا ناں......؟" مہرزاد نے اس سے تصدیق
چاہی۔

"اور رہی اوزاروں کی بات......" اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے
بولا۔ "تو اوزاروں کی فکر مت کرو۔" وہ اس کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے ہاتھ تمہارے اوزار
ہیں۔" اس نے اس کے گھٹنے کے گرد بندھے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم ان ہاتھوں سے ماضی کے
دفینے کھودیں گے۔"

زرنگار کو مہرزاد کا خود سے اتنا قریب موجود ہونا نئے اندیشوں میں ڈال رہا تھا۔ "کیا آدمیوں کے
میں شامل ہو کر یہ شخص بھی انسان ہونے کی شناخت کھونے جا رہا ہے؟" اس کا دل رکنے لگا۔ "کیا برسوں کے

بعد قائم ہونا، بڑھتا، پنپتا، پھولتا اعتماد ایک بار پھر ٹوٹنے والا ہے؟" اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔ "کیا
ہے میری اوقات؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ "ایک تنہا اور بے بس لڑکی جو اس وقت اس چھت کے نیچے،
اس کمرے کی تنہائی میں اس طاقت ور مرد کے اختیار میں ہے، اختیار بھی وہ جو پیسے کی طاقت سے خریدا گیا ہے،
کیا اب اس وقت دنیا کی کوئی طاقت اس مرد کو اس کے کسی شیطانی ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روک سکتی
ہے؟" اس کا دل خوف کی گہری کھائی میں جا گرنے کو تھا۔

"بس۔" اسی لمحے وہ اس کے قریب سے اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا کھڑا ہوا۔ "اتنا ہی
اعتبار تھا، اتنا ہی اعتماد......" "تو کیا وہ اس کے اعتبار اور اعتماد کی آزمائش کر رہا تھا...... اس کے ذہن
میں جھماکا ہوا.......... اس نے گردن موڑ کر سردار مہرزاد خان کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں، گوشت پوست کا انسان ہوں، ابلیس میرے پیچھے لگا
رہتا ہے...... میں کوئی ولی ہوں نہ اوتار، نفس میرے ساتھ بھی ہے اور نفس کو ہوس کا روپ اختیار کرتے لمحہ بھر کی
دیر نہیں لگتی۔" اس آواز بھاری ہونے لگی۔

"اس لیے مت لو میرے نفس کا امتحان...... مجھے ایکسپلور کرنے کا جنون ہے، میرا یہی جنون مجھے تمہیں
جان لینے کی راہ پر لے آیا ہے، میں تمہیں تمہاری اس شخصیت کو جو اصل میں تمہاری ہے اور اس ماضی کو جو تمہارا
تھا، جان لینے کے جنون کا ہی تو قصوروار ہوں...... پلیز اس قصور کی اتنی کڑی سزا نہ دو مجھے۔" وہ بے بسی سے
اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو ایکسپلوریشن کا شوق ہے، کیچڑ میں کھلے پھول تک رسائی کا شوق، کیکر کی جھاڑیوں میں اُگے
پھول تک رسائی کا شوق، بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کو نظر بھر کے دیکھنے کا شوق......" وہ اپنے اعتبار اور
یقین کے بچ جانے پر شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے بولی۔

"اس لیے ناں کہ ان سب تک رسائی حاصل کر کے کسی فاتح کی طرح بندوق اٹھائے انہیں اپنے قدموں
میں ڈالے، دنیا کو دکھانے کے لیے ایک تصویر بنا سکیں اور اسے بتا سکیں کہ آپ کی فتوحات کا سلسلہ صرف
سیاست کے میدان تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ انسان، حیوان، چرند، پرند، زمین، خلا، آسمان سب فتح کرنے
کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"کم آن......" وہ اس کی بات پر برا مناتے ہوئے بولا۔ "مجھے کسی بھی قسم کی فتح کا کوئی شوق نہیں، اگر میرا
مقابل مجھ سے زیادہ ماہر جنگجو ہو تو...... مجھے کبھی بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے احترام میں اپنے ہتھیار
پھینک دینے میں کوئی باک نہیں ہوگا...... ہاں مقابل کو مجھے کنونس کرنا ہوگا کہ وہ ہر فن میں مجھ سے آگے ہے۔"

"پھر......؟" اس نے اپنی گہری آنکھوں کے بھاری پپوٹے اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"پھر یہ کہ اپنے باقی چھپے کارڈز بھی میز پر رکھ دو، ہم جوکر سے بادشاہ تک ہر کارڈز کو جانچیں گے کچھ
اس طرح سے کہ یکے تک بہ آسانی پہنچ سکیں۔"

"جانے دیں سردار صاحب، بغیر کسی جرم کے ہی سہی کسی چہرے پر ایک بار کالک مل دی جائے تو پھر وہ
چہرہ مقدس ترین پانیوں سے بھی دھو لیں کالک زدہ ہی رہتا ہے، میرا ماضی جو بھی اور جیسا بھی تھا، وہ حالات
اور واقعات کی کالک سے رنگا جا چکا ہے، آپ کے سب جتن مل کر بھی اس کالک کو دھو کر اس کا اصل چہرہ نہیں
کھوج سکیں گے۔"

''جو میری ذمے داری ہے اسے میری ذمے داری رہنے دو۔'' وہ اس کی بات سے ذرا سا بھی ... ہوئے بغیر بولا۔ ''تم وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت بھی آپ کی یہاں موجودگی کسی کن رس تک رسائی پا گئی تو آپ کی ... روزہ فتح ایک شرمناک اسکینڈل کے حوض میں غوطے کھانے لگے گی۔''

''مجھے بیرونی اور مفروضوں پر مبنی خطرات سے ڈرانے کی کوشش بیکار ہے میرال صلاح الدین، میں ... کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہوں کر کے رہتا ہوں ...... اس سلسلے میں میرا موٹو میرے ماتھے پر لکھا نظر آنا چا... تمہیں جو صرف دو الفاظ پر مشتمل ہے who اور dares صرف دو الفاظ پر۔'' وہ پُراعتماد آواز کے ساتھ بو...

''ایک ہزار راتیں۔'' زرنگار کی خاموشی پر اس کی آواز بلند ہوئی۔ ''جن میں سے کئی راتیں بیکار ... گئیں...... بیکار......'' اس نے زرنگار کی طرف دیکھا۔ ''ایسے بھی بیکار اور ویسے بھی بیکار......'' اس کا لہجہ معنی ... ہوا۔ اب جو باقی رہ گئی ہیں انہیں کارآمد بنانے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ کارآمد۔'' اس کی آواز ایک بار ... بلند ہوئی۔ ''کسی رنگ ہی میں سہی......'' وہ دو قدم آگے بڑھا...... زرنگار نے اپنے اور اس کے درمیان مو... فاصلے کو نظروں سے جانچا۔

''میرے اور اس کے درمیان...... ''وہ'' موجود ہے۔'' اس نے خود کو ایک بار یقین دلانا شروع کیا۔

''اور...... ''اس'' کے ہوتے ہوئے یہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔'' اس کا یقین ایک بار پھر مضبوطی پکڑ... لگا۔ ''ہاں شاید...... ''وہ'' بھی یہ چاہتا ہے کہ کیچڑ میں کھلے جس پھول تک اس کو رسائی مقصود ہے وہ اسے ... چاہیے کیونکہ آزمائش تو اس کی بھی ہو رہی ہے، امتحان تو اس کا بھی لیا جا رہا ہے پھر کیوں ناں اسے امتحا... گاہ سے جتنا جلد ممکن ہو فارغ کر دیا جائے۔'' اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ ... پر ساکت کھڑا تھا۔

''میرا تعلق صوبہ سرحد کے شہر ایبٹ آباد سے تھا۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کے مخاطب کے کان کھڑے ... تھے اور کھڑے بھی......

☆☆☆

شہر سے قدرے ہٹ کر ایک نسبتاً نئی اور کھلی آبادی میں نادر کا گھر تھا۔ وہ روٹ وین سے اتر کر پیدل چ... ہوئے ایک کشادہ گلی میں آگئے۔ ذوالقرنین اس سے آگے چل رہا تھا اور زوئی اگرچہ حتی الوسع اپنا چ... اسکارف سے ڈھکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ قریب سے گزرتے اور راستے میں کھڑ... مرد و خواتین ایک دفعہ رک کر ضرور اس کی طرف دیکھتے تھے۔

''بس یہ ایک منفی عادت نہ ہو یہاں کہ لوگوں میں تو کیا ہی بات ہے، رک کر یوں دیکھتے اور گھورتے ... جیسے کوئی عجوبہ ان کے درمیان آگیا ہو۔'' اس نے سوچا تھا۔

''یہ بس تین گھر چھوڑ کر آگے نادر کا گھر ہے۔'' ایک جگہ رک کر ذوالقرنین نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا......'' زوئی نے رک کر اس تیسرے گھر کے گیٹ کی طرف دیکھا۔

''تم جاؤ، بیل دو، جو بھی کوئی باہر آئے اس سے بات کرلینا۔'' ذوالقرنین نے پیچھے کی طرف مڑ... ہوئے کہا۔

''تم کہاں جا رہے ہو ذوالقرنین؟'' زوئی نے حیرت سے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔

''میں آگے نہیں جاؤں گا زوئی۔'' ذوالقرنین نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے نادر کی امی اور بہنوں سے خوف آتا ہے، اُن کے لمبے لمبے سوالوں کے جواب کون دے، اوپر سے نادر بھی غائب ہے، تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر تو وہ یہی سمجھیں گی کہ میں مینڈک اور سانپ کھانے والی قوم کی ایک لڑکی ساتھ لے آیا ہوں اُن کے گھر...... توبہ، توبہ ان کی غضب ناک نظروں کا سامنا میں تو نہیں کرسکتا۔'' اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''چھوت چھات کے مرض میں مبتلا ہیں وہ، کہیں گی مینڈک اور چوہے کھانے والی کو ہمارے گھر لا کر ہمارے صوفے پر بٹھا دیا، مروتاً ہمیں اپنے برتنوں میں اسے چائے شربت پلانا پڑی، بعد میں صوفہ دھونا اور برتن توڑنے پڑیں گے۔'' ذوالقرنین زیرلب مسکراتا واپسی کے لیے آگے بڑھ گیا۔

''ہاں، مینڈک اور چوہے کھانے والی قوم ہے۔'' اپنے مزاج کے بالکل برعکس زوئی نے ذوالقرنین کو بآواز بلند مخاطب کیا۔ ''اسی قوم کے بنائے ہوئے برتن استعمال کرتے ہو، ٹھیلوں اور فٹ پاتھوں سے اسی قوم کے دماغ کے شاہکار خریدتے ہو، اپنے گھر ان چیزوں سے سجاتے ہو، تمہارے گھروں میں تم لوگوں کے اپنے علاوہ ہر طرف چائنا کا مال ہی بھرا ہوتا ہے، جانتے ہوئے بھی کہ ہم اس مال پر کوئی گارنٹی نہیں دیتے، خریدے چلے جاتے ہو چائنا کا ریشم، چائنا کا شیفون، جوتے، ہینڈی کرافٹس، ڈیکوریشن پیس تمہاری زندگیوں میں رچ بس چکے ہیں...... اس کا مطلب ہر دوسری چیز پلید ہے تمہارے گھروں میں، چوہے، مینڈک اور سانپ کھانے والی قوم کی بنائی چیز۔'' اس نے زور سے پیر زمین پر مارا۔

ذوالقرنین نے اس کے ردِعمل پر دانت نکوستے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر اس گفتگو سے محظوظ ہوتا آگے بڑھ گیا۔ ذوالقرنین سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زوئی نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا...... دو تین خواتین اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

''اوہ......'' اسے خجالت محسوس ہونے لگی...... وہ تو بہت ٹھنڈے دماغ کی مالک تھی، اسے سال میں شاید ایک بار ہی کسی بات پر غصہ آتا تھا اور اس طرح کا ردِعمل تو شاید ہی اس نے کبھی ظاہر کیا ہو۔ ''بس جو پریشانی سر پر سوار ہے اس نے ایسا کرا دیا۔'' وہ معذرت خواہانہ نظروں سے ان خواتین کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنے روایتی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ایک طرف نیوڑاتے ہوئے ان خواتین کو اپنے تئیں خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

اب وہ نادر کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی، گھر کے دو گیٹ تھے، ایک بڑا اور دوسرا اس کے ستون اور بیرونی دیوار کے درمیان گڑا چھوٹا گیٹ جس کے باہر بنی دو، تین سیڑھیاں اس تک پہنچاتی تھیں۔ کال بیل اسی گیٹ کے ساتھ لگی تھی۔ اس نے کال بیل کے بٹن کو دبایا اور خود سر اٹھا کر اس گھر کی عمارت کو دیکھنے لگی۔ بیرونی دیوار کو بوگن ویلیا کی بیل نے ڈھک رکھا تھا اور اس میں آتشی اور سفید پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد اسے گھر کے اندر سے کسی کے پیر گھسیٹتے چلتے آنے کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟'' ایک زنانہ آواز تھی اور یقیناً کسی بڑی عمر کی خاتون کی آواز تھی۔

''مہربانی سے دروازہ کھولیں۔'' زوئی نے اپنی باریک سی آواز میں درخواست کی۔

''ہو کون تم......؟'' اندر سے آواز آئی ساتھ ہی گیٹ کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ ایک بڑی عمر کی خاتون نے ذرا سا گیٹ کھول کر باہر جھانکا اور زوئی کو اپنے سامنے پا کر ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔ زوئی کا دل دھک، دھک کر رہا تھا۔

"اچھا......!" انہوں نے زوئی کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں، ان چہرے پر انتہا درجے کی سنجیدگی برس رہی تھی۔

"اندر آجاؤ۔" پھر انہوں نے گیٹ پورا کھولتے ہوئے کہا۔ زوئی اپنی ٹانگوں کی لرزش پر قابو پا کوشش کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔

"ٹھہرو...... میں گیٹ بند کرلوں۔" خاتون نے اپنے سفید ململ کے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے جھک کر نظریں بالکل ہی لاک کے قریب کرتے ہوئے اس کا ہک ڈھونڈنے لگیں۔ لاک لگانے میں انہیں منٹ لگے، اس دوران زوئی رنگ برنگ پتھر جڑے اس گیٹ وے کو دیکھ رہی تھی جس پر اس وقت وہ کھڑی گیٹ وے کے آخر میں چھوٹا سا ایک گیرج تھا جس میں اس وقت صرف ایک سائیکل کھڑی تھی۔

"ہوں۔" لاک سے نمٹ کر خاتون زوئی کی طرف مڑیں۔

"یوں نہیں آتے اچانک۔" انہوں نے اپنی سانس کے زیر و بم کو قابو کرتے ہوئے کہا، اتنی سی مشق میں اُن کی سانس پھول رہی تھی۔

زوئی نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اطلاع دے کر آتے ہیں۔" انہوں نے اس کی نظروں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا اور اس کمر پر ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف چلیں، زوئی بھی ان کے ساتھ چلنے لگی۔

"مجھے پتا ہوتا تو میں تیل کی شیشی تو پکڑ لیتی ہاتھ میں۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتی کہہ رہی تھیں۔ "ہمارے گھرانوں میں بہویں پہلی بار گھر آئیں تو تیل ڈالتے ہیں دہلیز پر پہلے پھر بہو کو اندر لاتے ہیں۔" وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھیں...... "میں تو گھر میں اکیلی ہوں آج اور تم بغیر بتائے آ گئیں، میں نے کیا خا استقبال کرنا تھا۔" اُن کے لہجے میں تاسف تھا اور زوئی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اور یہ کیا......؟" پھر وہ اچانک رک کر کھڑی ہو گئیں اور زوئی کی طرف دیکھنے لگیں۔

"گڈی کاٹ کی شلوار کس نے سی دی تجھ انجان بے خبر کو۔" انہوں نے زوئی کے اہتمام سے پہنی شل قمیص پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور یہ دوپٹی؟" انہوں نے اس کے اسٹولر کو چٹکی میں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ "بیٹا نہ لباس ہی تو انسان کی شان ہوتا ہے۔" وہ دوبارہ سے چلنے لگیں۔

"ہمارے گھروں میں ایسی چھوٹی اور تنگ شلواریں قمیصیں نہیں پسند کی جاتیں، دوپٹے بھی بڑے، بڑ لیتے ہیں ہم لوگ۔" وہ اسے اپنے ساتھ لیے برآمدے میں کھلنے والے ایک کمرے کے دروازے سے ا لے آئیں۔ زوئی نے دیکھا یہ ڈائننگ روم اور ٹی وی لاؤنج نما کمرا تھا، جس کے ایک طرف گول ڈائننگ اور چار کرسیاں رکھی تھیں اور دوسری طرف ایک صوفہ سیٹ، ٹی وی ٹرالی اور ایک بیڈ سجا تھا۔

"بیٹھ جا......" انہوں نے ایک ڈائننگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنی سانس درست کرنے لگیں، ز اُن کے سامنے بیٹھ گئی۔

"ایک لحاظ سے اچھا بھی ہوا۔" پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ "پہلے سے اطلاع کر کے آتیں میری بیٹیوں نے سب کام چھوڑ کے چلے آنا تھا اور پھر چل میرے بھائی!" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "تیری شامت آ جانی تھی۔" انہوں نے دوپٹا منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نادر کی ماں ہوں۔" پھر وہ دوپٹا منہ سے ہٹا کر بولیں۔ "جوڑوں کی مریض ہوں، کچھ کام کر

سکتی۔" انہوں نے اپنے گھٹنوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پانی پینا ہے تو خود ہی اٹھ کر پی لو۔" انہوں نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہوں مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔

"لیکن پہلے ٹھہرو......" پھر ایک دم اُن کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "نادر تو کہتا تھا کہ چینی ہے تو کیا ہوا، گارنٹی مسلمان ہے۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں سر ہلایا۔ زوئی نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مسلمان ہے تو کلمہ تو سنا ذرا......! پھر ہاتھ لگانے دوں گی کسی چیز کو۔" زوئی نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح سر پر اسٹول رکھ کر ہل ہل کر کلمہ سنانا شروع کیا۔

"ہوں......" کلمہ سن کر انہوں نے امتحان لینے والے استاد کی نظر سے اسے دیکھا۔ "اور کیا آتا ہے تجھے، چل نماز سنا لیکن ٹھہر نماز نہ سنا الحمد شریف ہی سنا دے۔" زوئی نے اپنی باریک آواز میں سورۂ فاتحہ سنانا شروع کی۔

"ہاں ٹھیک تو ہے۔" انہوں نے جیسے اسے کچھ مثبت پوائنٹس دیے...... "لیکن یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ عربی بھی چینی میں سننی پڑ رہی ہے، مارچیاں، پیاں......" وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ "نماز آتی ہے؟" اگلا سوال آیا۔

"جی الحمدللہ۔" زوئی نے تیزی سے کہا۔

"چل شکر ہے اتنی عقل تو نادر نے کر لی، نسل تو اس کی چینی چپٹی ہو ہی جانی ہے لیکن مسلمان لڑکی سے نکاح کیا، چینی چپٹی ہے تو کیا ہوا۔" انہوں نے تصدیق کے سرٹیفکیٹ پر گویا مُہر لگاتے ہوئے کہا۔

"اوہ......" زوئی کی کب سے رکی سانس بحال ہوئی، نادر کے گھر پر آ کر وہ جس قسم کے رویوں کی توقع کر رہی تھی، یہ سب اس کے بالکل برعکس تھا، تشکر کے احساس کے تحت اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"ماں جی، نادر کہاں ہے؟" اس نے نادر کی امی کے حوصلہ افزا رویے سے ہمت پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"نادر کو پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔" وہ شکوے بھرے انداز میں بولیں۔ "مجھے تو کچھ نہیں بتاتے یہ لوگ، صبح نکلتا ہے، شام پڑے گھر واپس آتا ہے، نوکری شوکری پر کوئی نہیں جاتا مجھے پتا ہے۔" انہوں نے جیسے زوئی سے شکایت لگائی۔

"پتا نہیں کسی اور ہی چکر میں ہے، میں نے تو سوچا تھا کہ تیرے پیچھے چین جانے کی تیاری کر رہا ہے، مجھے غم لگتا تھا لو ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی گیا مگر تُو، تو خود ادھر ہی آ گئی ہے، یہ بتا نکاح میں اس نے تجھے کچھ چڑھایا بھی تھا کہ نہیں؟" وہ بازو میز پر رکھ کر آگے کی طرف جھکیں۔ "حق مہر کتنا لکھایا تھا بونتر نے؟" انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

"شرعی۔" زوئی نے مختصر جواب دیا۔ "ماں جی نادر کس وقت گھر آتا ہے؟" اس نے سوال کیا، اس کا ذہن نادر کی مصروفیت کی تفصیل میں اٹکا ہوا تھا۔

"آ جاتا ہے رات پڑے کسی وقت۔" وہ بے پروائی سے بولیں۔ "میں تو سوئی ہوتی ہوں اس وقت، اس کے پاس ڈبل چابی ہوتی ہے، آ کر پڑ رہتا ہے، میں کون سا اس سے بولتی ہوں۔"

"آپ نادر سے کیوں ناراض ہیں؟" زوئی نے پوچھا۔

"مجھے بتاتا جو نہیں اسے مسئلہ کیا ہے، میں نے اسے بلانا ہی چھوڑ دیا ہے، خود ہی معافیاں مانگ کر مجھے منائے گا۔" زوئی کو اُن کی سادگی اور معصومیت پر پیار آ گیا۔ اس گھر کے در و دیوار سے سادگی تو ٹپک ہی رہی تھی لیکن ایسا بھی لگتا تھا کہ اس کی صفائی پر کسی کی کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔

"یہ اِدھر بیچ کے آخر میں جو کمرا ہے وہ نادر کا ہے جا کر کمرا دیکھ لے۔" پھر انہوں نے زوئی سے
"میں نے تو کبھی جھانک کر بھی نہیں دیکھا اس کے کمرے میں، سوچتی تھی بہو آئے گی تو اس بے چارے
اس کے کمرے کی سنی جائے گی شاید، بہو نہ ڈھونڈی نہ بارات چڑھانی پڑی، اپنی دو ٹانگوں سے چلتی
آ پہنچی گھر، اللہ نے میری کمزور ہڈیوں کو رُلنے سے جو بچانا تھا۔" وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر ہنسیں۔ "مگر
بیٹیاں ہیں نہ بڑی کپتی (لڑاکا) ہیں ساری یہ ہی کہتی ہیں نادر کو میں نے پالا، میں نے پالا، بھلا بتاؤ اے
نے پالا تو میں کیا کھنو (گیند) سے کھیلتی رہی ساری عمر۔" وہ ہنستے، ہنستے دُہری ہونے لگیں۔ "انہوں نے
مچاتا ہے تجھے دیکھ کر۔" پھر وہ رازداری سے زوئی کے قریب جھکتے ہوئے بولیں۔ "تو بس ایسے کریں،
انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں بس چپ کر کے رہیں، وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں تو
ظاہر کرنا جیسے کچھ سنا ہی نہیں، کہنا مجھے تو اردو سمجھ آتی ہی نہیں، مجھ سے بات کرنی ہے تو چی شنگ می شنگ کرو
ایک بار پھر ہنسنے لگیں۔

"جا، جا کر کمرا دیکھ آ پھر باورچی خانے کی خبر بھی لیتے ہیں کچھ تو دال روٹی تجھے کھلاؤں گی کہ نہ
انہوں نے اپنائیت سے کہا۔ "پر ایک بات ہے تجھے باورچی خانے کا چارج نہیں دوں گی پورا، خود ہی
کروں گی، تیرا کیا پتا، مرغی کے بجائے مینڈک تل لے، مجھ خاک پٹی کو سمجھ نہیں لگے اور میں کھا جاؤں۔"

"ماں جی میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں پر مینڈک حرام ہیں۔" زوئی نے اس تذکرے پر
ہوتے ہوئے کہا۔

"پتا ہے، پتا ہے تو مسلمان ہے لیکن رہتی رہی تو، تو اُن کے ساتھ ہی ہے ناں...." انہوں نے سر ہلایا۔
انہیں دیکھو وہ جو بھارت میں رہتے ہیں، ہیں وہ بھی مسلمان پر سنا ہے راکھیاں، دیوالیاں مناتے ہیں، ہولی
کھیلتے ہیں، ساتھ رہنے سے بڑا اثر ہو جاتا ہے بچو جی میں سب جانتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ماں جی، شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" زوئی نے اٹھتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔ "میں
دیکھ آؤں؟" اس نے اجازت طلب کی۔

"ہاں دیکھ لے، دیکھ لے مگر اس کی کوئی چیز اِدھر اُدھر نہ کرنا، بڑا شور مچاتا ہے اگر کوئی چیز نہ ملے اسے اپنی۔"

"اچھا ماں جی۔" زوئی آہستہ قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"ڈارک ہارس...... سمجھتے ہیں ناں آپ؟" یشل نے کولڈ کافی کی اوپری سطح پر تیرتے جھاگ کو اسٹرا
ہلاتے ہوئے مہرزاد سے پوچھا۔

"ایک دم سمجھتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"آپ کو نہیں لگتا، آپ وہ ثابت ہوئے ہیں ان الیکشنز میں۔" یشل نے کافی کا سپ لینے کے بعد کہا۔

"وہ کیسے؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ پوری الیکشن کمپین میں آپ کی جیت اور ہار کے بارے میں قیاس ہی لگتے رہے، نہ
کی پیش گوئی کرنے والے پر یقین تھے نہ ہی ہار کی پیش گوئی کرنے والے پُر یقین تھے۔ کبھی کبھار تو مجھے
کہ مقابلہ برابر ہو جائے گا اور آپ کو ایک اضافی اوور کھیلنا پڑے گا۔"

"خیر...... میں ایسا نہیں سمجھتا۔" مہرزاد نے کہنی میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اوّل دن سے یقین

الیکشن کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے۔"

"آپ زرنگار والی خبر سے بھی تذبذب میں نہیں پڑے کیا؟" ایشل نے دائیں آنکھ کا ابرو چڑھاتے ہوئے تیکھا سوال کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" وہ اتنے ہی اعتماد کے ساتھ بولا جتنے اعتماد کے ساتھ اپنی جیت کے بارے میں بولا کرتا تھا۔ "کچھ اسکینڈلز، انسان کو ننانوے کے ہندسے تک پہنچانے والی سیڑھی ثابت ہوتے ہیں۔" اس نے اپنے گلاس کی بیرونی سطح پر چپکتے قطروں کو انگلی سے ایک دوسرے میں ضم کرتے ہوئے کہا۔ "ننانوے کا وہ ہندسہ جہاں کوئی سانپ نہیں ہوتا۔" اس نے یشل کی طرف دیکھا۔ "بس انسان کو ایک اضافی ہندسے کی ضرورت ہوتی ہے اور جو لوگ اپنے ڈائس کو مہارت سے پھینکنا جانتے ہیں انہیں اس اکیلے ایک کا حصول دشوار نہیں ہوتا۔"

"اسکینڈل اور ننانوے کا حصہ......؟" یشل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اسکینڈل تو انسان کو سانپ کے منہ میں ڈال کر واپس زیرو تک پہنچا دیتے ہیں۔"

"یہی تو فرق ہے۔" وہ محظوظ ہوتا ہوا بولا۔ "سوچ کا، ردِعمل کا، منصوبہ بندی کا، زخم کھا کر جوابی وار کے انداز کا۔" اس نے سر ہلایا۔

"میرے لیے یہ اسکینڈل الیکشن کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ میں جو بزعم خود یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ میری منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہیں ہے، اس اسکینڈل والے جھٹکے نے مجھے اپنے منصوبے کے شین قاف کی درستگی پر مجبور کر دیا، بے خبری میں پڑا ہوا وہ وار جو انسان کی بے احتیاطی اور نالائقی کا نتیجہ ہو، اس سے کیسے سنبھلا جاتا ہے اور اس کا جواب دینے کا طریقہ کیا ہے، یہ میں نے اسی دوران سیکھا۔ یہ کیا سیکھا سمجھو فائنلی شیر کو درخت پر

چڑھنا بھی آگیا، بلّی بے چاری حق دق ہی رہ گئی، وہ کرتب جو اُس نے بچا کر رکھا تھا اس کے اپنے ہی او
کی نذر ہو گیا۔"

"اسکینڈل انسان کو چاروں شانے چت گرا دیتے ہیں، گرا ہوا انسان جوابی وار کیسے کر سکتا ہے" اس کی بات کو سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔ اسے یوں بولتا ہوا سردار مہرزاد خان بہت اچھا لگ رہا تھا، چاہ رہی تھی کہ وہ یونہی بولتا چلا جائے۔

"تاریخ پڑھنے کے رسیا لوگوں کو بھی شاید چنگیز خان اور منگول فوج والا باب پسند نہ آتا ہو، بربر چنگیز خان کے کارناموں کے نتیجے میں ایجاد ہوا تھا شاید...... لیکن میں چنگیز خان کی شخصیت اور منگول ف عسکری مہارت کو کسی اور نظر سے پڑھتا رہا ہوں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چنگیز خان میں قدرتی ایسی کئی خوبیاں تھیں جو اُسے اس وقت کے دوسرے تمام عسکری اور سیاسی قائدین سے منفرد بناتی تھیں ا کی فوج کی ایک بہت ہی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر بغیر پیچھے دیکھے کمان کندھے پر رکھ کر کھڑے دشمن پر تیر چلانے کی ماہر تھی اور ایسی ماہر کہ نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔"

"اوہ!" یشل نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "جو شخص اپنے اندر خوبیاں تخلیق کرتا ہو چاہے اس کا آف انسپائریشن کچھ بھی ہو، وہ کتنا اسمارٹ ہو سکتا ہے، میں شاید اندازہ نہ لگا پاؤں کبھی......" اس نے دل سوچا اور اپنے سامنے پھیلے اس گالف کورس کو دیکھنے لگی جو مہرزاد کے اس گھر کا حصہ تھا جو اس نے الیکشن جیت بعد اسلام آباد میں خریدا تھا جو جدید آرکیٹیکچر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ الیکشن میں جیت کے بعد یشل سے سردار مہرزاد پہلی انفرادی ملاقات تھی۔ مہرزاد نے یشل کو اسمبلی فلور پر اپنی پہلی تقریر کے نکات لکھنے کے لیے بلایا تھا جو تازہ بجٹ پر کرنی تھی۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج مجھے مستقل طور پر خدا حافظ کہنے کے لیے بلایا گیا ہے۔" یشل نے نوٹ بک کھولتے ہوئے کہا۔

"کیوں، یہ وہم کیوں آیا تمہیں؟" مہرزاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ آج کل میڈیا سپر ہیروز اور چند بے تاج بادشاہ آپ کے آستانے پر دن، رات حاضری دی چکروں میں رہتے ہیں، ایسے نام ور اور بادشاہ گر میڈیا منیجرز کے سامنے مجھ حقیر، ناچیز، ناتجربہ کار کی کیا ہو سکتی ہے، اس لیے میں نے سوچا میرا کام ختم کیونکہ شاید وہ یہیں تک تھا اور میرا بوریا بستر گول ہونے کو ہے۔"

"تمہیں ایک معقول عرصہ تو ہو گیا ہوگا میرے ساتھ کام کرتے ہوئے؟" اس نے سوالیہ انداز میں کی طرف دیکھا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے اتنا کم سمجھ پائی ہو گی اب تک۔"

"خیر ایسا تو نہیں ہے۔" یشل نے سر جھٹکا۔ "میں آپ کو اچھا خاصا سمجھ چکی ہوں اور اس کی دلیل یہ کہ الیکشن میں آپ کے بارے میں میرا ہر اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب کسی کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ کا اگلا قدم کیا ہو گا اس وقت مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا تھا کہ آپ آئندہ کیا کرنے والے ہیں۔" اس نے م کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ میں آپ کو سمجھنا شروع ہو چکی ہوں۔"

"کسی کام کے شروع ہونے اور ہو جانے میں خاصا فرق ہے۔" وہ اس کی بات سننے کے بعد اس کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بات سے ایسا لگتا ہے جیسے معاملہ ابھی ناپختہ ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"خیر ایسا ہے کہ......" پھر اس نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔ "میں تو آموز، میری سوچ، میرا

نو آموز، میں آگے بڑھنے کے عمل میں ہوں اور میرا دل یہ کہتا ہے کہ میری ٹیم کو بھی میرے ساتھ ہی آگے بڑھنا چاہیے، ہم ایک ساتھ سیکھیں اور ایک ساتھ یہ سفر طے کریں تاکہ آئندہ آنے والوں سالوں میں ہم گرگوں کے ایک پورے گروہ کو ری پلیس کر سکیں۔ روایتی ہتھکنڈوں کی جگہ لینے کے لیے ہمیں ایک گروپ کی شکل میں آگے بڑھنا ہو گا، ہمارے اپنے تجربے، اپنی سوچ اور اپنا انداز ہو گا...... ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ ڈنڈی نہیں مار پائے گا۔" وہ یشل کی طرف دیکھنے کو رکا۔

"لہٰذا یہ وہم دل سے نکال دو کہ تم یا تمہاری ٹیم کا کوئی بھی ممبر فارغ کیا جائے گا، ہاں کوئی اپنی مرضی سے جانا چاہے تو اسے کوئی روکے گا نہیں۔"

"لیکن یہ گُرگے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے، یہ آپ کو اپنی خدمات حاصل کرنے کے عوض مستقبل کے سبز باغ کی ایسی تھری ڈی عینک پہنائیں گے کہ آپ گھبرا کر جو بازو پکڑیں گے وہ انہی کا ہو گا۔" یشل نے حقیقت پسندانہ انداز میں کہا۔

"مجھے اب تک نہ جانے کتنی ہی ایسی عینکیں پیش کی جا چکی ہیں یا تو میری نظر ٹیڑھی ہے یا پھر مجھے عینک کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں کوئی عینک لے ہی نہیں سکا اُن سے۔ گھبرایا نہ ہی کوئی بازو پکڑ سکا۔" وہ اسے تسلی دینے کی خاطر بولا۔

"جو بھی ہے مجھے آپ کے perception پر اعتماد کرنے میں کوئی تامل نہیں مگر خارزارِ سیاست میں اُلجھ کر اس خارزار میں داخل ہونے سے پہلے کے نعرے اور وعدے گنبد کی گونج کے سوا کچھ نہیں رہ جاتے۔"

"چلو دیکھتے ہیں نعرے اور وعدے ایک مثبت انجام کو پہنچتے ہیں کہ گنبدِ بے در کی گونج بن کر رہ جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"آپ بہت مسرور اور پُراعتماد نظر آرہے ہیں کامیابی پر۔" یشل نے کہا۔

"ہاں میں ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کمرے کی مشرقی گلاس وال کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کامیابی ہمیشہ میٹریل فارم میں نہیں ملتی، کچھ کامیابیاں immaterial (غیر مادّی) بھی ہوتی ہیں، میں ایسی ہی ایک کامیابی پر مسرور ہوں، اتنا مسرور کہ فی الحال اس کے احساس سے باہر نکلنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔" اس نے ذرا سا مڑ کر یشل کی طرف دیکھا۔ یشل نے اس کے پاؤں کے چمکتے قیمتی جوتوں کو دیکھا اور پھر اس کی نظر اوپر اٹھنے لگی وہ سیاہ رنگ کا قیمتی ڈیزائنرز سوٹ پہنے ہوئے تھا، اس کی شرٹ اور ٹائی اس سیاہ رنگ کے ساتھ مطابقت رکھ کر اس کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کر رہی تھی، اس کی کلائی پر قیمتی گھڑی بج رہی تھی، اس کے بالوں اور داڑھی کا کٹ انتہائی نفاست سے کیا گیا تھا اور یقیناً کسی مہنگے ہیئر ڈریسر کے فن کا نمونہ تھا۔

"کچھ لوگ شخصیت کی پریکٹیشن حاصل کرتے ہیں کچھ کے پاس یہ قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے، سردار مہرزاد خان کے پاس یقیناً یہ پریکٹیشن قدرتی طور پر موجود ہے۔" اس نے سوچا۔

اسی دم انٹرکام کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے مہرزاد کی طرف دیکھا وہ شاید اسی سے توقع کر رہا تھا کہ وہ یہ کال وصول کر لے۔

"ڈی آئی جی پنجاب کرائمز برانچ از آن لائن سر۔" فون کا چونگا اٹھا کر کان سے لگانے پر اسے ایکسچینج آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

وہ اس دفتر میں پہلی بار آیا تھا۔ یہ سافٹ ویئر بنانے والی ایک ایسی مقامی کمپنی تھی جو کسی غیر ملکی اشتراک سے بنائی گئی تھی۔ اس وسیع کمرشل ٹاور کی دسویں منزل پر اس کا آفس تھا اور اس روز بلڈنگ کام نہیں کر رہی تھی۔ نادر نے سر اٹھا کر آسمان کو چھوتی اس عمارت کو دیکھا اور دسویں منزل کی اونچائی کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنا شروع ہوا۔ پچھلے کئی دن کی خواری اور راتوں کی بے خوابی کے باعث جسم دونوں دُکھ رہے تھے۔ صبح گھر سے بھی وہ دیر ہو جانے کے باعث افراتفری میں نکلا تھا۔ یہ عمارت کرنے کی خواری اور خالی پیٹ کی دُہائیوں نے اسے تقریباً نڈھال کر رکھا تھا۔ اپنی بھاری ہوتی ٹانگوں کو زبردستی زینہ بہ زینہ اوپر چڑھاتے ہوئے کئی بار اس کا دل اسی عمارت کی سب سے اوپر والی پہنچ کر وہاں سے چھلانگ لگا دینے کو چاہا۔

''زندگی حرام ہوئے جاتی ہے، موت بھی حرام ہوگی۔'' پھر وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔

دسویں منزل اسے سراب محسوس ہو رہی تھی اور آٹھ سیڑھیوں کا زینہ چڑھ کر گھوم کر اوپر جاتی اگلی سیڑھیوں کے نیچے رک کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ ادھر اُدھر دسویں منزل کا ٹیگ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ دسویں منزل تکنیکی طور پر شاید ابھی دور تھی۔

''مجھے کمپنی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر حمزہ محمود سے ملنا ہے۔'' بالآخر اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے ریسپشن پر بیٹھی لڑکی سے کہا تھا۔ اس وقت اس کا دل قریب ہی کہیں گر جانے کو چاہ رہا تھا۔

''آپ تشریف رکھیں اور اپنا نام اور تعارف بتائیں۔'' ریسپشنسٹ نے اپنے مخصوص پیشہ ورانہ انداز مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے نام سے شاید وہ واقف نہ ہوں، واقف ہوں بھی تو ان کے ذہن میں نہیں ہوگا، بس آپ بول دیں کہ میں میرال صلاح الدین کے سلسلے میں ان سے ملنے آیا ہوں۔'' نادر نے کرسی کی سیٹ کو اپنے نیچے مخصوص کرتے ہوئے سکون کے لحاتی احساس پر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اس کی توقع کے مطابق اسے فوراً ہی حمزہ محمود کے آفس میں بلا لیا گیا تھا۔

''کہو نادر کیسے ہو؟'' اس کی غلط فہمی تھی کہ حمزہ محمود اس کے نام سے واقف نہیں ہوگا یا اس کا نام اس ذہن میں نہیں ہوگا۔

''میں بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں سر۔'' نادر نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہ آئی سی!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''لگتا ہے انہوں نے تمہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔''

''بہت ایک چھوٹا سا لفظ ہے سر۔'' نادر نے دُکھتے سر کو ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ افسر نہیں عملہ ہوتا ہے، جس کی فائل میں کسی کا نام جانے کی بس دیر ہی ہوتی ہے۔'' پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''اٹس ریئلی سیڈ......!'' اس کا چہرہ افسردہ ہوا۔ ''میں تمہیں یا کسی کو بھی بلاوجہ کی اذیت میں نہیں چاہتا تھا۔''

''آپ نہیں چاہتے ہوں گے۔'' نادر نے کہا۔ ''لیکن جس محکمے کو آپ نے اپروچ کیا ہے، اس اہلکاروں کا کام ہی اسی بات سے جانچا جاتا ہے کہ وہ کس کو کتنا ذلیل کرنے میں کامیاب ہوئے۔''

''ویری سیڈ......'' وہ ایک بار پھر بولا۔ ''مگر شاید چیزیں میرے اختیار میں نہیں ہیں، میرے پاس اپروچ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، ویسے کرتے کیا ہیں وہ تمہارے ساتھ؟''

''سر وہ میری ایک، ایک موومنٹ پر نظر رکھے ہوئے ہیں، ہر جگہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں، انہی کی وجہ سے میں کئی روز سے اپنے آفس نہیں جا سکا، میرا گھر، میرے علاقے کی دکانیں، ہوٹل، ڈھابے، ٹی اسٹال، ڈسپنسری، ٹھیلے والے جس، جس سے میرا کسی ضرورت کے لیے تعلق ہے وہ بھی اُن سے محفوظ نہیں، وہ ہر کسی کو اسکین کرتے پھرتے ہیں۔''

''چچ......چچ......'' وہ ریوالونگ چیئر کو پیچھے کی طرف پش کر کے ریسٹ پوزیشن میں جاتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ کہاں ہے، تمہاری وائف......؟''

''مجھے معلوم نہیں ہے سر۔'' نادر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''وہ پاکستان آچکی ہے لیکن میرا اس سے رابطہ نہیں، نہ میں اسے ائرپورٹ پر لینے گیا، نہ میں نے اس سے ملاقات کی، میں تو اس ڈر سے اپنا فون بھی بند رکھتا ہوں کہ وہ یقیناً مجھے کال کرے گی اور اس کی کال کو ٹریس کر کے یہ لوگ اس تک جا پہنچیں گے۔''

''تو پہنچنے دو ناں یار۔'' اس کی چیئر سیدھی ہوئی۔ ''اس تک پہنچنا ہی تو مقصود ہے، اس تک پہنچ جائیں تو تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ اچھا نہیں ہے؟''

''نہیں سر۔'' نادر نے سر ہلایا۔ ''جو سلوک یہ میرے ساتھ کرتے ہیں اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں مرد ہو کر اپنے اعصاب کھو رہا ہوں وہ تو پھر عورت ذات ہے، اس کا یہ کیا حشر کریں گے۔''

''تمہیں اس سے محبت ہے، بہت، ہے ناں؟'' حمزہ محمود نے مسکرا کر کہا۔

''محبت کی بات نہیں ہے سر، احساس کی بات ہے۔'' نادر نے کہا۔ ''وہ مجھے اس اذیت سے اور خواری سے نکالنے کی خاطر واپس آگئی، اس نے اپنا فرض اور وعدہ نبھانے کی کوشش کی ہے، ہمیں اس کی اس حرکت کو سراہنا چاہیے، اس کا احترام کرنا چاہیے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ وہ بھی ان کی اِن حرکتوں کا شکار ہو جائے۔''

''پھر......؟'' حمزہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔

''اسی لیے میں آپ کو ڈھونڈتا یہاں آیا ہوں سر، آپ سے یہ درخواست کرنے کہ ان کے افسروں سے بولیں وہ خود تفتیش کے لیے یہاں آئی ہے ہمارا فرض ہے اس سے باعزت طریقے سے تفتیش کریں مہذب انداز میں۔''

''اور اگر وہ مجرم ثابت ہو گئی تو؟'' حمزہ نے سوال کیا۔

''تو پھر تو جو اس کی سزا بنتی ہے اسے ملنی چاہیے۔'' نادر نے سر جھکا کر کہا۔

''مگر تم تو اس سے محبت کرتے ہو؟'' حمزہ کا انداز تیکھا ہوا۔

''میں نے عرض کی ناں سر...... بات محبت کی نہیں ہے، احترام کی ہے اگر وہ مجرم ہے تو میں کیوں اپنے وطن کی ایک باعزت، بے گناہ بیٹی کی حرمت پامال کرنے والوں کو سزا ملنے پر افسردہ ہوں گا۔''

''تم مجھے دل کے کھرے اور نیت کے نیک انسان معلوم ہوتے ہو، جس جذبے کے تحت تم نے اس سے نکاح کر لیا اور جس احترام کے تحت تم اب بھی اس کے لیے نیک جذبہ رکھتے ہو، میں اس سے متاثر ہوا ہوں۔'' حمزہ نے کہا۔ ''میرا تم سے وعدہ رہا اب وہ تمہیں تنگ نہیں کریں گے اور تمہاری بیوی تک پہنچنے کے بعد بھی وہ اس سے اسی احترام سے بات کریں گے جیسا تم چاہتے ہو، میری دعا ہے کہ تمہاری بیوی کا اس سارے قصے میں کوئی قصور ثابت نہ ہو اور اگر ایسا ہو گیا تو میں خود چل کر تم دونوں کو سلیوٹ کرنے تمہارے گھر پہنچوں گا۔''

''تھینک یو سر......'' نادر کے رویں رویں میں تشکر کا احساس دوڑ گیا۔ ''مجھے آپ سے یہ ہی توقع تھی اور

اسی لیے میں آپ کو تلاش کرتا یہاں تک پہنچا تھا۔"

"شکر ہے میں یہاں تک تمہاری توقع پر پورا اترا۔"

"میری دعا ہے سر کہ آپ جس کی تلاش میں ہیں وہ آپ کو مل جائے۔" نادر نے سکون کے اس ... کے تحت دعا دی جو حمزہ کی بات نے اس کے رگ و پے میں اتار دیا تھا۔ اسے یہاں سے اٹھ کر زوئی ... کرنا تھا جو اَب تک یقیناً اس کے بارے میں مایوس ہو چکی ہوگی۔

☆☆☆

"اچھا تو تم ٹی وی پر کوکنگ شوز کرتے ہو۔" ڈاکٹر نادیہ نے خود سے ملاقات کے لیے آئے لڑکے ... "جب ہی میں سوچ رہی تھی کہ تمہارا چہرہ کچھ دیکھا دیکھا سا لگتا ہے حالانکہ میں کوکنگ شوز وغیرہ نہیں دیکھتی۔"

"ہو سکتا ہے آپ نے کہیں میری تصویر دیکھی ہو، اخبار میں، کسی میگزین میں۔" اس نے جواب ... "آنٹی مجھے امید ہے کہ میں آپ کا وقت ضائع نہیں کر رہا ہوں۔" اچانک اسے خیال آیا۔

"اس وقت تک تو یقیناً نہیں جب تک کوئی نیا مریض نہیں آ جاتا۔" نادیہ نے نرمی سے کہا۔

"آپ نے اِدھر بازار میں اپنا کلینک کیوں بنایا، وہیں ہل روڈ پر یا اس کے آس پاس کیوں نہیں ... پوچھ رہا تھا۔

"یہاں سب لوگوں کی رسائی ممکن ہے اور وہ جگہ تو اب ناقابلِ رسائی ہی ہو چکی...... حساس علاقہ ... اب اس لیے وہاں کوئی کمرشل کام نہیں ہو سکتا۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہوئے ہو؟"

"ہوٹل میں اور کہاں...... اب یہاں تو ہمارا گھر بھی بک چکا کبھی کا۔"

"تم میرے یہاں ٹھہرو جتنے دن اِدھر ہو۔" نادیہ کو خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ماضی جو انہیں کبھی یاد آیا ... جس سے کبھی کوئی لگاؤ محسوس ہوا تھا اس سے متعلق ایک کردار سے ملاقات پر انہیں خوشی کیوں محسوس ہو رہی ...

"نہیں آنٹی، میں وہاں سیٹ ہوں، آپ کو خواہ مخواہ تردّد کرنے... کی ضرورت نہیں خود آپ تو سارا ... مصروف رہتی ہوں گی اور علینہ......" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ "ہاں آنٹی، میں پوچھنا ہی بھول گیا ... کیسی ہے، کیا کر رہی ہے آج کل؟"

"ہاں علینہ۔" نادیہ کو خیال آیا۔ "اس لڑکے کو دیکھ کر شاید میں علینہ کی وجہ سے ہی خوش ہوں۔ کیوں ... ہوں یہ پتا نہیں؟" اس نے سوچا۔

"علینہ ٹھیک ہے، ماسٹرز کر رہی ہے انگلش لینگویج میں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"گریٹ۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "خوب بڑی ہو چکی ہوگی اب تو۔"

"ظاہر ہے تم بڑے ہو گئے ہو تو وہ بھی بڑی ہو چکی ہے۔" نادیہ نے کہا اور کلاک پر نظر ڈالی۔

"آٹھ بج رہے ہیں اور میرے خیال میں اب تو مزید کسی مریض کی آمد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ... چلتے ہیں۔" انہوں نے میز سے اپنا فون اور گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"واہ آنٹی، اگرچہ وقت نے آپ کی شکل صورت اور شخصیت پر کچھ خاص اثر نہیں چھوڑا لیکن آپ کا ... خاصا بدل چکا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ خود مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ میں فہد ... جسے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں کھیلنے پر آپ ڈانٹ کر بھگا دیتی تھیں اور اسی وجہ سے ہم بچوں نے ... کا نام......" وہ یاد کرتے کرتے مسکرایا۔ "خیر رہنے دیں ہر بات کیا کہہ دینی چاہیے بھلا۔"

"مجھے یاد ہے میرا نام "سڑیل آنٹی" رکھا ہوا تھا تم لوگوں نے۔" نادیہ نے کلینک سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"اوہ رئیلی آنٹی!" وہ ہنس دیا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"کان کھلے رکھتی ہوں میں ہر دم۔" وہ مسکرائیں۔

"کیا تبدیلی ہے یار۔" فہد نے دل میں سوچا۔ "یہاں تو واقعی تبدیلی آ گئی ہے۔"

☆☆☆

"نہیں بیٹا۔" عافیہ نے اپنے سامنے رکھے ہینڈ بلز پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ طریقہ تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ تو عزت بچانے کا نہیں عزت اچھالنے کا باعث بنے گا۔"

"اُفوہ ممی، آپ خود بتائیں اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔" دانیال نے کہا۔ "آپ نے اور ڈیڈی نے کتنے ہائی کمانڈز کو پچ دے کر دیکھ لیا۔ ان لوگوں کا مافیا اتنا اسٹرونگ ہے کہ کوئی ان پر ہاتھ ڈالنے کو تیار نہیں، ہر کوئی بس امید دلا کر ٹال دیتا ہے۔"

"تم جانتے تو ہو وہ کیسے بااثر سیاستداں کے کنٹرول میں ہے۔ ان ہاتھوں سے اسے نکالنا ان ہائی کمانڈز کے اختیار میں کہاں ہے۔" عافیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں تاسف تھا۔

"تو پھر؟" دانیال نے سوال کیا۔ "اگر ہم اس معاملے کو پبلک میں نہیں چھیڑیں گے، اس تلاش کو مہم نہیں بنائیں گے، ہماری اس تک رسائی ناممکن رہے گی۔"

"دیکھو دانیال تم اچھے بھلے سمجھ دار ہو۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہے کہ یوں پبلک میں معاملہ جانے سے کتنے مختلف قسم کے نتائج نکل سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمدردی میں تمہاری آواز کے ساتھ آواز ملائیں گے، بہت سے اس معاملے کو گندی لینن کی طرح دھونے بیٹھ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جن لوگوں کے قابو میں وہ اس وقت ہے وہ گھبرا کر اسے کوئی نقصان پہنچا بیٹھیں۔ تمہارے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں معاملہ بے حد ٹیڑھا اور نازک ہے۔ اسے بہت احتیاط سے چھیڑنے کی ضرورت ہے۔"

"ہوں۔" دانیال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور وہ ہینڈ بلز سمیٹنے لگا۔ "ٹھیک ہے پھر میں یہ تصویر عاصم بھائی کو فارورڈ کر رہا ہوں' ان سے کہتا ہوں پاکستانی کمیونٹی میں اور وہاں کی سوشل ویب سائٹس پر یہ معاملہ اٹھائیں۔ پیجز بنائیں اور بات کریں کہیں نہ کہیں تو معاملہ چھیڑنا ہی پڑے گا۔ گھر بیٹھے حل ہونے والی بات تو ہے نہیں۔"

"تم جذباتی ہو رہے ہو دانیال۔ جواَب تم اکثر نہیں ہوتے۔" عافیہ نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ معاملہ ہی ایسا ہے ممی...... اس پر جذباتی ہوئے بغیر چارہ نہیں۔" دانیال نے کہا۔ "مجھے جب یہ خیال آتا ہے میرا خون کھولتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن دعا کی طاقت پر جو یقین ہے اسے متزلزل نہ ہونے دینا۔"

"خیر اس میں تو کوئی شک نہیں ہے لیکن دعا کے ساتھ ساتھ کوشش بھی تو کرنی ہے۔" دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ دو کہ اِن بلز کو فی الحال اپنے تک رکھیں۔ انہیں تقسیم نہ کریں۔" عافیہ ابھی تک ہینڈ بلز میں الجھی ہوئی تھیں۔

"ہاں، خوب یاد دلایا۔" دانیال نے کہا اور اپنا فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو ہینش کیسی ہو؟" وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے یہ کہنا تھا کہ اِن ہینڈ بلز کو اپنے تک رکھو فی الحال۔ کسی کو دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم کچھ اور سوچ رہے ہیں۔"

"آہ۔" ہینش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اسے وہ چند ہینڈ بلز یاد آنے لگے جو اس نے نگین کو دیے

☆☆☆

"میری تو اپنی نظروں کے سامنے دنیا گھوم گئی تھی جب میں نے وہ نام اور یہ ہینڈ بل دیکھا۔" نگین نے حمزہ کو بتایا۔

"ہوں۔" وہ اس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ "اس کا مطلب ہے میرا اندیشہ درست تھا۔" وہ کچھ سو ہوئے بولا۔

"خیر اس لڑکی کو خود بھی مکمل یقین نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔"

"اتفاقات اتنے عام نہیں ہوتے کہ دنیا کے دو لوگوں کے ساتھ ایک جیسے ہی ہونے لگیں۔" حمزہ نے نگین کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ بھی ہے۔" نگین نے کہا۔

"خیر...... تھینک یو نگین۔" حمزہ نے اس کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس اتفاق میری اندھیرے میں تلاش کو ایک رخ تو دیا۔ میں ٹامک ٹوئیوں کے فیز سے نکل کر کسی خاص راستے پر چلنے قابل ہوا۔"

"مجھے تو پوری رات نیند نہیں آئی۔ تمہیں فون پر یہ بات بتانے کو دل نہیں چاہا اور تم بھی آج اس آئے ہو۔" نگین نے کہا۔

"اگر ممکن ہو تو اس لڑکی سے رابطے میں رہنا۔" حمزہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں نے اپنی ساس کی ناراضیوں، گھُرکیوں اور گھر میں پیدا ہونے والی ممکنہ بدمزگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے فون نمبر بھی لیا اور رابطے میں رہنے کا وعدہ بھی۔"

"اِٹس گریٹ آف یو نگین، میرے دل پر بوجھ بڑھا بھی ہے اور کم بھی ہوا ہے۔" وہ چلتے چلتے بولا۔

☆☆☆

"یہ میرال صلاح الدین کی تصویر ہے۔ پاکستان کی ایک گم نام اور مظلوم بیٹی۔" اس نے ایک سو ویب سائیٹ پر اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کسی پیج کا اشتہار دیکھا اور بے اختیار اس کو کلک کر اس کی حیرت کا باعث بنا وہ صفحہ میرال صلاح الدین کے بارے میں معلومات، تصویر اور تفصیل سے بھرا تھا۔ چند روز پہلے بنائے گئے اس صفحے کو پسند کرنے والے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ رہی تھی اور دنیا ہر کونے سے اس کے بارے میں کمنٹ ہر دوسرے منٹ میں نظروں کے سامنے آرہے تھے۔

"اس خبر، اس صفحے اور اس کے بنانے والوں کی تفصیل مجھے فوراً مہیا کرو۔" اس نے اپنے پی اے کو فو کر کہا۔

سردارزادہ مہرزاد خان کے لیے یہ صفحہ اس ہفتے کا واحد شاک ثابت ہو رہا تھا۔

جاری

ادھوری تصویر

رفاقت جاوید



"عمر! آپ تو اپنے تمام وعدے ہی بھول بیٹھے ہیں، آپ نے مجھے دیکھتے ہی جو پہلا گھسا پٹا فریب سے بھرپور ڈائیلاگ بولا تھا کچھ یاد ہے کہ یاد دہانی کراؤں......؟" صوفیہ نے عمر کو چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا اٹھے۔

"تم کسی پرستان کی باسی معلوم ہوتی ہو...... تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر تمہاری مانگ میں سجادوں۔ تمہارے لیے دودھ اور شہد کی نہریں

اپنے ہاتھ سے کھودڈالوں۔ فرماؤ، میرے لیے اور کیا حکم ہے۔'' وہ ان کی نقل کرتے ہوئے بے ساختہ بولے جارہی تھی۔

''یادداشت کا جواب نہیں، واہ واہ...... عورت کو اپنی من پسند تعریفیں سننے کو ملیں تو پھر بھلا انہیں کیونکر بھولے گی تو اب ذرا غور سے سننا اور آج کے ڈائیلاگ بھی ہمیشہ کے لیے یاد رکھنا...... تم آج بھی میرے لیے باغ و بہار ہو...... حسن کا مجسمہ اور میرے دل کا سرور و چین، تمہارے جیسی عورتیں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں اور کیا سننا چاہتی ہو!'' انہوں نے مخصوص قہقہہ لگایا۔

''سب سراب اور دھوکا ہے، اتنے سالوں میں میرا پورٹریٹ تو مکمل نہ کرسکے...... لگے ہیں جتانے محبتیں اور چاہتیں......'' وہ بناوٹی خفگی سے بولی۔

''بھئی دال روٹی کے چکر میں ہی جوانی بیت گئی۔ اپنے جذبۂ شوق کو تو پسِ پُشت ہی ڈال دیا۔ تم سے وعدہ رہا کہ اپنی اس نایاب حسینہ کی تصویر جلد از جلد مکمل کردوں گا لیکن اب ایک بہت بڑا ایشو ہے، مائنڈ تو نہیں کروگی اگر بندۂ خاکی عرض کی جسارت کرے تو؟'' وہ ایزی چیئر سے اٹھ کر نہایت مؤدبانہ انداز میں بولے۔

''آپ تصویر مکمل کیجیے، میں مائنڈ نہیں کروں گی۔'' وہ فخریہ انداز میں کہنے لگی۔

''اب پورٹریٹ میں کچھ رِنکلز کا اضافی استعمال تمہیں پریشان تو نہیں کردے گا صوفیہ! چلو اسے ادھورا ہی رہنے دیتے ہیں۔ دیکھو اس ادھورے پن میں بھی تمہاری مکمل جوانی جھلک رہی ہے۔'' وہ ادھوری تصویر جو کبھی کبھار پھر سے بورڈ پر چسپاں کردی جاتی تھی اور وہ آتے جاتے اس پر ایک آدھ لائن کھینچ دیا کرتے تھے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ لہجے میں ہلکے پھلکے مزاح کا عنصر تھا۔ وہ ایک دم سے چونک گئی اس کا لہجہ یکسر ہی دھیما اور بجھ سا گیا تھا۔

''عمر! حسن اور محبت تو کبھی فنا نہیں ہوتے بوسیدہ اور سال خوردہ عمارت اپنے حسن اور جلال کی چغلی کھائے بِنا نہیں رہتی...... اور محبت تو لافانی جذبہ ہے بلکہ مرنے کے بعد اس پر مزید اور تازگی آجاتی ہے۔ ہاں شرط ہے کہ محبت یک طرفہ نہ ہو۔ ہم دونوں کے معاملے میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔ باقی ماندہ تصویر میں آج کی صوفیہ کو دیکھیے۔ بھلا مجھے کیونکر اعتراض ہوگا۔ ظاہری صورت کو چھوڑیں۔ باطن میں تو صوفیہ کی روح موجود ہے ناں جو کبھی بوڑھی نہیں ہوگی۔ میرے مرنے کے بعد لرزش زدہ ہاتھوں سے اسے مکمل ذرا مشکل ہوجائے گا آپ کے لیے...... لیجیے۔'' وہ ہونٹوں پر بکھرنے والی سرد آہ کو اندر ہی کر لہجے کو بشاش بناتے ہوئے بولی کہ کہیں اس اندر کی توڑ پھوڑ کی صدا شوہر تک نہ پہنچ جائے۔ میں سراسر تضاد ہی تھا۔

''صوفی! تم نے تو بزرگوں کے مقولے روح ہی نکال کر رکھ دی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے حسین اور ایکٹیو عورت کو بڑھاپا دکھ، کرب پچھتاوے کے حصار میں نہیں لیتا...... اور دوسرول تنبیہی نظریں اسے بیتے ہوئے ماضی یاد نہیں دلاتیں۔'' وہ مبہم انداز میں بولے اور میں چاشنی بھرتے ہوئے مزید کہا۔

''ہاں یہ تو سچ ہے کہ بیٹوں کی ماں کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وہ جب بھی بہو بیاہ کر لاتی ہے تو نئے سرے سے جوان اور تر و تازہ محسوس کرتی ہے کیونکہ جوانی کے بیتے حسین وقت کو وہ فراموش نہیں کرپاتی۔ وہ بہو کی طرح ایکٹ کرنے لگتی ہے۔ تم بھی پانچ بیٹوں کی ماں ہو، جب سے ...... لائی ہو اور جوان اور ہشاش بشاش نظر آنے لگی ہو۔ تمہاری خواہش تو میں پوری کر ہی دوں گا مگر اس بات پر غور و فکر ضرور کرنا۔ بعض اوقات ادھورا پن تجسس کو بڑھاتا ہوا زندگی کے حسن کی پوشیدہ پرت عیاں کرنے لگتا ہے۔''

''میں آج بھی پرانی آرزو دُہراتی ہوں کہ ان پانچ بچوں میں مجھے دو بیٹیوں کی چاہ تھی جو پوری نہ ہوسکی۔ میرے دل کے اندر ہر وقت اِک شوریدگی بر پا رہتی ہے اگر آج میری بیٹی ہوتی تو وہ میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی۔ بہو آنسو بہاتی ہوئی ساس کے تمام دُکھڑے تو ضرور سن لیتی ہے مگر وقت آنے پر طعنوں اور تشنوں سے چھلنی کرنا کوئی اس سے سیکھے لیکن بیٹی ...... میری اس بڑھتی ہوئی عمر میں میری ذمے داریوں کو اٹھالیتی۔ مجھے جوان اور چاق و چوبند رکھنے کے تمام نسخے استعمال کرتی۔ آہ ایسی میری قسمت کہاں......! اب تو بے توجہی ہی میرا نصیب بن چکا ہے۔ دس دن نائٹ سوٹ میں رہوں کسی کو محسوس تک نہیں ہوتا...... کھانا نہ کھاؤں تو کسی کو پروا نہیں ہوتی۔ دن بھر اکیلی کمرے میں رہوں تو کیا مجال کہ کوئی جھانک کر دیکھ جائے کہ مرگئی ہوں یا زندہ...... ہر بیٹے کی پیدائش پر میرا واویلا بجا تھا یا نہیں۔ بتائیں......؟'' وہ تقریباً روہانسی ہوگئی تھی۔

''اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو جھٹلانے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ اس کی رحمتوں کا ہر وقت شکرانہ ادا کیا کرو میری جان...... اولادِ نرینہ کو لوگ ترستے ہیں، کیسے کیسے پاپڑ نہیں بیلتے...... ہم پر تو دعاؤں کے بغیر ہی نعمتوں کی فراوانی ہوگئی ہے۔'' وہ تسلی دینے کے انداز میں بولے۔ ''تمہاری بہوئیں بہت اچھی ہیں۔ تمہاری بے پناہ عزت کرتی ہیں۔''

''ہاں......! میں خود ہی صلح جُو ہوں اور ہر طرح کی بدمزگی سے دور رہتی ہوں ورنہ اس ذات میں ساس کے لیے کوئی حس ہے ہی نہیں محبت نہ چاہ اور نہ احساسات و جذبات...... میں نے ٹھیک ہی سوچا ہے کہ بہو بیٹی بن کر ساس کو اپنی ماں کے مدِ مقابل کھڑا نہیں کرسکتی۔ بس میں نے ہی گزارہ کرنا ہے ان تمام بے اعتنائیوں کے باوجود...... توقع اور امید رکھنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے اس رشتے میں۔'' وہ پلکیں جھپکتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی اور پھر پُرامید لہجے میں بولی۔ ''اب پوتی کا انتظار ہے، وہ اس گھر کو چار چاند لگادے گی اور اپنی دادو کی بچی اور پکی بیٹی بن کر رہے گی پھر دیکھیے گا میری شان...... ہر جگہ میرے ساتھ ساتھ ہوگی وہ۔''

''اری پگلی...... میں جو تمہارے ساتھ ہوں، میں نے کبھی کسی کو تم پر فوقیت دی ہے؟ یہ یاد رکھو کہ پوتی بھی تمہاری بیٹی نہیں ہوسکتی۔ وہ بھی تمہیں اصلی رشتے سے پہچانے گی۔ خوش فہمیوں کی دنیا سے باہر نکل آؤ۔ اب حال تمہارا اغلام ہے، خوب انجوائے کرو۔'' وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولے۔ جیسے اپنے اندر کا تمام سکون اس کے وجود میں اتار دیں اور اسے خوش و مطمئن کردیں۔

''آپ تو ہیں ہی بے حس انسان، ڈاکٹر کی بیوی ہمیشہ تنہا ہی زندگی کے نشیب و فراز سے گزر جاتی ہے۔ میں تو ہر لڑکی کو نصیحت کرتی ہوں کہ کبھی ڈاکٹر سے شادی کرنے کی غلطی نہ کرے۔ چاہے عمر بھر کنواری ہی کیوں نہ رہ جائے۔'' لہجہ یاسیت سے لبریز تھا۔

''یار تم نے تو تمام کیا کرایا خاک میں ملا دیا ہے۔ میری سالہا سال کی ریاضت بھی رائگاں گئی اور پَل پَل کی محنت بھی اکارت گئی۔'' اضطرار سے ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

''تو پھر مجھے بتائیں کہ میں دل کے پھپھولے

کس قدر مختصر کہانی تھی
ابھی کل ہی تو ملے تھے ہم
اور آج بچھڑ بھی گئے
صائمہ سجاد بنگش...... کوہاٹ

کیسے دکھاؤں۔ کیا میری زندگی بڑی رواں ہے کہ کسی تسلی دلاسے کی مجھے قطعاً ضرورت ہی نہیں؟" وہ رقت آمیزی سے بولی۔

"ہمت کرو بیگم......! اب تو گھر کی رونقوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ تم اپنے پوتے اور پوتیوں میں ایسے بہل جاؤ گی کہ تمہیں اپنے ادھورے پن کی شکایت کافور ہوتی محسوس ہوگی پھر تمہاری ادھوری پورٹریٹ کو مکمل کرکے سب کے سامنے لے آؤں گا۔ پوتے، پوتیوں میں گھری خوب اچھی لگو گی۔ تم کیوں سوچتی ہو کہ میں نامکمل اور ادھوری ہوں؟ ایسی سوچوں کی بھلا کیا وقعت؟ اللہ کے فیصلوں پر راضی بہ رضا ہونا سیکھ لو۔ خوش رہو گی۔"

"جب میرے وجود نے بیٹی کے رشتے کو پیدا ہی نہیں کیا تو میں ادھوری ہی کہلاؤں گی ناں...... چلیں انتظار فرمائیں پوتی کی تشریف آوری کا۔ بقیہ پورٹریٹ اس کی موجودگی میں مکمل ہوگی۔ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔" وہ زبردستی مسکرا کر بولی اور پھر کسی گہری سوچ میں غرق ہوگئی۔

☆☆☆

جب صوفیہ عمر کی زندگی میں شامل ہوئی تھی تو وہ ایک گورنمنٹ اسپتال میں ایک جونیئر ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ تنخواہ قلیل اور بیوی کے لیے وقت کا بھی فقدان تھا پھر بھی اس مشترکہ زندگی میں وہ شوہر کی وفادار ساتھی بنی رہی۔ گھریلو سیاست میں اس کے ردِعمل کی رو دھیمی رہا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی خوش تدبیری سے اس نے عمر کے دل پر حکمرانی کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد جو بیٹی کی چاہ کا بھوت سر پر سوار ہوا تو تین سال میں تین بیٹوں کو جنم دے ڈالا۔ جب کسی چیز کی کمی کا احساس وبالِ جان بننے لگے تو اس کی تمنا کا پیمانہ ایسا ہمہ گیر اور گہرا ہوجاتا ہے کہ پھر گردوپیش کی ہر شے خاصی دھندلی اور غیر مرئی معلوم ہونے لگتی

ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام عنایات ونوازشات باوجود خود کو ادھورا اور نامکمل تصور کرنے لگی تھی۔ کی طبیعت میں شکست خوردگی بتدریج بڑھتی جا تھی۔ ہر بار بیٹی نہ ہونے کا تمام الزام عمر تھوپ دیا کرتی تھی۔ جب بیٹے کی پیدائش پر لڈو کیے جاتے، عقیقے کی تقریب دھوم دھام سے جاتی تو آنسو اس کی پلکوں پر رکے نظر آتے۔ جو سی بات پر بہہ نکلتے۔

اس کی آزردگی وقت کے ساتھ بڑھتی جا تھی۔ حالانکہ وہ بیٹوں کے لیے بھی مثالی ماں ان کے فیوچر روشن اور تابناک بنانے میں اس کاوشیں شامل تھیں۔ کئی بار اس کے دل کو دھڑکا لگ جاتا کہ آج کل کے دور میں بیٹے پرا ہوجاتے ہیں فقط بیوی کو پیارے ہونے میں مصلحت سمجھتے ہیں۔ ایسے میں تو وہ بالکل ہی تنہا ہو زندگی کیسے گزارے گی۔ عمر اتنی گہرائی میں پہنچنے فطرت سے بے بہرہ تھے۔ اس کے خدشات کو معنی ولا حاصل سوچ قرار دیتے۔ کبھی اس کی تصور سے نہ سوچتے۔ اپنی ہی حالیہ دنیا میں مست رہتے مگر اس کے پیار کی یہ حالت تھی کہ ہلکی سی چھینک بھی آتی تو وہ تڑپ اٹھتی تھی حالانکہ اسے اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے بھی پیچھے رہ گیا جیتے جی ہی مارا جائے گا۔ ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں دھری کی دھری رہ جائیں گی...... اور وہ عہد و پیمان جو نکاح کے وقت ہوا تھا اسی کے ساتھ منوں مٹی کے ڈھیر تلے دفن ہوجائے گا۔ یہ سب اس کی خود ساختہ پریشانیاں، ڈر خوف تھے جسے وہ سمجھتی تھی کہ بیٹی کی موجودگی میں اسے کس قسم کے اندیشوں سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ نہ میاں کی آفس سے واپسی کا انتظار ہوتا نہ بہو، بیٹوں کی قربت میں دل بہلانے کی ضرورت محسوس ہوتی بس ظاہر اور باطن فقط بیٹی کی موجودگی میں ہی خوشی کا متلاشی

رہتا...... محبت کرنے والے تمام رشتوں کے باوجود اس کے دل کے کسی گوشے میں اک درد کی لہر ہر وقت محوِ گردش رہتی تھی۔ عمر اسے کئی بار ذہنی مریضہ ڈکلیئر کر چکے تھے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ ہر طریقے سے سمجھاتے کہ اب اس بے جا خواہش سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں ہی عقلمندی ہے۔

جب دو پوتوں کے بعد ان کے آنگن میں ایک معصوم ننھی پری کی آمد ہوئی تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ بچی کی ہو کر رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی دیرینہ خواہش پوری ہوگئی ہو، حنا اسپتال سے گھر پہنچی تو سمانہ دن، رات صوفیہ کی گود میں ہوتی، محض فیڈ کے لیے ماں کی آغوش نصیب ہوتی۔ دوسری بہوؤں نے حنا کی سماعتوں میں ایسی موشگافیاں انڈیلیں کہ وہ ایک دم سے نیند سے بیدار ہوگئی...... وہ جو ساس کی مہربانیوں اور توجہ کی وجہ سے چین وسکون کے دن گزار رہی تھی ایک دم سے ساس کی ہر بات سے نتیجہ اخذ کرنے لگی۔ اس کی حرکات و سکنات نے اس کے وجود میں زہر بھر دیا۔

عید کی آمد آمد تھی۔ صوفیہ نے نہایت لگاوٹ اور انسیت سے سب کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار کیا کہ اس بار عید کچھ مختلف ہوگی اور چاند رات منائی جائے گی۔ سمانہ کے لیے ہر رنگ کی چوڑیاں خریدی جائیں گی۔ خوب صورت ڈریسز دادو بذات خود سلائی کریں گی۔ جس گھر میں صرف بیٹوں کا راج ہوتا ہے وہاں کسی تہوار کے آنے اور جانے کا علم ہی نہیں ہو پاتا۔

"کیوں میری رانی خوب مزہ آئے گا ناں دادو کے ساتھ!" سمانہ نے دادو کی گود میں باتیں سنتے ہوئے اپنی معصوم مسکراہٹ سے اپنی خوشی اور سمجھ کا اظہار کیا تو صوفیہ نے اسے سینے میں بھینچ لیا۔

"ممی......! ہم عید منانے اب کے لاہور جائیں گے۔" بہو بیگم نے کہا۔

"سمانہ کی پہلی عید ہے حنا...... ہمارے ساتھ گزارے گی تو ہمیں بہت اچھا لگے گا۔" وہ مردنی سی آواز میں بولی۔ "ایسا کرو تم عید کے بعد چلی جانا، یا سمانہ یہاں ہی رہ جائے۔"

"آپ کیسی انہونی باتیں کرتی ہیں۔ اب آپ کی خوشی پر میں اپنی ممتا قربان کرنے سے تو رہی...... جہاں میں وہاں میری بچی...... آپ اپنے دوسرے پوتوں سے دل بہلا لیجیے ممی۔" حنا نے گستاخانہ انداز میں کہا اور بچی کو اس کے ہاتھوں سے لے کر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ میاں، بیوی حق دق ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ زبان جیسے گنگ ہوگئی ہو۔ تھوڑے توقف کے بعد عمر اپنی قوتِ گویائی کو بحال کرتے ہوئے بولے۔

"دل چھوٹا مت کرو، پہلی اولاد کسی لڑکی کے لیے کافی مشکل مرحلہ ہے، اس لیے پوزیسیو بھی ہوتی ہے، غیر ضروری فکریں اور اندیشے بھی اسے گھیرے رکھتے ہیں، تم اس سچویشن سے خود بخوبی واقف ہو۔ ریلیکس رہو، وقت کے ساتھ سب کچھ درست ہوجائے گا...... اور تمہاری یہ خواہش کہ سمانہ ماں کے بجائے تمہارے ساتھ رہے سراسر غلط اور ناقابل قبول ہے۔ آئندہ ایسی بے وقوفانہ باتیں مت کرنا۔ لوگ تمہیں پاگل کا خطاب دے ڈالیں گے۔" عمر اپنے تئیں سمجھانے لگے۔

"تمہارا کیس ہی نرالا ہے۔ تم نے تو اپنی زندگی میں خود مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ ایسا کرو کہ میرے ساتھ کل ہی ایدھی سینٹر چلو، کسی لاوارث بچی کو گود لے لو۔ شاید تمہارے دل کو سکون مل جائے۔" وہ چڑ کر بولے۔

"آپ بھی خفا ہوگئے۔" وہ منمنائی۔

"ہاں...... میری تمام زندگی یہی بے ہودہ بکواس سنتے گزر گئی...... اب بہو، بیٹے کو گنوا بیٹھو گی۔" وہ خفگی سے بولے۔

"سچ مچ میں پاگل، دیوانی اور سر پھری ہو گئی ہوں۔" وہ زور سے چیخی۔ اس وقت سچ مچ وہ پاگل ہی لگ رہی تھی۔

"تو پھر اٹھو تمہیں پاگل خانے چھوڑ آؤں۔ زندگی عذاب بنا رکھی ہے......" پھر وہ غصے پر قابو پا کر سنبھل کر بولے۔ "خوش رہو اور خوش رہنے دو...... ہم سب کو۔"

"جی......" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کا بازو مضبوطی سے تھام کر اپنے دل کو مستحکم کرنے لگی۔

"تم کیسے کہتی ہو کہ سمانہ کی شباہت تم پر ہے...... میری صوفی تو اس دنیا میں واحد ہے، نہ ماضی میں اس جیسی کوئی پیدا ہوئی ہے نہ ہی حال اور مستقبل میں ایسا ہونے کا امکان ہیں۔" وہ اس کا دل بہلانے کی خاطر بولے۔ صوفیہ کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو پھسل کر رخساروں کو بھگو گئے۔ عمر کا دل چاہا کہ فوراً اس ننھی پری کو اس کی آغوش میں چھپا دیں مگر یہ تو ناممکن تھا کیونکہ صوفیہ دادی تھی، سمانہ کی ماں نہیں تھی۔ بے شک صوفیہ کی ممتا کا پیمانہ انتہا ہی ہمہ گیر تھا۔ یہ جذبہ حنا کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

سمانہ نے رات بھر ماں کو جگایا تھا، رونے کی آواز پر صوفیہ کئی بار تڑپ کر اس کے کمرے میں گئی تھی تا کہ بچی کو اپنے پاس ہی لے آئے کیونکہ اس وقت ماں کو آرام وسکون کی اشد ضرورت تھی مگر ہر بار وہ اپنا سا منہ لے کر واپس آجاتی۔ اس نے بھی اسی کشمکش میں رت جگا منایا تھا۔ وہ دن کے وقت بچی کو اپنے پاس رکھنے کو تیار تھی مگر حنا کو ایسی ان سکیورٹی ہوئی کہ وہ اپنے تخلیق کردہ شاہکار کو اپنی آنکھوں سے دور کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

کئی بار عمر کی زبان پر اسے سمجھانے کے لیے الفاظ آئے مگر اس کے غیر معمولی انداز پر وہ صوفیہ کو پھر سے ڈانٹ پلانے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر حالات کی کشیدگی کو بھانپتے ہوئے اسے پیار سے سمجھانے لگے کہ ماتا کی بے لوث محبت فقط ما[illegible] دل میں بسیرا کرتی ہے۔ دادی کو اعلیٰ رتبہ بخشا [illegible] ہے لیکن بہو اس کی محبت اور لگن پر شک کرتی [illegible] کیونکہ بچہ ماں کی پراپرٹی ہے، دادی کی نہیں [illegible]

کھینچا تانی میں ساس اور بہو کی نیندیں حرام ہو گئیں [illegible] صوفیہ اپنی عمر کے تقاضے اور حنا ڈیلیوری کے بعد [illegible] کمزوری، بے آرامی اور ان سکیورٹی کے خوف [illegible] اعصابی جنگ سے بیمار پڑ گئی۔ آخر بہو نے [illegible] جانے اور عید وہیں منانے کا اعلان کر دیا۔ ریان [illegible] ہاں میں ہاں ملائی بلکہ اسے یہ کہہ کر مطمئن بھی کر[illegible] کہ جب تک تمہاری صحت بحال نہیں ہوتی۔ تم وہ[illegible] قیام کرو، بہتری اسی میں ہے۔

صوفیہ نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ عموماً بیٹیاں ڈیلیوری اور ریکوری کا وقت میکے میں گزارنا پسند کر[illegible] ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی صوفیہ کو سمانہ کی جدائی کا سو[illegible] کر اک جھٹکا سا لگا۔ آنکھوں میں جل تھل کی کیفیت [illegible] پر حنا تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے سمانہ کو سینے سے چپکا[illegible] دادی کو چھونے تک نہ دیا۔

صوفیہ نے بچی کو پیار کرنے اور خدا حافظ [illegible] کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے تو بہو نے سخت برہمی [illegible] اسے گھورا۔ صوفیہ کی پیشانی پر شدتِ احساس سے [illegible] ندامت چمکنے لگا۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"بیٹا عید کے بعد جلدی آجانا، سمانہ کے بغیر تو گ[illegible] ہی سونا ہو جائے گا۔ اداس ہو جاؤں گی۔" یہ جملہ [illegible] ہی بہو نے ساس کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

سمانہ سے جدائی کا احساس عمر کو بھی ہو رہا تھا [illegible] مرد تو بہت پریکٹیکل ہوتے ہیں۔ ایسی فضولیات [illegible] اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ صوفیہ کی رگ رگ [illegible] واقف تھے۔ انہوں نے سرد مہری سے بچوں کو خد[illegible] حافظ کہا اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں [illegible] آئے اور اس موضوع پر گفتگو کیے بغیر صوف[illegible] ٹرنکولائیزر کھلا کر اسے سلانے کی کوشش کر[illegible]

لگے۔ اس کے چہرے پر زردی اور نقاہت کا بسیرا تھا۔ کمرے میں عجیب سی اداسی اور تنہائی کی بھیانک خاموشی تھی۔ عمر کو اس پر بے تحاشا ترس بھی آیا اور غصہ بھی کہ ایسی بھی کیا ستم ظریفی کہ اپنی بیٹی نہیں...... بھلا دوسروں کی اولاد کبھی اپنی بنی ہے اگر ایسا ہوتا تو آج تمام بہوئیں ہماری ہی اولاد ہوتیں مگر اس باؤلی کو کوئی کیسے سمجھائے.. کہ تمہاری چاہ اور لگن، پیار ومحبت کو کوئی اور رنگ دیا جا رہا ہے۔ عمر فکر مند تھے کہ صوفیہ کو اس سراب سے نکالنے کی کون سی سبیل نکالیں کہ خانگی سکون واطمینان بھی برقرار رہے اور صوفیہ بھی پاگل پن سے باہر نکل آئے۔

اس ابتدائی سلوک پر وہ دل گرفتہ تو ہوئی تھی...... مگر اس کی زبان سے کوئی ناخوشگوار کلمات نہیں نکلے کہ وہ ہی اس خاندان کی روایات برقرار رکھنے کی ذمے دار تھی کہ وہ ہر لحاظ سے مشاہدات وتجربات میں بہو سے بہت آگے تھی۔ اسے ہی صبر وشکر کی راہ پر گامزن رہنا تھا۔ اسی پر صوفیہ نے اکتفا کر لیا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک مہینے کے بعد اس نے پوتی سے ملنے کا پروگرام بیٹے کے ساتھ مل کر بنا لیا۔ وہ کس قدر خوش تھی۔ سمانہ کے لیے دل کھول کر شاپنگ کی۔ ایسی شاپنگ، جو وہ زندگی میں پہلی بار کر رہی تھی...... کلر فل اور خوب صورت پونیاں بالوں کے کلپس اور ہیئر بینڈز، ننھی منی بے شمار خوب صورت فراکس خریدتے ہوئے دن بھر کی تھکن کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ اس کے اداس اور مرجھائے ہوئے چہرے پر پھولوں کی سی شگفتگی اور چمک تھی۔ اسے عجیب سا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ ڈھیر سارے کھلونوں کو اس نے ایک اٹیچی میں بھر لیا تھا بہو اور اس کے میکے کے ہر فرد کے لیے ڈیزائنر ڈریسز خریدے اور اس ویک اینڈ پر لاہور جانے کی تیاری مکمل ہو گئی۔ نوکر نے سامان گاڑی کی ڈکی میں رکھا ہی تھا کہ موبائل کی بپ پر عمر نے موبائل کانوں سے لگا لیا اور کچھ سن کر او کے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ صوفیہ کی طرف غور سے دیکھ کر کچھ کہہ نہیں پائے تو صوفیہ نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تمہیں، اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔ حنا از ناٹ فیلنگ ویل...... وہ تمہیں اٹینڈ نہیں کر سکے گی۔ ریان تمہارا جانا ضروری ہے تم جاؤ اور صوفیہ میں تمہیں اگلے ویک اینڈ پر لے چلوں گا۔" ریان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... ماں کا سامان پورچ میں رکھا اور یہ جا وہ جا۔

...... وہ اچنبھے سے شوہر کو دیکھنے لگی۔ عمر کے چہرے پر تاسف سے بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کیا میرے لیے حنا کے پاس چند گھنٹے بھی نہیں تھے۔ ایسی بھی کیا ایمرجنسی تھی۔" وہ دکھ سے بولی۔

"عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ صوفیہ اب بھی سمجھ جاؤ بچی کی خاطر اپنی عزتِ نفس داؤ پر کیوں لگانے تلی بیٹھی ہو۔ دعا کرو کہ وہ جن کی بیٹی ہے انہی کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ اللہ تعالیٰ ان

انمول موتی

وقت اور دولت دو ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے اختیار میں نہیں، وقت انسان کو مجبور اور دولت مغرور بنا دیتی ہے۔

☆ ہمیشہ اس انسان کے قریب رہو جو تمہیں خوش رکھے لیکن اس انسان کے اور بھی قریب رہو جو تمہارے بغیر خوش نہ رہ پائے۔

☆ نماز کی حالت میں آنکھیں بند کرنا مکروہ ہے، نماز میں جب قیام پر کھڑے ہو تو نظریں سجدے کی جگہ رکھو، جب رکوع کرو تو پاؤں کے درمیان دیکھو، جب سجدہ کرو تو ناک کی سیدھ میں اور جب بیٹھ جاؤ تو نظریں جھولی میں ہونی چاہیے اور جب سلام پھیرو تو دونوں کانوں کو دیکھو۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کے گھر کو آباد و خوش حال رکھے۔ ان کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو۔ فطرت کا یہ اصول ہے کہ آپ جس کے تعاقب میں اپنا تن من دھن لٹا دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ آپ کی رسائی اور پہنچ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں لے گئے۔ ان کی آواز میں رقت تھی۔ صوفیہ نے میاں کی نگاہوں میں تاسف کے ہمراہ تحقیر آمیزی بھی محسوس کی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود شرم وندامت سے پانی پانی ہوکر مٹی کی نذر ہو جائے گا۔ اس تذلیل، بے بسی اور استہزائیہ کیفیت میں وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے سسکنے لگی۔ دل کے زخم پھر سے ہرے ہونے لگے...... پھر سے وہ جنونی بن گئی۔

"خدا کے لیے خود کو سنبھالو...... ہم نے اپنی زندگی کا طویل سفر اکٹھے طے کیا ہے۔ دھوپ چھاؤں، اتار چڑھاؤ کے تمام موسموں کو ہنس کر برداشت کیا ہے اپنی زندگی کی ہر آزمائش پر تم اور میں پورے اترے ہیں۔ اب جو ہم پر وقت ہے بہت ہی حسین ہے۔ بچے اپنی بیویوں کے ساتھ اپنی، اپنی زندگی میں مگن اور مست ہیں۔ آج اس گھر میں پہلی پوتی کی آمد ہوئی ہے یکے بعد دیگرے بے حساب پوتیاں تشریف فرما ہوں گی۔ کس کس کا تعاقب کرو گی۔ سب کے لیے یہ گھر چھوٹا ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں سب اپنا، اپنا آشیانہ بنانے کی تگ ودو میں مصروف ہو جائیں گے۔ سب کو جانے دو اپنے اپنے ٹھکانوں پر...... یوں بلکتی رہو گی تو کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا۔ دنیا ہمیشہ ہنسنے والوں کا ساتھ دیا کرتی ہے۔ رونے والے لوگ ہمیشہ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔" وہ نرم لہجے میں بولے تو وہ خفیف سی ہو کر آنسو صاف کرنے لگی۔ "تمہاری اولاد تعلیم یافتہ ہے اور تم اپنی تربیت پر بھروسا رکھو مگر اپنے جذبات پر قابو رکھنا سیکھو۔ یہی اولین شرط ہے، حد سے زیادہ پیار اور نرمی سے انسان کی زندگی زوال پزیر ہو جایا کرتی ہے۔ خود پر اور مجھ پر رحم کرو پلیز۔" میاں کی سپورٹ ملتے ہی اس کی انا و خودداری نے وجود میں بھرپور انگڑائی لی اور وہ سر اٹھا کر بیٹھ گئی۔ شوہر ابھی تک اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ملتجیانہ انداز میں بیٹھے تھے۔

"بیٹیوں کی ماؤں کو آئیڈیلائز کرنا چھوڑ دو۔ اُن سے اُن کے دل کا حال پوچھو۔ اندر کی داستان سنو...... وہ کتنی دکھی اور رنجیدہ ہیں کیونکہ ہمارے معاشرے میں بیٹی خاندان بھر کے لیے آزمائش ہے کیونکہ بیٹے والے ہر حال میں اوپر رہتے ہیں۔ تم عجیب عورت ہو۔ سکون، عزت وتکریم تمہیں اذیت دیتی ہے۔ خدا کا شکر ادا کرنا سیکھو۔ ورنہ کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گی۔ تم میری باتوں سے یہ نتیجہ اخذ مت کرنا کہ میں اولاد کے سامنے لاچار، کمزور اور مجبور ہو گیا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ہمیں اس وقت دل کے بجائے ذہن سے سوچ کر حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔ وقت کا تقاضا یہی ہے۔ تمہاری بے پناہ محبت وتوجہ نے حنا کو ان سیکیور کر ڈالا ہے۔ اب تمہارا متوازن سلوک ہی اسے تحفظ دے سکتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ پیار کا اس طرح کا اظہار کرنا چھوڑ دو گی۔ محبت اور لگن کو دادی کے رشتے کے مطابق نبھاؤ یہی جائز حق ہے۔ ہمارے مسئلے کا یہی حل ہے۔ اگر تم اپنے بچوں کے قریب رہنا چاہتی ہو تو ایسا کرنا ہوگا۔"

"مجھے آپ کی تمام باتوں سے اتفاق ہے۔ کاش میں منہ کی کھانے سے پہلے آپ کی بات مان لیتی ہوتی؟ سچ میں ادھوری نہیں ہوں۔ اب ادھوری تصویر کو مکمل نہ بھی کریں تو بھی میں مکمل ہوں۔" وہ خود اعتمادی سے بولی۔

"تھینک یو صوفی! یو آر سو گریٹ آئی لو یو سو مچ۔ بس ہم ابھی اور اسی وقت مری چلتے ہیں۔ ویک اینڈ سمانہ کے ساتھ نہیں بلکہ دونوں مل کر گزاریں گے جوانی تو اپنی، اپنی نوعیت کی مصروفیت میں ہی بیت گئی...... " وہ قدرے پُرجوش انداز میں بولے۔ صوفیہ کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا وہ لمبی سانس لے کر مسکرا دی۔

☆☆☆

صوفیہ نے اپنا دل ایسا مضبوط کیا کہ پوتی کا نام زبان پر لانے سے پہلے وہ دس بار سوچتی۔ حنا سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ بہت محتاط رہنے لگی تھی۔ حنا کو بھی ساس کی یہ تبدیلی خاصی روح افزا لگی۔ وہ چار، چھ مہینے میکے گزارنے کے بعد اپنی سسرال واپس آ رہی تھی کہ موٹر وے پر ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ حنا اسپتال پہنچتے، پہنچتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ باپ اور بیٹی معجزاتی طور پر زندہ بچ گئے۔

صوفیہ بن ماں کی بچی کے دکھ میں نڈھال ہو گئی، بہو کا یوں آناً فاناً چلے جانا کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ بیٹے کے گھر اجڑ جانے کا قلق اسے چین نہیں لینے دیتا۔ اس نے سمانہ کو حاصل کرنے کے لیے ایسی کوئی دعا نہیں مانگی تھی پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ وہ ہر وقت یہی سوچتی رہتی۔ سمانہ سات مہینے کی ہو چکی تھی۔ اسے ماں کی گود کی عادت تھی وہ اس کی خوشبو سے مانوس تھی۔ اسے ماں کے چہرے کی پہچان تھی...... ہاتھوں کی شناخت تھی۔ ماں کے عکس کی جستجو میں وہ گھنٹوں روتی اور صوفیہ تڑپ اٹھتی۔ اسے سینے سے چپکائے لوریاں سناتی رہتی...... اب زندگی کا محور سمانہ تھی۔ اسی کی مسکراہٹ پر کھل اٹھتی اور اسی کے رونے کی آواز اسے بھی رُلا جاتی۔ معصوم بہت جلد دادی کو اپنی ماں تصور کرنے لگی تھی۔ انہی کی آغوش اس کا مسکن بن گئی۔ لیکن اب اس مسکن میں دکھ، درد اور آہیں شامل ہو چکی تھیں۔

صوفیہ، بیٹے کو دوبارہ گھر آباد کرنے کی تلقین کرنے لگی تھی۔ وہ ہر بار انکار کر جاتا۔ جوان بیوی کے اپنے سامنے دم توڑ دینے کو وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر ہوتے ہوئے خود ڈپریشن میں چلا گیا...... اور بیٹی سے بالکل ہی لاتعلق ہو گیا۔ والدین، دوست واحباب سے بھی رابطہ برائے نام رہ گیا تھا۔ والدین ہر وقت فکرمند رہنے لگے۔ انہیں اس مسئلے کا حل فقط اس کی شادی میں ہی نظر آ رہا تھا مگر ریان کا حنا کے ساتھ بیتا ہوا وقت اس کی زندگی پر حاوی ہو چکا تھا۔

اس کی بے حد توجہ، محبت اور ہمدردی میں پوتی پروان چڑھنے لگی۔ وہ اسے ممی اور دادا کو ابو کہہ کر پکارتی جبکہ باقی تمام چچاؤں اور باپ کو بھیا جان کہتی۔ کسی کو اعتراض کیونکر ہوتا۔ صوفیہ نے ماں بن کر جو دکھایا تھا۔ اس میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا کریڈٹ صوفیہ کو جاتا تھا جبکہ وہ بیٹے کے دکھ اور بہو کی جوان موت کی اذیت میں گھلتی جا رہی تھی۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے ساتھ ہی ہارٹ کا بھی عارضہ ہو گیا تھا مگر پوتی کی تربیت اور لاڈ پیار میں کمی نہ آنے دی۔ بیٹا اور بیٹی کے پالنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ریان، کوکھ سے پیدا کرنے اور پالنے والی دونوں ایک جیسی ہی لگی تھیں۔ وہ مطمئن تھا۔ وقت گزرتا گیا وہ بڑی ہوتی گئی دادی کی صحت بتدریج گرتی چلی گئی۔ ریان نے ماں کی یہ حالت دیکھی تو شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس کی شادی اسی کی ایک کولیگ حرا سے طے کر دی گئی۔ دو سال تک حرا سسرال میں ہی رہی۔ پریگنینٹ ہوتے ہی اس نے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہی دنوں ریان کی پوسٹنگ لاہور کی ہو گئی اور وہ اپنی بیوی کو لے کر لاہور چلا گیا۔ بیٹی، دادی کے پاس خوش تھی۔ اس لیے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اس دن سمانہ کی آٹھویں برتھ ڈے نہایت دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔ جب سمانہ کے بھائی کی پیدائش کا مژدۂ راحت ان لوگوں تک پہنچا۔

دادا اور دادی مع سمانہ کے بچے کو دیکھنے پہنچ

گئے۔ دو دن رہنے کے بعد جب انہوں نے واپسی کا پروگرام بنایا تو ریان نے بیٹی کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ صوفیہ کو یوں لگا جیسے اس کے جسم کا سب سے اہم حصہ کاٹنے کا منصوبہ بنا لیا گیا ہو۔ سوتیلی ماں کی آنکھوں میں نفرت اور بے اعتنائی کو اس نے بھانپ تو لیا تھا۔ اس کے لہجے کی سختی اور درشتی پر وہ کمرے میں جا کر جی بھر کر روئی تھی۔ وہ اسے اس ماحول میں کیسے چھوڑ کر واپس جا سکتی تھی مگر یہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑا کیونکہ ریان بیٹی کی ذمے داری خود اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے اس گھر میں ماں اور بھائی کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی ٹریننگ دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جگہ بالکل درست زاویے سے سوچ رہا تھا۔ لمبی چوڑی قیل وقال کے بعد صوفیہ دل پر منوں بھاری سِل رکھے اپنے گھر واپس آ گئی۔

دن رات کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ کمرے میں بند رہ کر اللہ تعالیٰ کے حضور ہر وقت دعا گو رہتی کہ سمانہ اپنی ماں کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جائے۔ اسے بچی کی خوشی عزیز تھی۔ وہ اسے فون کرنے سے بھی گریز کرنے لگی تاکہ سمانہ اسے سرے سے بھلا ہی دے۔ صوفیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنی بیٹی وداع کر دی ہو اور اس کے لیے ہر صورت سسرال میں ایڈجسٹ ہونے کے گُر استعمال کرنے ضروری ہو گئے ہوں۔ عمر میٹنگ کے لیے لاہور جا رہے تھے۔ ان کے بے حد اصرار پر صوفیہ کو ساتھ جانا پڑا۔ دل میں سمانہ سے ملنے کی بے پناہ خوشی بھی تھی مگر ظاہر کرنا مناسب نہ لگا۔ وہاں جا کر سوتیلی ماں کے سلوک پر وہ چپ نہ رہ سکی اور ریان سے شکایت کر ڈالی تو وہ سیخ پا ہو گیا۔

”ہماری زندگی میں دخل اندازی کرنا بند کریں خواہ مخواہ میرے لیے نئے مسائل پیدا مت کریں، حرا ماں ہے وہ اس کے لیے بہتر ہی سوچے گی۔ آپ نے تو اسے spoil کر کے رکھ دیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب قدرے سنبھل گئی ہے۔ ممی مجھ پر مہربانی کیجیے آئندہ سمانہ سے ملنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اس طریقے سے وہ کبھی اس گھر کا فرد نہیں بن سکے گی۔“

صوفیہ اور عمر نے بڑے دکھ سے اپنا سامان اٹھایا اور ہوٹل شفٹ ہو گئے اور سمانہ کو ایک دم سے ماما کی حدت کی کمی نے بے کل کر دیا۔

چند دن بعد وہ اسلام آباد اپنے گھر واپس آ گئے مگر صوفیہ بستر سے نہ اٹھ سکی۔ اسے آج محسوس ہوا کہ بیٹی کی چاہ میں اس نے اپنی زندگی کی تمام نعمتوں اور خوشیوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ وہ کسی طرح بیٹی کی ماں تو بن گئی مگر اس ناشکری کے باعث وہ ایک نئے اور کٹھن امتحان کا شکار ہو گئی اور یہی امتحان اس کی موت کا باعث بن گیا تھا۔

”بیٹا تمہاری ماں تمام عمر بیٹی کی کمی کو روگ کی طرح پالتی رہی مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہی روگ اس کی زندگی نگل لے گا۔“ جنازے کے بعد جب ریان واپسی کے لیے تیار تھا تو انہوں نے بہ مشکل چند جملے بیٹے سے ادا کیے اور پوتی کو پیار کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ہم سفر سے جدائی کی پہلی رات عمر کے لیے کس قدر جان لیوا تھی۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتے تھے۔ نیند ان سے کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے تھک گئے تھے۔ کانوں میں صوفیہ کی آواز گونجی۔

”عمر! میں پورٹریٹ کے مانند ادھوری ہی رہ گئی۔ جب باری تعالیٰ نے ہی مجھے نامکمل رکھنے کی ٹھان لی تھی تو آپ مجھے مکمل شاہکار کیسے بنا سکتے تھے۔“

وہ چونک کر بستر سے اٹھے...... اور صبح تک صوفیہ کا پورٹریٹ مکمل ہو چکا تھا۔ وہی پرانا حُسن جس کے بانکپن میں جوانی کا لازوال جمال سرگوشی کر رہا تھا کہ کوئی ذی روح کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا اپنا متعین کردہ رول ہے...... مکمل، بھرپور اور جاندار......

قربانی

شمع سید



''کس سوچ میں گم ہیں آغا صاحب......؟''
شوہر کو کسی گہری سوچ میں گم دیکھ کر وہ پوچھ بیٹھی تھیں۔
''بیگم میں سوچ رہا ہوں اس عید پر ہم قربانی کے جانور نہ خریدیں۔''
''یہ کیا بات ہوئی آغا صاحب...... ہمارے گھرانے میں بقرعید پر قربانی کی مثال پورے شہر میں نہیں ملتی۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے اعلیٰ نسل کے صحت مند اور خوب صورت جانور عید کے تیسرے دن تک منگوائے جاتے ہیں...... اور آپ نے بھی عیدِ قرباں پر کبھی کوئی حساب کتاب نہیں رکھا۔'' وہ ذرا متفکر ہوئیں۔ ''رب نے آپ کو بے حساب نوازا ہے تو آپ نے بھی اس کی راہ میں بے دریغ خرچ کیا...... ہمارے پورے علاقے میں دور و نزدیک کا کوئی گھرانا ایسا نہیں ہوگا جس میں قربانی کا گوشت ان کی ضرورت اور افرادِ خانہ کے حساب سے نہ بھیجا جاتا ہو۔ درجنوں ملازمین صرف قربانی کی وجہ سے گاؤں سے شہر بلوائے جاتے ہیں۔ اللہ پاک نمود و نمائش سے دور رکھے مگر یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے گھروں کو آس ہوتی ہے، عید میں صرف چار دن باقی ہیں، ایسے میں آپ کا قربانی سے انکار...... کیوں آغا صاحب...... سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' وہ تشویش میں مبتلا ہو چکی تھیں۔
''ارے ایسا کچھ بھی نہیں ہے، آپ اس قدر پریشان نہ ہوں بیگم۔'' انہوں نے بیوی کو تسلی دی۔
''دراصل کل صبح فجر کی نماز کے بعد مسجد سے واپسی پر میرے ساتھ نثار صاحب اور ان کا بیٹا حمزہ بھی مسجد سے باہر نکلے...... حمزہ کا اصرار تھا کہ اس کے سب دوستوں نے بکرے خرید لیے ہیں اسے بھی بکرا خریدنے جانا ہے، آپ تو جانتی ہیں نثار صاحب خاصے معقول اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ پچھلے سال تک تو سب ٹھیک ٹھاک تھا پھر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں کچھ مسئلہ ہوا تو اب کام کرنے کی وہ سکت نہ رہی ان میں، اوپر سے بڑھتی ہوئی مہنگائی مگر

بچے تو پھر بچے ہیں بیگم...... میری موجودگی کا خیال کرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے حمزہ کو سمجھا رہے تھے جبکہ اُن کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے کرب کو اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا تھا۔" آغا صاحب بڑے دکھ سے کہہ رہے تھے کہ وہ کل سے اسی سوچ میں گم تھے۔

"میں آپ کی بات اور احساسات کی قدر کرتی ہوں آغا صاحب مگر میں سمجھ نہیں پائی کہ اس بات کا ہمارے قربانی نہ کرنے سے کیا تعلق ہے؟"

"میری بات پوری ہو تو آپ سمجھ جائیں گی۔" وہ رسان سے بولے۔

"آپ نے میری بات پر شاید غور نہیں کیا، میں نے کہا کہ ہم قربانی کے جانور نہیں خریدیں گے، یہ نہیں کہا کہ اس سال قربانی نہیں کی جائے گی۔"

"آپ مجھے پریشان کر رہے ہیں آغا صاحب، صاف صاف بتائیں آپ کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ آپ کو اپنے محلے کے لوگوں کا احساس ہے ان کے لیے دردِ دل بھی آپ رکھتے ہیں، یہ تو اچھی بات ہے لیکن اس سب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ اپنے بچوں کی خوشیاں اور خواہشات پسِ پشت ڈال دیں۔ آپ کے بچے پورا سال اس دن کا انتظار کرتے ہیں، ان کا خیال نہیں ہے آپ کو؟" وہ ذرا تیز لہجے میں بولیں۔

"آپ تھوڑا خاموش ہوں تو ہم اصل مدعا آپ کے گوش گزار کریں۔" آغا حیدر نے مسکرا کر اپنی بیوی کو دیکھا جو قدرے ناراض نظر آنے لگی تھیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس عید پر بہت غیر محسوس طریقے سے ہر اس گھر کو قربانی کے جانوروں کی خریداری میں شامل کیا جائے جو الگ سے قربانی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور پھر بچے تو سب ہی اپنے ہیں، گاؤں میں بھی الگ سے قربانی کی جاتی ہے اور پھر اماں جی بھی ہر کام سب کی مشاورت سے کرتی آئی ہیں۔ سو کسی کی حق تلفی کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس بار گاؤں ملازموں کو نہ بلوایا جائے۔ میں آج شام نثار ... اور محلے کے دیگر لوگوں کو بلوا لیتا ہوں اور ان ... درخواست کرتا ہوں کہ کاروباری مصروفیات ... سے مجھے فرصت نہیں ہوگی۔ سو آپ جیسے محلے ... افراد جا کر قربانی کے جانور خرید لیں، نہ ... جانور خرید لیں بلکہ عید کے دن تک ان کی دیکھ ... کے معاملات کو بھی وہی لوگ سنبھالیں۔ قصاب ... انتظام سے لے کر گوشت بانٹنے تک اور پھر ... کھانے تک سب گھرانے ہمارے ساتھ رہیں ...

بیگم حق دق انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"دل کو تھوڑی وسعت دینے کی ضرورت ... بیگم...... بس خیال یہ رکھیے گا کہ آپ کے منہ سے ... کوئی بات نہ نکلے یا بچوں کی کسی بات سے ایسے ... یا احساسات کا اظہار نہ ہو جن سے کسی کی دل آزاری ... ہو، یہ سب بھی ہمارے بہن بھائی ہیں، ہم پر حق ر... ہیں اور پھر پہلے بھی تو یہ سب ان تک ہی پہنچا ... اس بار اس انداز سے عید کی خوشیوں میں ان سب ... بھی شامل کر لیتے ہیں۔ شاید بارگاہِ الٰہی میں ہ... قربانی قبول ہو جائے۔" آغا حیدر بولے جا رہے ... اور بیگم صاحبہ اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔ "بس ... بات کا خیال رکھیے گا کہ کسی کو بھی یہ احساس نہ ہو کہ ... یہ سب ان کی بے بسی کی وجہ سے کر رہے ہیں، آپ ... سے کہہ دیں کہ باورچی اور ڈیکوریشن وغیرہ کے ... معاملات طے کر لے تاکہ عید کے دن کوئی پریشانی ... ہو، باہر لان میں دسترخوان لگایا جائے گا۔"

"جی آغا صاحب میں سمجھ گئی، میں کوشش کروں ... آپ کو کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو پھر وہ ... بولیں۔ "آغا صاحب! ایسے ہی تو مجھے آپ پر فخر اور ... نہیں ہے ناں۔ آپ ہمیشہ زمانے سے منفرد کام جو کر... ہیں۔" بیگم کی بات پر آغا صاحب مسکرا دیے تھے۔

میرا نام آج حنا ہے

شیریں حیدر



"ارے مر وگی کیا......!" میں نے پوری قوت سے گاڑی کے بریک لگائے اور گاڑی کے اندر سے ہی چلا کر کہا جیسے کہ وہ مجھے سن رہی ہو۔ وہ اس گٹھڑی نما چیز کو سڑک پر ہی چھوڑ کر بھاگتی ہوئی میری ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئی، میں نے غور سے دیکھا اس کا سفید یونیفارم لہولہان ہو رہا تھا، سڑک پر پڑی گٹھڑی ذرا سی ہلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی آدمی تھا...... سڑک پر اس کے گرد خون پھیلا ہوا تھا، میری

گاڑی کے آگے اور پیچھے کوئی اور گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''بچالیں...... میرے پاپا کو بچالیں پلیز......''
اس نے میری طرف کی کھڑکی کو کھٹکھٹا کر کہا۔ میں نے سوچا کہ شیشہ اتاروں اور اس سے پوچھوں کہ کیا ہوا ہے مگر میں جھجک گئی۔ چند لمحوں کے توقف سے میں نے شیشہ ذرا سا نیچے کیا، باہر سے سردی کی ایک تیز سی لہر اندر داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم اور کیوں خود کو مارنے کے درپے ہو؟'' میں نے ایک ہی بار میں کئی سوالات کر ڈالے۔

''وہ میرے پاپا...... وہ گاڑی کے پہیے کا پنکچر لگا رہے تھے، ایک گاڑی انتہائی تیزی سے آئی اور انہیں کچلتے ہوئے گزر گئی...... میں باہر نکلی مگر اس سے پہلے ہی وہ اتنا دور جا چکی تھی کہ میں نمبر بھی نوٹ نہ کر سکی...... لال رنگ تھا اس گاڑی کا۔''

''تو؟'' میں نے لمبی سی تو میں سوال کیا۔

''پاپا کا بہت سا خون بہہ چکا ہے...... وہ...... انہیں کچھ ہو نہ جائے۔'' وہ سسکی اور کئی آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے چھلک گئے۔ ''آپ میری مدد کردیں انہیں اسپتال لے جانے میں۔''

''میں تمہاری مدد کیوں کروں جبکہ میں تمہیں جانتی تک نہیں......'' میرے لہجے کی سفاکی پر اس کی آنکھوں کی حیرت دیدنی تھی۔

''آپی...... میرا نام حنا ہے...... مم......'' اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے گاڑی چلا دی، بیک ویو مرر میں مجھے اس کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت نظر آئی اور سڑک پر اس کا تڑپتا ہوا باپ...... مگر میں پھر بھی نہ رکی، رکنا ممکن بھی نہ تھا، آپ میری جگہ ہوتیں تو آپ بھی نہ رکتیں۔ مجھ میں انسانی ہمدردی کا بہت مادّہ تھا، بہت ترس اور شفقت تھی...... مگر اب نہیں رہی۔ میں انسان ہوں اور میرا دل بھی دوسروں کی تکلیف پر تڑپتا ہے مگر اس [illegible] میں اس کرب کی آڑ میں چھپا لیتی ہوں، جو [illegible] میں چند برس قبل گزری تھی...... آپ مجھے [illegible] رہے ہوں گے کہ کسی مظلوم کو مصیبت میں دیکھ [illegible] میں نے اپنی گاڑی آگے کیوں بڑھالی تھی۔

☆☆☆

ہر روز میں دفتر جاتے ہوئے ایک ہی [illegible] سے جاتی اور میرے راستے میں کئی موڑ آتے [illegible] سگنل اور کئی اہم چوک...... ہر روز ہر ایک چیز [illegible] اسی مقام پر ہوتی، وہی اخبار فروش، وہی بھکاری [illegible] وہی بس اسٹاپ پر کھڑے لوگ اور وہی [illegible] والے...... میرے ذہن میں ہر تصویر اس طرح [illegible] تھی کہ مجھے علم ہوتا کہ اگلے لمحے کیا سامنے آنے [illegible] ہے۔ اس بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے ہر ایک [illegible] چہرے سے بھی میں آشنا ہو چکی تھی جو ائرپورٹ چوک [illegible] سے پہلے آتا تھا اور جس پر ہر روز لازماً سگنل بند [illegible] اور دو منٹ مجھے وہاں لگ جاتے...... میں ان چہروں [illegible] سے بھی آشنا ہو چکی تھی جو کبھی کبھار وہاں دیکھنے [illegible] ملتے۔ سات بج کر چودہ منٹ...... وہاں پہنچ کر [illegible] وقت دیکھتی۔

وہ چہرہ کیسے بھول سکتی ہوں میں، سیاہ نقاب [illegible] کے ہالے میں چھپا ہوا، فقط دو سہمی ہوئی آنکھیں...... مردوں کے ہجوم میں خود کو سمیٹ کر کھڑی ہوئی [illegible] عمر سی نظر آنے والی لڑکی۔ اس روز، میں ایک منٹ [illegible] کی تاخیر سے پہنچی تو لوگوں کا وہ ہجوم ایک بس [illegible] بیٹھنے کے لیے دھکم پیل کر رہا تھا، وہ اپنی جگہ کھڑی [illegible] اور اس انتظار میں تھی کہ رش گھٹ جائے تو وہ حرکت [illegible] کرے مگر رش تھا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا...... تب [illegible] چند قدم چلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چل نہیں سکتی [illegible] اس کے ایک ہاتھ میں بیساکھی تھی، واللہ...... حسن [illegible] وہ بھی داغدار...... وہ خود کو گھسیٹ گھسیٹ کر بس [illegible] پہنچی، کسی نے ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دیا...... میر [illegible]

عقب میں ہارن بجنے لگے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں لے دیکھنے میں کس قدر محو تھی۔

دفتر پہنچ کر بھی میرے حواسوں پر اسی کا خیال چھایا رہا۔ جانے وہ پیدائشی ایسی تھی یا بعد میں کسی حادثے نے اسے یہ معذوری بخش دی تھی، جو بھی تھا مگر اس کا یوں معذور ہونا بہت تکلیف دہ تھا۔ اسے یاد کرتے میں نے دل سے اسے دعا بھی دے ڈالی اور اللہ کا شکر ادا کیا، ان نعمتوں کے لیے جو اس نے ہمیں عطا کر رکھی ہیں اور ہم ان کی قدر تک نہیں کرتے...... جب کسی معذور کو دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ کیا کچھ ہے ہمارے پاس...... کاش میں اس کی کسی طرح مدد کر سکتی، اس کی آنکھیں، کتنی... خوب صورت اور کتنی اداس تھیں۔

☆☆☆

ہر روز کی طرح سات بج کر چودہ منٹ پر میں اسی اشارے پر پہنچی، اس وقت سیاہ گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں...... کسی وقت بھی آسمان ٹپک سکتا تھا، میں نے بس کے آتے ہی لوگوں کی دھکم پیل اور اس لڑکی کی بے بسی دیکھی جب ایک دو نوجوان خواہ مخواہ اس کے ساتھ اپنے کندھے رگڑ رہے تھے، میں نے فوراً اشارے کی بتی آن کی اور گاڑی کو سڑک کی انتہائی بائیں جانب کر لیا، عین بس کے پیچھے جا کر میں نے ہارن دیا، وہ متوجہ نہ تھی تو میں نے گاڑی سے اتر کر اسے بلایا۔

''بات سنو پیاری لڑکی!'' اس کی اداس آنکھوں میں حیرت کی چمک در آئی اور وہ جیسے سکتے میں آ گئی، سراپا سوال بنی کھڑی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں؟

''ہاں ہاں......'' میں نے اشارے سے اسے بلایا۔ ''آجاؤ میں تمہیں ڈراپ کردیتی ہوں۔''

''ارے نہیں نہیں...... میرا تو ہر روز کا معمول ہے...... اس بس میں جگہ نہ ملی تو اگلی بس میں چلی جاؤں گی، آپ اپنے کام سے لیٹ ہو جائیں گی۔'' اس کے لہجے میں کتنی شیرینی تھی۔

''کوئی بات نہیں...... ایک دن لیٹ ہو جاؤں گی تو کوئی بڑی بات نہیں......'' میں نے کہا۔ ''تمہاری مدد کرکے مجھے خوشی ہوگی۔''

''بہت شکریہ کہ آپ نے احساس کیا مگر میں نہیں چاہوں گی کہ مجھ بدقسمت کی وجہ سے آپ کو اپنے کام سے دیر ہو جائے اور کوئی آپ پر ناراض ہو......''

''ہاہاہا......'' میں ہنسی۔ ''کوئی ناراض نہیں ہوگا مجھ پر...... اپنے کام پر میں ہی باس ہوں، کوئی نہیں ڈانٹے گا مجھے، میری فکر نہ کرو تم، جلدی سے آجاؤ، بارش کسی لمحے بس برسا ہی چاہتی ہے......''

وہ اپنی بیساکھی ٹیکتی ہوئی میرے ساتھ چلی اور پچھلی سیٹ پر اپنی بیساکھی سمیت بیٹھ گئی، مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ اگلی سیٹ پر سہولت سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا اور کیا کرتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ہر روز کہاں جاتی ہو؟''

''میرا نام حنا ہے...... اور میں ایک مدرسے میں جاتی ہوں۔''

''کیا کرتی ہو مدرسے میں؟ میرا مطلب ہے کہ پڑھتی ہو یا پڑھاتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہ پڑھتی ہوں نہ پڑھاتی ہوں......'' اس نے پھر مختصر سا جواب دیا۔

''گاڑی میں تو اپنی نقاب ہٹا دو، بہت گرمی ہے۔''

''عادت نہیں ہے مجھے بغیر نقاب کے یوں باہر نکلنے کی۔'' اس نے کہا۔ ''جب سے ہوش سنبھالا ہے اسی طرح نقاب میں گھر سے باہر نکلتی ہوں...... گھر کا ماحول ہی ایسا ہے کہ ذرا دیر کو نقاب ہٹا لیا اور کسی نے دیکھ لیا تو گھر سے باہر نکلنا بند ہو جائے گا۔''

''کیسے سانس لیتی ہو تم اتنی سختی والے ماحول میں......؟'' میں نے آئینے میں اس کی طرف دیکھا۔

"دم نہیں گھٹتا تمہارا؟"

"بس کہاں چلتا ہے کہ سانس لیں، نہ ہی ایسی زندگی کو چھٹنا اپنے اختیار میں ہے......" اس نے گہری سانس لی۔ "مگر پیٹ کا دوزخ بھرنے کو جانے کیا، کیا جتن کرنا پڑتے ہیں۔" میں نے مزید اس کی دکھتی رگ کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے گاڑی چلاتی رہی۔

☆☆☆

"اگلی گلی میں بائیں......" اس کی ہدایات پر عمل کرتی میں اپنے دفتر کی طرف جانے والے راستے سے بالکل مخالف راستے پر جانے کتنا ہی دور نکل آئی تھی مگر نیکی کا خیال اس سوچ پر غالب آ گیا تھا کہ میں کتنی دیر سے دفتر پہنچوں گی۔

"اتنی دور آتی ہو تم مدرسے میں پڑھنے کے لیے......" میں نے گاڑی موڑتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"میں نے کب کہا کہ میں یہاں پڑھنے آتی ہوں؟"

"چلو پڑھانے ہی سہی......" میں نے ہنس کر کہا۔

"پڑھانے بھی نہیں آتی میں......" اس نے کہا۔ "آپ نے خود ہی سوچ لیا ہے......"

"ہیں...... نہ تم پڑھنے آتی ہو اور نہ ہی پڑھانے...... تو پھر ہر روز اتنا فاصلہ کیوں طے کرتی ہو اور بھلا کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"مدرسوں میں بھی پڑھنے اور پڑھانے کے علاوہ کئی کام ہوتے ہیں......" اس نے کہا تو میری حیرت دیدنی تھی۔ شاید صفائی وغیرہ کا کام کرتی ہو، استانیوں کے لیے چائے بناتی ہو یا پھر کلرک نما ملازمت ہو اس کی...... میں نے خود ہی سوچا۔

"اس بڑے سیاہ گیٹ کے سامنے روک کر ذرا مسلسل ہارن تو بجائیں......" میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا، گیٹ خودکار نظام سے کھلا۔

"گاڑی اندر لے چلیں پلیز......" میں نے گاڑی گیٹ کی اندرونی روش پر ڈال دی، پیچھے گیٹ بند ہوتا نظر آیا تو میں نے مڑ کر اس سے کہا۔

"ارے گیٹ بند نہ کرتے کیونکہ مجھے ا[...] جانا ہے...... پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔"

"کتنی جلدی آپ کو احساس ہو گیا ہے [...] کر کے آپ نے غلطی کی ہے، ابھی تو......" وہ [...] رک گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں حنا......" میں نے قطع [...] سوچا کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے، تم ہرگز ایسا [...] سوچو، بس مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری اور [...] منزل یوں مخالف سمتوں میں ہو سکتی ہے، تاہم [...] نے تمہاری تھوڑی سی مدد کر دی، مجھے دل سے [...] ہوئی......" میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ حالانکہ [...] میں میں وہی سوچ رہی تھی جو وہ کہہ رہی تھی۔

گاڑی میں نے پورچ میں روکی تو اندر سے [...] آدمی باہر نکلے...... ایک نے حنا کی طرف کا در[وازہ] کھولا اور دوسرا میری سیٹ کی طرف آیا، مد[رسے] میں کوئی طالب علم نظر نہیں آ رہا تھا، شاید چھٹی ہو [...] نے دل ہی دل میں سوچا۔

"باہر آ جائیں میڈم......" حنا نے باہر نکل [کر] کہا، وہ بغیر بیساکھی کے کھڑی تھی، اس کی بیسا[کھی] ابھی تک گاڑی کے اندر تھی۔

"چلتی ہوں اب میں......" میں نے [...] بیساکھی اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"ساون...... میڈم کو عزت کے ساتھ اند[ر] [...] اور گاڑی کو گراؤنڈ کر دو......" کہتی ہوئی میرے [...] میں پکڑی بیساکھی کو نظر انداز کر کے وہ اپنے قد[موں] پر چلتی ہوئی اسی دروازے سے اندر چلی گئی جس [...] سے ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں باہر آئے تھے [...] مجھے احساس ہوا کہ میں نے انسانی ہمدردی [...] جذبے سے مغلوب ہو کر کتنی بڑی غلطی کر دی تھی [...]

"تشریف لائیں میڈم......" اس نے [...]

طرف کا دروازہ کھولا۔

"دیکھو بھائی...... مم مم......" میں تھوڑا ہکلانے لگی۔ "مجھے جانے دو پلیز......"

"میڈم کا حکم ہے کہ میں آپ کو عزت سے اندر لے کر آؤں اس لیے آپ خود ہی تشریف لے چلیں، مجھے آپ کو اٹھا کر لے جانا اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا مگر اس کے لہجے میں دھمکی نمایاں تھی کہ اگر میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ مجھے اٹھانے میں عار محسوس نہیں کرے گا۔

میں نے چابی گاڑی میں ہی چھوڑی اور اپنا بیگ اٹھا لیا، چلو خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر دیکھ لیتے ہیں...... میں نے اس کے پیچھے قدم اٹھانا شروع کر دیے، اندر داخل ہوتے ہی مجھے عجیب سی... پراسراریت کا احساس ہوا، سیلن اور اندھیرا... دونوں نے مل کر میرے وجود میں پھریری سی دوڑا دی، میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی، ایک کمرے کے باہر جا کر وہ رکا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

"چلیں میڈم......" اس نے مؤدبانہ انداز میں دروازہ کھولا، میں نے اندر کی طرف قدم بڑھایا۔

"یہ بوجھ مجھے دے دیں......" اس نے تقریباً چھیننے کے انداز میں میرا بیگ لے لیا، میرے جسم سے جیسے جان نکل گئی، اس میں میرا فون تھا، میرے لیے امید کی ایک کرن، میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گی مگر اب وہ آسرا بھی چھن گیا تھا۔

"اس میں میرے استعمال کی کچھ چیزیں ہیں......" میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔

"میڈم اس کی اسکریننگ کر کے واپس بھجوا دیں گی آپ کو۔" کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا، باہر سے اسے بولٹ لگانے کی آواز سے اندازہ ہوا کہ کتنا مضبوط انتظام تھا۔ میں سر تھام کر کھڑی تھی، کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی، کوئی کھڑکی نہ تھی البتہ بہت اونچائی پر روشندان تھا، ایک طرف کونے میں ایک اور دروازہ تھا، یقیناً وہ غسل خانہ ہو گا، کمرے میں ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک میز تھی...... میں کرسی پر جیسے ڈھے سی گئی، کیا ہونے والا تھا میرے ساتھ؟

☆☆☆

میں اتنی غیر معروف تو نہ تھی کہ میرے اغوا کی خبر جنگل کی آگ کی طرح نہ پھیلتی، یقیناً اب تک میرے بارے میں کام پر فکر شروع ہو چکی ہو گی کیونکہ میں کبھی دیر سے نہیں جاتی تھی اور گھر پر کال کر کے پوچھا جائے گا تو بتایا جائے گا کہ وہ تو مقررہ وقت پر گھر سے نکل گئی تھیں...... میری بیٹی ان دنوں امتحانات سے فارغ ہو کر گھر ہی تھی وہ پریشان ہو جائے گی، ابا سے بار بار کہے گی، ماما کو فون کریں، سعید میرا نمبر ڈائل کریں گے...... جانے ان لوگوں نے میرا فون بند کر دیا ہو گا یا پھر کال اٹینڈ کریں گے اور سعید کو بتائیں گے کہ انہوں نے مجھے اغوا کر لیا ہے...... تاوان کا مطالبہ کیا جائے گا، بات پولیس تک پہنچے گی، سودے بازی ہو گی، پولیس اور ایجنسیاں مل کر کوئی ڈراما ترتیب دیں گی اور میرا تاوان دینے کے بہانے اغوا کنندگان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا جائے گا...... اور ممکن ہے کہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ ان کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے...... غصے میں آ کر وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ کم از کم قتل! مجھے جھرجھری آ گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ "سعید ان سے کوئی سودے بازی نہ کرنا...... جو مانگیں انہیں خاموشی سے دے دینا۔" میرے دماغ میں چکی سی چلنے لگی، اس نے میری ہمت کو پیس کر رکھ دیا...... "کیا سعید میرے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے، کیا اتنا پیار کرتے ہیں وہ مجھ سے؟" میں خود سے ہی سوال کر رہی تھی......

"یااللہ...... تو ہی میرا مددگار ہے!" میں نے دل کی گہرائی سے اپنے رب سے کہا، اس سے مدد کی اپیل کی اور دل ہی دل میں کئی ورد کرنے لگی۔

"ماما کتنی پریشان ہو جائے گی۔" بار بار یہی سوچ آ رہی تھی، حقیقت تو یہ ہے کہ سعید سے مجھے کوئی توقع نہ تھی، جو میرے پاس فون ہوتا تو میں سعید کو کال کر کے کہتی کہ اُن کا مطالبہ مان لیں میں اُن کی پائی پائی چکا دیتی، سعید پیسے کے معاملے میں کنجوس ہیں اور اظہار محبت کے معاملے میں مہا کنجوس...... کاش یہ لوگ مجھ سے پوچھیں تو میں انہیں ابرار بھائی کا ٹیلی فون نمبر دے دیتی، وہ تو میرے بھائی ہیں، میرے معاملے میں لاکھوں کروڑوں بھی بہانے پڑ جاتے تو حیل و حجت نہ کرتے......"آہ یوبی بھائی......" میں اپنے بھائی کو یاد کر کے ملول ہوگئی، ساتھ ہی ماں کا خیال آیا اور میں اس خیال سے دل گرفتہ ہوگئی کہ انہیں معلوم ہوگا تو کتنی دکھی ہو جائیں گی...... کاش انہیں کوئی نہ بتائے۔

☆☆☆

کھانے کی ٹرے کے ساتھ ہی مجھے میرا بیگ واپس کر دیا گیا، اس میں سے ہر وہ چیز نکال لی گئی تھی جو میرے کسی بھی طرح کام آ سکتی تھی...... ٹیلی فون، رقم، نیل کٹر، قینچی، پرفیوم اور میری کچھ ضروری دوائیں...... کھانے کے نام پر کوئی پتلا سا شوربہ تھا اور ساتھ تنور کی دو روٹیاں۔ کیا وہ سوچ رہے تھے کہ ان حالات میں مجھے بھوک لگ رہی تھی یا یہ کہ میرے حلق سے وہ کھانا اترنے والا تھا، میں نے ٹرے کو پرے دھکیل دیا۔

"میڈم کھانا کھا لیں تو بہتر ہے اس کے بعد آپ کو کل کھانا ملے گا......" میں اس کے جواب میں خاموش رہی۔ وہ تھوڑی دیر تک مجھے دیکھتا رہا اور پھر مڑ کر جانے لگا۔

"اپنی میڈم سے کہنا کہ میری دوائیں دے دیں، وہ میری ضروری دوائیں ہیں......" میں نے ہولے سے اسے کہا۔ "ساتھ مجھے سادہ پانی دے [illegible]" اس نے سر ہلایا اور چلا گیا۔

بے بسی کے احساس سے میرا دل ڈوبنے [illegible] میں ہولے ہولے سسکنے لگی، کوئی مجھے یوں [illegible] دیکھتا تو یقین نہ کرتا کہ اس قدر مضبوط اعصاب [illegible] مالک کیسے بچوں کی طرح رو رہی تھی مگر اس سیلن [illegible] بدبودار کمرے میں مجھے امید کی کوئی کرن بھی نظر [illegible] آ رہی تھی کیونکہ کسی سے رابطہ ہو تو میں بتاؤں کہ [illegible] بچا لیں، کوئی ایسا کام نہ کریں کہ وہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں...... میں نے یہ سبق تو سیکھ لیا تھا کہ کسی [illegible] معذوری تو کجا، جان پر بھی بنی ہو تو ہمدردی کرنے [illegible] ضرورت نہیں۔

کس قدر منظم اور بظاہر سادہ نظر آنے وا[illegible] لوگوں کے اندر کیا کیا عفریت چھپے ہوتے ہیں کہ [illegible] عام نظر میں دیکھ بھی نہیں سکتے اور ان کے جال [illegible] پھنس جاتے ہیں۔ میں نے اس پر اس لیے ترس [illegible] کہ وہ ایک ہجوم میں کھڑی ایک بے بس عورت [illegible] جس پر مردوں کی ہوس زدہ نظریں پڑتی دیکھ کر مجھے [illegible] لگا، سوچا کہ وہ معذور اور بے بس ہے سو انسانی ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اس کی مدد [illegible] اور اس وقت اسی مدد کا نتیجہ دیکھ رہی تھی۔ سر درد [illegible] پھٹ رہا تھا اور کسی چیز کی طلب نہ تھی، بس جسم بار بار سن ہو رہا تھا خوف سے کہ جانے اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ "کاش...... یہ سب ایک بھیانک خواب ثابت ہو۔" میں نے دل سے دعا کی۔

دوائیں ملیں تو میں نے سر درد اور بلڈ پریشر [illegible] دوا لی...... لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں کہ نیند آ جائے [illegible] کچھ وقت کٹ جائے، نظروں کے سامنے سے مناظر انگریزی اور دیسی بدیسی فلموں کے گزر رہے تھے جو اس موضوع پر بنی تھیں، کسی میں اغوا کنندہ [illegible] جان بچ جاتی ہے اور کسی میں گھر یا پولیس والوں [illegible]

غفلت یا چالاکی کرنے کی کوشش کے باعث اس کی جان چلی جاتی ہے یا پھر زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے...... میرے ساتھ کیا ہوگا؟ سوچتے سوچتے نیند کے ہلکورے لینے لگی، نیند جو سولی پر بھی آ جاتی ہے اور اللہ کی نعمتوں میں سے کتنی بڑی نعمت ہے جو ہمیں کچھ وقت کے لیے ہر فکر سے آزاد کر دیتی ہے۔

موسم گرم نہ تھا مگر آنکھ اس لیے کھل گئی کہ میں پسینے پسینے ہو رہی تھی، جاگی تو کچھ نہ کرنے کے باوجود بھوک کا احساس غالب آ رہا تھا، کھانا جانے کب سے دھرا تھا، سالن کی پلیٹ کے کناروں پر گھی جما ہوا تھا جو اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ کھانا گھی میں بنا ہوا تھا، ہمارے ہاں تو ملازموں کے لیے بھی کھانا تیل میں بنتا تھا، روٹی سوکھ کر چمڑے کی طرح ہو رہی تھی مگر میں نے اس کا ایک ٹکڑا توڑا اور اسے تقریباً جمے ہوئے شوربے میں ڈبو کر منہ میں ڈالا...... اتنا بدمزہ نوالہ میں نے اس سے قبل شاید ہی حلق سے اتارا ہو، ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا، دس بارہ نوالے بہ مشکل چبا چبا کر نگلے اور پانی کے چند گھونٹ پی کر کھانے کی ٹرے پھر پرے کھسکا دی، پیٹ میں کھانا جاتا ہے اور انسان کو اگلے وقت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ مجھے اگلے وقت کے کھانے کی تو نہیں...... البتہ آنے والے مشکل وقت کی فکر لاحق ہوگئی۔

☆☆☆

اس وقت کے بعد سے حنا کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی، کم از کم مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ یہاں پر باس کی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ جن دو مردوں کی صورت اب تک یہاں اس کے علاوہ نظر آئی تھی وہ دونوں اسے میڈم کہہ کر بلا رہے تھے، میڈم تو وہ مجھے بھی کہہ رہے تھے...... میں نے سوچا، شاید وہ ہر عورت کو اسی طرح مخاطب کرتے ہوں گے۔

"ایک بار یہاں سے نکل کر جاؤں گی تو پولیس کو لے کر ایک بار تو یہاں ضرور آؤں گی کہ کس طرح یہ لوگ جرائم کا اڈا چلا رہے ہیں......" میں نے کرسی پر بیٹھ کر اس کی پشت سے ٹیک لگا لی اور سوچنے لگی، تصور میں ہی میں نے خود کو اس بس اسٹاپ پر پہنچا لیا اور وہاں سے سفر شروع کیا، سوچتی گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ چند موڑ مڑنے کے بعد مجھے یاد تک نہ تھا کہ اس نے مجھے کہاں، کہاں سے کس طرف مڑنے کو کہا تھا، کتنا فاصلہ طے کیا تھا، یہ بھی یاد نہیں تھا اور تو اور گیٹ سے داخل ہوتے وقت عمارت پر جو نام پڑھا تھا وہ بھی ذہن سے نکل گیا تھا، ذہن پر زور دینے لگی مگر اس وقت تو ذہن کام ہی نہیں کر رہا تھا، چند گھنٹے قبل کی باتیں بھی یاد نہ رہی تھیں...... ممکن ہے کہ کچھ دیر کے بعد سوچوں تو یاد آ جائے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی زیر لب کئی نام دُہرانے لگی، الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ دروازے کے لاک کے کھلنے کی آواز پر میں چونکی اور نظر دروازے پر جما دی۔ آنے والا ایک مرد تھا جو اُن دو کے علاوہ تھا، میں اس زاویے پر بیٹھی تھی کہ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں تمہیں یہاں؟" کرخت سا لہجہ اور بدتمیزی سے کیا گیا سوال...... اگر یہ باس تھا تو اپنے ماتحتوں سے ہی اسے کوئی تمیز سیکھ لینی چاہیے تھی۔ "کیا خیال ہے تمہارا، تمہارا شوہر تمہارے لیے پچاس لاکھ دینے کو تیار ہو جائے گا؟"

"پچاس لاکھ؟" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے...... ہم کوئی ایسے امیر نہیں ہیں۔" میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے میں ہکلاہٹ نہ ہو۔

"اگر ہم تیرے شوہر کو اغوا کرتے تو کیا تو اتنی رقم دینے کو تیار ہوتی یا پھر اس سے چھٹکارا پا کر خوش ہوتی؟" اس نے بدتمیزی کے ساتھ ساتھ بے شرمی کا تڑکا لگایا۔

"تم لوگ ہو کون اور کیوں اغوا کیا ہے مجھے؟"

میں نے چیخ کر کہا۔

''آرام سے بات کرو بی بی...... مجھے عورتوں کے چیخنے چلّانے سے نفرت ہے......'' مجھے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

''اغوا کیوں کیا جاتا ہے کسی کو؟ تاوان کے لیے ناں!'' مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا مگر میں اندازہ کرسکتی تھی کہ اس پر کتنی خباثت ہوگی۔

''کیوں ...... مجھے ہی کیوں اغوا کیا تم لوگوں نے......؟'' میں نے کوشش کرکے لہجہ دھیما رکھا۔

''ہم نے تو خاص طور پر تمہیں نہیں ٹارگٹ کیا تھا، اللہ سائیں نے تمہیں دل ہی اتنا نرم دیا ہے کہ تم نے خود ہمیں اپنے آپ کو اغوا کرنے کی دعوت دی...... ہمارا تو طریقۂ واردات یہی ہے بی بی، تم نہ ہوتیں تو کوئی اور ہوتا......'' اس نے خباثت سے ہنس کر کہا۔

''تم جیسے لوگوں کی وجہ سے دنیا سے نیکی کا عمل ختم ہوتا جا رہا ہے......'' میں تقریباً رو دینے کو تھی۔

''دنیا سے نیکی کا عمل ختم کرنے کو اور بہت سے شیطان موجود ہیں، ہم تو اس کے ادنیٰ سے چیلے ہیں...... ہمارے دھاگے تو کوئی اور ہلاتا ہے بی بی، ہمارے سلسلے بہت دور تک جاتے ہیں، ہم تو تنخواہ دار ملازم ہیں جس طرح تم ہو۔''

''تم نے میرے گھر والوں سے رابطہ کیا ہے کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''اونہوں ...... ابھی نہیں ...... ابھی تو ہم لوہا گرم کر رہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ تمہارے گم ہونے پر وہ کتنا بے چین ہوتے ہیں پھر اسی حساب سے مطالبہ کریں گے۔''

''دیکھو...... میرے شوہر کے پاس اتنی رقم نہیں ہے جتنی تم کہہ رہے ہو، تم مجھے جانے دو، میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں جتنی رقم ممکن ہوگی وہ بندوبست کر کے تمہیں دے دوں گی۔''

''ہاہاہا...... ہاہاہا...... ایسا تاوان، ایسی چالاک مغویہ اور ایسے بھولے بھالے اغوا کرنے والے فلموں اور ڈراموں میں بھی نہیں ہوتے بی بی......'' وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ''کالیا کہتے ہیں مجھے......اور ریکارڈ ہے کہ میں نے آج تک جس تاوان کا مطالبہ کیا ہے وہ لوگوں نے اپنا خون نچوڑ کر بھی دیا ہے۔'' وہ کہہ کر واپس مڑا اور باہر سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ سعید کہاں سے دیں گے اتنا تاوان، ان کے پاس کہاں سے اتنی رقم آئے گی اور اگر آ بھی گئی تو مجھ پر کیوں خرچ کریں گے وہ بھلا، میرے ساتھ ان کا کون سا ایسا مضبوط قلبی تعلق تھا۔ ہم ایک ایسی گاڑی کے دو پہیے تھے جو سمجھوتوں اور رسوم و رواج کے بندھنوں میں بندھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

''مجھے کسی ضرورت سے حنا سے ملنا ہے......'' میں نے ساون سے کہا، جو میرے لیے کھانا لایا تھا اور ساتھ ہی کمرے کی صفائی کا سامان...... میرے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ کر وہ غسل خانے کی صفائی کے لیے چلا گیا، کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور تازہ ہوا اور روشنی آرہی تھی، تین چار دن کے بعد ایسی تازہ ہوا ملی تھی، طبیعت پر خوش کن اثر ہوا، میں نے سوچا کہ دروازہ کھلا ہے تو کمرے سے باہر نکل کر دیکھوں، دروازے سے باہر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ میرے قدموں کی چاپ سن کر ساون کا دوسرا ساتھی سامنے آن کھڑا ہوا، وہ اس کے ساتھ ہی آیا ہوگا اور باہر پہرے پر کھڑا تھا۔

''مجھے چند قدم برآمدے میں چلنے دو......'' میں نے اس کی منت کی تو وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے گیٹ نظر آرہا تھا اور بلند و بالا چار دیواری بھی۔

''اس جگہ کا نام کیا ہے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''میں ان پڑھ ہوں ...... مجھے کچھ پڑھنا نہیں

آتا۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''بادل......'' کمرے کے اندر سے آواز آئی۔ ''شکار کہاں ہے؟''

''فکر نہ کرو، یہیں کھڑی ہیں میڈم......'' بادل نے جواباً کہا۔

اپنے لیے شکار کا لفظ سن کر مجھے عجیب سا لگا، باوجود اس کے کہ میں ان کا شکار تھی۔ کہیں وہ مجھے شکار ہی نہ سمجھ لیں اور اپنا مطالبہ پورا نہ ہونے پر مار دیں......ایک خوفناک سوچ نے میرے رونگٹے کھڑے کردیے۔ ''کاش ایک بار میرا سعید سے رابطہ ہوجائے تو میں ان کی منت سماجت کرلوں کہ ان کے پاس رقم نہ ہو تو بوبی بھائی سے ہی لے کر وہ تاوان دے دیں تاکہ میری جان بچ جائے، میں ان کی پائی پائی چکا دوں گی۔'' گھر والوں کی یاد نے مجھ پر جذبات کا غلبہ کر دیا۔ ساون صفائی کرکے جا چکا تھا، میں نے کھانے کی ٹرے اپنے سامنے کھسکا لی اور کھانا زہر مار کرنے لگی۔

''ہاں اگر کوئی سعید کو اغوا کرلیتا تو میں اپنا سب کچھ بیچ باچ کر انہیں چھڑا لیتی۔'' میں نے کالیا کے اس سوال کا جواب خود کو دیا جو اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

☆☆☆

مجھے سعید سے محبت تھی، وہ میرا شوہر تھا، میرے بچوں کا باپ اور میرے سر کا سائیں۔ ہماری اٹھارہ سالہ رفاقت نے ہمیں تین بچوں کا تحفہ دیا تھا، ہم دونوں ملازمت کرتے تھے اور چند ماہ قبل ہی ہم نے شہر سے قدرے دور ایک نئی آبادی میں پلاٹ خرید کر اس پر گھر تعمیر کروایا تھا۔ کمیٹیاں، قرضے اور زیور کی فروخت نے اس گھر کے وجود کو ممکن بنایا تھا۔ گھر میں شفٹ ہوئے تو لگا کہ زندگی کی ہر خواہش کی تکمیل ہوگئی ہو، اپنی چھت کا احساس ہر احساس پر حاوی آ گیا تھا۔ پلاٹ خریدنے سے لے کر گھر بنانے تک کے عرصے میں ہی اس گھر کی مالیت اس سے کئی گنا بڑھ گئی تھی جو ہماری کل خرچ کردہ رقم تھی۔

بچوں کو اپنے، اپنے کمرے ملے تو وہ بھی مسرور تھے اور خود شوق سے اپنے کمروں کو صاف کرتے، انہیں سجاتے اور فخر سے ہر کسی کو بتاتے تھے۔ شادی سے پہلے سے میں ملازمت کرتی تھی، سعید کی مالی حالت اور ذمے داریوں کے باعث مجھے یہ ملازمت جاری رکھنا پڑی، بہنوں کی شادیاں ہوئیں، ماں باپ یکے بعد دیگرے چل بسے تو ہم اکیلے ہوئے اور پھر احساس ہوا کہ ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔ اس مشکل وقت میں ہم نے زندگی کی گاڑی کو یوں چلایا جیسے مجبوریوں کو نبھایا ہو۔ جب تک مجبوریوں اور ذمے داریوں کے یہ پہاڑ ہٹے تب تک ہم عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں آ کر احساس ہوا کہ لطیف جذبات کا دور تمام ہوا، سعید کی بہنوں کے بعد اب اپنے بچوں کی ذمے داریوں کے سلسلے شروع ہو چکے تھے، زیست کے گزرے سالوں کے گوشوارے کھول کر بیٹھتی تو اپنا دامن محبت سے تہی پاتی، میری یاد کے نہاں خانوں میں سعید کی طرف سے اظہارِ محبت نہ دھرا تھا، وہ ایسے ہی تھے، چپ چپ سے رہنے والے اور مجھ جیسی ہنسوڑ لڑکی بھی ان کے ساتھ رہ رہ کر اندر سے مر گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سعید کو مجھ سے محبت ہوئی ہی نہ تھی، میں ان کے لیے ایک کام کرنے والی اور کمانے والی مشین تھی، جس کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

☆☆☆

''لو بات کرو اپنے شوہر سے......'' حنا خود آئی تھی، اس کے پیچھے ساون اور بادل دروازے میں ایستادہ تھے، دروازہ پورا کھلا تھا، اس روز چند قدم کی چہل قدمی سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں سے فرار ممکن نہ تھا۔ میں نے فون لیا اور سعید کی ہیلو کی آواز سنتے ہی میری ہچکیاں بندھ گئیں، حلق بند ہو گیا، ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

''بولو ناں میری جان......'' یہ تو کوئی اور ہی لگ رہا تھا، سعید بھلا کب مجھے جان کہتے تھے۔ ''ہیلو ہیلو...... تم سن رہی ہو ناں!'' میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''کچھ تو کہو، کچھ جواب تو دو، تم ٹھیک ہو ناں...... تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی انہوں نے؟'' یہ وہی سعید تھے جن کی بہنوں کی بدتمیزیوں کی شکایت کرتی تو وہ مجھے ہی سمجھاتے اور کہتے کہ بدتمیزی پر کوئی تبھی اترتا ہے جب دوسرا فریق اسے اس مقام پر آنے کی دعوت دے۔

اس وقت مجھے ان کے الفاظ یاد آئے اور حلق سے ایک گولا سا اٹھا، جی میں آئی کہ میں انہیں ان کے الفاظ لوٹاؤں مگر نکلا بھی تو کیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' اس سے بڑا لطیفہ بھلا کیا سنا سکتی تھی میں سعید کو اس وقت۔

''تم پریشان نہ ہونا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' سعید مجھے بہلا رہے تھے، جانتی تھی کہ اس وقت پچاس لاکھ تو کجا وہ پچاس ہزار کا بندوبست بھی نہیں کر سکتے تھے...... مجھے طفل تسلی دے رہے تھے، میں نے ان کے جذبے کو دل میں سراہا، یہ بھی شکر تھا کہ اس وقت انہوں نے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ اغوا کوئی تبھی کرتا ہے جب کوئی دوسرا فریق اغوا کرنے کا موقع دے...... حالانکہ میں نے بھی تو کیا تھا، بیل کو خود ہی دعوت دی تھی کہ وہ مجھے آ مارے۔

''بچے ٹھیک ہیں......؟'' میں نے سوال کیا مگر سعید کا جواب سننے سے پہلے ہی مجھ سے فون چھین لیا گیا اور میں حنا کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ میں سر گھٹنوں میں دے کر ہچکیوں سے رونے لگی، کاش وہ مجھے بچوں کے بارے میں سن لینے دیتی۔

''پچاس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے ہم نے......'' حنا نے کہا۔ ''وہ تم سے بات کر کے یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ تم ہمارے پاس ہی ہو! جونہی وہ ہماری مطلوبہ رقم ادا کر دے گا، ہم تمہیں واپس اسی بس اسٹاپ پر چھوڑ آئیں گے جہاں سے ہمارا اشتراکت کا سفر شروع ہوا تھا۔'' وہ زہریلی ہنسی ہنسی...... ''اور ہاں!'' انگلی اٹھا کر اس نے مجھے تنبیہ کی۔ ''یہاں سے فرار ہونے کا سوچنا بھی نہیں، ممکن بھی نہیں اور پھر جو فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور یہاں ہمارے ٹھکانے تک تو کوئی پہنچ بھی نہیں سکتا، سب کچھ بڑے بڑے افسروں کی ناک تلے ہوتا ہے۔'' وہ نہ بھی کہتی تو مجھے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرنا تھی کہ مجھے خود ہی اس کے انجام کا اندازہ تھا۔

☆☆☆

ٹی وی پر بھی میرے بارے میں یقیناً خبریں آ رہی ہوں گی اس لیے ممکن ہی نہیں ہوا ہوگا کہ اماں کو علم نہ ہو، میں ان کی علالت کا سوچ سوچ کر پریشان تھی، ماہا کی تنہائی کا سوچ، سوچ کر ہول اٹھتے کہ وہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی تھی اور میرے بنا گھر پر ایک لمحہ نہیں گزرتا تھا اس کا، سعید تو بار بار کہتے کہ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے اسے خود سے یوں اتنا زیادہ منسلک نہ کرو کہ کل کو اس کی شادی ہو تو وہ نہ اپنے گھر میں سیٹ ہو اور نہ ہی میں اس کی جدائی سے روگ لگا بیٹھوں...... جانے اس وقت وہ کیا کر رہی ہو گی؟ گھڑی تھی میرے پاس نہ فون، وقت کا احساس تھا نہ دنوں کا، بس یہ معلوم تھا کہ وقت چیونٹی کی رفتار سے چل رہا تھا۔

ایک بار پھر انہوں نے میری سعید سے بات کروائی تو میں نے منت کر کے کہا کہ میری ماہا سے بھی بات کروائیں...... بیٹے باپ کی طرح تھے، اظہارِ محبت بھی نہ کرتے اور نہ ہی ان کے چہرے سے بڑی سے بڑی پریشانی کا تاثر جھلکتا، اپنی عمر سے بڑے بڑے اور مدبر دکھائی دیتے تھے۔ ماہا فون پر بلک رہی تھی، میرا وجود کٹنے لگا اور دل اسے سینے سے لگانے کو ہمکنے لگا۔ نہ اس سے کچھ بولا جا رہا تھا نہ مجھ سے بات کی جا سکی اور ہم دونوں ہچکیوں اور آہوں کا تبادلہ کر کے رہ گئے۔

''تمہارے شوہر نے کچھ وقت مانگا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ رقم کا بندوبست کر رہا ہے......'' حنا نے مجھے تسلی دی۔ ''ہم نے اسے بتایا ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع کی تو اسے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی، ہمارے اس قلعے میں لاشوں کو تلف کرنے کا بہت اچھا انتظام ہے، آج تک کوئی ہمارے اس ٹھکانے تک نہیں پہنچ پایا اور یوں بھی یہ ہمارا اکلوتا ٹھکانا تو نہیں ہے......'' اس کی باتوں کا مقصد میرے اندر خوف بٹھانا تھا جو پہلے سے ہی کافی موجود تھا، سعید کہاں سے رقم کا بندوبست کریں گے، ان کے تو سارے اکاؤنٹ خالی تھے، الٹا قرضے اتار رہے تھے ہم ابھی تک مل کر۔ میں نے خود ہی سوچا، مہلت اسی لیے مانگی ہو گی کہ پولیس وغیرہ سے چھپ چھپا کر رابطہ کریں اور میں کسی مشکل صورتِ حال میں پھنس جاؤں...... شاید وہ اسی طرح مجھ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔

ایک کے بعد ایک خیال اور وہم قطار در قطار دل میں آتا اور میں اس سلسلے کو روک بھی نہیں پا رہی تھی...... تنہائی، خوف اور فارغ ذہن کی وجہ سے خیالات کا جمِ غفیر تھا اور میں......

☆☆☆

یقین کرنا بھی مشکل تھا کہ میرے قید خانے کا دروازہ کھلا اور مجھے نوید دی گئی کہ میں آزاد ہوں، میں نے اپنا سامان سمیٹا اور حنا کے قدموں کا تعاقب کرتی ہوئی باہر نکلی، سورج کی کرنیں اس وقت تھک کر اپنے آخری وقت کو پہنچ چکی تھیں اور شام اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ مجھے ایک سیاہ گاڑی میں بٹھایا گیا جس کی کھڑکیوں پر پردے لگے ہوئے تھے، حنا حسبِ معمول نقاب میں تھی، اس کا چہرہ میں دیکھ ہی نہ پائی تھی۔

میرے چہرے پر اس نے رومال رکھا اور میں جانے کہاں کھو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کون تھا، یہ بھی

نہ دیکھ پائی۔ آنکھ کھلی تو میں اپنی گاڑی میں بیٹھی تھی اور اسی بس اسٹاپ کے سامنے گاڑی کھڑی تھی، میرا سارا بدن تھکاوٹ سے ٹوٹ رہا تھا اور ابھی تک غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ میں نے پرس سے ٹٹول کر فون نکالا اور اسے آن کرنے کی کوشش کی تو اس کی بیٹری مکمل ختم تھی۔ ابھی تک میں خود کو اس حالت میں نہیں پا رہی تھی کہ ڈرائیونگ کر سکتی، ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے کار چارجر نکالا اور فون کو چارجنگ پر لگا دیا، دس منٹ کے بعد فون اتنا چارج ہوا کہ میں اسے استعمال کر سکتی۔

میں نے سعید کا نمبر ڈائل کیا اور جونہی انہوں نے فون اٹھایا میں رونے لگی، انہوں نے میرا اتا پتا پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میں فلاں بس اسٹاپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ چودہ منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے مگر آدھا گھنٹا گزر گیا تب جا کر اُن کی گاڑی نظر آئی۔ بڑا بیٹا ان کے ساتھ تھا، وہ مجھے گلے سے لگا کر تھپکنے لگا، سعید نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنی گاڑی کی طرف لے چلے، بیٹے کو میری گاڑی کی چابی دی، گاڑی میں بیٹھتے ہی سعید نے مجھے گلے لگا لیا۔

”آئی لو یو...... میں مر جاتا اگر تمہیں کچھ ہو جاتا......“ جس اظہارِ محبت کو عمر بھر ترسی تھی وہ ملا بھی تو کیا کچھ کھو کر، کتنا وقت ٹیلوں کے نیچے سے پانی کی طرح بہہ چکا تھا۔ گاڑی کہاں جا رہی تھی، میں نے حیرت سے سعید کو دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

”ہمارا گھر تو اس طرف ہے......“ میں نے اشارہ کیا، اس گھر کو میں اپنی جنت کہتی تھی۔

”اب نہیں رہا......“ سعید نے حسبِ عادت مختصراً کہا۔ ”اسے بیچنا پڑا......“

”آپ نے میری جنت بیچ دی؟“ میں چیخی۔

”اپنے بچوں کی جنت بچانے کے لیے......

اپنی زندگی بچانے کے لیے کوئی برا سودا نہیں نے...... زندگی اور ہمت رہی تو پھر گھر بن جا اور نہ بنے گا تو کرائے کے مکانوں میں بھی تو ہی رہتے ہیں ناں......“ سعید نے میرے ہاتھ ہاتھ رکھا تو میری روح تک میں سکون اتر گیا۔

”میں کب سے اتنی اہم ہو گئی آپ لیے......؟“

”ہمیشہ سے ہو، بس مجھے بتانا ہی نہیں آ تمہاری جدائی نے احساس دلایا کہ تم میرے چیز سے بڑھ کر اہم ہو......“ میں نے گھر کھو کر کے دل میں گھر بنا لیا تھا، سعید ٹھیک کہتے ہیں، ز اور ہمت رہی تو گھر پھر بن جائے گا۔ میں اپنے اور شوہر کے ساتھ خوش ہوں، زندگی کی صبح اور پہیہ پہلے کی طرح چل رہا ہے۔ اس واقعے نے دو اسباق سکھائے جو میں سب کو بتانا چاہتی ہو میاں بیوی کے درمیان محبت اسی طرح ہوتی ہے ہمارے ارد گرد لپٹی ہوئی ہوا کی چادر، جو ہما لیے اہم ہے، اس کے بغیر ہم جی بھی نہیں سکتے ہوا کے وجود کو ہم تب تک محسوس نہیں کرتے جب ہم اس کی کمی سے دوچار نہ ہوں...... کیونکہ اس کوئی رنگ ہے، شکل نہ خوشبو......

یہ ہوا نہ ہو تو حبس ہو جاتا ہے، سانس بند ہو لگتی ہے۔

دوسرا سبق یہ سیکھا کہ آج کل کے دو انسانی ہمدردی کے جذبے کو بھی حیوانی رکھنے والے لوگوں نے گالی بنا دیا ہے، بہروپ بھیک مانگنے اور جرائم کرنے کے لیے ایسے بہروپ بھرتے ہیں کہ حقیقی مظلوموں پر اعتبار ختم ہو گیا ہے۔

اب آپ ہی بتائیں کیا اب بھی میں کسی کو دیکھ کر اس کی مدد کرنے کو رکتی؟



ناولٹ

سلو پوائزن

سیما بنتِ عاصم

بشریٰ کی منگنی کیا ہوئی مانو بم بلاسٹ ہو گیا۔ چاروں جانب منگنی کی دھوم مچ گئی۔ سلمیٰ بیگم نے یہ خبر سنی تو سارے گھر میں جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں سے وہاں چکراتی پھریں اور جب کسی پل قرار نہ پایا تو رفاقت حسین ہی کے سامنے منہ کھول بیٹھیں۔

”اجی سنتے ہو، منیب الرحمٰن نے بشریٰ کی منگنی کی رسم کروا بھی لی اور کسی کو جھوٹے منہ نہ پوچھا۔ آج اگر صولت آپا کے گھر سے مٹھائی نہ آتی تو ہمیں کانوں

کان خبر نہیں ہوتی۔'' یہیں آ کر سلمٰی بیگم سے خطا ہوئی۔ اپنی بے تابی و بے چینی میں وہ اس امر کو فراموش کر گئیں کہ اُن کے میکے کے نام سے ہی رفاقت حسین کو پتنگے لگتے تھے...... کجا کہ خوشی کی خبر...... وہ اچھل ہی تو پڑے تھے۔

''اری چل! نام نہ لیا کر میرے سامنے، اپنے بھائی بھاوج کا...... پرلے درجے کے نمک حرام اور احسان فراموش ہیں۔ اپنی اوقات بھول گئے ہیں، میں نے تھوڑا قرض مانگا تو صاف انکار کر دیا کہ کام ڈھیلا جا رہا ہے اور سنا ہے اسی ماہ ٹیکسی خرید کر دھڑلے سے کرائے پر بھی اٹھالی اور اب یہ منگنی...... نامراد نہ ہوں تو دیکھنا ٹکے کو ترسیں گے......''

رفاقت حسین نے وہ طبیعت پائی تھی کہ کسی کا گھر جلے اور وہ ہاتھ تاپیں اسی طرح کسی کی خوشی بھی ان سے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے میں ناکام ہو جاتے تو کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے۔

سلمٰی بیگم کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ شوہر کو چھیڑنے کا مطلب تھا اپنے میکے والوں کے بخیے ادھیڑنا یعنی اپنے آپ کو خود ہی بے عزت کروانا...... وہ چوٹ کھائی ناگن کی طرح بلبلائی تھیں۔ اُن کا دل کسی طرح اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا تھا کہ اس اہم موقع پر بھاوج نے انہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔ ان کی چھوٹی بھاوج عاصمہ جو اَب تک صرف ان کے لیے ہی نہیں، ساری سسرال کے لیے انتہا کی تابعدار اور سعادت مند ثابت ہوتی چلی آئی تھیں۔ اب اتنا بڑا کارنامہ تن تنہا انجام دے بیٹھی تھیں، وہ بھی اس صورت میں کہ صولت آپا کو عاصمہ کے گھر کا رستہ دکھانے اور اس رشتے کو طے کروانے میں خود انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھر کا تھا، کماؤ تھا اور بھلا کیا خوبیاں چاہیے ہوتی ہیں ایک اچھے رشتے میں۔ سلمٰی بیگم کا خیال تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھی تو عاصمہ انہیں ہار پھول پہنا کر بڑھیا سے جوڑے نوازنے کے ساتھ کچھ کیش بھی مٹھی میں تھمائیں گی کیونکہ ان کا گھر رشتے طے کروانے کے سبب ہی چلا کرتا تھا اور یہ بات عاصمہ بھی جانتی تھیں مگر یہاں معاملہ سگی بھتیجی کا تھا تو ہزار دو ہزار کم پر بھی وہ ٹرخا دے جائیں گی...... گھی کہاں گیا کھچڑی میں اور کھچڑی گئی پیاروں کے پیٹ میں، اس پر ان کے احسان کا ٹھینگا بھی عاصمہ کے سر پر رہے گا کہ ایسا بڑھیا رشتہ جو چراغ لے کے ڈھونڈنے پر بھی نہ نصیب ہوتا۔ سلمٰی بیگم کے طفیل انہیں میسر ہوا تو وہ شکرانہ ادا کرتے نہ تھکیں گی مگر یہاں تو بات ہی الٹی پڑ گئی تھی۔ انہیں کسی طرح چین نہ پڑتا تھا اور رفاقت حسین کے سامنے منہ کھولنے سے بہتر تھا کہ کہیں اور جا کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لیے جائیں اور ایسے میں انہیں بجیا کی یاد کیوں نہ آتی۔ یوں تو دونوں بہنوں میں ایک پل نہ بنتی تھی مگر معاملہ بھاوجوں کے لتے لینے کا ہوتا تو دونوں کا اتحاد و اتفاق قابلِ دید رہتا تھا۔

گھڑی کی چوتھائی میں انہوں نے بجیا کے گھر کا ارادہ باندھا تھا اور اگلے ہی پل وہ اپنا کھونٹی پر ٹنگا برقع اتارنے کو آگے بڑھیں تو ثمر جو باپ کے ہاتھوں ماں کی عزت افزائی پر کچن میں کھڑی کھی کھی کر رہی تھی جھٹ آگے بڑھی۔

''کہاں کے ارادے ہیں امی؟'' ثمر نے اتنا کہہ کر ایک بار پھر کھی کھی کا سلسلہ جاری رکھا تو ان کے تلووں سے لگی اور سر پر بجھی۔

''چپ کر! اور دانت اندر کر اپنے۔ میرے بغیر تیرے کون سے کام پڑے رہ جائیں گے۔ صورت نہ شکل، ڈھائی من کی دھوبن۔ نصیب تو کھوٹی۔ تیرے کرم کرتوت اچھے ہوتے تو کاہے کو اب تک میری چھاتی پر بیٹھی مونگ دل رہی ہوتی!'' سلمٰی بیگم نے اپنی ساری کھولن اپنی ہی بیٹی پر نکالی اور برقع کے بٹن بند کرتی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

''دروازہ بند کر لے اچھی طرح سے میں بڑی آپا کے گھر جا رہی ہوں۔''

بیٹی بھی اس لعن طعن کی عادی ہو چکی تھی۔ انہیں بات، بات پر اس کے نصیبوں کو کوسنے کی عادت تھی۔ ثمر کی معمولی شکل صورت ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی جس کے طفیل اس کے نصیب کھل کر نہ دیتے تھے اور ثمر...... اسے صرف اپنی تعلیم پر ناز تھا۔ کم تعلیم یافتہ یا معمولی ملازمتوں والے رشتوں کو وہ خاطر میں نہ لاتی تھی۔ سلمٰی بیگم کے تفکر سے قطع نظر راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھتا تھا۔

اب بھی ثمر کا دل ماں کے گھر سے سدھارنے پر بلیوں اچھل رہا تھا۔ ان کا بڑی خالہ کے گھر جانے کا مطلب تھا کہ شام تک کی چھٹی اور اس عرصے میں وہ مزے سے کچھ گھنٹے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر پڑوسی ملک کے دو چار ڈرامے دیکھ سکتی تھی۔ ورنہ سلمٰی بیگم تو اسے ایک پل چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔ اِدھر اُدھر کے کام بتا کر اسے دوڑاتی ہی رہتیں۔ وہ پھرکی کی طرح پھرتے پھرتے کبھی کبھی اچھی خاصی چڑ جایا کرتی تھی۔ اب ماں کے نہ ہونے سے دوپہر کے کھانے میں چٹ پٹے آلو یا مٹر والے چاول بھی پکائے جا سکتے تھے۔ جن کے نام سے ہی ماں چڑتی تھیں کہ ان کا پرہیز تھا۔ البتہ رفاقت حسین بدپرہیزی کے رسیا تھے بھلے بعد میں کئی، کئی دن کھوں کھوں کرتے گزریں، بیگم سے ان کی کچھ خاص نہ بنتی تھی کہ ان کے طور طریقے ہی ایسے تھے۔ وہ یونہی آنے بہانے کر کے تیرے میرے گھر جھانکتی پھرتی تھیں۔ کہیں رشتہ طے کروا دیا کہیں چھوٹے موٹے کام کر دیے۔ اس طرح بٹوے میں کچھ نہ کچھ آمدنی بھر لاتیں۔

سلمٰی بیگم ہوں یا رفاقت حسین دونوں زمانے بھر کے معاملات پر نظر رکھتے تھے۔ جتنی فکر وہ دوسروں کی پالتے تھے اگر کبھی بھولے سے بھی اپنے

گھر کی کرلیا کرتے تو حالات قدرے مختلف ہوتے مگر سلمیٰ بیگم اپنے گھر کو گھر والے سمیت جوتی کی نوک پر رکھتیں اور ہمیشہ من مانی کیا کرتیں۔

جوانی میں تو پھر بھی رفاقت حسین نے کچھ ہاتھ پاؤں چلالیے تھے مگر اب تو بیماری کا بہانہ تھا قسمت نے ایک ہی بیٹی سے نوازا تھا جس کے مزاج اللہ اللہ...... اس تمام کھینچا تانی کے درمیان ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ ثمر نے روپیٹ کر چار حرف پڑھ ڈالے۔ یہ اور بات کہ ان چار حرفوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا۔ چودہ جماعتیں پڑھ کے جیسے آسمانوں پر جا بیٹھی تھی۔ کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ سلمیٰ بیگم اس کی شادی کی فکر میں ہلکان رہتی تھیں مگر اس کی ناک تلے کوئی نہ سماتا تھا۔

☆☆☆

سلمیٰ بیگم کے سدھارنے کے بعد ثمر نے ان کی حسبِ ہدایت دروازہ اچھی طرح بند کیا پھر کچن میں یہاں وہاں چیزیں ٹٹول کر مسالے والے مٹر چاول چڑھا ہی دیے۔ کچن سے فارغ ہو کر وہ ٹی وی کے سامنے آبیٹھی۔ چینل بدل بدل کر کبھی من پسند فلم پر رکی تو کبھی گانوں کے پروگرام پر مگر چند ہی منٹوں میں اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ یک دم ہی جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹتا بکھرتا چلا گیا تھا۔

بشریٰ کی منگنی کی خبر پر اس کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ اب تک تو بس موہوم سی امید ہی تھی کہ ممکن ہے رشتہ طے ہی نہ ہو مگر آج صولت آپا کے یہاں سے مٹھائی آنے کے بعد رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ابھی بشریٰ کی عمر ہی کیا تھی اور ثمر نے تو بشریٰ کو گودوں کھلایا تھا اور اب اس کے منسوب ہوجانے کی خبر اس کے دل پر آرے چلائے دے رہی تھی۔ بشریٰ کا نازک کامنی سا وجود چشمِ تصور میں لہرایا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

''ہونہہ! اِک ذرا شکل ہی تو اچھی ہے ورنہ پر لے درجے کی چھپن چھری ہے یہ بشریٰ اور [illegible] دیکھو...... واہ!'' ثمر کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی [illegible] بقول اس کے چھوٹے بڑے کی تمیز ہی نہ تھی اس [illegible] ایک سے ایک بے ڈھنگے فیشنوں والے لباس پہن[illegible] ٹوکو تو عزت دو کوڑی کی کرکے رکھ دیتی تھی اور چالاک ایسی کہ اللہ بچائے۔ نہ جانے کون کون سے تیل [illegible] رگڑ رگڑ کر بال گھٹنوں تک بڑھا لیے تھے۔ ہزار بار [illegible] لگایا کہ نسخہ ہی بتادے مگر نہ......!

ثمر کو لمبے بالوں کا بڑا شوق تھا۔ ہزار ترکیبیں لڑاتی مگر بال بڑھ کے نہ دیتے اور آج اسی صاف رنگ وروپ اور لمبے بال کے طفیل بشریٰ اس سے بازی لے گئی تھی۔ اسی احساس کے سبب اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

اس معاملے میں سب سے بڑھ کر اسے ماں کی بے مروتی نے دکھ دیا تھا۔ صولت آپا، سلمیٰ بیگم کی پڑوسن کی نند تھیں۔ صولت آپا کی اچھی سی لڑکی دکھانے کی فرمائش پر سلمیٰ بیگم بالا ہی بالا انہیں بھتیجی دکھانے بھائی کے گھر لے گئی تھیں یعنی خود ثمر شاید اچھی سی لڑکی کی شرط پر پوری ہی نہ اترتی تھی اور یہ احساس کچھ کم جان لیوا نہ تھا۔

☆☆☆

سلمیٰ بیگم بجیا کے گھر پہنچیں تو دل مسوس کر رہ گئیں۔ ان کے گھر کے داخلی دروازے پر لٹکا ہوا سا تالا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ بل کھا کے رہ گئیں۔ ان کے اندر ابلتا غبار روزن مانگ رہا تھا۔ پلٹنے کو دل بھی نہ کرتا تھا انہوں نے ایک چور نگاہ اطراف میں ڈالی پوری گلی سنسان پڑی تھی پھر سلمیٰ بیگم نے آگے بڑھ کر بے دھڑک پڑوس کا دروازہ بجادیا۔ بجیا کے پڑوس کا یہ گھر عاصمہ کا میکا تھا۔ جو اب صرف عاصمہ کے بھائی بھاوجوں کے دم سے آباد تھا مگر عاصمہ کا میکا ہمیشہ اس کے لیے باعثِ شرمندگی ہی رہا۔ جس کے شرمناک حوالوں نے سدا عاصمہ کا سر سسرال والوں کے سامنے جھکائے ہی رکھا۔ عاصمہ کی جنت مکانی والدہ اس کے بچپن ہی میں گزر گئی تھیں، والد ہمیشہ شوقین مزاج رہے تھے۔ اہلیہ کے گزر جانے کے بعد اُن کی رنگین مزاجی عود کر آئی تھی اور ان کا گھر ناپسندیدہ کاموں کا گڑھ بن کے رہ گیا۔ شغل میلے ہوتے۔ تاش کی بازیوں پر شرطیں لگا کرتیں اور ہر وہ کام ہوتا جن کے صرف نام سے ہی شرفا کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ والدہ کے گزر جانے کے بعد عاصمہ کی پرورش کا ذمہ ان کی ایک دور پار کی بیوہ پھوپی نے اٹھالیا اور مانو عاصمہ کے والد کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ عاصمہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور ماں کی آخری اولاد تھی ان سے پہلے اوپر تلے کے ایک نہ دو چار بھائی تھے جو رفتہ رفتہ والد کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ شاید ان وتیروں کے باعث عاصمہ کے کسی بھائی کا گھر کبھی نہ بس پاتا مگر شومئی قسمت کہ عاصمہ کے والد کو اپنی زندگی میں ایک بار کسی موقع پر انڈیا اپنے رشتے داروں کے یہاں جانا پڑ گیا اور وہاں اپنی ایک یتیم ویسیر بھتیجی نگار ایسی بھائی کہ اسے بہو بنانے کی نیت سے بغل میں داب کر واپس پاکستان لوٹے۔ عاصمہ کے والد نے نگار کو بہو بنانے کے ارادے کو عملی جامہ ضرور پہنایا مگر بعد ازاں ان کی زندگی نے زیادہ دنوں تک وفا نہ کی۔ چلتے چلتے وہ یتیم بھتیجی کو سہارا دے کر ایک نیک کام کر گئے تھے مگر یہ نیک کام دوسرے بیٹوں کا گھر بسنے کا بھی پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یوں نگار کی ایک بھانجی بھی اس گھر میں چھوٹے بیٹے کے ساتھ بیاہی گئی۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب بجیا کے بیوہ ہو جانے کے بعد مجیب الرحمٰن کا پڑاؤ آپا کے گھر رہا کرتا تھا اور نہ جانے کسی بھلے موقع پر انہوں نے عاصمہ کو تاڑ لیا۔ عاصمہ کے سیرت و کردار پر اپنے میکے کی چھینٹ تک نہ پڑی تھی مگر میکے کا حوالہ سدا اُن کے لیے گالی بن کر رہا۔ مجیب الرحمٰن سے ان کی شادی پر بھی بڑا

طوفان کھڑا ہوا مگر مجیب الرحمٰن بھی ڈٹے رہے۔ عاصمہ صورت و کردار میں ایسی ہی یکتا تھیں کہ ایک ہی نظر کام کر گئی۔ بیوہ پھپو نے بیٹیوں کے مانند انہیں اپنے گھر سے بیاہا تھا۔ عاصمہ کا طور طریقہ، سلیقہ، حسنِ اخلاق و اوصاف انہیں ایک پسندیدہ شخصیت بناتے تھے مگر ضرورت پڑنے پر ان کے میکے کا حوالہ ضرور گھسیٹا جاتا اور وہ جیسے زمین میں دھنس کر رہ جاتیں۔ تیز وطرار بھاوجیں مکان کے اوپری حصے پر قابض تھیں اور نچلے حصے میں اب ان کے چوتھے اور جوان العمر بھائی عبد المجید کی رہائش تھی۔ جو عادات و خصائل کے معاملے میں سوفی صد باپ پر گیا تھا اور درست معنوں میں ان کا جانشین ثابت ہو رہا تھا۔ عاصمہ کا میکا شرفا میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عام حالات میں کوئی اُدھر پھٹکنے کی بھی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ سلمیٰ بیگم بھی اُدھر کا دروازہ بجاتے ہوئے یونہی چور سی بن گئی تھیں، ان کی دستک پر داخلی دروازہ از خود وا ہوگیا تھا۔ انہوں نے پھر اک محتاط نگاہ یہاں وہاں دوڑائی اور تیزی سے گھر کی اوپری منزل کو جاتے والا زینہ طے کرتی چلی گئیں۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران ہی انہیں عاصمہ کی بڑی بھاوج نگار سے معلوم ہوا کہ عاصمہ نے منگنی کی رسم میں انہیں تو کیا، اپنے میکے والوں کو بھی گھاس نہیں ڈالی تھی۔ اکیلے ہی اکیلے چپ چپاتے رسم کر ڈالی۔ سلمیٰ بیگم نے شڑپ شڑپ کر کے نگار کی پیش کردہ چائے پی، پان کلّے میں دبایا اور اپنی کھولن کو زبان دی۔

''اندھیر ہے اندھیر...... یا تو ہرے سے عاصمہ بیٹی کا رشتہ کرنے پر آمادہ ہی نہ تھی یا بات آگے بڑھی تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ جھوٹے منہ نہ پوچھا۔ اے ہم کیا جلنے والوں میں سے تھے؟ یا کوئی حق نہ بنتا تھا ہمارا...... نیکی معاف، گناہ لازم...... وہی والا معاملہ ہوگیا۔''

"نیکی کا زمانہ ہی کہاں ہے آپا!" نگار نے محبت سے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی کہ نند سے پُرخاش تو وہ بھی کچھ کم نہ رکھتی تھیں۔ "عاصمہ کے مزاج ہی کہاں ملتے ہیں، ایسا اچھا رشتہ بیٹھے بٹھائے مل گیا تو پیر ہی زمین پر نہیں ٹک رہے عرش پر جا بیٹھی ہیں۔ عاصمہ کے تیور دیکھ کر تو لگتا تھا کہ دس سال بیٹی کو بیاہنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ننھی چوزی بنا رکھا تھا۔ کوئی اس کی شادی کا نام بھی لیتا تو تاؤ کر رکھ دیتی تھیں...... اور آپا! آپ کو بھی کیا پڑی تھی عاصمہ کے گھر کا رخ کرنے کی......؟ عاصمہ کا ارادہ نہیں تھا تو نہ سہی، ہمارا گھر نہ دکھائی دیا آپ کو۔ لڑکیوں کا ریوڑ ہے ریوڑ...... کیسے ٹھکانے لگاؤں گی میں ان سب کو؟" نگار نے دہائی دی تھی۔ لڑکے کے بر دکھوے کو عاصمہ میکے اور سسرال کے سب لوگوں کو اکٹھا کر کے لے گئی تھیں اور تب ہی سے نگار کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ تین منزلہ شاندار گھر اعلیٰ، قابل اور کماؤ لڑکا...... خیر سے نگار نے تین بیٹیاں بیاہی تھیں اور ایک داماد بھی ایسا نہ پایا تھا۔ کچھ تو لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یعنی...... ایک نہ دو، پوری چھ بیٹیاں...... اور کچھ ان کا شرمناک بیک گراؤنڈ...... جن کے سبب انہوں نے زیادہ حیل وحجت نہ کی۔ جیسے رشتے ان کے ہاتھ لگے وہ آنکھیں بند کر کے بیٹیوں کو بیاہتی چلی گئیں۔

سلمیٰ بیگم ان کی بات سن کر چپ سی ہو کر رہ گئیں۔ نگار کی دو بیٹیوں کے رشتے ان کے ہی توسط سے ہوئے تھے رشتے داری کا لحاظ آڑے آ گیا۔ ورنہ اتنا تو کہہ ہی دیتیں کہ تمہاری دو بیٹیوں کے رشتے طے کروا کے بھی انہیں ملا ہی کیا تھا۔ ٹکا بھی نہ جڑا...... ایک جوڑا تک نصیب نہ ہوا۔ معاملہ لین دین پر آ کر رکا تو نگار نے رشتے کا حق جتا کر انہیں صاف ٹھینگا دکھا دیا تھا۔ تب سے سلمیٰ بیگم نے تو اس گھر کے لیے کان ہی پکڑ لیے تھے۔ نگار بھی ان کا گریز خوب سمجھتی تھی سو بات پلٹ دی۔

"صاف چاپلوس لگتی تھیں لڑکے کی اماں...... نظر میں لگ گیا کہ گھر بھر کو مٹھی میں لے رکھا ہے...... نندیں بھی باون گزی سی ہیں اور میں تو خدا لگتی کہوں سلمیٰ آپا! دیکھا جائے تو قابلیت اور عمر کے لحاظ سے جوڑ تو آپ کی ثمر کا بنتا تھا جب اپنے گھر میں جوان بیٹی بیٹھی تھی تو کاہے کو بھائی کے گھر کا رستہ دکھایا۔"

نگار کی بات پر جیسے سلمیٰ بیگم کے کلیجے پر آرا چلا تھا۔ اب وہ منہ کھول کر کہتی کیا بھلی لگتیں کہ لڑکے کے کوائف سن کر پانی تو ان کے بھی منہ میں بھر آیا تھا، مگر صولت آپا کی دو ہی شرائط تھیں کہ لڑکی خوب صورت اور کم عمر ہو۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔ بی بی آج کل اچھے رشتے قسمت والوں کو جُڑتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ رشتے طے کروانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں چار پیسوں کی آس میں اور جو لوگ ہماری حق تلفی کریں تو ان سے اللہ ہی سمجھے۔" اپنے تئیں انہوں نے نگار پر طنز کا ڈھیلا مارا تھا مگر وہ بھی بڑی حرفوں کی بنی تھیں ایسی ہزار باتوں کو وہ جھاڑ جھٹک کر پرے کر دیا کرتی تھیں سو اب بھی کچھ خاص کان نہ دھرے۔ وہ زبان سے جیتنے کی عادی تھیں اور جیت بھی جایا کرتی تھیں۔ اب بھی سلمیٰ بیگم کو کوئی کرارا سا جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ سوچ کر پھر زبان بند ہی رکھی۔

اِدھر سلمیٰ بیگم کی آمد کا مقصد بھی پورا ہو چکا تھا۔ اپنے تمام شکوے شکایات نگار کے کانوں میں اتارنے کا مطلب دوسری زبان سے اپنی بات کو بھاوج کے کانوں تک پہنچانا تھا۔ وہ نگار کی چغل خور فطرت سے بخوبی واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ یہ ساری باتیں نگار کے پیٹ میں زیادہ دیر تک نہیں ٹکیں گی۔ وہ ان سب باتوں کو مرچ مسالا لگا کر عاصمہ کے کانوں تک ضرور پہنچائے گی۔ سلمیٰ بیگم برقع کی ڈوریاں کس کر زینہ اتر کر نیچے آئیں تو

ان کا ٹاکرا اپنے بھانجے رشید سے ہو گیا۔ رشید اندر قدم رکھنے کو ہی تھا مگر انہیں دیکھ کر ٹھٹکا یا تھا۔

"اوہ خالہ جان! السلام علیکم......" سلمیٰ بیگم نے سلام کا جواب دینے کے بجائے چشمہ درست کر کے رشید کا سرتاپا جائزہ لیا۔ جو بے داغ سفید کلف دار کھڑ کھڑاتا جوڑا پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کپڑوں سے کسی اچھے پرفیوم کی مہک اٹھ رہی تھی۔ رشید کے کرتوتوں کے بارے میں ان کے گنہگار کان جو کچھ سنتے تھے آج رشید کی عاصمہ کے میکے آمد، ان سب کی تصدیق کر رہی تھی۔

"ماشاء اللہ بڑے بچ رہے ہو، بجیا کو خبر ہے کہ خیر سے عاصمہ ممانی کے میکے میں تمہاری آمد ورفت چلتی ہے؟" انہوں نے تاک کے تیر مارا تھا۔ بھاوج کے میکے کے نام سے بجیا کو آگ لگتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ رشید کو بگاڑنے میں عاصمہ کے میکے کا ہاتھ ہے۔ وہ اپنی اولاد کی اندھی حمایت کرتی تھیں۔ ہر ممکن ان کے عیوب کو ڈھکنے کی کوشش کیا کرتیں اور جو کرتوت کھل جاتے تو اُن کا الزام وہ آرام سے دوسروں کے سر پر دھر دیا کرتی تھیں۔ رشید کے کرتوت بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ خالہ کے طنز کا اس پر رتی بھر بھی اثر نہیں ہوا۔ اس نے فخر و غرور سے چھاتی پھلا کر کہا تھا۔

"ہم جو کام کرتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں کسی سے چھپ کر نہیں کرتے۔" وہ جز بز سی ہو کر رہ گئیں۔ اس کے منہ لگ کر اپنی بے عزتی کروانے سے بہتر تھا کہ خاموشی سے اپنی راہ لیں۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا اور یہ سلمیٰ بیگم کی تیرے میرے گھر جھانکنے والی فطرت کا ہی کمال تھا کہ بشریٰ کی منگنی کی مٹھائی تقسیم ہونے سے پہلے ہی یہ بات گھر گھر پھیل چکی تھی کہ عاصمہ نے چپ چپاتے بیٹی کی رسم کروالی اور اپنی اصلیت دکھاتے ہوئے سلمیٰ بیگم کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھی ناں آخر موری کی اینٹ...... یہ وہ طعنہ تھا جو عاصمہ کے لیے مخصوص تھا اور موقع پڑنے پر خوب ہی کام آتا۔ اب تو اولادیں منہ کو آ گئی تھیں اور کون نہیں جانتا تھا کہ منیب الرحمٰن کی گرہستی سنبھال کر ان کے گھر کو جنت بنانے والی عاصمہ ہی تھیں۔ صد شکر کے بیس سالہ ازدواجی زندگی میں منیب الرحمٰن نے کبھی ان کے میکے کو گھسیٹ کر انہیں بے عزت نہیں کیا۔

☆☆☆

بجیا کے دونوں بیٹے رشید اور حمید بھی بشریٰ کی منگنی کی خبر سن کر ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔

"خاندان کے لڑکے کیا مر گئے تھے جو چھوٹے ماموں اب غیروں میں بیٹی بیاہنے چلے ہیں؟" رشید نے اپنے ازلی فخر و غرور بھرے لہجے میں نہایت بدتمیزی سے کہا تھا۔

بڑی پھوپھو کے گھر کے داخلی دروازے پر سبطین کے قدم جیسے جم کر رہ گئے تھے۔ دستک کے لیے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا تھا اندر کی ساری آوازیں دروازے تک بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ رشید و حمید کا غرور ہی تھا ورنہ ان دونوں بھائیوں کے اوصاف کوئی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ رشید اپنی رنگین مزاجی اور شغل میلوں کے سبب اچھی شہرت نہ رکھتا تھا تو حمید کے مزاج آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ حمید نے قسمت سے چار جماعتیں پڑھ لی تھیں اور اب نوکری حسبِ مرتبہ درکار تھی۔ دُبلے پتلے منحنی سے حمید کی آدھی چندیا نظر آنے لگی تھی مگر وہ خود کو بڑی توپ چیز سمجھتا تھا۔ نوکری ہو یا چھوکری اسے دونوں ہی میں سے کوئی اپنے لائق نظر نہ آتی تھی۔ وہ ہر لڑکی میں کیڑے نکالتا اور ہر نوکری کو اپنے لیے کسرِ شان سمجھتا۔ بجیا بھی بھاوج سے کچھ کم پُرخاش نہ رکھتی تھیں۔ عاصمہ کا میکا ان کے پڑوس میں تھا اور ان کے خیال میں رشید کو بگاڑنے میں عاصمہ کے میکے کا ہاتھ تھا۔ سو وہ اکثر و بیشتر عاصمہ کے میکے کے بخیے ہی ادھیڑتی نظر آتیں۔ البتہ اپنی اولاد کے عیوب پر پردے ہی ڈالتی نظر آتیں۔

"آسمان سے زمین پر آکر پٹخنی کھائیں گی ممانی صاحبہ! بڑی اونچی ہواؤں میں اُڑ رہی ہیں۔" رشید نے شانِ تفاخر سے دعویٰ کیا۔

یہ امکان تینوں کے لیے ہی دل خوش کُن رہا سو اس نکتے کو لے کر کچھ مزید دل شکن پیش گوئیاں کی گئیں۔ سبطین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ عاصمہ نے آج اسے بہن کی منگنی کی مٹھائی گھر گھر بانٹنے کا ذمّہ سونپا تھا مگر بڑی پھپھو اور ان کے بیٹوں کے دل شکن تبصرے..... وہ الٹے پیروں واپس پلٹ گیا تھا۔

☆☆☆

عاصمہ بہت دیر سے سر نہیوڑائے گہری سوچ میں گم تھیں۔ پہلے ان کی بھاوج نگار نے سلمٰی بیگم کی گفتگو انہیں چارے ضرب دے کر سنائی تھی اور اب رشید اور حمید کے تبصرے..... جو سبطین اپنے کانوں سے سن کر آیا تھا۔ بیٹی کی نسبت طے کر کے وہ جیسے گنہگار ہو گئی تھیں۔ چاروں جانب سے لعن طعن کی برسات تھی، ان کی ساری زندگی ہی ان کڑے رویوں کا زہر پیتے پیتے گزری تھی۔ قسمت سے سسرال کے نام پر تین گھر پلے پڑے تھے۔ دو نندوں اور ایک جیٹھ کا گھر..... اور تینوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ عاصمہ کی ساری زندگی ان سب کے آگے پیچھے پھرتے ہی گزری تھی۔ اگرچہ بیٹی کے معاملے میں انہوں نے ہر ایک سے رائے اور مشورہ لیا تھا مگر انہیں ان بے لاگ تبصروں کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ وہ مشورے کی خاطر پہلی بار جیٹھ کے گھر داماد جواد احسن کی تصویر لے کر گئیں تو جیٹھ صاحب کے بڑے صاحبزادے نے تو منہ پر صاف ہی کہہ دیا تھا۔

"سب باتیں ٹھیک ہیں چچی جان مگر اس لڑکے کا شناختی کارڈ دیکھا.....؟" عاصمہ سمجھ گئیں کہ اشارہ جواد احسن کی عمر کی جانب ہے۔ لڑکا کماؤ تھا، تعلیم یافتہ، سنجیدہ مزاج، ذمّے دار، اب ساری ہی خوبیاں تو یکجا ہو کر نصیب نہیں ہو جاتیں۔ کہیں نہ کہیں تو جھکنا ہی پڑتا ہے مگر وہ کس کس کو سمجھاتیں اُدھر جیٹھانی صاحبہ نے بیٹے کے منہ سے نکلی بات سنبھالی تھی۔

"تم رائے لوگی تو جس کی جو بھی بُری بھلی رائے ہوگی وہی دے گا۔ باقی تم والدین ہو اپنی اولاد کے لیے بہتر ہی سوچو گے۔" انہوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر کہا تھا۔ عاصمہ خوب جانتی تھیں کہ جیٹھانی صاحبہ ان کے گھر پر پورا استحقاق جماتی تھیں۔ اب بیٹی کے رشتے کے معاملے میں ان سے غیروں کی طرح رائے لی جا رہی ہے، یہ بات ان سے ہضم ہونے والی کہاں تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بیٹی کی شادی کا ارادہ باندھتے ہی کوئی معقول رشتہ نظر میں رکھنے کی وہ ان سے التجا کرتیں پھر انہیں اختیار تھا کہ برے بھلے جو رشتے میسر ہوتے وہ ان میں سے بہتر رشتہ چُنتے، تب ہی بات بنتی تھی۔ اب جب بات رشتہ طے کیے جانے پر آن لگی ہے تو ان سے رائے طلب کی جا رہی ہے۔

"بشریٰ پر آپ کا بھی حق ہے بھابی جان لڑکے کا گھر بار، رہن سہن سب ہی کچھ آپ دیکھ چکی ہیں۔" عاصمہ نے حتی الامکان اپنا لہجہ مؤدبانہ رکھا تھا کہ اپنی جیٹھانی روشن آرا کے مزاج کی تیزی سے بخوبی واقف تھیں۔ منٹوں میں مقابل کی عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دیا کرتی تھیں۔

"خیر دیکھ بھال کا تو تم ذکر ہی نہیں کرو۔ جس طرح تم دوسروں کو وین میں بھر کر بردکھوے کی خاطر لے گئی تھیں اسی طرح ہم سب بھی ساتھ چلے گئے۔ بشریٰ کو ہمارے گھر کی بیٹی سمجھا ہوتا تو رشتہ آتے ہی ہمارے سامنے رکھا جاتا اور کچھ نہیں تو دیکھ بھال اور معلومات کا ذمّہ ہی ہمارے دونوں بیٹوں کو بخش دیا جاتا، تب میں کہتی بھی اچھی لگتی مگر اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ تم والدین ہو تمہیں اختیار ہے؟ تم اولاد کا برا تو نہیں چاہو گے ناں؟" عاصمہ اس لطیف سے طنز کے عقب میں چھپے اشارے خوب سمجھتی تھی۔ روشن آرا کی حیثیت سے کون ناواقف تھا۔ انہیں اپنے بڑے ہونے کا زعم تھا کچھ رتبے کے حوالے سے اور کچھ مالی پوزیشن مضبوط ہونے کی وجہ سے خاندان بھر میں ان کی دھاک تھی۔ چاروں گھروں میں، خوشی ہو یا غم ان کا ہی حکم چلتا تھا..... ان کے سامنے تو کسی کا منہ نہ کھلتا مگر پیٹھ پیچھے سب ہی ان کے لیے زہر اگلتے تھے بس اِک عاصمہ تھیں جو اُن کے مقابل سدا ایک چپ سو سکھ کی پالیسی پر عمل پیرا رہا کرتیں۔ اب بھی چپ کی چپ رہ گئیں مگر روشن آرا کی تسلی اتنے کم پر کہاں ممکن تھی۔ انہوں نے نیا نکتہ اٹھایا تھا۔

"میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی کہ جب صولت آپا کے اپنے خاندان میں ایک سے ایک لڑکیاں موجود تھیں تو انہیں ہم غیروں میں رشتہ کرنے کی کیا سوجھی.....؟ اس بات کی بھی چھان بین ہونی چاہیے کہ خاندان میں انہیں رشتہ نہ ملا تو کیوں نہ ملا؟ اور اگر انہوں نے مانگا تو کیوں نہ مانگا؟" اور ایسی ہی جانے کتنی باتیں انہوں نے نکالی تھیں۔

عاصمہ لہو کے گھونٹ بھر کر رہ گئیں اگرچہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے رشتہ طے نہیں کیا تھا۔ لڑکے کی بابت ضروری چھان پھٹک اور جانچ پڑتال کروائی تھی کردار، اخلاق، خاندان اِک، اِک شے سے مطمئن ہو کر ہی ہامی بھری تھی مگر یہ مشورہ اور رائے طلب کرنے کا کٹھن مرحلہ انہیں گھائل کر گیا تھا۔ اگر انہیں صفیہ ان کی پڑوسن کی کمک حاصل نہ ہوتی جسے عاصمہ نے اپنی دوپٹا بدل بہن بنایا تھا اور وہ اس بہناپے کا فرض پوری طرح نبھا رہی تھی۔

"تم اپنی اولاد کے لیے زیادہ بہتر سمجھتی ہو۔ ان نکتہ چینیوں سے گھبرا کر اگر تم حوصلہ کھو بیٹھیں تو یہی رشتے دار آگے بڑھ کر اگلا رشتہ نہیں بتائیں گے۔ رشتہ اچھا ہے تو ہاتھ سے نہ جانے دو، یہ نکتہ چینیاں ہر بار چلیں گی۔ ابھی تمہاری دو بیٹیاں اور بھی ہیں آج کل رشتے کی تنگی ہر گھر میں ہے۔ اللہ کا نام لے کر... بسم اللہ کرو۔" صفیہ کی باتیں عاصمہ کو حوصلہ بخشتیں۔ وہ پڑوسن تھی مگر بہنوں سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔ لڑکے کی بابت تمام چھان بین بھی صفیہ کے میاں ہی نے کی تھی اور ہر جانب سے انہیں اوکے کا سگنل ملا تھا۔ اُدھر سلمٰی آپا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

"ایسے رشتے مقدر والوں کو ملتے ہیں۔ گھر بیٹھے اچھا رشتہ مل رہا ہے تو زیادہ سوچ بچار سے کام مت لو۔"

"صولت آپا کو اپنی بشریٰ بھا گئی ہے تو یہ ہمارے نصیب ہیں، ورنہ اچھی لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے، ہر گھر میں دو چار لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ ایک سے ایک حسین و جمیل اور لاکھوں کے جہیز سمیت۔" یہ سب باتیں راست سہی مگر ابھی عاصمہ نے بیٹی کی شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا پھر صولت آپا کی اسی

سال شادی کی شرط بھی کڑی تھی۔ اللہ، اللہ کر کے اب تو وہ وقت آیا تھا کہ دونوں بیٹے کسی قابل ہو کر روزگار سے لگے تھے۔ سمجھو اب تو ان کے آنسو پونچھنے کا وقت آیا تھا ورنہ اب تک تو منیب الرحمٰن کی محدود آمدنی کے سبب تنگ دستی ان کا مقدر رہی تھی...... اور وہ خوب جانتی تھی کہ ہاتھی پالو تو دروازے بڑے رکھنے ہی پڑتے ہیں۔

رشتہ اگرچہ سلمٰی بیگم نے صولت آپا کو بتایا تھا مگر ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھاوج اکیلے، اکیلے منگنی کر ڈالیں گی۔ اُدھر صولت آپا اور صفیہ بہن کے اصرار پر دولہا کے گھر سے چند لوگ آئے اور بچی کو انگوٹھی پہنا گئے یوں مٹھائی تقسیم ہوگئی۔

عاصمہ کو اس اقدام کے بعد ان کڑے رویوں کا بھرپور اندازہ تھا۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آتی تھیں۔ اسی خاموشی سے سر جھکائے ٹپ ٹپ جانے کتنے آنسو گرے تھے بیٹے نے انہیں یوں سر جھکائے چھم چھم آنسو بہاتے دیکھا تو صفیہ خالہ کو بلا لایا۔ وہ بھی کھنچی چلی آئی تھی اور ساری روداد سن کر اب مقدور بھر دلجوئی میں لگی تھی مگر عاصمہ کا قلق کم ہو کے نہیں دے رہا تھا۔

"زندگی گزر گئی ان سب کی جی حضوری کرتے ہوئے مگر نتیجہ......" عاصمہ نے اِک سرد آہ بھری۔

"وہی ڈھاک کے تین پات۔"

"وہی تو تمہیں سمجھاتی ہوں کہ جب نتیجہ صفر ہی ہے تو کیا فائدہ ان جی حضوریوں کا؟" صفیہ کی بات لبوں ہی میں تھی کہ سبطین کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر کی چین گھماتا چلا آیا۔

"اور یہی میں امی سے کہتا ہوں کہ اتنا آگے پیچھے ہونے پر بھی جب برائی سر پر لادی جائے تو کیا ضرورت ہے ان مکھن بازیوں کی؟"

"مکھن بازی......؟" اس لفظ پر عاصمہ نے تڑپ کر زخمی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ٹھیک ہی تو کہتا تھا وہ ان کی ساری زندگی شوہر اور سسرال والوں کی تیوریوں کے بل گنتے ہی گزری تھی۔ خوشامد، چاپلوسی اسے مکھن بازی نہیں تو اور کیا کہتے ہیں۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں...... سلمٰی آپا کے طفیل رشتہ کروا کر ساری زندگی اُن کے احسان کا ٹوکرا میرے سر پر لدا رہے گا۔"

"اور میں نے بھی تو تم سے کہا تھا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے، یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایک اچھے رشتے کو اس سبب چھوڑنا کہ وہ سلمٰی آپا بتا رہی ہیں، دانشمندی نہیں۔ رشتے ناتے آسمان پر طے ہوتے ہیں۔ انسان تو بس وسیلہ ہے، جواد احسن کے ستارے اپنی بشریٰ سے ملتے تھے تو کچھ بھی وسیلہ بن جاتا، دونوں کا ملن ہو کے رہتا۔"

"تم سلمٰی آپا کو نہیں جانتیں۔ وہ گاہے بگاہے یہ احسان جتانا کبھی نہ بھولیں گی۔"

"تو یہ اُن کی کم ظرفی ہوگی...... بشریٰ ان کی بھتیجی ہے، اس کا حق بنتا ہے۔" صفیہ کا فرمان بجا مگر عاصمہ جانتی تھیں۔ یہ اتنا سہل نہ ہوگا۔

"دین سے دنیا نباہنی مشکل ہے۔" انہوں نے بڑی بے چارگی سے کہا تھا۔

"بجا فرمایا ہے اور دنیا سے بھی زیادہ سسرال نباہنی مشکل ہے مگر کبھی کبھی دنیا کو سنگ بھی ہماری خاموشی ہی بخشتی ہے۔ لوگ ہمیں ہماری صفات کے حوالے سے بھی تو برتتے ہیں۔"

صفیہ درست کہہ رہی تھی مگر کاش وہ اینٹ کا جواب پتھر سے ہی دینے کا حوصلہ رکھتیں۔ ان کی بہت سی کمزوریوں نے ہمیشہ ان کا سر جھکائے رکھا تھا۔ ذلت بھرا خاندانی پس منظر بہن بھائیوں کے ... منیب الرحمٰن کی اطاعت...... اور خود عاصمہ کا ... وفا و خلوص...... در گزر کا وصف...... سسرال نباہ ... چلن...... صفیہ کا فرمان راست ہی تو تھا کہ دنیا ...

سی ہم خود ہی بخشتے ہیں۔ ایک ادنیٰ سے اقدام نے جیسے اسے مجرم بنا ڈالا تھا اور وہ خوب جانتی تھی کہ اب یہ سلسلہ اور دراز ہوگا۔ اس نے گویا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنی شامت کو آواز دی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟" عاصمہ سر تھام کر بیٹھ گئی مگر صفیہ نے بھرپور تسلی سے نوازا۔

"ناقدر شناسوں کے قدموں میں دل بھی نکال کر رکھ دو تو وہ روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ تم بھی اپنے دو کانوں کا درست استعمال کرو۔ ایک سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہو بس......" کہتے ہوئے وہ ہنسی تھی۔ صفیہ کا مشورہ دل کو لگتا تھا تجویز نامعقول نہ سہی مگر قابلِ عمل تھی مگر دشوار تو یہی تھا کہ دشوار بہت تھا۔

☆☆☆

یکایک جیسے حیات نے رخ بدلا تھا۔ بشریٰ کے آس پاس ڈھیروں ڈھیر خوشگواریت کا احساس جاگا تھا اور جیسے سب کچھ نیا نیا سا لگنے لگا تھا۔ بس اِک محبت کے اچھوتے احساس کے طفیل...... اور یہ وہی جواد تھا جس کی تصویر دیکھ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

"ہاہ...... یہ......؟ مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔" وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی تھی۔ جیسے کسی نے زبردستی پکڑ دھکڑ کر اندھیرے میں تصویر کھینچ دی تھی۔ بکھرے بال...... بڑھی ہوئی شیو...... بے ترتیب لباس......

عاصمہ نے بھی دبا دبا سا احتجاج کیا تو صولت آپا کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا پھر جواد احسن کی بطورِ خاص بر دکھوے کے لیے بنوائی گئی بڑی اسٹائلش سی تصویر سامنے آئی تھی، جو قدرے معقول تھی، جواد احسن خوبرو تھا اور ساتھ خوش اخلاق بھی...... ذمے دار ایسا کہ درست معنوں میں والدین کا دایاں بازو بنا ہوا تھا۔ اوپر تلے کی تین بہنوں کو بیاہنے میں اس کی اپنی عمر کچھ زیادہ ہوگئی تھی اور ہر کسی نے بس ایک یہی نکتہ پکڑ لیا تھا۔ حتیٰ کہ جواد احسن کو دیکھ کر آنے کے بعد سبطین اور کاشف بھی پھیل گئے تھے۔

"بشریٰ اور جواد کی عمروں میں بہت فرق ہے، جوڑ ہی کہاں بنتا ہے؟" اس نکتے پر سب ہی متفق تھے مگر ہر شے مکمل کہاں ملتی ہے۔

جواد احسن کی تین بہنیں بیاہی تھیں، ایک بن بیاہی...... اور سب کی ایک ہی رائے تھی۔

"ہمارے بھائی لاجواب ہیں۔" تینوں اس سے عمر میں بڑی تھیں۔ البتہ آخری بن بیاہی شازیہ شاید ہم عمر ہوگی مگر رشتہ اس کا معتبر بننے جا رہا تھا۔ ابھی اس نے فرسٹ ایئر کے پیپرز دیے تھے ساس صاحبہ کو شادی کی جلدی تھی اور ان ہی کا حکم تھا کہ شادی کے بعد گریجویشن ضرور کرنا ہے۔ بات طے ہونے تک ان سب کے خلوص و محبت نے جیسے اسے خرید لیا تھا اور جب صفیہ آنٹی نے جواد کی تصویر دکھا کر اس سے رائے طلب کی تو اس کے لب جنبش ہی نہ کر سکے۔

"سوچ لو...... سمجھ لو..... آخری فیصلہ تمہارا ہی ہوگا۔" جواد احسن کی عمر کے سبب اٹھتی چہ مگوئیوں نے اس کا دل بوجھل کر رکھا تھا مگر یہ بھی درست ہی تھا کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کمی تو ہوتی ہی ہے۔ کچھ نہ کچھ سقم تو خود اس کی ذات میں بھی ضرور ہوگا۔

منگنی کی رسم اگرچہ بہت سادگی سے انجام پائی تھی مگر تحائف کی برسات ہوگئی تھی۔ ایک نند نے طلائی لاکٹ سیٹ ایک نے نازک و نفیس رسٹ واچ اور بن بیاہی نند شازیہ نے میک اپ کٹ اور پرفیوم، جواد نے خوب صورت کام سے سجا نفیس پنک سوٹ بھجوایا پھر یہ سلسلہ ہی چل نکلا۔ ساس صاحبہ آئے روز آن پہنچتیں۔ ایک بار اس کا ہاتھ پکڑ کر بازار لے گئیں۔ اصرار کر کے ہاتھ بھر بھر کر چوڑیاں پہنا دیں۔ موسم نے رنگ بدلا تو لان کے کئی جوڑے دے گئیں اور پھر ہدایت کہ اپنے ہاتھ سے سی کر پہننا ہے۔ اس کے ہاتھ کی سلائی میں بہت نفاست اور صفائی تھی۔ اس نے نارنجی لان کا سوٹ سی کر پہنا تو

انہوں نے ساتھ لگا کر چوم لیا۔
''میری بچی پر یہ رنگ بہت کھل رہا ہے۔ یہ کلر میں بری میں ضرور رکھوں گی۔'' ہونے والے سسر کا اپنا پولٹری فارم تھا۔ وہ درجنوں انڈے، مرغی کا گوشت، ڈھیروں کے حساب سے اٹھالاتیں اور ساتھ میں تاکید کہ کھانا پکانا سیکھو۔ کھانا تمہیں ہی پکانا ہوگا اور عاصمہ نے اس کی ڈیوٹی مستقل کچن میں لگا دی۔ سیکنڈ ائیر کے پیپرز کی ڈیٹ آئی تو اس کا ذہن صاف سلیٹ تھا۔ تیاری ٹھیک سے نہ ہو پائی تھی۔ اُدھر صولت آپا کا اصرار کہ شادی اسی عید کے چاند پر ہر جانیے اور عاصمہ مُہر بہ لب رہ جاتیں۔
امتحانات اس کے سر پر منڈلا رہے تھے اور تیاری صفر تھی۔ اتنا بہت سارا وقت تو سسرال والوں کے ناز نخرے اٹھانے میں گزر جاتا تھا۔ آئے روز کوئی نہ کوئی آن پہنچتا منگنی کے ساتھ ہی جواد نے بشریٰ کو موبائل فون کا تحفہ بھجوا دیا تھا اور جواد احسن سے بات ہوتی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ کئی کئی گھنٹے گزر جاتے۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا انٹر کلیئر ہی نہ ہو پائے گا، اس نے اسی بابت ایک بار جواد سے تفکر کا اظہار کیا تو اس نے بھی بات اُڑا دی۔
''امتحانات کو گولی ماریے اب تو شادی کی تیاری کیجیے۔ اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔'' بشریٰ کا دل جل کر خاک ہو گیا۔ اسے فکر کھائے جا رہی تھی اور ادھر کسی کو پروا نہیں تھی۔ اگرچہ ماں اسے سمجھاتیں کہ بحث سے گریز کیا کرو، بات تلخ ہونے لگے تو مذاق میں اڑا دو مگر کبھی کبھی کا مذاق مہنگا بھی تو پڑ جاتا ہے۔
''اسی لیے میں اس شادی وادی کے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔'' یونہی بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا اپنے تئیں اس نے مذاق میں بات اڑا دی تھی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ دوسروں کو ان کے مزاجوں کے مطابق بھگتنے کا چلن سیکھا ہی کب تھا۔ جو منہ میں آتا پٹ سے کہہ دیتی مگر صفیہ آنٹی کی خاص

ہدایت تھی کہ زبان کو لگام دینا سیکھو۔ اسے یہ بات یاد بھی رہتی مگر زبان تھی، جو شامتِ اعمال پھسل گئی تھی۔۔۔ اور اس بار زبان کا پھسل پڑنا قیامت ڈھا گیا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ جواد کے تیور تیزی سے بدلے تھے۔ اس نے بنا کچھ کہے موبائل آف کر دیا تھا۔ بشریٰ کو کسی گڑبڑ کا اچانک احساس ہوا اور دل انجانے خدشات سے لرزنے لگا۔ اور شام تک اس کا ہر اندیشہ سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ صولت آپا کی آمد خاصے کڑے تیوروں کے ساتھ ہوئی تھی اور انہوں نے چھوٹتے ہی بے دھڑک کہا تھا۔
''میں یہ رشتہ ختم کرنے آئی ہوں۔''
''ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟'' عاصمہ سہم گئیں۔
''آپ نے یہ رشتہ طے کرنے سے پہلے بشریٰ کی صلاح کیوں نہیں لی تھی؟'' عاصمہ سمجھ گئیں بشریٰ کے مزاج کا بچپنا کوئی رنگ دکھا گیا ہے۔ انہوں نے بشریٰ کے الفاظ من و عن عاصمہ کے سامنے دُہرا دیے تھے۔
''جواد کو بشریٰ کی یہ بات سخت ناگوار گزری ہے اور اسی نے مجھے یہ رشتہ ختم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ میں نے ہزار بار کہا ہے اور اتنا تو آپ بھی جان گئی ہوں گی کہ جواد کے مزاج میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔ بے تکی باتیں اسے پسند ہی نہیں ہیں مگر آپ نے بیٹی کو یہ بات نہیں سمجھائی؟'' عاصمہ سرتاپا لرز اٹھیں۔ کیسی جگ ہنسائی ہوگی جب یہ بات اُڑے گی کہ منگنی بشریٰ کی حماقت کے سبب ختم ہو گئی اور وہ منیب الرحمن کو کیا جواز دیں گی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ بشریٰ اور جواد احسن کی موبائل پر گفتگو چلتی ہے۔ تب تو شوہر کا ڈنڈا ان کے سر پر بجے ہی بجے۔ عاصمہ نے معذرتوں اور وضاحتوں کی انتہا کر دی تھی مگر صولت آپا نہ، نہ کرتے کرتے بھی بشریٰ کے سر پر جا سوار ہوئیں۔
''کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو......؟ آسمان سے اتری کوئی حور ہو یا تم میں لعل جڑے ہیں۔ کیا سوچ کر تم نے ایسی بات کہی؟ میں چار لوگوں کو بٹھا کر یہ

رشتہ ختم کروں گی اور ساتھ میں تمہارا کارنامہ بھی نشر ہوگا۔ جواد کو تم سے لاکھ درجہ بہتر لڑکی مل سکتی ہے۔ یہ یاد رکھنا۔'' وہی غرور و طنطنہ...... جو کماؤ پوت قابل بیٹوں کی ماؤں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ بشریٰ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ عاصمہ کے اشارے پر ان سے معذرتیں بھی کرتی رہی۔ صفیہ آنٹی درمیان میں کود پڑیں اور بہ مشکل بات سنبھالی گئی۔ صولت آپا نے اعلیٰ ظرفی کی انتہا کرتے ہوئے جیسے اسے معاف کیا تھا مگر آئندہ کے لیے تنبیہ کرنا نہ بھولی تھیں۔ یقیناً بعد ازاں بیٹے کو بھی سمجھا بجھا لیا ہوگا کہ رابطے بحال ہو گئے مگر صولت آپا کے سدھارنے کے بعد عاصمہ نے خوب ہی اس کے لتے لیے تھے۔
''باپ کے مزاج کی بھی پروا ہے کہ نہیں؟'' ماں کا کہنا درست تھا۔ سسرال پرستی ان پر ختم تھی۔ اسے شدت سے اپنی خطا کا احساس ہوا، ساتھ ہی یہ سبق بھی حاصل ہو گیا کہ دوسروں کو ان کے مزاجوں کی مناسبت سے برتنے ہی میں عافیت ہے۔ اس نے سچ مچ آئندہ کے لیے کان پکڑ لیے تھے۔

☆☆☆

''اے لو...... تو کیا مجھے باؤلے کتے نے کاٹا ہے یا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ نصیب پھوٹے تھے میرے جو اِک ذرا دو گھڑی کو دم لینے صولت آپا کے گھر جا پہنچی۔ ثمر کے ابا کی ٹیسٹ رپورٹیں لینے گئی تھی۔ ذرا جو گرمی سے چکر سا آ گیا تو قریب ہی صولت آپا کا گھر تھا پھر ان کی طبیعت کی خرابی کا بھی سنا تھا۔''
''سلمیٰ آپا......!'' عاصمہ کی آواز بڑی کمزور سی تھی۔
''اے جانے دو بی بی اب یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے کہ سمدھیانہ کیا ہے تو ذرا سمدھیانے کا طور طریقہ بھی سکھاؤ بیٹی کو؟ سسرال بھگتنا آسان کام نہیں ہے۔ پتا پانی کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر غیر اپنا بنتا ہے۔'' سلمیٰ آپا نے یوں کہا جیسے خود بڑی

سسرال بھگتائے بیٹھی ہوں۔ بشریٰ ان کے لیے چائے بنا کر لائی تو عاصمہ مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔
''مجھے الہام تو نہیں ہوا ناں! صولت آپا نے مجھ سے یہ سب کہا ہے تو مجھے معلوم ہوا۔'' انہوں نے بشریٰ پر نظر پڑتے ہی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر کہا۔ سلمیٰ بیگم کی بات بجا تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس سے مزید وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ الٹے قدموں لوٹ گئی اور سلمیٰ بیگم نئے سرے سے اسٹارٹ ہوئیں۔
''کان کھول کر سن لو اور بیٹی کو بھی سمجھا دو، صولت آپا نے مجھ سے شکوے شکایت کیے تو میں تو مانو زمین میں گڑ کر رہ گئی تھی...... اور یوں کھلے بندوں لڑکے، لڑکی کی ٹیلیفون پر بات چیت، شریف لوگوں کے طور طریقے ہیں بھلا؟ اور شریف بہو بیٹیوں کے ایسے لچھن ہوتے ہیں؟ گھنٹا گھنٹا بھر موبائل پر باتیں...... اللہ معاف کرے، منگنیاں ہمارے یہاں بھی ہوتی چلی آئی ہیں...... مگر لڑکے کا لڑکی سے پردہ کروایا جاتا ہے۔ اپنے میکے کے طور طریقے آزمائے تو نتیجہ بھی خود ہی بھگتتی پھرنا۔'' عاصمہ تڑپ کر رہ گئیں۔ سلمیٰ بیگم صاف انہیں میکے کی سیاہ کاریوں کا طعنہ دے رہی تھیں اور ان کے میکے کا حوالہ ہزار بار دُہرا لیا جائے تب بھی اتنا ہی شرمناک ہی رہتا... کہ عاصمہ پر گھڑوں پانی پڑ جایا کرتا تھا۔ وہ وضاحت بھی کرتیں تو سلمیٰ آپا نے کون سا اسے مان لینا تھا کہ یہ نیا دور ہے۔ لڑکی گھر سے باہر نکلتی ہے تو غیر متعلقہ ہزار لوگ اسے دیکھتے ہیں اور جس سے راہ و رسم پر شرعاً بھی ممانعت نہیں، اُدھر پردہ رواجوں میں شامل ہے۔ انہوں نے اسی امکان کے سبب جواد احسن سے بشریٰ کی بات چیت پر پابندی نہ لگائی تھی کہ مبادا کہیں وہ چور راستے تلاش کر لیں اور یہ امکان زیادہ شرمناک ثابت ہوتا۔ عاصمہ کو اپنی آنکھوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے صفیہ کا فرمان بجا تھا۔

''قدر ناشناس لوگوں کے قدموں میں دل بھی نکال کر رکھ دو تو وہ کچل کر گزر جاتے ہیں۔'' عاصمہ نے چور نظروں سے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ منیب الرحمٰن کے لوٹنے کا وقت تھا اور سلمیٰ بیگم میں لاکھ خامیاں سہی مگر ایک اچھا گن یہ بھی تھا کہ انہوں نے کبھی بھاوج کے خلاف شکایت جڑ کر بھائی منیب الرحمٰن کے کان بھرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس بار خطا بھتیجی کی تھی۔ نند صاحبہ کا بگڑنا بجا ہی تھا۔ اُن کی لعن طعن بھتیجی کے کانوں تک پہنچی تو اس کے دل کو بھی ٹھیس پہنچی تھی۔ ساس صاحبہ تمام لحاظ و مروت بالائے طاق رکھ کر اس پر گرجی برسی تھیں۔ بعد ازاں اس کے معافی مانگنے پر اسے کھلے دل سے معاف بھی کر دیا تھا، تب بھی انہیں سلمیٰ پھوپی سے شکایت جڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ سلمیٰ بیگم کے مزاج کے لُترے پن کا تھوڑا بہت اندازہ تو یقیناً صولت آپا کو بھی ہوگا۔

مگر اتنا تو بشریٰ بھی جان گئی تھی کہ ساس صاحبہ لاکھ کھلے دل کی، محبت کرنے والی سہی مگر خاصا ٹیڑھا مزاج پایا تھا انہوں نے۔ بظاہر تو وہ بشریٰ کی محبت میں پھڑکتی نظر آتی تھیں۔ کوئی دن نہ جاتا کہ ان کا فون نہ آتا ہو۔

سلمیٰ بیگم نے درست ہی کہا تھا کہ سسرال بھگتنے کے لیے پتا پانی کرنا پڑتا ہے۔ وہ دیکھتی تھی کہ ماں بھی جان مار کے سسرال بھگتایا کرتی تھی۔ سسرال پرستی اس کا وصف تھا اور سسرال والوں کی خدمت، اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آگے کی راہ سہل ثابت نہ ہوگی، اسے بخوبی اندازہ تھا اور اپنے منہ کو تالا لگا کر رکھنے کا تہیہ تو وہ کر ہی چکی تھی۔

☆☆☆

اس شام عاصمہ اور منیب الرحمٰن صولت آپا کی مزاج پُرسی کو گئے تھے۔ اور ان کے گھر سے واپس لوٹ کر منیب الرحمٰن سر تھام کے بیٹھ گئے۔ صولت آپا دل کی مریضہ تھیں اور اپنی زندگی کا بھروسا ہی کر... تھیں اب جلد از جلد بیٹے کی شادی کے لیے... تھیں جبکہ منیب الرحمٰن نے احتیاطاً سال بھر کا... مانگا تھا۔ عاصمہ نے اپنے ازلی سلیقے طریقے اور... اندیشی کو کام میں لاتے ہوئے جمع جوڑ تو کب ... شروع کر رکھی تھی۔ اب شادی کی نیت سے ایک... کمیٹی بھی ڈال رکھی تھی جو سال بھر میں انشاء اللہ... ہی آتی۔ فی الوقت تو تنگی کا رونا تھا اور عاصمہ... دھیمے اور نرم لہجے میں یہی سب کچھ صولت آپا پر وا... کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر انہوں نے تو چٹکی... میں حل نکال ڈالا۔

''پیسے کی تنگی ہے تو پہلے کہا ہوتا، غیر سمجھا ان... نے مجھے؟ میں نے کیا تم سے کچھ مانگا ہے؟''

''صولت آپا! میرا مطلب تھا کہ اسی سال... نویں مہینے میں میری کمیٹی نکل آئے گی تو شادی کی... تاریخ......'' مگر صولت آپا نے اُن کی پوری بات... نہ سنی۔ فوراً بھاؤ تاؤ پر اتر آئیں۔

''کتنے کی کمیٹی ہے؟''

''دو لاکھ کی...... کوشش کروں گی کہ کچھ پہلے ہی نکل آئے۔ ابھی تو......'' انہیں ہار کر کہنا پڑا مگر صولت آپا نے بِنا کچھ کہے سنے ان کے لاکھ نہ نہ کرنے پر بھی دو لاکھ کا چیک کاٹ کر تھما دیا۔

''بہن سمجھ کر قرض دے رہی ہوں۔ بخشوں گی تھوڑی۔ سال بھر میں جب کمیٹی نکل جائے تو لوٹا دینا۔'' اس طرح احتجاج کا ہر جواز ہی دم توڑ گیا۔ انہیں تاریخ دیتے ہی بن پڑی۔

☆☆☆

سلمیٰ بیگم صبح سے اٹیچی کیس سنبھالے بھائی کے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ آج منیب الرحمٰن کے گھر دن میں قرآن خوانی اور میلاد پھر شام میں بشریٰ کے مایوں کی تقریب تھی۔ دو بجنے کو آئے تھے مگر صاحبزادی کے بناؤ سنگار ہی ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ وہ بے چینی سے پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ثمر پورے دو گھنٹے پارلر میں لگا کر آئی اور شکل بھی لش لش کر رہی تھی۔ فیشل، تھریڈنگ، بلیچنگ، یہ وہ...... بشریٰ کی شادی میں جاذبِ نظر دکھائی دینے کے لیے جانے کون سی اللہ ماری کریم کا لیپ مہینہ بھر سے جاری تھا مگر نتیجہ بھی خاطر خواہ برآمد ہوا تھا۔ پارلر سے لوٹ کر بھی وہ اِدھر اُدھر جانے کون سے دھندے بھگتانے میں لگی تھی۔ بالآخر سلمیٰ بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''اے ثمر! تیرے کیڑے پڑیں۔ ستیاناس جائے تیرا...... لاکھ چمکا لے مگر یہ بکری جیسی شکل بدل نہیں سکتی۔ ایسی ہی حسین مورت ہوتی تو کاہے کو اب تک یوں گھر میں پڑی سڑ رہی ہوتی؟ بشریٰ تیری گودوں کی کھلائی ہوئی تھی۔ آج کل میں خیر سے گھر باروالی بھی ہو جائے گی اور تیرے نصیب...... مجھے تو لگتا ہے کہ یونہی سوئے کے سوئے رہیں گے۔ دو بج گئے...... میری آنتیں حلق کو آ رہی ہیں۔ بھوک کے مارے اب بس بھی کر۔'' سلمیٰ بیگم کا یہ طعنہ ثمر کے کلیجے کو چھلنی کر دیتا تھا۔ اب کہ وہ بھی بھڑک اٹھی۔

''امی......! مجھے یہ شادی نہ ہونے کا طعنہ مت دیا کریں، بھلا خوبی ہی کیا ہے اس چڑیل بشریٰ میں...... منہ پھٹ...... بدتمیز اِک ذرا سی شکل اچھی ہے جو ساری خامیاں چھپا لیتی ہے، انٹر بھی نصیب نہیں ہوا، بڑا کہتی ہیں ساس کہ گریجویشن کرواؤں گی۔ اب شادی کے بعد کیا خاک پڑھے گی اور آپ تو جتنا فخر کریں کم ہے، خاندان کی واحد تعلیم یافتہ لڑکی ہوں میں۔'' اس نے اترا کر کہا تھا۔ ثمر کو اپنی تعلیم پر بڑا ناز تھا۔ خاندان کے عام اور کم تعلیم یافتہ لڑکے اس کی نگاہوں میں نہ سماتے تھے۔ اس نے آنکھ کھلتے ہی اپنے گھر میں معاشی بدحالی دیکھی تھی۔ سو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ اونچا گھرانا بھی اس کے معیار میں شامل تھا۔ بیٹی کے اعلیٰ معیار کے سبب سلمیٰ بیگم کی اپنے بڑے بھائی بھاوج سے اچھی خاصی بگڑ چکی تھی۔ ثمر، عبدالقدیر کی ٹھیکرے کی مانگ تھی مگر چار حرف پڑھ کر دس جماعتیں پاس، عام سی شکل صورت والا عبدالقدیر اس کی نگاہوں میں نہ سمایا۔ اس کے رعونت سے کیے گئے انکار کے سبب ہی بچپن سے جُڑا یہ رشتہ ختم ہوا تھا۔

ثمر ان سب کو نیچا دکھانے کے لیے اونچے گھرانے میں رشتے کے خواب دیکھتی تھی مگر اونچا گھرانا تو دور کی بات یہاں تو سرے سے رشتہ ہی ملنا دشوار تھا۔ یہ تو سلمیٰ بیگم ہی جانتی تھیں کہ آج کل لڑکے والوں کے مزاج اونچے ہیں ثمر جیسی معمولی شکل کی لڑکیوں کو کون گھاس ڈالتا ہے اس کے حسبِ معیار رشتہ ڈھونڈنے میں انہیں دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات...... سلمیٰ بیگم جواباً اسے پھر سے لتاڑنے کو تھیں کہ ان کی بڑی بھاوج روشن آرا ہانپتی کانپتی چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں بھاری بھرکم سوٹ کیس تھا۔

''گھنٹا بھر ہو گیا...... دروازے کی گھنٹی بجاتے بجاتے یہ دھیان ہی نہیں رہا کہ گرمیوں میں تو سارا سارا دن بجلی غائب رہتی ہے اور تمہارے گھر میں جنریٹر یا یو پی ایس بھی کہاں ہوگا۔'' روشن آرا کے غرور بھرے انداز پر ثمر کھول کے رہ گئی۔ اسی کھولن میں اس نے بڑی مامی کو سلام تک نہیں کیا جو یونہی بات، بات پر اپنا نو دولتیا پن عیاں کرنے کی عادی تھیں۔

بجلی واقعی نہیں تھی۔ ان کی یوں اچانک آمد پر سلمیٰ بیگم گڑبڑا اٹھی تھیں۔ اسی گڑبڑاہٹ کے ساتھ وہ اٹھ کر بھاوج کی پزیرائی کو آگے بڑھی تھیں۔ مگر وہ نخوت سے صحن میں بچھی چارپائی پر ہی بیٹھ گئیں اور بیٹی کی جانب دیکھا۔

''اے ثمر...... کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے، جا، جا کے شربت گھول کے لے آ......'' ان کے مخاطب کرنے پر روشن آرا نے چونک کر یوں ظاہر کیا جیسے ثمر

پر ابھی نظر پڑی ہو۔ اس کی گھنٹا بھر کی تیاری رنگ لائی تھی۔ سیاہ و سرخ بارڈر، والے سوٹ میں وہ خاصی جاذبِ نظر لگ رہی تھی۔ اسے لمبے بالوں کا از حد شوق تھا۔ سو لمبی سی مصنوعی چوٹی خوب کس کر گوندھ رکھی تھی اور خاصی دلکش بھی نظر آ رہی تھی مگر روشن آرا نے اسے بے عزت کرنے کا نکتہ ڈھونڈ ہی لیا۔

''ماشاء اللہ! بال تو بڑے لمبے جا رہے ہیں۔ کون سا شیمپو استعمال کر رہی ہو؟'' اس سے پہلے کہ وہ بڑی ممانی کو ٹکڑا توڑ جواب سے نوازتی، سلمیٰ بیگم نے شربت کی یاددہانی کروا کر اسے منظر سے ہٹانا چاہا تھا اور وہ منظر سے ہٹ گئی تھی۔ مگر روشن آرا نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''بس زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی، سوچا چلتے چلتے...... تمہیں بھی سارا سامان دکھا دوں۔'' انہوں نے فخریہ انداز میں اٹیچی کیس کھول کر ایک، ایک چیز دکھانی شروع کی۔ منیب الرحمٰن کے گھر بھر کے جوڑے تھے۔ سونے کا سیٹ اور چاندی کی پاؤ بھر کی پازیبیں بشریٰ کے لیے اور لڑکے کی سلامی کے لیے رولیکس گھڑی...... روشن آرا کو یونہی خودنمائی کی عادت تھی۔ ان سے کون پوچھتا کہ اکلوتے دیور کے گھر کی پہلی خوشی میں اتنا کچھ نواز کر وہ کس پر احسان فرما رہی ہیں۔ ان کے دو بیٹوں کی شادی پر منیب الرحمٰن نے بھی تو انہیں حیثیت سے بڑھ کر نوازا تھا۔ روشن آرا کو زبردستی کا ٹھینگا دوسروں پر رکھنے کی عادت تھی نو دولتیوں کے وتیروں کے عین مطابق وہ دوسروں کے لین دین پر نظر رکھتیں اور کمی بیشی پر آنے بہانے سے منہ پھوڑ کر مانگنے میں شرم بھی نہ کرتیں اب بھی اپنی ایک، ایک چیز کی بھرپور نمائش کر کے انہوں نے سلمیٰ بیگم سے بشریٰ کو دیے جانے والے تحفے کی بابت پوچھا تو سلمیٰ بیگم کھسیا کر رہ گئیں۔ ایک اعلیٰ گھرانے میں بھتیجی کا رشتہ طے کروا کے اپنی دانست میں انہوں نے عاصمہ کی سات پشتوں پر احسان کیا تھا۔ اس کارنامے پر تو وہ اعزازات و مراعات کی مستحق تھیں کجا کہ ... دلانے کے بکھیڑوں میں پڑ کر اپنی جان کو ... پھرتیں۔ پہلے تو ان کا ارادہ تھا کہ قسطوں پر ٹی وی کر دے دیں گی مگر یہ بھی تھا کہ کہیں سے لے کے اگر وہ ایڈوانس بھی دیتیں تو ماہانہ قسط کی ادائیگی کیونکر ہو پاتی پھر رشتے کے معاملے میں عاصمہ نے جس طرح ان کی حق تلفی کی تھی، ان کا دل جل کر خاک ہو گیا تھا۔ عاصمہ ایسی گئی گزری بھی نہ تھیں کہ بات پکی ہونے پر ایک جوڑے پر ہزار دو ہزار رکھ کر نہ دے سکتیں۔ لہٰذا انہوں نے بھی کلر ٹی وی دینے کے خیال پر چار حرف بھیج دیے تھے۔

''ایک پلاسٹک کا ڈنر سیٹ ہے بھابی اور لڑکے کو سلامی میں نقد دے دوں گی۔'' روشن آرا نے ناک بھوں چڑھا کر ان کا ادنیٰ سا نیوتا سنا تھا۔

''تمہارے بھائی بولے پچیس ہزار منیب الرحمٰن کے ہاتھ پر رکھیں گے صرف سلامی کے نام پر اب چاہے منیب الرحمٰن کھورے میں ڈالیں یا داماد کو دیں۔ روپے پیسے سے ہی امداد ہوتی ہے تحائف تو دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اگر ایک کی جگہ دو آ جائیں تو......؟'' انہوں نے گردن اکڑا اکڑا کر اپنی سلامی کے بارے میں بتایا مگر ساتھ ہی نند کے تحفے کو رگیدنا نہ بھولی تھیں۔

''ارے دو بج گئے ہیں تم لوگ اب نکلو گے تو پہنچو گے کب؟ پھر وہاں جا کر کہنا کہ کھانا بھی نہیں کھا کے آئے۔'' روشن آرا نے پھیکا سیٹھا شربت ناک بھوں چڑھا کر پیا اور جاتے جاتے طعنہ زنی کرنا نہ بھولیں۔

''ہونہہ...... ! بڑی کمائیاں آ رہی ہیں ناں جیسے...... آسمان سے ہن برس رہا ہے میرے گھر پر...... پرانی عادت ہے کسی کو کچھ دیں گی تو ہزار جگہ گائیں گی اور دکھائیں گی، اوچھی کہیں کی...... جس نے نہ دیکھے دو اس نے دیکھ لیے سو۔'' ان کے جاتے ہی وہ بڑبڑائی تھیں۔

روشن آرا منیب الرحمٰن کے گھر پہنچیں تو قرآن خوانی ختم ہو چکی تھی اور اب محفلِ میلاد کا آغاز ہونے کو تھا۔ انہوں نے پہنچتے ہی کچن میں جھانکی ماری اور دیورانی سے پہلا سوال یہی کیا۔

''دوپہر میں کیا پکایا تھا دلہن؟'' عاصمہ مہمانوں کے لیے چائے دم دے رہی تھیں۔

''آلو گوشت تھا بھابی جان۔'' عاصمہ نے اپنے ازلی مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ روشن آرا نے چشمہ درست کر کے دیگچے کا ڈھکن ہٹا کر جائزہ لیا۔ کافی سارا سالن بچا ہوا تھا۔

''کھانا تو سب نے کھا ہی لیا ہوگا، یہ باقی کا سالن برتن میں ڈال کر فریج میں رکھ دو۔ وہ جنم جنم کی بھوکی آ رہی ہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت ہے آ کے بیٹھ جائیں گی اماں بیٹی...... مہارانی بن کر...... ہاتھ پاؤں ہلائے نہیں جاتے، بس حکم چلانا آتا ہے۔ اب دوپہر ڈھلنے کو ہے، کسی آئے گئے کو کھانے کا پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ شادی بیاہ کے گھر میں رشتے داروں کو دو چار دن پہلے کام ہلکا کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے نہیں۔''

عاصمہ خوب سمجھتی تھیں کہ جیٹھانی کے نشانے پر کون ہے۔ وہ جز بز سی ہو کر رہ گئیں۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے سب ہی کے لیے پکوایا تھا اور خصوصاً سلمیٰ بیگم تو کسی بھی وقت آ ئیں، انہیں کھانا درکار ہوتا تھا مگر روشن آرا کے کہنے پر انہوں نے کمالِ سعادت مندی سے ان کے حکم کے عین مطابق بقیہ سالن ڈش میں نکال کر فریج میں رکھ دیا۔

روشن آرا مطمئن ہو کر اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گئیں اور سب سے پہلے پاندان کی خبر لی جو عاصمہ نے پہلے ہی سے دھو مانجھ کر اور بھر بھرا کر رکھ دیا تھا۔

''سمجھ رہی ہو ناں میری بات! کان میں روئیاں ٹھونس کر رکھو۔ دنیا کسی حال میں دوسرے کو خوش نہیں دیکھ سکتی۔ انسان کو اپنے مقدر کے دکھ سکھ خود ہی بھگتنے ہوتے ہیں اور یہ سسرالی رشتے...... اللہ بچائے...... ان کے لیے تو جان بھی نکال کر رکھ دو تو صلہ دینے والے نہیں ہوتے۔''

صفیہ کی ایک، ایک بات عاصمہ کے دل کو چھو رہی تھی۔ سچ ہی تو تھا کہ ان کی زندگی پر ان کا اپنا اختیار تو تھا ہی نہیں۔ ان کا وجود تو بس دوسروں کی جی حضوری کے لیے وقف ہو کر رہ گیا تھا۔ تب بھی صلے میں ہمیشہ لعن طعن ہی نصیب ہوئی تھی۔ اس میں خود عاصمہ کا بھی کیا قصور کہ منیب الرحمٰن کا نمبر بہن بھائیوں میں سب سے آخری تھا اور ان کی اہلیہ ہونے کے ناتے زمانے بھر کی اطاعت و فرمانبرداری ان کا نصیب بن گئی تھی مگر صفیہ بھی سچ ہی کہتی تھی دنیا کو ہم کبھی کسی حال میں خوش نہیں رکھ سکتے۔ عاصمہ کی تمام کی تمام تابع داری پر منٹوں میں پانی پھر جایا کرتا تھا۔ اس نے اضافی برتن اور بستر وغیرہ پہلے ہی نکال رکھے تھے۔ اب چائے کے لیے مزید کچھ برتن درکار تھے۔ صفیہ گول سینی میں کئی کپ اوندھے کر کے رکھتے ہوئے انہیں بڑے گاڑھے فلسفے سے نواز رہی تھی۔ جس کا لُبِ لباب یہ تھا کہ ''سنو سب کی مگر کرو اپنے من کی۔ کانوں میں روئیاں ٹھونس رکھو۔ چھوٹا ہو یا بڑا کسی کو زیادہ لفٹ کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

غزل

رات کے پہر تمہیں سوچتے سوچتے سو گیا ہوں میں
کیا تھا اور پیار میں کیا ہو گیا ہوں میں
اترا تھا محبت کے سمندر میں کوئی اپنا ڈھونڈنے
بے وفائی کے طوفاں کی نذر ہو گیا ہوں میں
سکوں تو تمہیں بھی نہ ملا ٹھکرا کر مجھے
تمہارے دل میں بھی پیار کا بیج بو گیا ہوں میں
چاند میں دیکھتا رہتا ہوں شب بھر عکس ترا

شاعرہ: درخشاں ضیا، حیدر آباد

صفیہ کی ہدایات سے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے عاصمہ نے اس کی ساری ہدایات پلّو سے باندھ لی تھیں۔ میلاد اور رسم مایوں خیر سے انجام کو پہنچے مگر اس دوران عاصمہ کے کانوں میں مختلف جملے گردش کرتے رہے جو کبھی مذاق اڑانے والے ہوتے تو کبھی طنز کے تیر...... روشن آرا بیگم بڑی بنی حکم پہ حکم چلا رہی تھیں۔ دونوں نندیں اور جیٹھانی مع اہل و عیال براجمان تھیں اور کام کرنے کے لیے صرف عاصمہ یا پڑوسن صفیہ...... ایسے میں صرف ثمر کبھی کبھی رکھنے اٹھانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

اگلے دن دولھا کے گھر مہندی تھی۔ جواد کے گھر میں مہندی کی تقریب کے لیے نہایت اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے گئے تھے۔ ان سب کا استقبال بھی شاندار طریقے سے کیا گیا۔

یہ عقل مندی کی گئی کہ پہلے کھانا کھلایا گیا پھر جواد کو رسم کے لیے اسٹیج پر لایا گیا تو اس کے چہرے پر گہری متانت اور سنجیدگی تھی۔ سالیوں نے مہندی لگا کر اس کی انگلی تھامی تھی تو ہزار، ہزار کے منہ مانگے نوٹ ان کی ہتھیلی پر آن ٹھہرے۔ ان سالیوں میں عاصمہ کی جیٹھانی روشن آرا کی بھانجی بھی شامل تھی۔ جسے خاص طور پر انہوں نے شادی کے لیے بلوایا تھا تاکہ اس کا بھی کسی کے ساتھ نصیبا کھل جائے۔ بشریٰ کی شادی کے طفیل سہی...... سالیوں کی چھیڑ خوانی پر جواد کے تیور بگڑے تھے مگر بہ مشکل جواد کو سمجھا بجھا کر اسٹیج پر بیٹھے رہنے کے لیے آمادہ کیا مگر اس کے بگڑے تیور نہ سنبھل سکے۔ پھر بقیہ رسم جلدی، جلدی بھگتائی گئی۔ پھر کسی کو جواد سے ہنسی مذاق کی جرأت نہ ہو سکی مگر بھرے پنڈال میں یہاں سے وہاں تک سرگوشیاں ہی سرگوشیاں پھیلتی چلی گئیں۔

''لڑکا تو بڑا مزاج دار ہے، ناک پر مکھی بیٹھنے کا روادار نہیں۔''

''توبہ...... توبہ...... ایسا غصہ...... کیسی خطرناک نظروں سے گھورا، بے چاری ماہین کو، وہ منہ... کروا رہی تھی اور ہنسی مذاق تو سالیوں کا حق بنتا...

''اللہ رحم کرے بشریٰ پر...... ساری ز... شوہر کی تیوریوں کے بل ہی گنتے گزرے گی۔''

''خیر...... اپنی بشریٰ بھی کوئی کم نہیں ہے۔ اس... زبان کو لگام ہی کہاں ہے۔ میں تو کہتی ہوں بشریٰ ہے ہی اسی لائق۔ بڑی کتر کتر زبان چلتی... اب ٹکرایا سیر کو سوا سیر۔'' کسی دل جلی کے کلیجے... ٹھنڈک پڑی تھی۔

''سسرال چیز ہی ایسی ہے، لمبی لمبی زبانیں بھی... سے لگ جاتی ہیں۔ جواد کے مزاج سے تو لگتا ہے کہ... کی ہنکار پر بھی زبان کھینچ کر ہتھیلی پر دھر دے گا۔''

غرض جتنے منہ، اتنی ہی باتیں، عاصمہ سارے تبصرے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی تھیں۔ اگرچہ ذرا سی بات پر جواد کا یوں رد... انہیں بھی پسند نہیں آیا تھا۔ پل بھر کے لیے ان کا... اندیشوں اور واہموں کی زد میں آ گیا تھا۔ یوں لگا... ان کی بیٹی بھی ان ہی کی طرح قسمت لکھوا کر... ہے۔ اس کے نصیب میں بھی سسرال کی جی حضوری اور قدرنا شناسی ہی ہے مگر انہیں اپنی تربیت پر ناز تھا۔ صولت آپا کی ڈانٹ پھٹکار کے بعد سے وہ وقتاً فوقتاً بشریٰ کو بٹھا کر اونچ نیچ، سسرال بھگتنے کے آداب سمجھایا کرتی... اور سب سے بڑھ کر حکم زبان بندی کہ انسان کی زندگی... کے کئی آزار اسی زبان کے مرہون منت ہوتے ہیں... ان کی زندگی سسرال پرستی کا نمونہ رہی تھی...... انہوں نے بیٹی کو بھی اسی کا درس دیا تھا مگر اب بیٹی... مات کھا بیٹھی تھیں یا پھر دوسروں کی باتوں میں آ... اپنے ازلی چلن سے پھرتی چلی جا رہی تھیں۔

مہندی کی رسم بھگتا کر اسی رات، رت جگے... پروگرام تھا...... گلگلوں کے لیے کڑاہی چڑھائی... مرحلہ آیا تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے... ناچار عاصمہ کو ہی کچن میں کھڑا ہونا پڑا...... ان... تھکا تھکا سا تھا۔ کام کی زیادتی سے بار بار ان کے اندر غبار سا بھر جاتا۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا کسی سے رتی بھر کام کا سہارا نہ تھا۔ میکے سے آئے گھرانوں میں بھاوجیں اور بیاہی، بن بیاہی بھتیجیاں تھیں جو کسی حد تک ہاتھ بٹا دیتیں۔ اِدھر صفیہ، عاصمہ کی ایک ہی پکار پر کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی اور عاصمہ کو کچن میں آ کر کھڑا پایا تو اس کے تلوؤں سے لگی تو سر پر بجھی۔ خوب ہی لتے لیے۔

''یہ کوئی تمہارے کرنے والے کام ہیں؟ یہ جو... آیا بیٹھا ہے یہ صرف گانے بجانے کے لیے ہے؟ یا فیشن کرنے کے لیے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا ان لوگوں نے ہاتھ پاؤں کچھ نہیں ہلانے۔ بس باتیں ہی بنانی ہیں اور تم بات بات پر رونے نہ بیٹھ جایا کرو، جیسے تمہارے منہ میں زبان ہی نہیں۔''

☆☆☆

آج بارات کا دن تھا اور ساری رات رت جگا کر کے جو صبح اذانوں کے بعد پڑ کے سوئے تو بس چند گھنٹے کی ہی نیند لے سکے تھے۔ بجیا اور روشن آرا سحر خیز تھیں۔ خواہ کسی بھی وقت سوئیں، جاگتے ہی وہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ جاتیں اور عادت کے مطابق نکتہ چینیوں کا آغاز ہو جاتا۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔

''رات بریانی کا گوشت لگ گیا تھا۔''

''بری میں چوڑیوں کے سیٹ کچھ کم نہیں آئے؟''

''بری کا میوہ اب تک کیوں نہیں بانٹا گیا؟''

''ارے دستور کے مطابق دلہن کے ساتھ پھوپی سدھارتی ہے۔'' وہ دونوں سر جوڑ کے ان ہی نکات پر غور و خوض کر رہی تھیں اور پھر از خود ہی طے کر لیا کہ بڑی پھوپی ہونے کے ناتے رات رخصتی کے بعد بشریٰ کے ساتھ بجیا ہی سدھاریں گی اور آج روشن آرا اپنے ہاتھوں سے بری کا میوہ اور پہناونیں سب کو جوڑے تقسیم فرمائیں گی۔ عاصمہ علی الصباح ہی جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ آج بارات کا دن تھا اور سارے گھر میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ سب ہی سوئے پڑے تھے۔ روشن آرا نے دس بجتے ہی اودھم مچا دیا تھا۔ تیاری کے نام پر کاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ سب ہی ہڑبڑا کر جاگ اٹھے تھے۔ روشن آرا نے ایک، ایک کر کے سب لڑکیوں کو جگایا تھا۔

''اری لڑکیو! تم میں سے کوئی اٹھ کر کچن کی خبر لے۔ یہ سارا کا سارا ریوڑ اٹھ کر کیا خاک پھانکے گا؟'' دن چڑھ آیا تھا۔ عاصمہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ منیب الرحمٰن، سبطین اور کاشف بھی غائب تھے پھر اللہ اللہ کر کے ناشتے کا آغاز ہوا۔ ناچار ثمر کو کچن کی خبر لینی پڑی۔

بقر عید کے بعد

بہت ہی مزہ آیا بقر عید کے بعد
ہر گھر میں گوشت ہی گوشت ہے بقر عید کے بعد

درخت میں لگے تھے کچے پپیتے بہت
ایک بھی نہ پکا کھا سکے بقر عید کے بعد

ریسٹورنٹ اور باربی کیو سارے ہیں اب خالی
ہر گھر میں دعوت ہو رہی ہے بقر عید کے بعد

اپنا ہی مزہ ہوتا ہے کولڈ ڈرنک پینے کا
کولڈ ڈرنک اب ملتی ہے ران روسٹ کے بعد

پیٹ بھی ہے اپنا اور گوشت بھی ہے اپنا
اس روسٹ کو ہضم کیجیے اب ہاجمولا کے بعد

پارک گھر سے قریب ہوں تو لگتے ہیں کتنے پیارے
چہل قدمی ضروری ہے بقر عید کے بعد

شاعرہ: شمسہ رضوان...... گلستانِ جوہر، کراچی

پھر کسی طرح خبر لگی کہ منیب الرحمٰن، سبطین اور کاشف صبح ہی سے شادی.... ہال کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں مگر جب وقت آیا دوپہر کے کھانے کا تو ساری کی ساریاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ گرمی کی شدت تھی اور بجلی بار بار دغا دے جاتی تھی۔ سب ہی کو پریس کی پڑی تھی اور پریس ہو بھی رہی تھی۔ بشریٰ ماموں کی بیٹی سحر کے ہمراہ بیوٹی پارلر سدھار چکی تھی۔ ہاتھ پیر ہلانے کی تو وہ سب قائل نہ تھیں کچن کے انتظامات کی امید عاصمہ سے نہ رکھی جاتی تو شاید مل ملا کے کچھ کر بھی لیتیں مگر دوپہر کے دو بج گئے۔ عاصمہ کی صورت کا دیدار نصیب نہ ہو سکا تو سب کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھنے لگیں۔

اس دوران بار بار یہ نکتہ اٹھتا رہا کہ آخر عاصمہ گئیں کہاں؟ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اللہ اللہ کر کے عاصمہ کی آمد ہوئی۔ گرمی سے تپتا چہرہ...... پسینے سے تر وجود...... بکھرے بال، وہ آتے ہی چادر ایک طرف ڈال کر بڑے کمرے کے صوفے پر ڈھیر ہو... گئیں۔ ہال کمرے کے کونے میں پاندان کے سامنے بیٹھی روشن آرا نے پان چھانٹتے ہوئے بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے دیورانی کو دیکھا تھا اور بنا اس کی ناگفتہ بہ حالت کا احساس کیے چھوٹتے ہی شروع ہو گئیں۔

"شاباش ہے دلہن تمہاری ہمت کو...... صبح ہی صبح بغیر کسی سے کچھ کہے سنے چادر اٹھا کر جو نکلیں تو اب کی خبر لائیں۔ تمہیں تو اپنے گھر آئے مہمانوں کے کھانے پینے تک کا خیال نہیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے مگر تمہیں اپنے سیر سپاٹوں سے ہی فرصت نہیں۔ گھر بھر کو بھوکا مار ڈالا تم نے۔"

تپتی جھلستی دھوپ سے اب تک عاصمہ کا دماغ کھول رہا تھا۔ ان کے تلووں سے لگی تو سر پر بجھی۔ وہ تڑخ اٹھیں۔

"کیوں بھوکے مر گئے سب؟ فریج بھرا پڑا تھا، کچن میں راشن کا سارا سامان موجود تھا۔ ان سا... لڑکیوں کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے ہیں کیا؟ یا یہ ہاتھ... ہاتھ دھر کر مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے تم... سے آئی بیٹھی ہیں۔"

روشن آرا کو دیورانی سے ایسے ٹکڑا توڑ جواب... امید کہاں تھی۔ ان کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں... بجیا نے آگے بڑھ کر بات سنبھالنی چاہی تھی۔

"بھابی جان کا یہ مطلب نہیں تھا عاصمہ......"

مگر عاصمہ کے دل کو تو سیر سپاٹے کا لفظ ٹھک کر... تھا۔ دوپہر ڈھل گئی تھی انہیں لور لور پھرتے...... نے پانی کا گھونٹ تک نہ پوچھا تھا اور الٹا شکل دیکھ... ہی جوتیاں برسانی شروع کر دی تھیں۔ کل سے بشریٰ... کی سسرال سے فون پر فون آ رہے تھے کہ دلہن کا ک... سجانا ہے اور ابھی تک فرنیچر والے نے فرنیچر نہیں... دیا۔ منیب الرحمٰن تو دونوں بیٹوں کے ہمراہ شادی ہا... کے انتظامات کا جائزہ لینے نکل کھڑے ہوئے تھے... خود فرنیچر والے کے سر پر جا کر سوار ہوئیں۔ فرنیچ... وصول کر کے بشریٰ کی سسرال پہنچایا اور جہیز کا بقیہ... سامان بھی...... کلر ٹی وی کا وعدہ سلمیٰ بیگم نے کر رک... تھا مگر عین وقت پر پلٹ گئیں اور ڈنر سیٹ دے ک... جان چھڑائی تھی۔ اب عاصمہ بیگم کا بجٹ بھی منہ چ... رہا تھا جیسے تیسے کر کے دو تین چیزوں کی کمی پوری کر... کے سارا جہیز پہنچا دیا گیا تھا مگر اسی بات پر بجیا سمیت سب کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں۔

"ہائیں جہیز کا سامان پہنچا بھی دیا گیا بنا کسی ک... دکھائے بتائے بغیر۔" وہ تو حق دق رہ گئیں۔

ان کا خیال تھا کہ جہیز سجایا جائے گا وہ اپنے... خاندانی دستور کا پرچار کرتے ہوئے بھرپور نکتہ چینی... کے ہمراہ جو کمی بیشی ہوگی کھڑے ہو کر وہ پوری... کروائیں گی۔ عاصمہ کے لیے یہ امکان نیا نہیں تھا... مگر اپنا غبار نکال کر اب وہ قدرے شانت تھیں۔ خوب... جانتی تھیں کہ جہیز سجا کر بھی ملامت کے ڈونگرے ی...

نصیب ہونے تھے۔ لہٰذا بنا کسی نمود و نمائش کے بالا ہی بالا جہیز پہنچانے کی جانے کب سے ٹھانے بیٹھی تھیں۔ جیٹھانی سے بھی یہ معاملہ ہضم نہیں ہو رہا تھا کہ سدا ان کے سامنے سر جھکائے رکھنے والی مؤدب دیورانی اچانک ایسی بے لگام ہو گئی، ان کی لمبی زبان اور ہٹ دھرم روش سے پہلی بار ان کا سابقہ پڑا تھا۔ پل بھر میں جیسے غبارے کے مانند ان کی ہوا نکل گئی تھی۔ اپنی حیثیت اور بڑے پن کا غرور خاک میں ملتا نظر آنے لگا۔ ان کے جبڑے بھینچ سے گئے تھے۔ وہ بمشکل ضبط کا دامن تھامے بیٹھی تھیں۔

"عاصمہ! جہیز بے شک نہ سجایا جاتا مگر کمی بیشی پر مشورہ تو دیا ہی جا سکتا تھا بڑے بوڑھے آخر ہوتے کس لیے ہیں؟ خیر کوئی بات نہیں۔ تمہاری مرضی...... بڑے کو بڑا سمجھ لیا جائے تو چھوٹے مزید چھوٹے نہیں ہو جاتے۔ بھتیجی کی شادی کے لیے کچھ ارمان تو ہم نے بھی اپنے دلوں میں پال رکھے ہیں۔ تمہیں برا مشورہ تو نہیں دیں گے، کیا حرج ہو جائے گا اگر پہناؤنیوں کے جوڑے، بری کا میوہ بھابی جان کے سامنے رکھ دو...... وہ اپنے ہاتھوں سے بانٹ دیں گی۔ دو دن ہو گئے اِدھر اُدھر پڑا سڑ رہا ہے۔" بجیا، بڑی بھاوج کی تیز مزاجی سے واقف تھیں۔ ڈر تھا کہ وہ اب پھٹیں کہ تب پھٹیں۔ سو نرمی سے معاملہ رفع دفع کروانے پر تلی تھیں۔ یہ اور بات کہ روشن آرا کی اس عزت افزائی پر ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"ہونہہ بڑا بہناپا دکھاتی تھی ناں دیورانی سے۔ نندوں کو تو سدا کونے میں کھڑا کیے رکھا کہ ان کی اولاد کا ددھیال الگ ہے۔ دیور اور اس کی اولاد سے لہو کا رشتہ ہے اور اب وہی دیورانی کیسی عزت افزائی فرما رہی تھی۔ کیا خوب اتفاق و التفات تھا دونوں گھرانوں میں اور اب تو بس عاصمہ کے جوتی اتارنے کی کسر رہ گئی تھی۔"

"کیوں...... ؟ بری کا میوہ...... پہناؤنیوں کے جوڑے کیا کسی کو کاٹ کھا رہے ہیں جو میں جلد از جلد منہ پر مار کر اپنی جان چھڑاؤں؟ ابھی بیٹی باپ کے گھر بیٹھی ہے پہلے اسے بھگتانے کی ذمے داریاں نہ نبھائیں؟" عاصمہ نے تلملا کر ایک بار پھر جیسے ان کی بات رد کی۔ اور جیسے در پردہ روشن آرا کے منہ پر جوتا ہی دے مارا۔ روشن آرا پر گھڑوں پانی پڑتا چلا گیا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ ان کی آنکھیں چوپٹ کھل گئی تھیں۔ بدتمیزی و ہٹ دھرمی کے اس عظیم مظاہرے پر دل کسی طرح اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ وہی عاصمہ ہے۔ سسرال پرستی جس کا روز اول سے چلن تھا۔ خصوصاً ان کے سامنے تو عاصمہ کو کبھی دم مارنے کی بھی جرأت نہ رہی تھی اور اب اس کی بد زبانی اور ہٹ دھرم روش! الامان الحفیظ...... اسی روش کے سبب وہ جیسے مایوں والے دن سے کونے میں بیٹھی تھیں مگر عاصمہ آج پھٹ پڑی تھیں۔ روشن آرا کا بس نہ چلا کہ ابھی کے ابھی سارا سامان سمیٹ کر بیٹوں اور بیٹیوں سمیت اٹھ کر گھر کی راہ لیں اور کبھی پلٹ کر دیور کے گھر کی طرف بھی نہ دیکھیں۔ عاصمہ اب تک منہ پر انگلی رکھ کر ساری نکتہ چینیاں سنتی چلی آئی تھیں۔ یہ نکتہ چینیاں ان کے لیے بعید از امکان یا نئی نہیں تھیں مگر اب اپنی سی کر کے اک عجیب فتح مندی اور شادمانی کا احساس ان کے اندر سکون اتارتا چلا گیا.... اب بھی وہ نخوت سے سر جھٹک کر کمرے سے نکلتی چلی گئیں، روشن آرا کو جیسے ہزاروں والٹ کا کرنٹ لگا تھا، وہ اب تک شاکڈ کی سی کیفیت میں تھیں۔ انہیں اپنا بلڈ پریشر گرتا ہوا محسوس ہوا تو وہ بے وقت ہی دوائیں کھا کر منہ سر لپیٹ کر پڑ گئیں اور پھر شام تک ان کا موڈ بحال ہو کے نہ دیا۔ بجیا سمیت بہو بیٹے سب ہی ان کے آگے پیچھے پھرتے رہے مگر عاصمہ نے جیسے بھرے مجمعے میں انہیں جوتے لگائے تھے... ان کے دل سے یہ آزار

مٹ کے نہ دے رہا تھا۔ سب کے منانے اور منتیں ترلے کرنے پر وہ تیار ہو کے شادی ہال تک تو آ گئیں مگر کیا مجال جو عاصمہ کی جانب رخ دے کر بات بھی کی ہو۔ صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ کر یا سمدھیانے کا خیال کر کے پہلے پہل تو عاصمہ نے ان کے آگے پیچھے پھر کر ان کا بگڑا مزاج اعتدال پر لانے کی کوشش کی مگر پسپائی بالآخر عاصمہ کا مقدر ٹھہری۔ بارات آ گئی تو وہ اس جانب متوجہ ہو گئیں۔ بارات کے استقبال کی خاطر لڑکیوں کی قطار ہاتھوں میں مٹھائی کی پلیٹیں اور ہار تھامے شادی ہال کے داخلی دروازے پر تھی اور ثمر ان میں سب سے نمایاں لگ رہی تھی۔

عنابی لش لش کرتے لہنگے میں لمبا سارا سنہری پراندہ ڈالے، ہاتھ بھر بھر چوڑیاں پہن کے شادمانی سے مسکراتی وہ روشن آرا کو زہر سے زیادہ بری لگی۔ مووی لائٹس کی تیز روشنی میں اس کا سلونا روپ دمک اٹھا تھا۔ چہرے پر ملاحت بکھر گئی تھی۔ ثمر پر ایک نظر ڈال کر ہی روشن آرا کی جان جل کر خاکستر ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک کونے میں لے جا کر بھانجی کے کان اینٹھے تھے۔ جسے خاص طور پر بجیا کے لڑکوں کو شیشے میں اتارنے کے لیے بلوایا تھا۔

''تجھ سے کتنی بار کہا ہے کہ ذرا بڑی آپا کے آگے پیچھے پھر لیا کرو، ذرا اپنی شکل اور عمر پر غور کر۔ کون بیاہنے آئے گا تجھ چمارن کو؟ گھر بیٹھے بیٹھے بڈھی کھوسٹ ہو جائے گی اگر یہی مزاج رہے تو......''

منور جو انہی کی بھانجی تھی۔ یوں بھرے پنڈال میں اپنی بے عزتی اسے ایک آنکھ نہ بھائی...... اسے خالہ کی اس بات پر پتنگے لگ گئے تھے اپنے مخصوص اکھڑ اور گنوار لہجے میں وہ بولی۔

''نہ تو مجھے کیا پڑی ہے ہر ویلے خالہ جی کے آگے پیچھے پھرنے کی اور خالہ...... !ایسے کوئی لعل نہیں جڑے ہیں ان کے بیٹوں میں...... ہوں......''

وہ تنک کر اپنا لمبا سا پراندہ جھلاتی آگے بڑھ گئی تو روشن آرا کھولتی ہوئی دوبارہ بجیا کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ بارات آ چکی تھی۔ خوب پٹاخے چھوڑے گئے۔ آتش بازی ہوئی اور شایانِ شان استقبال کے بعد بارات کے ساتھ آنے والے لوگ شادی ہال میں سجی کرسیوں پر آ کر بیٹھنے لگے۔ صولت آپا اپنی ازلی خوش مزاجی اور خلوص کے ہمراہ روشن آرا اور بجیا کے ساتھ والی کرسی پر آن بیٹھی تھیں اور محبت سے سلام دعا کے بعد ان کی احوال پرسی کرنے لگیں۔ روشن آرا رسمی سے جوابات سے انہیں نواز کر کمال بے اعتنائی سے رخ موڑ کر بیٹھ گئیں۔

عاصمہ کی نظریں صولت آپا پر ہی تھیں وہ جیٹھانی کے مزاج کو بھانپتے ہوئے اُدھر ہی منڈلا رہی تھی۔ روشن آرا کے یوں رخ پھیرنے پر انہوں نے بلا کی سمجھداری اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چند مہمانوں سے ملوانے کے بہانے صولت آپا کو اُدھر سے اٹھایا تھا اور سب سے ان کا تعارف کروانے لگیں۔ اس بار صولت آپا فراغت پا کر اپنی کسی رشتے کی نند کے برابر والی نشست پر جا بیٹھیں جو چشمہ درست کر کے باریک بینی سے ایک جانب دیکھ رہی تھیں۔

''صولت ! یہ لڑکی کون ہے؟ کچھ اتا پتا ہے؟'' صولت آپا نے ان کی نظروں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں اور ان کی نظر سر تا پا لش لش کرتی ثمر پر جا ٹھہریں۔

''یہ...... یہ تو سلمٰی آپا کی بیٹی ہے۔'' انہوں نے ذہن پر زور ڈالا تو یاد آ گیا کہ کل مہندی کی تقریب میں ہی تو سلمٰی بیگم نے اس کے لیے کوئی بھلا سا رشتہ نظر میں رکھنے کی تاکید صولت آپا کو کی تھی۔

''ماشاء اللہ بڑی پُرکشش ہے۔'' خاتون کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ صولت آپا چونکی ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔

''کچھ تعلیم وغیرہ کا بھی پتا ہے کہ کتنی ہے؟''

''ہاں...... سلمٰی آپا بتا رہی تھیں کہ خیر سے بی اے پاس ہے۔''

''بس...... پھر تو سمجھو کام بن گیا۔'' وہ کھل اٹھیں۔ جیسے ان کی دلی مراد بر آئی ہو۔ پھر انہوں نے صولت آپا کے کان میں جو بات کہی تو اگلے ہی پل صولت آپا اُن کا ہاتھ تھام کر سلمٰی بیگم کے پاس چلی آئیں۔

نفیسہ بیگم ان دنوں اپنے بیٹے کے لیے مناسب لڑکی کی تلاش میں تھیں۔ ''لڑکا'' چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا۔ اتفاق سے اس وقت بارات میں بھی موجود تھا اور اسٹیج پر جواد کے شانے سے شانہ ملائے بیٹھا تھا۔ سلمٰی بیگم نے ایک نظر ڈالی اور ایک نظر سے ہی جیسے ان پر منوں اوس پڑ گئی۔ چالیس کے پیٹے میں، سفید کنپٹیاں مگر انداز میں بے انتہا ملاحت نمایاں تھی۔ مناسب شکل صورت اور قد کاٹھ مگر انہیں بھلا اور کیا درکار تھا۔ بیٹی کے مزاج کی رعونت سے بھی وہ خوب واقف تھیں۔ جس کے معیار میں تعلیم اور خوشحالی صفِ اول پر تھی۔ چنانچہ یہ ہر لحاظ سے معقول رشتہ تھا۔

نفیسہ بیگم نے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی تو سلمٰی بیگم نے خوش اخلاقی دکھاتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ اس طرح بشریٰ کی شادی کے طفیل ثمر کے بھی شاید نصیب کھلنے جا رہے تھے۔

رخصتی کے وقت بشریٰ کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ منیب الرحمٰن بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے روئے تھے اور صولت آپا ایک ایک کو یقین کرواتی رہیں۔

''یہ میری بیٹی ہے، اسے بیٹی بنا کے رکھوں گی۔'' بجیا، بشریٰ کے ہمراہ جانے کے لیے تیار تھیں اور ایک ایک کا منہ تک رہی تھیں مگر عاصمہ سمیت کسی نے بھی انہیں بشریٰ کے ساتھ بیٹھنے کو نہ کہا تو وہ بری طرح خفا ہو گئیں اور سارے کنبے کو سمیٹ کر رخصتی کے بعد بالا ہی بالا میرج ہال سے اپنے گھر کو روانہ ہو گئیں۔

''عاصمہ ہمیں اپنے سمدھیانے سے متعارف نہیں کروانا چاہتی۔'' روشن آرا ان کے غم میں برابر کی شریک تھیں۔

☆☆☆

ولیمے کا انتظام شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ اگلی صبح جب روشن آرا کی بہویں بشریٰ کی سسرال ناشتے کا سامان پہنچانے کو تیار تھیں۔ روشن آرا نے دونوں بہوؤں کو حکم صادر فرمایا۔

''شام تک سارا سامان سمیٹ لینا۔ ولیمہ بھگتا کر ہم وہیں سے اپنے گھر چلے جائیں گے۔''

جیسے در پردہ انہوں نے عاصمہ کو سنایا تھا۔ کل سے اب تک انہوں نے رخ دے کر دیورانی سے بات نہ کی تھی۔ ان کا بگڑا مزاج بحال کرنے کو عاصمہ نے دبے لفظوں میں بہوؤں کے ساتھ ناشتا لے کر بشریٰ کے سسرال جانے کو بھی کہا مگر روشن آرا جنہوں نے بھانت بھانت کی دوائیاں پھانکی تھیں وہ کمالِ بے اعتنائی سے منہ سر لپیٹ کر پڑ گئیں۔

''میرے سر میں درد ہے۔'' بجیا نے تو سرے سے ولیمے کا ہی بائیکاٹ کر دیا تھا۔ منیب الرحمٰن خود اسکوٹر پر بیٹھ کر بڑی بہن کو منانے ان کے گھر گئے مگر وہاں انہوں نے وہ، وہ سنائیں کہ منیب الرحمٰن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ گھر آ کر انہوں نے بیوی کی ایسی ایسی خبر لی کہ وہ بس آہ بھر کے رہ گئیں۔

''گھٹیا عورت! کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو؟ تم نے میرے ہی گھر میں میرے لہو کے رشتوں کو بے عزت کر کے رکھ دیا؟ حیثیت و اوقات ہی کیا ہے تمہاری؟ اوقات سے بڑھ کر مل گیا تو آسمان پر جا بیٹھی ہو؟ اپنی قسمت پر جتنا فخر کرو کم ہے ورنہ شرابی جواریوں کی نسلیں کہاں جا کر بھٹکتی ہیں، معلوم ہے تمہیں؟'' منیب الرحمٰن کے الفاظ تھے کہ طنز و ملامت کے پتھر جیسے وہ انہیں سنگسار کرنے پر تلے تھے اور عاصمہ کا وجود ذلت کی اتھاہ پستیوں میں دھنستا چلا

جار ہا تھا۔

اندر اور اندر...... اور جیسے ساری دنیا ہی ان کی دشمن بن بیٹھی تھی۔

بھرا پرا گھر تھا مگر کوئی بڑھ کر منیب الرحمٰن کو روکنے تھامنے والا نہ تھا...... یہ ذلتیں بھی تو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سمیٹی تھیں۔ وہ صفیہ کے گھر جا کر چھکوں پھکوں روئی تھیں اور صفیہ بھی برابر اسے تسلی دینے لگی۔

"جانے بھی دو...... وقتی غصہ ہے منیب الرحمٰن بھائی کا۔ اتر ہی جائے گا۔" مگر یہ اتنا سہل نہ تھا کہ انہوں نے زندگی میں پہلی بار منیب الرحمٰن کے اس طرح کے غیظ و غضب کا سامنا کیا تھا اور ان کے انداز میں بس عاصمہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکالنے کی کسر رہ گئی تھی۔ نہ جانے عورت کے قدموں تلے کی زمین اتنی بھربھری کیوں ہوتی ہے؟ منیب الرحمٰن نے زندگی میں پہلی بار ان کے میکے کے حوالے کو گھسیٹ کر انہیں ذلیل کیا تھا۔ صفیہ ہر ممکن انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہیں مگر لگائی بجھائی کی آگ بھڑک جاتی تھی۔

☆☆☆

جانے درست ہے کہ غلط...... مگر سنا یہی ہے کہ بیٹیوں کے نصیبوں پر ماؤں کے نصیب کا ہلکا سا عکس ضرور پڑتا ہے اور خود بشریٰ کے معاملے میں تو یہ بات صدفی صد درست ثابت ہوئی۔ عاصمہ کی زندگی سسرال کے آزار سمیٹتے گزری تھی اور اب ایسے ہی آزار خود بشریٰ کے بھی کھاتے میں آن پڑے تھے مگر ماں کی نصیحت بھی یاد تھی۔

"عافیت چاہیے اور گھر بسانا ہے تو زبان تالو سے لگا کر رکھنا۔"

بہت کم وقت میں اس نے جانچ لیا تھا کہ گھر بھر پر ساس صاحبہ کے حکم کا سکہ چلتا ہے۔ کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں تھی۔ وہ جو اپنی بیٹی بنا کے اسے بیاہ کر لائی تھیں۔ بہت جلد روایتی ساس بن گئیں۔۔ اور یہ بات سسرال کی دہلیز پار کرتے ہی اس کے کا... میں ڈال دی گئی تھی کہ اس گھر میں بیاہی بیٹیوں ... حیثیت مسلّم ہے۔ ان کی اہمیت پر کبھی کوئی ز... آنا چاہیے شادی پر صولت آپا نے عاصمہ کا رو... نندوں کے ہمراہ تاڑ ہی لیا تھا...... انہیں کون یقین دلاتا کہ عاصمہ کا پیمانہ اب جا کے لبریز ہوا تھا مگر موقع غلط تھا۔ اور وہ جو کہا گیا ہے کہ دنیا کو آپ ... بھی طرح خوش نہیں رکھ سکتے اور یہ کہ

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

سو صولت آپا کے کان بھر کر انہیں اکسانے ... بہت سے کرم فرماؤں کا ہاتھ تھا۔

"بہوؤں کو بھگتنے کے لیے بڑا دل گردہ در... ہوتا ہے ورنہ آج کل کی بہوؤں سے تو اللہ ... بچائے۔ سر چڑھالو تو ناچنا شروع کر دیتی ہیں۔" واری صدقے جاتی صولت آپا کا رویہ چند دنوں ... لیے بدل جاتا۔ وہ یوں بھی کھلاؤ سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نظر والی مثل پر عمل پیرا رہا کرتیں۔ عجیب دھوپ چھاؤں سا انداز...... کبھی محبت و روادار... ٹھنڈے میٹھے چشموں کا سا رویہ...... اور کبھی یکسر اجن... بن کے آنکھیں بدل لیا کرتیں۔ بشریٰ سٹپٹا کر ... جاتی۔ ابھی وہ دنیا کے چلن سے ناواقف تھی اور ابھی اس نے دنیا کو بھگتا ہی کتنا تھا اور تو اور جواد کے مزاج جاننے کے لیے بھی بڑے حوصلے درکار تھے۔ ... جیسا ہی دھوپ چھاؤں سا رویہ...... موڈ ہو تو لانگ ڈرائیو پر نکل جاتے ورنہ لاکھ اس کے کہنے پر گھر ... ہی گھسے رہتے۔ شادی کو چند مہینے گزرے اور بشر... آہستہ آہستہ مزاج آشنا ہونے لگی۔

اس روز کافی دنوں بعد وہ تفریح کو نکلے تھے ... وہ بھی اس علاقے میں جہاں سے ثمر کی سسر... نزدیک تھی۔ یوں بھی ثمر کی ساس جواد کی بھی ... پرے کی رشتے دار ہوتی تھیں۔ جبھی بشریٰ نے کہا...

اور آئس کریم وغیرہ کھانے کے بعد فرمائش کر دی کہ ثمر باجی کی سسرال نزدیک ہے وہاں سے ہو کر چلتے ہیں۔ بشریٰ کے اتنا کہنے پر جواد فوراً بول اٹھا۔

"نہیں! امی پریشان ہو جائیں گی۔" مگر اس کا دل آمادہ ہی نہ ہو رہا تھا اتنے قریب آ کے پلٹ جانے کو۔

"انہیں فون کر دیں گے۔ کچھ ہی دیر کی تو بات ہے۔" جواد احسن نے ناچار گاڑی موڑ لی تھی مگر وہاں جا کر بھی وہ لیے دیے سا بیٹھا رہا۔ بدقسمتی سے موبائل گھر بھول گیا تھا ثمر کے گھر سے اپنے لینڈ لائن نمبر پر فون کیا تو مستقل انگیج جاتا رہا کہ صولت آپا دیر ہو جانے پر یہاں وہاں فون کھڑکا رہی تھیں پھر جواد کے تیور ایسے رہے کہ انہیں لوٹتے ہی بن پڑی۔ اگرچہ ثمر بہت خوش ہو گئی تھی۔ کچھ ایسی زیادہ دیر بھی نہ گزری تھی...... مگر وہ لوٹے تو ساس صاحبہ کو غش پر غش آ رہے تھے۔ سارا گھر انہیں لعن طعن کرنے کھڑا ہو گیا اور سارا الزام بشریٰ کے سر آن پڑا۔ جواد کی بھی آنکھیں ماتھے سے جا لگی تھیں کسی نے سخت سست کہا تو چند حرف کہہ کر ہاتھ جھاڑ کر اِک طرف ہو گیا تھا۔

"میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ امی پریشان ہو جائیں گی۔" بشریٰ سے جیسے کوئی جرم سرزد ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عجیب دھوپ چھاؤں سے رویے جو مہرباں ہوں تو ابرِ باراں بن جاتے اور نامہرباں ہوں تو اجنبی بن کے کونے میں کھڑا کر دیتے۔ وقت بھی کیا شے ہے، انسان کو سرتاپا تبدیل کر دیا کرتا ہے۔ کبھی کبھی دل کی خوشیاں زندگی کا چلن کچھ بھی تو اپنا نہیں رہتا۔ کچھ زیادہ عرصہ تو نہ گزرا تھا جب وہ فرسٹ ائیر کی نادان اور الہڑ سی طالبہ تھی مگر اب وقت کا چلن بدل گیا تھا۔ زندگی کا ڈھب اور اس کا مقام بھی کبھی کبھی اس کا دل برسات میں بھیگنے کو چاہتا کہ جھولے پر بیٹھ کر ایک لمبی سی پینگ لے کر دو قوسِ قزح کے رنگوں سے سجے بلبلے اپنے ہاتھوں کی کٹوریوں میں بھر کے رہ جاتی۔ زندگی کا چلن بدلا تھا اور اس کا مقام بھی...... اب وہ نادان اور الہڑ سی لڑکی نہیں، ایک ذمے دار بہو اور خدمت گزار بیوی بن چکی تھی۔ اور کچھ ہی عرصے بعد کائنات کے ایک عظیم رتبے پر فائز ہو کر ماں بننے کا شرف حاصل کرنے والی تھی۔ زندگی اب نئے اچھوتے رشتوں سے بندھ گئی تھی۔ یہ رشتے مضبوط سہی مگر نازک بھی بہت ہوتے ہیں۔ یونہی تو نہیں عورت انہیں اپنا بنانے کے لیے اپنا آپ مٹا دیتی ہے...... اور وہ بھی تو ایک عورت تھی سو اُن سب کے حسبِ منشا رنگ میں ڈھل کر اپنا آپ کھوتی چلی جا رہی تھی۔

عاصمہ نے ساری زندگی سسرال پرستی میں گزاری تھی اور صرف اِک بار کی من مانی نے ساری ریاضتوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ بس کچھ پل کی لغزش اور بھول...... جن کے سبب زندگی بھر کا خسارہ اس کے دامن میں سمٹ آیا تھا مگر بشریٰ نے ٹھان لی تھی۔ کسی نادانی یا بھول کے سبب ایسا کوئی خسارہ اپنے دامن میں نہیں بھرنا ہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ تجربہ انسان کو خطا سے بچاتا ہے مگر تجربہ خطا کے طفیل ہی حاصل ہوتا ہے اور یہ تجربہ اسے اب حاصل ہوا تھا کہ دوسروں کو برتنے کے لوگوں کے اپنے اپنے انداز اور طریقے ہوا کرتے ہیں۔ صولت آپا ہوں کہ جواد احسن جیسے لوگ... ان کے رویے بظاہر نرم اور سست رفتار ہوتے ہیں۔ جو بہت آہستگی سے چھیلتے ہیں کاٹتے ہیں اور پھر روندتے بھی ہیں اور بہت سہل طریقے سے دھیرے دھیرے ہمارے اندر اتر کر آہستہ آہستہ ہمیں فنا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی سلو پوائزننگ کا عمل بشریٰ نے اپنا آپ فنا کر کے دوسروں کے رنگ میں رنگ جانے کا تہیہ کر رکھا تھا کہ اسی میں ازدواجی زندگی کی بقا تھی شاید...... اپنا آپ کھو کر ہی تو دوسروں کے دل تسخیر کیے جاتے ہیں۔

منی ناول

اک نئے موڑ پر

رضوانہ پرنس

کبھی منزل ، کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا
یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا
بدل کر اس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا

راہِ زیست کبھی پُرخار و پُرپیچ تو کبھی رواں دواں ہوتی ہے۔ اسی راہ پر سفر کرتے ہوئے اجنبی مسافروں سے آشنائی، کبھی منزل کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو کبھی راہ گم کردیتی ہے... ایسے ہی ایک مسافر کا دلگداز احوال جو منزل پر پہنچا تو ضرور مگر کیسے...؟

شوبز کی دنیا کے اسرار سے پردے اٹھاتی، گراتی ایک دل فریب روداد

زنیرا نے جھلملاتی سبز چوڑیوں کے سیٹ کو بڑی حیرت سے اپنی سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا دیکھا۔
''ارے یہ کہاں سے آیا؟'' اس نے جیسے... زیرلب اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ تبھی آٹھ سالہ روشانہ کے کھلکھلا کر ہنسنے پر اس نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو روشانہ نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کی کھلکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا۔ زنیرا اس



اس طرح بے ساختہ ہنستے دیکھ کر خود بھی ہنس پڑی۔

”روشی ذرا مجھے بھی تو پتا چلا کہ تمہیں اتنی ہنسی کیوں آرہی ہے۔“ اس نے پیار سے روشی کے سرخ سرخ رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے پوچھا۔

”مما یہ چوڑیاں بابا لے کر آئے ہیں آپ کے لیے۔“ روشانہ نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔

”ارے وہ کب آئے؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔“ زنیرا نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ وہاں باتھ روم میں چھپے ہوئے ہیں۔“ روشانہ نے بڑی معصومیت سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ تب فاران اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا ہوا روشانہ کو مصنوعی خفگی سے دیکھتے ہوئے باتھ روم سے باہر نکل آیا۔

”روشی تمہیں راز دار بنانے سے بہتر ہے کہ انسان خود ہی ٹی وی پر خبر نشر کروا دے۔“ اس نے ہلکے سے روشی کی پونی ٹیل کھینچتے ہوئے شرارت سے زنیرا کی طرف دیکھا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

”اچھا تو جناب مجھے سرپرائز دے رہے تھے۔“

”ہاں، سرپرائز تو دے رہا تھا لیکن ہماری گڑیا نے اسے مکمل ہی نہیں ہونے دیا۔“ فاران نے بڑی بے چارگی سے روشانہ کی طرف دیکھا تو وہ بھاگ کر اس کے پاس آگئی۔

”بابا میں نے مما کو کیک کے بارے میں بالکل بھی نہیں بتایا اور نہ ہی......“ روشانہ کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ فاران نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ زنیرا کھلکھلا کر ہنس دی۔

”چھوڑیں فاران...... اب جو بھی سرپرائز ہے سب بتا دیں ورنہ رہی سہی کسر فرحان آکر پوری کر دے گا۔“

”نہیں مما، فرحان کو تو نہ کیک کا پتا ہے اور نہ ہی اس گولڈ رنگ کا جو بابا نے چوڑیوں کے پیچھے چھپا کر رکھی ہے۔“ اس بار روشانہ نے سرپرائز کا مکمل خاتمہ کر ہی دیا۔

”اوہ مائی گاڈ، چوڑیوں کے پیچھے رنگ بھی رکھی ہے۔“ زنیرا نے بے ساختہ ایکسائٹڈ ہو کر چوڑیوں کے سیٹ کو ہٹا کر اس سرخ مخملی ڈبیا کو اٹھایا تو فاران سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

اصل میں آج زنیرا کی برتھ ڈے تھی۔ اسے سرپرائز دینا اور لینا دونوں ہی بہت پسند تھے سو فاران نے اپنے حساب سے بہت خوب صورت سرپرائز دینا چاہا تھا لیکن اس کی لاڈلی بیٹی نے اس کے سرپرائز کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا تھا۔ زنیرا کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ اسے تو موقع مل گیا تھا فاران کا ریکارڈ لگانے کا۔

فاران اور زنیرا کی لو میرج تھی، راہ میں بہت سی رکاوٹیں اور مخالفتیں بھی آئیں۔ ماں کے آنسو اور باپ کی شدید خفگی کو بھی ان دونوں نے فیس کیا لیکن ان کی شدید اور گہری محبت بڑوں کی نفرتوں کی آگ میں جل کر بھسم ہو جانے کے بجائے مزید کندن بن گئی اور بالآخر محبت کی جیت ہو ہی گئی۔ دونوں گھرانوں میں شروع، شروع میں کافی سرد مہری سی رہی لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ برف پگھلنی شروع ہو گئی۔ فاران نے کچھ ایسے اپنے ساس سسر کے دل میں جگہ بنائی کہ وہ جو اس کا نام بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے تھے اب انہیں اپنے داماد سے بڑھ کر کوئی اور لگتا ہی نہیں تھا۔ بیٹے سے بھی بڑھ کر ثابت ہوا تھا وہ ان لوگوں کے لیے۔ یہی حال زنیرا کا بھی تھا۔ اپنے صبر، محبت اور خدمت سے اس نے سسرال میں سب کا دل کچھ ایسے جیتا کہ بچے بڑے سب ہی اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ زنیرا کی ساس کا انتقال ہو چکا تھا۔ سسر اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتے تھے۔ دو نندیں شادی شدہ تھیں اور اس شادی کی سب سے زیادہ مخالفت بھی انہی دونوں نے کی تھی کیونکہ انہوں نے ہمیشہ سے اپنی خالہ زاد بہن کو اپنی بھابی کے روپ میں دیکھا تھا جو ان دونوں کی بچپن کی دوست بھی تھی۔

بڑے بھائی ذیشان کو بھی اجالا اپنی بھابی کے طور پر بہت اچھی لگتی تھی جبکہ سسر الطاف صاحب کی بھی اجالا بچپن سے ہی بہت لاڈلی تھی۔ پورا خاندان ذہنی طور پر اجالا کو اس گھر کی بہو تسلیم کر چکا تھا لیکن فاران جو کہ اپنی جاب کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا، وہ ان کے خیالات جانتے ہوئے بھی انجان بنا رہتا کیونکہ وہ تو اپنا دل زنیرا کے معصوم حسن کے سامنے ہار چکا تھا جو آفس میں اس کی کولیگ ہونے کے ساتھ ساتھ اب اس کے دل کی ہر دھڑکن میں بھی بسنے لگی تھی۔ اجالا نے اپنے دل کے ٹوٹنے کی صدا کسی کو بھی نہیں سننے دی بلکہ فاران کی شادی سے پہلے، پہلے ہی وہ عدیل کی دلہن بن کر امریکا سدھار گئی۔ عدیل اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا تو پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا لیکن یونیورسٹی کے زمانے سے ہی شاید اجالا اس کی محبت بن کر اس کے دل میں چھپی ہوئی تھی تبھی تو اس بار اپنی ماں کے اصرار پر وہ اپنی شادی کے سلسلے میں پاکستان آیا تو سب سے پہلے اجالا ہی سے ملا اور پھر دوسرے ہی دن عدیل کی امی اس کا رشتہ لے کر اُن کے گھر چلی آئیں۔ اجالا تو حیران ہی رہ گئی۔ وہ تو شکر ہوا کہ اجالا کے ابو نے فوراً جواب نہیں دیا تھا۔ اسی شام اتفاق سے فاران کی بڑی بہن راحیلہ باجی سُوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کے پاس چلی آئیں اور ان کی باتوں نے جیسے اجالا کا دل لہولہو کر دیا۔

راحیلہ باجی، فاران کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ زنیرا کو کوس رہی تھیں لیکن اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کان جیسے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ جو بچپن سے اس کے دل میں بسا ہوا تھا۔ جس کے خوابوں سے اس کی دنیا سجی ہوئی تھی۔ اپنی آنے والی زندگی میں سوائے فاران کے اس نے کبھی کسی اور کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ اسی کو اپنے جسم و جان کا مالک بنا بیٹھا تھا اور آج اچانک اسے پتا چلا کہ وہ تو اس کا تھا ہی نہیں...... اس کی محبت، اس کے جذبات، اس کے احساسات سب کسی اور کے لیے تھے اور وہ کتنی نادان تھی، نہ اس کے دل میں جھانک سکی اور نہ اس کی آنکھوں کو پڑھ سکی اس کی ہر بات کو اپنے مطلب کے معنی پہنا کر احمقوں کی جنت میں گھومتی رہی۔ اس نے بہت ضبط سے راحیلہ باجی کی ساری باتیں سنیں...... چہرے سے کچھ ظاہر کیے بغیر مسکرا کر انہیں فاران کو اس کی مرضی سے جینے کا حق دینے کی بات کی اور اسی رات عدیل کو فون کر کے اس کے پروپوزل پر ہاں کر دی۔ فاران کے گھر والوں پر اس کی شادی کی خبر شدید شاک کی صورت میں پہنچی۔ فاران سے خفگی اور زنیرا سے نفرت مزید بڑھ گئی لیکن اب وہی زنیرا ان سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ فاران کے ابو الطاف صاحب جب بھی ان کے گھر رہنے آتے زنیرا جیسے ایک پیر سے ان کے لیے کھڑی رہتی۔ اتنا خیال اتنی خدمت کرتی کہ الطاف صاحب نہال، نہال ہو جاتے۔ روشانہ اور فرحان کی پیدائش کے بعد ان کا زیادہ دل اب فاران کے گھر پر ہی لگنے لگا تھا جس کا اکثر ذیشان گلہ کرتا رہتا تھا۔ آج زنیرہ کی سالگرہ تھی اور اس کے میکے اور سسرال والے دونوں ہی رات ڈنر پر اس کے گھر آرہے تھے لیکن اس وقت روشانہ کی معصوم اداؤں میں کھو کر وہ جیسے سب کچھ بھلا بیٹھی تھی۔ فاران کو بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے بھولپن پر بہت پیار آرہا تھا۔ اپنے سرپرائز کے خراب ہونے کے دکھ پر روشانہ کی معصومیت غالب آگئی تھی۔ زنیرا کو فاران کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آرہا تھا تبھی فاران کے موبائل پر اس کے آفس سے فون آگیا اور زنیرا اسے باتوں میں مصروف چھوڑ کر فرحان کو دیکھنے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی جو نہ جانے کب سے ٹی وی ہی دیکھے جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں فاران کچھ اپ سیٹ سا وہیں لاؤنج میں آگیا۔

”کیا ہوا فاران سب ٹھیک تو ہے ناں؟“ اس

نے کچھ کانشس ہو کر فاران کے الجھے ہوئے سے انداز کو دیکھا۔

''ہمارے باس صاحب کا فون تھا۔ فوراً لاہور بلایا ہے، اِن فیکٹ ان کا کہنا ہے کہ تین گھنٹے بعد کی فلائٹ سے وہ میری سیٹ بک کروا رہے ہیں۔ آفس کا آدمی ٹکٹ لے کر مجھے ائرپورٹ پر ہی مل جائے گا۔'' فاران نے بے حد کوفت سے اسے دیکھتے ہوئے اطلاع دی تو وہ ایک لمحے کو تو بالکل چپ سی ہوگئی۔ ساری خوشی لمحوں میں جیسے ہوا میں تحلیل ہوگئی تھی۔

''فاران اس سے تو بہتر تھا کہ ہم لاہور میں ہی رہتے۔ ناحق آپ نے کراچی کی برانچ میں اپنا ٹرانسفر کروایا۔ ارے یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی نہ وقت دیکھتے ہیں اور نہ موقع جب دل چاہتا ہے بلا لیتے ہیں مانو لاہور نہ ہوگیا طارق روڈ ہوگیا۔'' وہ کچھ لمحوں بعد اپنی چپ کو توڑتے ہوئے جیسے پھٹ ہی پڑی۔

''زینی میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ آج ہمارے گھر کوئی فنکشن ہے لیکن بات ہی کچھ اتنی اہم ہے کہ میرا جانا ضروری ہے۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنی ہے اور تم خود بھی اس میں کام کرچکی ہو اور تم کو پتا ہی ہے کہ......''

فاران کی بات کو زنیرا نے درمیان سے ہی کاٹ دیا۔

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ آج آپ کے بغیر میری زندگی کی بدترین سالگرہ ہوگی۔ فاران میں ابھی سب کو آنے سے منع کردیتی ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے فون کی طرف بڑھی تو فاران نے بے اختیار اس کے ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے نزدیک بٹھالیا۔

''پلیز جان اگر تم ایسے بی ہیو کروگی تو میں جس ذہنی ٹینشن کے ساتھ لاہور جاؤں گا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتیں۔ جانا تو مجھے بہرحال ہے لیکن اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم مجھے کیسے رخصت کرتی ہو۔'' زنیرا نے چونک کر اس کے بجھے ہوئے چہرے کو دیکھا تو اپنے اس رویے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کون سا اپنی خوشی سے جا رہا تھا۔ اب سے کچھ دیر قبل کتنا چہک رہا تھا وہ...... کتنے پیارے گفٹ لے کر آیا تھا وہ اس کے لیے...... نوکری میں تو یہ سب بہت ہی ہے اور فاران کے سنگ تو اسے زندگی کا ہر دن ہی اپنی سالگرہ کے مانند لگتا تھا۔

''سوری فاران، شاید میں کچھ جذباتی ہوگئی تھی۔ یقیناً یہ meeting زیادہ امپورٹنٹ ہوگی تبھی نسیم صاحب نے آپ کو ارجنٹ کال کیا ہے۔'' اس نے کچھ شرمندگی سے فاران کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اطمینان کی سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''تھینک یو میری پیاری بیوی' اللہ تمہیں سدا خوش رکھے اور مجھے ہمیشہ سہاگن رکھے۔'' وہ بہت شرارت بھرے لہجے میں اسے دعائیں دیتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔

''سہاگن......؟'' زنیرا بے اختیار ہنس دی۔

''تو پھر سہاگا ہی کہہ لو، بھئی میرا مطلب ہے کہ تم ہمیشہ سلامت رہو۔'' وقت بہت کم تھا زنیرا نے جلدی جلدی اس کی ضروری چیزیں بیگ میں رکھیں کہ کل شام تک تو اسے واپس آہی جانا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے زنیرا کو خاص طور پر پھر تاکید کی۔

''دیکھو زینی اپنی برتھ ڈے بہت خوشی، خوشی منانا، کسی چیز میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ خوب ہنستی مسکراتی رہنا۔'' زنیرا اپنے دل کی اداسی چھپا کر بظاہر مسکراتے ہوئے اس کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ فرحان نے بھی خوشی خوشی اپنے بابا کو خدا حافظ کہا لیکن روشانہ کافی روٹھی، روٹھی سی تھی فاران سے۔

''ارے میری گڑیا میں کل تو آہی جاؤں گا ناں...... پھر ہم لوگ دوبارہ تمہاری مما کی سالگرہ سلیبریٹ کریں گے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں۔'' فاران نے روشانہ کی آنکھوں میں نمی محسوس کرکے اسے لپٹالیا۔

''مجھے آپ کے باس بہت برے لگتے ہیں بابا۔'' وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی تو فاران ہنس دیا۔

''او کے بیٹا میں انہیں تمہارا یہ پیغام دے دوں گا لیکن اگر انہوں نے مجھے جاب سے نکال دیا تو پھر......؟''

''پھر آپ میرے اسکول میں جاب کرلیجیے گا۔ میں اپنی میڈم سے کہہ دوں گی۔'' روشانہ کے اس معصوم سے حل پر زنیرا اور فاران بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دیے تھے۔

سالگرہ میں سب ہی کو فاران کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی شوخ زندگی سے بھرپور شخصیت ہر محفل میں جیسے جان ڈال دیا کرتی تھی لیکن آج زنیرا کے اس اسپیشل دن پر سجائی گئی محفل کتنی سونی سونی سی محسوس ہو رہی تھی۔ زنیرا بظاہر خوش نظر آنے کی کوشش کررہی تھی لیکن دل کے اندر سناٹا جیسے اترتا ہی جا رہا تھا۔ تیار بھی وہ بہت بے دلی سے ہوئی تھی۔ وہ سراہنے اور نثار ہوجانے والی نظریں ہی جب آس پاس نہ تھیں تو وہ کس کے لیے تیار ہوتی۔ اس نے تو فاران سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ یہ ڈنر کل اس کی واپسی پر رکھ لیتے ہیں لیکن وہ نہیں مانا تھا کہ عین وقت پر سب کو منع کرنا بہت آکورڈ لگے گا۔ کیک کاٹتے وقت لاشعوری طور پر اسے فاران کی کال کا انتظار رہا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لاہور پہنچتے ہی وہ کس طرح کام میں بزی ہوگیا ہوگا۔ ویسے تو وہ اکثر ایک دو دن کے لیے لاہور جایا ہی کرتا تھا لیکن اس بار اس کا جانا زنیرا کی ایک خوب صورت سی خوشی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور آج اسے اپنی یہ سالگرہ زندگی کی سب سے خراب سالگرہ محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

فائیو اسٹار ہوٹل کے خوب صورت کمرے میں وہ صوفے پر بیٹھا ہوا اس وزیٹنگ کارڈ کو ہاتھ میں تھامے بار بار پڑھ رہا تھا اور ہر بار ایک ناقابلِ یقین کیفیت اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگتی۔ قسمت کبھی کبھی انسان کو اتنے حیران کن لمحات سے دوچار کردیتی ہے کہ جن کا اس نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا ہوتا۔ کبھی کوئی آنے والا دن اپنی پٹاری میں سے ایسا طاقتور لمحہ نکال کر انسان کی جھولی میں ڈال دیتا ہے جو اس کی پوری زندگی ہی بدل ڈالتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ لمحہ خوش قسمتی کا لبادہ اوڑھے ہوتا ہے یا بدبختی کی سیاہی میں ڈوبا ہوتا ہے۔ فاران کی زندگی میں بھی وقت نے اچانک ہی اپنے دامن سے ایک جگمگاتا ہوا لمحہ جھٹک کر اس کی جھولی میں گرادیا تھا۔ حالانکہ لاہور پہنچنے کے بعد وہ اپنے کام میں کچھ ایسا بزی ہوا تھا کہ سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی لیکن پھر بھی ہمہ وقت دل میں ایک حیرت انگیز خوشی بار بار اسے عجیب سے احساس سے دوچار کرتی رہی تھی اور اب رات تقریباً بارہ...... بجے وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو تھکن کا احساس کیے بنا بے اختیار اس نے شیرازی صاحب کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ نکال لیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے بغور اسے پڑھا تو ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نے احاطہ کرلیا۔ شیرازی سے آج اپنی ملاقات کا وہ سین اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

اسے جب بھی لاہور کمپنی کے کام کے سلسلے میں جانا ہوتا تھا تو ہمیشہ اسے بزنس کلاس کا ٹکٹ ہی ملتا تھا سو اس وقت بھی وہ اس لگژری کلاس کی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے زنیرا اور بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے یوں اچانک چلے جانے پر کتنے اپ سیٹ سے لگ رہے تھے۔ اس اچانک میٹنگ نے جیسے سب کی خوشیوں پر پانی ہی پھیر دیا تھا۔ جہاز نے کب ٹیک آف کیا اپنے خیالوں میں گم فاران کو پتا ہی نہیں چلا۔ بزنس کلاس میں زیادہ مسافر نہیں تھے۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ پیاری پیاری سی دو ائر ہوسٹس کھانا وغیرہ سرو کرنے میں مصروف تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ کافی پیتے ہوئے کوئی میگزین دیکھنے میں محو تھا کہ ایکسکیوزمی کی آواز پر اس

نے بے اختیار چونک کر اوپر دیکھا۔ ایک صاحب جو کافی بُردبار اور بارعب سی شخصیت نظر آرہے تھے اس سے بڑی شائستگی سے مخاطب تھے۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں کچھ دیر آپ کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟''

''جی بالکل ضرور بیٹھیے۔'' فاران نے بھی بہت تہذیب سے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی۔ اُسے ان کی صورت بہت دیکھی ہوئی سی محسوس ہورہی تھی لیکن بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔

''میں فرہاد شیرازی ہوں، یہاں کی فلم انڈسٹری کا ایک مشہور ڈائریکٹر، آئی ہوپ آپ نے میرا نام ضرور سنا ہوگا۔'' ان کے تعارف کروانے پر فاران کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور ایک دم ہی پہچان کی روشنی اس کی آنکھوں میں دمک اٹھی اس نے اور زنیرا نے فرہاد شیرازی کی کافی فلمیں دیکھی ہوئی تھیں۔ اِن فیکٹ وہ زنیرا کے فیورٹ ڈائریکٹر تھے۔ اخبارات اور رسائل میں ان کی تصویریں چھپتی رہتی تھیں اور اکثر ٹی وی پر ان کے انٹرویوز کو بھی ان لوگوں نے بہت شوق سے دیکھا تھا۔

''اوہ...... شیرازی صاحب، واٹ اے... سرپرائز...... مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں اپنے فیورٹ ڈائریکٹر کو اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔'' اس کے پُرجوش لہجے پر فرہاد شیرازی دھیمے سے مسکرا دیے۔

''ابھی میں جو کچھ آپ سے کہنے جارہا ہوں اسے سن کر آپ کو مزید یقین نہیں آئے گا۔'' ان کے معنی خیز انداز پر فاران نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا تو کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد ان کے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے الفاظ سچ مچ فاران کو حیرت کے گہرے سمندر میں ڈبو رہے تھے۔

''سب سے پہلے تو میں آپ کا تعارف حاصل کرنا چاہوں گا۔''

''جی، میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہوں اور میرا نام فاران سجاد ہے۔''

''کیا آپ شادی شدہ ہیں؟'' یہ شیرازی کا اگلا سوال تھا۔

''جی ہاں اور میرے دو پیارے، پیارے بچے بھی ہیں۔'' فاران نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''فاران آپ جانتے ہوں گے کہ آج کل میں اپنی ایک نئی فلم کی لانچنگ پر کام کر رہا ہوں جس کے لیے مجھے نئے چہروں کی تلاش ہے خاص طور پر ہیرو کے لیے میں کافی دنوں سے سرگرداں تھا لیکن کوئی بھی نوجوان میرے قائم کردہ معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا لیکن آپ کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی دل نے کہا یہ ہی وہ شخص ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''جی...؟'' فاران نے شدید حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اس کے دھڑکنے کی آواز اس کے کانوں تک آئی تھی۔

''آپ کی پرسنالٹی، آپ کا چہرہ خاص طور پر آپ کی آنکھوں کی کشش ہی فلم بینوں کو سینما تک کھینچ لائے گی۔'' شیرازی اتنے نارمل انداز میں اس کی تعریف کر رہے تھے گویا آٹے، دال کا بھاؤ بتا رہے ہوں جبکہ فاران کی اضطراری کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ دل سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

''لیکن سر میں تو شادی شدہ ہوں اور آپ کو ینگ ہیرو کی تلاش ہوگی۔'' فاران کے لہجے میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ اتنا نروس تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

''دیکھیے فاران ایک بات یاد رکھیے جواب دہی کو خود ہی کھٹا کہتا ہے اس سے کوئی بھی دہی نہیں خریدتا۔'' شیرازی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا شادی شدہ ہونا جب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تو آپ کیوں اس کے بارے میں پریشان ہورہے ہیں۔ بس آپ مجھے صرف اس بات کا جواب دیجیے کہ کیا آپ میری فلم میں ایز اے ہیرو کام کرنے کو تیار ہیں، میرا مطلب ہے کہ میری آفر آپ کو قبول ہے؟'' انہوں نے دو ٹوک انداز میں اس سے پوچھا تو وہ مزید گڑبڑا گیا۔

''سر میں نے پہلے کبھی ایکٹنگ نہیں کی ہے، دراصل مجھے اس بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے ورنہ آپ کی آفر تو میرے لیے دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔'' اس نے ان کے حتمی انداز پر بہت نروس ہوکر.... جواب دیا تو شیرازی صاحب نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''مجھے ایسے لوگ پسند ہیں جو کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو اس پر سرتاپا ڈٹ جاتے ہیں اگر کوئی دوڑ نہیں سکتا تو پھر بھی وہ فاتح ہے کیونکہ اس نے کوشش ہی نہ کرنے کے خوف کو شکست دی ہے۔ ناکامی سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں دوست، میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ آپ جو بھی چاہتے ہیں وہ بن سکتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں ایکٹنگ کرسکوں گا وہ بھی ایز اے ہیرو؟'' فاران نے بہت جھجکتے ہوئے یقین نہ آنے والے لہجے میں پوچھا تو وہ ہنس دیے۔

''یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ جوہری کو ہی پتا ہوتا ہے کہ ہیرا کیسے تراشا جاتا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ کل شام اس پتے پر آکر مجھ سے مل لیں۔ ہم وہیں پر سب باتیں ڈسکس کرلیں گے۔'' وہ جیب سے اپنا کارڈ نکالتے ہوئے بولے تھے اور فاران کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اس جہاز کی اڑان سے بھی زیادہ اونچا اڑتا جارہا ہے۔ پھر لاہور آنے تک شیرازی نے اپنی باتوں سے جیسے اس کے اندر ایک نئی روشنی اور نیا شعور اجاگر کردیا تھا۔ اس وقت وہ ان کا وزیٹنگ کارڈ ہاتھوں میں لیے اپنی زندگی میں آنے والے اس واقعے کو ایک معجزہ سے ہی تشبیہ دے رہا تھا۔ تب اچانک ہی اسے زنیرا کا خیال آیا جس کی برتھ ڈے پر قدرت نے فاران کی زندگی میں ایک بہت چونکا دینے والا حسین موڑ لانے کا اشارہ دیا تھا۔ ویسے بھی پہلے اپنی میٹنگ اور پھر اس ایکسائٹمنٹ میں وہ جیسے زنیرا کی سالگرہ کا دن بھول ہی گیا تھا۔ کتنی بور اور اپ سیٹ لگ رہی تھی وہ اس کے یوں اچانک چلے جانے سے لیکن اللہ کے ہر کام میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے اگر آج وہ کمپنی کے کام سے لاہور نہ آرہا ہوتا تو یہ وقت، یہ لمحے کبھی یوں اس کی زندگی میں نہ آتے۔ اسی فلائٹ میں اس کی زندگی کی

نئی خوشیاں نئی شروعات چھپی ہوئی تھیں اگر یہ فلائٹ مس ہوجاتی تو اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والی کتنی بڑی خوشی کو بھی مس کر گیا ہے۔ فاران نے مسکراتے ہوئے یہ سب سوچا اور اب اس خبر کو اسے اپنی زنیرا سے بھی تو شیئر کرنا تھا۔

☆☆☆

''اوہ مائی گاڈ...... مجھے بالکل یقین نہیں آرہا، فاران! بھلا شیرازی آپ کو فلم کی آفر کیسے کر سکتے ہیں؟'' زنیرا کو کسی طور یقین نہیں آرہا تھا اور یہ جملہ کوئی تیسری بار اس کے منہ سے ادا ہورہا تھا۔

''ارے بابا اب میں اتنی دور سے تمہیں کیسے یقین دلاؤں...... پہلے میں خود تو اس بے یقینی کی کیفیت سے کسی طرح نکلوں۔'' فاران کا لہجہ خوشی سے معمور تھا۔

''کمال ہوگیا یہ تو...... فاران میری فرینڈز ہمیشہ مجھ سے کہتی تھیں کہ تمہارا شوہر کسی فلم کا ہیرو لگتا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ سچ مچ ایک ہیرو بن جائیں گے اور وہ بھی شیرازی جیسے ٹاپ موسٹ ڈائریکٹر کی فلم کے۔ سچ فاران آپ جو کچھ بتارہے ہیں میرا دل چاہ رہا ہے کہ ابھی سب فرینڈز کو فون کر کے انہیں یہ خبر سناؤں۔ ویسے بھی آج کل شیرازی کی اس نئی فلم تیرا میرا پیار امر کے چرچے کافی ہورہے ہیں۔ اوہ میرے خدا...... اور اس کے ہیرو آپ ہوں گے۔'' آخری جملہ اس نے اتنی زیادہ ایکسائٹمنٹ کے ساتھ ادا کیا کہ فاران بے اختیار ہنس دیا۔

''ارے جانِ فاران ابھی کل میری ان سے ملاقات تو ہوجانے دو، ان لوگوں کے دین ایمان کا کچھ پتا نہیں، ہوسکتا ہے کہ کل ان کا ارادہ ہی بدل جائے۔'' اس کی بات پر زنیرا ایک دم گھبرا گئی۔

''پلیز فاران ایسی ناامیدی کی بات کر کے میری خوشی کو الجھن میں تو مت بدلیں ناں!'' وہ کچھ اپ سیٹ سی ہوگئی۔

''بھئی میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب تک ہر چیز کنفرم نہ ہوجائے ہمیں ہوائی قلعے نہیں بنانے چاہئیں۔ پلیز ابھی تم میرے یا اپنے گھر والوں کو بھی اس خبر کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ میں کل رات ان سے ملنے کے بعد تم کو فون کروں گا اور انشاء اللہ اچھی خبر ہی ہوگی۔'' فاران نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا تو وہ دل پر جبر کر کے مان گئی۔ ورنہ اس کا تو ارادہ ہورہا تھا کہ وہ ابھی اتنی لیٹ نائٹ میں بھی سب کو جگا کر یہ ناقابلِ یقین خبر سنادے۔

☆☆☆

وہ جلے پیر کی بلی کے مانند پورے گھر میں ادھر سے اُدھر گھومتی پھر رہی تھی۔ بڑے بیٹے فرحان کو آج اس نے جلدی ہی کھانا کھلا کر سلا دیا تھا جبکہ روشانہ کسی طور سونے پر راضی نہیں ہورہی تھی۔

''مما، بابا نے تو کہا تھا کہ وہ آج آجائیں گے، مجھے ان کا ویٹ کرنا ہے۔'' وہ ٹھنک کر بولی تھی۔

''بیٹا ابھی ان کا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ انشاء اللہ وہ کل ضرور آجائیں گے۔'' وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے سلانے کی کوشش کررہی تھی۔

''بابا ہمیشہ اپنا پرامس پورا کرتے ہیں، وہ آج ضرور آئیں گے۔'' روشانہ اس کی بات مان کر نہیں دے رہی تھی۔ بیٹیاں اپنے باپ سے زیادہ اٹیچڈ ہوتی ہیں لیکن روشانہ کی تو جان ہی جیسے اپنے بابا میں تھی اور فاران کو بھی اس کے بنا ایک پل بھی چین نہیں آتا تھا۔ اکثر زنیرا اسے ٹوکتی بھی رہتی تھی کہ اس کا اتنا لاڈ پیار اسے بگاڑ دے گا لیکن فاران اس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتا۔

''بیوی تم ہم باپ بیٹی کی محبت سے جیلس ہونا چھوڑ دو۔ تمہارے عشق کا کوٹا تو میں نے الگ اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہوا ہے پھر تمہیں کیا پریشانی ہے۔''

روشانہ کو بڑی مشکل سے سلا کر وہ لاؤنج میں آگئی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا لیکن بج کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ زنیرا نے کئی بار خود فاران کو کال ملانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی آف جارہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ زنیرا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود ابھی اُڑ کر لاہور پہنچ جائے۔

''آخر کتنی لمبی میٹنگ چل رہی ہے اس کی شیرازی کے ساتھ!'' زنیرا نے بہت الجھ کر سوچا تھا تبھی اس کا موبائل بج اٹھا اسکرین پر فاران کا نام جگمگا رہا تھا۔

''ہیلو فاران کیا ہوا کانٹریکٹ سائن کرلیا آپ نے؟'' اس نے یہ سوالات اتنی بے چینی سے پوچھے کہ فاران کو اپنی ہنسی روکنی محال ہوگئی۔

''ارے لڑکی تم تو کچھ زیادہ ہی ایکسائٹڈ ہورہی ہو۔''

''اُفوہ، بھئی آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔ کیا کہا ہے شیرازی نے؟ آپ سلیکٹ ہوگئے ناں؟'' اس بار اس کا لہجہ اور زیادہ بے تابی سمیٹے ہوئے تھا۔

''ہاں زنیرا آج سب کچھ فائنل ہوگیا ہے انہوں نے کل مجھے کانٹریکٹ سائن کرنے کے لیے بلایا ہے۔'' فاران کے لہجے میں خوشی کی بے پناہ کھنک تھی۔ زنیرا خوشی سے چیخ ہی اٹھی۔

''اُف فاران، آپ شیرازی کی فلم کے ہیرو بن گئے ہیں۔ اللہ کتنا مزہ آئے گا۔'' اس کے بے ربط جملے خوشی کے بے پناہ اظہار کو ظاہر کررہے تھے پھر کتنی ہی دیر دونوں اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ ابھی فاران کو اسی سلسلے میں دو تین دن اور رکنا تھا۔ باس سے اس نے لاہور میں کسی عزیز کی شادی کا بہانہ بنا کر کچھ دنوں کی چھٹی لے لی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اچانک فاران کو کچھ یاد آیا۔

''ارے ہاں زنیرا!...... تمہارے فیورٹ ڈائریکٹر صاحب نے ایک عجیب سی شرط بھی رکھی ہے۔''

''کیسی شرط......؟'' زنیرا نے بہت تجسس سے پوچھا۔

''ان کی تاکید ہے کہ جب وہ اس سلسلے میں پریس کانفرنس کریں گے تو مجھے اپنے آپ کو اَن میریڈ ظاہر کرنا ہوگا اور جب تک فلم ریلیز نہیں ہوجاتی مجھے میڈیا کے سامنے تمہارا اور بچوں کا قطعی کوئی ذکر نہیں کرنا ہے۔ بہت سختی سے منع کیا ہے انہوں نے۔'' فاران کا لہجہ الجھا ہوا سا تھا۔

''کوئی بات نہیں فاران، یہ بات ان کے اور ان کی فلم کے مفاد میں ہی ہے۔ کتنا مزہ آئے گا جب آپ کی فلم ہٹ ہوجائے گی۔ لڑکیاں آپ کے لیے کریزی ہورہی ہوں گی اور پھر یہ اچانک انکشاف کہ آپ کی ایک پیاری سی بیوی اور دو کیوٹ سے بچے بھی ہیں ان کے دل پر کیسی بجلی گرائے گا۔ ایمان سے پھر تو میں ہر جگہ آپ کے ساتھ ساتھ جایا کروں گی۔ خوب خون جلاؤں گی آپ کی فینز کا۔'' وہ بہت ترنگ میں کہتے ہوئے جیسے خوابوں کی حسین دنیا میں کھو رہی تھی۔

''اچھا، اچھا میری شیخ چلّی صاحبہ اب ذرا حقیقت کی دنیا میں واپس آجائیں۔'' فاران اس کی معصومیت پر بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اور ہاں میرے دونوں پھولوں کا کیا حال ہے۔ مجھے یاد تو نہیں کررہے؟'' دفعتاً اسے اپنے بچوں کی یاد آئی تھی۔

''فرحان تو مگن ہے لیکن روشانہ آپ کو بہت مس کررہی ہے۔ آج بھی بڑی مشکل سے سوئی ہے۔ فاران آپ نے اسے کچھ زیادہ ہی اپنا عادی بنا لیا ہے۔ قسم سے بڑا تنگ کرتی ہے مجھے آپ کی غیر موجودگی میں۔'' وہ شکوہ کرتے ہوئے بولی۔

"بس میری بچی کو بہلائے رکھنا، پرسوں تک آجاؤں گا۔" فاران کے لہجے میں اپنی بیٹی کے لیے پیار امنڈ آیا تھا۔

"اوکے ہمارے ہیرو جی، انشاء اللہ جب آپ گھر واپس آئیں گے تو سب سے پہلے تو میں آپ سے آٹوگراف لوں گی۔ آپ کی زندگی کا سب سے پہلا آٹوگراف۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی تو فاران نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔

فاران نے آنے میں تین دن مزید لگا دیے تھے۔ شیرازی سے ایکٹنگ کے اسرار و رموز سمجھتے ہوئے اسے بہت مزہ آرہا تھا۔ شیرازی بہت ہی اچھے انداز میں اسے ہر طرح سے بریف کر رہے تھے۔ فاران کی صبح شام زنیرا سے اور بچوں سے بات ہوتی رہی تھی۔ زنیرا نے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے خاندان میں پھیلا دی تھی۔ مبارک بادیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ سب ہی بہت ایکسائٹڈ تھے۔ زنیرا کی چھوٹی بہن لالہ رخ اور بھائی شہباز تو فخریہ اپنے، اپنے فرینڈز کو بھی یہ خبر سنا رہے تھے۔ امی فلموں کی زیادہ شوقین نہیں تھیں پر داماد کے ہیرو بننے کی ویلیو سے بھی واقف تھیں لیکن خاموش سے تھے تو بس اسلم صاحب یعنی زنیرا کے ابو...... انہوں نے اس خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ اس دن زنیرا اپنے بہن بھائی کے اصرار پر شام کو امی کے گھر پہنچی تو آنکھوں میں خوشی کی جگمگاہٹ لیے وہ ابو کے کمرے میں بھی چلی آئی۔

"فاران کب تک آرہا ہے؟" زنیرا سے انہوں نے بنا کسی خوشی کا اظہار کیے بجھے ہوئے لہجے میں جب سوال کیا تو زنیرا نے بڑی حیرت سے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہر طرف سے اس خبر کی اہمیت کو انجوائے کرتے ہوئے زنیرا کو ابو کا رویہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔

"جی انشاء اللہ وہ پرسوں تک آجائیں گے لیکن کیا آپ کو فاران کا فلم سائن کرنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ آپ کچھ اپ سیٹ سے لگ رہے ہیں ابو؟" زنیرا نے کچھ جھجکتے ہوئے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"بیٹا کبھی کبھی کسی جگمگاتی ہوئی رنگین خوشی کے پیچھے گہرے دکھ چھپے ہوتے ہیں اور ان کا پتا اس وقت چلتا ہے جب وہ دکھ اپنی سیاہی اس جگمگاتی خوشی پر پھیلا کر زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا بکھیر دیتے ہیں۔" اسلم صاحب کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ زنیرا بس انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

فاران کو لاہور گئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو چکے تھے اور فی الحال اس کا واپس آنے کا کوئی پروگرام بھی نہیں لگ رہا تھا۔ زنیرا کا انتظار اب سخت بوریت میں بدلنے لگا تھا۔ بچوں کو خاص طور پر روشانہ کو بہلاتے، بہلاتے اب وہ تھکنے لگی تھی جو ہر روز اپنے بابا کا انتظار کرتے ہوئے اسے کافی تنگ کرتی تھی۔

"مما آپ نے تو کہا تھا کہ بابا آج آجائیں گے لیکن وہ آج بھی نہیں آئے۔" پورے دن کا انتظار رات اس کی آنسو بھری آنکھوں پر ختم ہوتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ فاران وہاں کچھ ایسا بزی ہو چکا تھا کہ بچوں سے تفصیلی بات کرنے کا بھی اس کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ زنیرا سے بھی بس جلدی، جلدی میں ہی بات ہوتی۔

"زنی میری جان، انشاء اللہ میں کل رات تک ہر حال میں واپس آنے کی کوشش کروں گا۔" آج بھی وہ زنیرا کو کل اپنے آنے کا یقین دلا رہا تھا۔

"بس، بس رہنے دیں فاران...... پتا نہیں کتنے دنوں سے آپ ہمیں یہ جملے بول بول کر بہلائے جا رہے ہیں۔ قسم سے مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ کے ڈائریکٹر صاحب نے آپ کو کڈنیپ کر لیا ہے۔" زنیرا آج خاصی الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ارے، ارے اپنے فیورٹ ڈائریکٹر کے لیے ایسی بات کہہ رہی ہو...... اگر انہیں پتا چل

جائے ناں کہ ان کی اتنی بڑی فین کے اُن کے بارے میں یہ خیالات ہیں تو اُن کو کتنا دکھ ہوگا۔" فاران نے اس کی خفگی کو مزاح کا روپ دینے کی کوشش کی لیکن وہ مزید بھڑک گئی۔

"آپ کو نہیں پتا فاران کہ روشانہ آج کل کتنی ضدی اور چڑچڑی ہو گئی ہے۔ صبح شام آپ کا انتظار کرتی رہتی ہے اور مشکل یہ ہے کہ سارا دن آپ اتنا بزی ہوتے ہیں کہ بچوں سے بات کرنے کا بھی آپ کے پاس ٹائم نہیں ہوتا اور رات جب آپ کا فون آتا ہے تو وہ سو چکے ہوتے ہیں۔"

"کیا کروں جان...... میرا تو خود دل چاہ رہا ہے کہ میں اڑ کر تم لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ ہیرو بننا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ دو تین تو میرے اسکرین ٹیسٹ ہو چکے ہیں، مختلف ٹریننگ دی جا رہی ہیں مجھے، دو تین میٹنگز تو پروڈیوسر کے ساتھ ہو چکی ہیں۔ ہیروئن کا سلیکشن بھی ان ہی دنوں میں ہو رہا ہے۔ شیرازی صاحب کا خیال ہے کہ ہیروئن سلیکٹ ہو جائے تو وہ ہم دونوں کی کیمسٹری بھی بنانے کی کوشش کریں گے۔ یار اب تو میں خود بھی تھکنے لگا ہوں۔" فاران کے لہجے میں اتری تھکن کو محسوس کر کے زنیرا پریشان ہو گئی۔

"اچھا، اچھا فاران پریشان مت ہوں۔ میں بچوں کو سنبھال لوں گی اور اپنے دل کو بھی تسلی دے دوں گی کہ میرا سجنا بہت جلدی میرے پاس واپس لوٹ آئے گا۔" زنیرا نے لہجے میں شوخی سمو کر اتنے پیار سے کہا کہ فاران کا موڈ ایک دم فریش ہو گیا۔

"اوکے میری سجنی اب اپنے سجنا کو سونے کی اجازت دے دو۔ کل نو بجے اسٹوڈیو پہنچنا ہے۔ ویسے فکر مت کرو، سپنوں میں تم میرے ساتھ ہی ہو گی۔" زنیرا نے مسکراتے ہوئے اس کے جملے کی خوبصورتی کو اپنے دل میں اتارا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"بیٹا مجھے ڈر ہے کہ فاران کی جاب پر اس فلم کی وجہ سے کوئی برا اثر نہ پڑے۔ ماشاء اللہ سے اتنی اچھی جاب ہے، فاران کو اسے کھونا نہیں چاہیے۔" آج اسلم صاحب زنیرا کے گھر آئے ہوئے تھے اور فاران کی طرف سے کافی فکرمند بھی لگ رہے تھے۔

"ارے نہیں، ابو فاران نے بہت عرصے سے چھٹیاں نہیں لی تھیں اسی لیے کمپنی نے اسے بہ آسانی چھٹیاں دے دی ہیں۔ اس معاملے میں فاران نے بالکل بھی بے پروائی نہیں برتی ہے۔" زنیرا نے فوراً ہی فاران کی طرف سے صفائی دی تو وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

"ابو میں نے نوٹ کیا ہے کہ آپ کو فاران کا فلم میں کام کرنا اچھا نہیں لگ رہا؟" زنیرا نے کچھ جھجکتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح انہوں نے مسکرا کر اس کی بات کی تردید نہیں کی بلکہ ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بیٹا...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل تو ہر کوئی فلموں کی اس جادونگری میں آجانے کو اپنے لیے خوش قسمتی کی ایک انتہا سمجھتا ہے اور اگر وہ ہٹ ہو جائے تو سمجھو شہرت اور پیسے کو سمیٹنا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور فاران کی جھولی میں یہ موقع خود بخود قدرت نے ڈال دیا ہے۔ اسے کوئی بھی effort نہیں کرنی پڑی لیکن زنیرا پتا نہیں کیوں میرا دل اس خوشی کو محسوس نہیں کر پا رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنی بیٹی سے بے اندازہ محبت ہے۔ بیٹا میں تمہاری حساس طبیعت سے واقف ہوں...... جب تم چھوٹی سی تھیں تو میری ذرا سی بے توجہی تمہیں فوراً ہی کملا دیا کرتی تھی۔ تمہاری امی کی ہلکی سی خفگی سے تمہاری آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر جاتے تھے اور......" وہ ایک دم بات ادھوری چھوڑ کر روشانہ کی طرف دیکھنے لگے جو کچھ دور... بیٹھی

اپنا اسکول ہوم ورک کر رہی تھی۔ زنیرا نے الجھ کر ان کی طرف دیکھا۔

''ابو لیکن ان سب باتوں کا تعلق فاران کے فلم میں کام کرنے سے کیا ہے؟''

''بیٹا بہت گہرا تعلق ہے جسے تم ابھی نہیں سمجھ رہی ہو۔ اس انڈسٹری کی چمک دمک انسان کی آنکھوں کو اتنا خیرہ کر دیتی ہے کہ پھر اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ تمہارے اس پُرسکون محبتوں سے معمور گھر کی خوشیوں پر کہیں اس فلم انڈسٹری کی جگمگاہٹ ایک اندھیرا بن کر نہ چھا جائے۔ زنیرا تمہارا حساس دل وہ سب نہیں برداشت کر پائے گا جن کا تمہیں ابھی ادراک نہیں ہے خاص طور پر روشانہ جو ہو بہو تمہاری تصویر ہے، وہ تو ٹوٹ ہی جائے گی۔'' اسلم صاحب کی دور اندیش نگاہیں جیسے بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔ زنیرا نے گہری نظروں سے ان کے پُرتفکر چہرے کی جانب دیکھا اور دھیمے سے مسکرا دی۔

''ابو میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں لیکن مجھے فاران پر پورا بھروسا ہے وہ کبھی بھی اپنی فیملی سے الگ نہیں رہ سکتے۔'' اس نے اپنے ابو کے احترام میں لفظ ''فیملی'' استعمال کیا تھا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں بتائے کہ فاران اس سے محبت نہیں عشق کرتا ہے۔ کیسے اب بھی لاہور سے ہر رات وہ اپنی حکایاتِ دل اسے سناتا رہتا ہے۔ کتنا بے تاب اور بے قرار ہو رہا ہے وہ اس کے لیے جتنی شدت سے فاران نے اسے چاہا ہے شاید کوئی کسی کو ایسے چاہ ہی نہیں سکتا۔ یہ سب باتیں اس نے دل میں سوچی تھیں لیکن اس کے ابو نے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جھلملاتی فاران کی محبت کی روشنی کو اس پر اعتماد اس پر اعتبار کے جنونی جذبے کو بہت اچھی طرح سے محسوس کیا تھا تبھی دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''ہمیشہ خوش رہو میری بچی۔''

''ارے ابو میں آپ کو بنا کھانا کھائے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔'' وہ ان کے جانے کا ارادہ دیکھ کر انہیں رکنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔

''بیٹا ایسے ہی کسی کام سے نکلا تھا تو تم سے بھی ملنے چلا آیا۔ تمہاری امی یقیناً مجھ سے خفا ہوں گی کہ بغیر اُن کو لیے میں تمہارے گھر آ گیا۔ انشاء اللہ اگلی بار ان کے ساتھ آؤں گا تو ضرور کھاؤں گا۔'' وہ اس کے اصرار کے باوجود نہیں رکے۔ زنیرا ان کے جانے کے بعد جب واپس کمرے میں آئی تو روشانہ کتاب ہاتھ میں لیے پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔

''کیا بات ہے روشی...... ہوم ورک میں کوئی مشکل پیش آ رہی ہے؟'' اس نے بیٹی کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے اس سے پیار سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''مما اگر آج بھی بابا نہیں آئے تو ناں کل ہم لوگ لاہور ان کے پاس چلے جائیں گے اور اگر آپ نہیں گئیں تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔'' اس نے بڑے حتمی لہجے میں اپنا پروگرام سنا دیا۔ زنیرا بس اسے دیکھ کر ہی رہ گئی۔ اس وقت روشانہ کا انداز ایسا تھا کہ زنیرا کو اسے کچھ سمجھانا بالکل ہی بیکار لگا لیکن پھر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رات کو وہ بچوں کو ان کے کمرے میں سلانے کے لیے لے کر آئی ہی تھی کہ اچانک ہی روشانہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک چیخ سی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ ''بابا'' زنیرا نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور ایک لمحے کو ساکت سی کھڑی دیکھتی ہی رہ گئی۔ دروازے کی چوکھٹ پر فاران کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اپنی چابی سے دروازہ کھول کر وہ اتنی خاموشی سے اندر آیا تھا کہ ان لوگوں کو خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بچے فاران سے لپٹے اپنی بے تحاشا خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور وہ جھلملاتی آنکھوں سے اس کے اس خوب صورت سرپرائز پر جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

☆☆☆

فاران کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے خاندان میں پھیل گئی تھی اور دو دن سے جیسے زنیرا کے گھر میں لوگوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا، لوگ جوق در جوق اسے مبارک باد دینے چلے آ رہے تھے اور وہ سب کے درمیان جیسے راجا اِندر بنا بیٹھا تھا۔ زنیرا اس کی اتنی اہمیت دیکھ کر فخر آمیز خوشی سے سرشار ہوئی جا رہی تھی۔ یہ شوبز بھی عجیب پُراسراری جگہ ہے کچھ لوگ جو اسے برا بھی سمجھتے ہیں لیکن اگر کسی فنکار سے ان کی دور کی بھی رشتے داری ہو تو فخریہ انداز میں تعلق بتاتے ہوئے جھکتے بھی نہیں ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا اور پھر دفعتاً اسے اپنے ابو یاد آ گئے۔ وہ ابھی تک فاران سے ملنے نہیں آئے تھے۔ ہاں البتہ فون پر ان کی فاران سے بات ضرور ہوئی تھی۔

''فاران میرے خیال میں کل ہمیں ابو سے ملنے ضرور جانا چاہیے۔ آپ کی ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔'' رات سونے سے پہلے زنیرا نے فاران سے جب یہ بات کی تو وہ کچھ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''فاران کیا بات ہے، کیا آپ نے ابو کے نہ آنے کو مائنڈ کیا ہے؟'' زنیرا نے اس کی خاموشی پر کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اصل میں ابھی جب تم کچن میں تھیں تو شیرازی صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کل مجھے فوری بلایا ہے۔'' فاران نے کچھ جھجکتے ہوئے اسے بتایا اور زنیرا کا...... ردعمل فاران کی توقع کے عین مطابق تھا۔

''ارے یہ کیسے ممکن ہے، ابھی دو دن ہی تو ہوئے ہیں آپ کو آئے ہوئے۔ آپ کے ڈائریکٹر صاحب نے یہ کیا تماشا لگایا ہوا ہے۔ خرید نہیں لیا ہے انہوں نے آپ کو۔ روشی تو ہرگز برداشت نہیں کر سکے گی آپ کا پھر سے یوں اچانک چلے جانا اور...... اور میں بھی نہیں۔'' وہ بے اختیار رو دی۔

''اُفوہ زینی...... اگر تم اس طرح رو دو گی تو میں کیسے اپنی زندگی کے اس مشکل ترین ٹاسک کو پورا کر سکوں گا۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے جان۔ سمجھنے کی کوشش کرو ناں۔'' وہ اسے اس طرح روتے دیکھ کر بے حد پریشان ہو گیا تھا۔

''فاران پلیز چھوڑ دیں آپ اس فلم ولم کو...... قسم سے اگر پتا ہوتا کہ مجھے آپ کے ہیرو بننے کی قیمت آپ کی جدائی کی صورت میں دینا ہو گی تو میں کبھی بھی آپ کو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ بس آپ شیرازی صاحب کو منع کر دیں۔ میں آپ کو کل ہرگز بھی نہیں جانے دوں گی۔'' وہ اس کے سینے سے لگی بس روئے جا رہی تھی۔

''زنیرا تم تو روشانہ سے بھی چھوٹی بچی لگ رہی ہو۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں کہ بس میں انہیں فون کر کے کہہ دوں کہ اب میری بیوی کا موڈ بدل گیا ہے اس لیے میں آپ کی فلم میں کام نہیں کر سکتا۔ ارے پاگل لڑکی میں ایگری منٹ سائن کر کے آیا ہوں اور اتنے بڑے ڈائریکٹر کی فلم سائن کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ تو شکر کرو کہ نیوز رپورٹرز کو ہمارے گھر کا ایڈریس نہیں معلوم ورنہ کتنے ہی تو انٹرویوز کے لیے آ جاتے۔'' وہ کبھی الجھ کر اور کبھی پیار سے اسے سمجھا رہا تھا لیکن زنیرا کا دل جیسے ڈوبا جا رہا تھا اور آنسو تھم کر ہی نہیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

فاران جہاز کی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے زنیرا کو اپنے موبائل سے مسلسل فون ٹرائی کر رہا تھا لیکن نہ تو وہ لینڈ لائن پر کال اٹینڈ کر رہی تھی اور موبائل تو اس نے آف ہی کیا ہوا تھا۔ تبھی ائر ہوسٹس نے آ کر... اس سے موبائل آف کرنے کی ریکویسٹ کی کہ جہاز کے ٹیک آف کرنے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ فاران نے مایوس ہو کر موبائل آف کر دیا۔

آج روشانہ اور فرحان کے اسکول جانے کے بعد جب وہ ائرپورٹ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو زنیرا کا اترا ہوا چہرہ اور سوجی ہوئی آنکھیں جیسے اس کے دل کو مسلے دے رہی تھیں۔

”پلیز زینی مجھے ایسے تو رخصت نہ کرو، اگر تم میری مجبوری نہیں سمجھو گی تو پھر کون سمجھے گا۔“ اس نے زینی کو بے اختیار اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”فاران آپ کو دیر ہو رہی ہے اگر فلائٹ مس ہوگئی تو شیرازی صاحب آپ کو فلم سے باہر کر دیں گے۔“ وہ بے حد تلخ ہو رہی تھی۔ فاران کو بھی غصہ آگیا۔

”فلم سے باہر کر دیں گے تو میں مر نہیں جاؤں گا لیکن تمہارا رویہ ایسا ہی رہا تو میں موت کو اس زندگی پر ترجیح دینا زیادہ پسند کروں گا۔“ فاران کی اس بات پر زنیرا نے ہول کر اس کی طرف دیکھا۔ سفر پر جانے سے پہلے کتنی بدشگونی کی بات کر رہا تھا وہ۔

”پلیز فاران آپ خیریت سے جائیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ضبط کرتے کرتے بھی اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔

”زینی بس یہ میری پہلی اور آخری فلم ہوگی۔ مجھے تم سے اور بچوں سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں۔ یہ جو تھوڑے سے جدائی کے دن ہیں پلیز انہیں کسی طرح سہار لو۔ خدا کی قسم مجھے نہیں پتا تھا کہ ہم لوگوں کو اس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور پھر تم تو سب سے زیادہ ایکسائٹڈ تھیں...... سوچو اگر یہ فلم ہٹ ہوگئی تو ایک مشہور ہیرو کی بیوی کے طور پر تمہاری کتنی اہمیت اور عزت ہوگی ہر جگہ۔ اگر لوگ مجھ سے آٹو گراف مانگیں گے تو میں اُن سے کہوں گا کہ پہلے میری بیگم سے اجازت لو۔“ آخری جملے کو اس نے اتنے مزے سے ادا کیا کہ زنیرا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

”شکر خدا کا تم کو ہنسی تو آئی اب میں اطمینان سے جا سکوں گا۔“ فاران نے جیسے اطمینان کی سانس لی تھی۔ زنیرا نے اداس نظروں سے اس کی جانب دیکھا جو بہت مطمئن انداز میں اب اپنا سوٹ کیس بند کر رہا تھا۔

”بس میری ایک چھوٹی ہنسی کو اپنے اطمینان کا جواز بنا لیا۔“ اس نے دل ہی دل میں فاران سے شکایت کی لیکن لب خاموش رہے تھے۔ فاران کو سی آف کرنے کے بعد وہ بجھے دل سے اپنے کمرے میں واپس آگئی جہاں فاران کی چھوڑی ہوئی چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی فاران کے آفس جانے کے بعد اپنے بکھرے ہوئے کمرے کو سمیٹتے ہوئے ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتی تھی۔ اسے کبھی بھی فاران پر غصہ نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ قالین پر پڑے موزے کو بھی وہ بہت پیار سے اٹھاتی تھی۔ بیڈ پر بے پروائی سے ڈالے گئے گیلے تولیے سے بھی اسے کوئی الجھن نہیں محسوس ہوتی تھی لیکن آج اس نے ان تمام چیزوں کو بہت بے دلی سے سمیٹا اور خاموشی سے آنکھیں بند کر کے اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ موبائل اس نے آف کر دیا تھا وہ جانتی تھی کہ فاران عادت کے مطابق ائرپورٹ پہنچ کر اسے فون ضرور کرے گا اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ لینڈ لائن پر بجتی ہوئی بار بار فون کی گھنٹی اسے بتا رہی تھی کہ کون اس سے بات کرنا چاہ رہا ہے لیکن زنیرا کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی آواز بھی سنے۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ ابھی ایک رات پہلے تک وہ تفخر و انبساط کے جذبے سے سرشار سارے گھر میں چہکتی پھر رہی تھی۔ فاران سے وہاں کے قصے بے حد دلچسپی سے سنتی رہی تھی۔ شیرازی صاحب کے بارے میں کتنے ہی سوالات کر ڈالے تھے اس نے فاران سے۔ اس نے شاید یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ فاران محض دو دن کے لیے اس کے پاس آیا ہے۔ اس کا ایک دم سے دوبارہ چلے جانا جیسے زنیرا کی ساری ایکسائٹمنٹ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ اسے یہ فلم اپنی اتنی بڑی رقیب محسوس ہو رہی تھی جسے قتل کر دینے کو دل چاہ رہا تھا۔ شیرازی صاحب سے بڑا ولن اسے پوری دنیا میں کوئی اور نہیں نظر آ رہا تھا۔

”کاش اس دن فاران کو لاہور نہ جانا پڑتا......“ یہ شادی کے بعد اس کی پہلی سالگرہ تھی جو اس نے فاران کے بنا منائی تھی۔ پتا نہیں کیسا منحوس دن تھا وہ۔ ہاں اس سالگرہ والے روز ہی تو فاران کو جیسے شیرازی صاحب نے اس سے چھین لیا تھا۔ کاش، کاش وہ اس دن فاران کو کسی طور بھی لاہور نہ جانے دیتی یا پھر وہ کسی اور فلائٹ سے چلا جاتا جس میں وہ ڈائریکٹر نہ ہوتا۔ وہ بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سوچوں کی یلغار میں الجھ رہی تھی اور ابھی تو اسے روشانہ کے ری ایکشن کا بھی سامنا کرنا تھا۔ کتنا شاک لگے گا اسے جب پتا چلے گا کہ اس کے بابا پھر سے اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

”ابو آپ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے۔ ابھی تو صرف شروعات ہے اور میں اندر سے بھربھری مٹی کی طرح ڈھتی جا رہی ہوں۔ میرا گھر میرے معصوم بچے سب کتنے ڈسٹرب لگنے لگے ہیں۔ اس وقت فاران کی آنکھوں میں مجھے محبت کی نرمی نہیں بلکہ آنے والے دنوں کا خمار ڈولتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ابو پلیز دعا کریں کہ فاران کی یہ فلم بالکل فلاپ ہو جائے وہ پھر کبھی کوئی فلم نہ کر سکیں۔ میں بہت خود غرض ہو رہی ہوں... اس وقت لیکن ابو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اس فلم... انڈسٹری کی چمک دمک میں اگر فاران کو میں اور بچے نظر نہیں آئے تو ہم بے موت مر جائیں گے۔ ابو میری تو ہر سانس میں صرف فاران بستے ہیں۔ میں تو سانس بھی نہ لے پاؤں گی۔“ وہ انجانے میں اپنے ابو سے لاڈ کرتے ہوئے اپنے دل کی باتیں کہہ رہی تھی جو دور ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس تھے۔

☆☆☆

”امی مجھے آئے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں لیکن الطاف انکل کے گھر سے ابھی تک کوئی ملنے ہی نہیں آیا۔ سب خیریت تو ہے ناں۔“ اجالا نے ننھے عفی کو بستر پر لٹاتے ہوئے پوچھا جو تھوڑی ہی دیر پہلے اپنی نانی کی گود میں سو گیا تھا۔

”ارے بیٹا جب سے تم آئی ہو ڈھنگ سے تم سے بات کرنے کا موقع ہی کب ملا ہے، ماشاءاللہ صبح سے شام تک مہمانوں کی آمد و رفت اور پھر تمہارے بچوں نے بھی تو تمہیں اتنا مصروف رکھا ہوا ہے۔ اصل میں ابھی عادی نہیں ہوئے ناں وہ یہاں کے ماحول کے۔ اپنے امریکا کو مس کر رہے ہیں۔“ اجالا کے سوال کے جواب میں ماں کی طویل کتھا سن کر اجالا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

”امی آپ کا جواب اتنا طویل تھا کہ اس میں میرا سوال ہی کہیں کھو گیا۔ پلیز مجھے بتائیں ناں کہ راحیلہ باجی کو کیا میرے آنے کی اطلاع آپ لوگوں نے نہیں دی ہے؟“ اس بار اجالا کے لہجے میں تجسس بھی در آیا تھا۔ شادی کے بعد اتنے عرصے میں پہلے وہ محض ایک مرتبہ ہی پاکستان آئی تھی۔ تین بچوں کی اوپر تلے پیدائش نے اسے کافی مصروف کر دیا تھا اور پھر عدیل کا دل ہی نہیں مانتا تھا کہ وہ اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ اتنا لمبا سفر کرے اور دوسرے وہ دونوں ہی ڈرتے تھے کہ پتا نہیں اتنے چھوٹے بچوں کے لیے پاکستان کا پانی اور وہاں کی آب و ہوا موافق ہوگی بھی یا نہیں، پہلی بار وہ شادی کے سات ماہ بعد جب پاکستان آئی تھی تو عدیل بھی اس کے ساتھ تھا۔ سسرال اور میکے دونوں جگہ ہی اس نئے نویلے جوڑے کی بھرپور پزیرائی ہوئی تھی۔ دعوتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ راحیلہ باجی نے تو ان کے آنے کے دوسرے ہی دن ان کے اعزاز میں ڈنر رکھ دیا تھا۔ اجالا کو ان کے گھر جانے کے تصور سے ہی ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ دشمنِ جاں بھی اپنی محبوب بیوی کے ہمراہ وہاں ضرور موجود ہوگا۔ آخر وہ اس کی بہن کا گھر ہے۔

"تم میرے دل سے چلے کیوں نہیں جاتے فاران۔ میری اتنی خوب صورت زندگی میں تمہاری یاد کا کانٹا مجھے کیوں بے چین کیے رکھتا ہے۔ میں اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگتی رہتی ہوں کہ شاید عدیل کی اتنی شدید محبت کا صلہ میں منافقت سے دے رہی ہوں لیکن میرا اللہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اس معاملے میں بالکل بے بس ہوں کہ لاکھ نہ چاہنے کے باوجود تمہیں کھودینے کا دکھ میرے دل کے اندر کہیں چھپا رہتا ہے لیکن مجھے اپنے اللہ پر پورا یقین ہے کہ ایک روز وہ خود ہی میرے دل سے اس دکھ اس کسک کو نکال کر اس میں صرف اور صرف عدیل کا پیار بھر دے گا۔" کار کی پچھلی سیٹ پر وہ عدیل کے ساتھ بیٹھی انہی سوچوں میں گم تھی۔ وہ لوگ اس وقت راحیلہ باجی کے گھر جا رہے تھے۔ تب ہی کار ایک دھچکے سے راحیلہ باجی کے گھر کے سامنے رک گئی۔ سامنے گیٹ سے اسی وقت فاران بھی باہر نکلا تھا۔ اجالا کے دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہو گئیں۔۔اور نہ جانے کیوں جیسے لاشعوری طور پر اس نے عدیل کے ہاتھ کو تھام لیا۔

"ارے اجالا یہ امریکا نہیں ہے جو ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یوں سب کے سامنے چلیں۔" عدیل نے شوخی سے اسے دیکھا تو اس نے کچھ خجل ہو کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تبھی فاران مسکراتا ہوا ان کے نزدیک آ گیا۔

"ارے اجالا کیسی ہو تم؟" اس کا لہجہ بہت پُرجوش تھا اور وہ بڑی گرم جوشی سے عدیل سے ہاتھ ملاتے ہوئے اجالا کی خیریت بھی پوچھ رہا تھا۔ کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ لگ رہا تھا وہ۔ عدیل کی شخصیت اس کے سامنے اجالا کو بہت دبی دبی سی لگی۔ دل میں ایک کسک سی اٹھی۔ فاران تو اس کا خواب تھا۔ وہ خواب جو وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی لیکن اس کی تعبیر کسی اور نے پالی تھی۔ راحیلہ باجی بھی اس سے بہت والہانہ انداز میں ملیں۔ وہ اجالا سے تین سال بڑی تھیں لیکن عمر کا یہ چھوٹا سا فرق ان کی دوستی کے درمیان کبھی حائل نہیں ہوا تھا۔ ساجدہ باجی تو شادی کے بعد سے ہی بحرین میں مقیم تھیں ویسے بھی وہ اجالا سے کافی بڑی تھیں اس لیے دوستی سے زیادہ ان کے درمیان محبت اور احترام کا زیادہ رشتہ تھا۔ الطاف صاحب نے بھی بہت شفقت سے دونوں کو گلے لگایا اور اپنے شفیق خالو سے ملتے ہوئے نہ جانے کیوں اجالا کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس کے مایوں والے روز الطاف انکل اس کے کمرے میں چلے آئے تھے اور اسے گلے سے لگا کر بے اختیار رو پڑے تھے۔

"تم تو میرے گھر کا چراغ تھیں بیٹا لیکن فاران کی ضد کی وجہ سے اس کی روشنی اب کسی اور کے گھر میں بکھرے گی۔" ان کے یہ الفاظ اجالا کے دل میں ایک درد بن کر ایسے اترے کہ پھر اسے اپنے آنسوؤں پر قابو ہی نہیں رہا تھا اور اس وقت ان سے ملتے ہوئے نہ جانے کیوں ان کے الفاظ کی بازگشت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"ارے بھئی یہ زنیرا کہاں غائب ہے، اسے کر بتاؤ کہ مہمان آ چکے ہیں۔" الطاف انکل نے راحیلہ باجی کو مخاطب کر کے کہا تو اجالا نے غور سے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر کچھ تلاش کرنا چاہا۔ راحیلہ باجی نے ایک بار امریکا فون کر کے اسے بتایا تھا کہ وہ سب لوگ فاران کی شادی سے سخت ناخوش ہیں اور کسی نے بھی زنیرا کو بہو کے طور پر دل سے قبول نہیں کیا ہے اور اس وقت اجالا کا دل شدت سے اس بات کا متمنی ہونے لگا کہ وہ اپنی آنکھوں سے الطاف انکل اور راحیلہ باجی کا روکھا اور سرد رویہ زنیرا کے ساتھ روا ہوتے ہوئے دیکھے۔ وہ لوگ اپنے ایک، ایک فعل سے یہ ظاہر کریں کہ ان کی اولین پسند اور چاہت فاران کے لیے صرف اور صرف وہ تھی زنیرا نہیں۔

اس وقت بھی زنیرا کا ان لوگوں سے ملنے نہ آنا اسے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہی لگا تھا۔ وہ یقیناً ان لوگوں کے رویے سے خائف تھی لیکن راحیلہ باجی کے جواب نے جیسے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔

"ارے ابا وہ جب سے آئی ہے کچن میں ہی مصروف ہے۔ مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بریانی وہ خود بنائے گی بس بریانی کو دم پر لگا کر آ رہی ہے۔" راحیلہ باجی کے لہجے میں چھلکتی بے پناہ محبت زنیرا کے لیے محسوس کر کے وہ جیسے ششدر رہ گئی۔ الطاف انکل نے مسکراتے ہوئے اجالا کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کس نیکی کے صلے میں اللہ نے ہمیں زنیرا جیسی بہو دے دی۔ یقین کرو اجالا! اتنی نیک اور پیاری بچی ہے زنیرا کہ کیا بتاؤں۔" وہ کتنی محبت سے زنیرا کی تعریف کر رہے تھے اور وہ بھی اس اجالا سے جسے انہوں نے اس کے بچپن سے ہی اپنی بہو مانا تھا۔ اور جس کی شادی پر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے انہوں نے جی بھر کر زنیرا کو کوسا تھا اور آج اجالا کے جذبات اس کے احساسات کو بالکل بھلا کر وہ اسی کے سامنے زنیرا کو بہو کے بجائے بیٹی گردان رہے تھے۔ اسے اپنے گھر کی رونق اور اپنی خوشیوں سے تشبیہ دے رہے تھے۔ اجالا کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ تبھی گہرے فیروزی کامدار اسٹائلش سوٹ میں ملبوس ہنستی مسکراتی زنیرا ان لوگوں کے درمیان چلی آئی۔ وہ بہت خوش دلی سے اجالا سے ملی۔ فاران اور عدیل بہت جلد ہی ایک دوسرے سے گھل مل گئے تھے۔ اجالا بھی اپنے دل کا درد چھپا کر بظاہر ہنستے مسکراتے سب سے باتیں کر رہی تھی لیکن زنیرا کی اپنی سسرال میں اتنی آؤ بھگت اور پذیرائی اسے ایک عجیب سی جیلسی سے دو چار کر رہا تھا۔ یہ سب تو اس کا حق تھا جو زنیرا نے اس سے چھین لیا تھا۔ راحیلہ باجی اور الطاف انکل کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ان کا زنیرا سے یہ التفات اجالا کو

کتنی تکلیف دے رہا ہے۔ ان کے حساب سے تو عدیل جیسے چاہنے والے شوہر کا ساتھ پا کر اجالا اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ شادی اُس نے محض اپنی انا کی خاطر کی تھی۔ فاران نے اسے اور اس کی محبت کو ٹھکرایا تو اس نے فوراً ہی عدیل کا ہاتھ تھام کر فاران کو جتا دیا کہ اسے بھی فاران کی کوئی پروا نہیں اور اس وقت بھی وہ مسکراتے چہرے کا ماسک سجائے کسی پر بھی یہ ظاہر نہیں کر رہی تھی کہ اس کا دل کس اذیت سے دوچار ہو رہا ہے۔ اسے اپنی انا اور خودداری کچھ زیادہ ہی عزیز تھی۔ فاران کی محبت بھری نگاہ جب، جب زنیرا کی طرف اٹھتی تب اجالا بھی مسکرا کر کوئی شوخ سا جملہ عدیل کی طرف اچھال دیتی۔ اپنے اور عدیل کے ورلڈ ٹور کے قصے اتنے پیار سے سنائے تھے اس نے کہ سب مبہوت ہو کر سن رہے تھے اور عدیل آنکھوں میں پیار کی چمک لیے اسے تک رہا تھا اور یہ اذیت بھرا کھیل کھیلتے کھیلتے جب وہ تھکنے لگی تو واپس لوٹ آئی تھی۔

رات عدیل کے سو جانے کے بعد نہ جانے کتنی دیر تک اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا۔ اس دن کے بعد پھر اس کی زنیرا اور فاران سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی یا پھر اس نے چاہا ہی نہیں تھا۔ وہ عدیل کے ساتھ اسلام آباد، مری، کاغان، سوات وغیرہ کے ٹرپ پر نکل گئی تھی اور اب تقریباً آٹھ نو سال بعد اس کا پاکستان آنا ہوا تھا تو پورا خاندان جیسے اس سے ملنے کو اُمڈ آ رہا تھا لیکن راحیلہ باجی اور الطاف انکل خلافِ توقع نہ ہی اس سے ملنے آئے تھے اور نہ ہی ان کا کوئی فون آیا تھا۔ اس نے تو لاشعوری طور پر فاران اور زنیرا کا بھی انتظار کیا تھا لیکن ان کی فیملی تو جیسے پتا نہیں کہاں کھو گئی تھی۔ ویسے بھی پچھلے سات آٹھ سالوں میں تین بچوں کی آمد نے جیسے اس کے دل کے موسم کو بہت بدل دیا تھا۔ بچوں کی مصروفیت ان کی فکر اور ... کے مختلف خوب صورت رنگوں نے جیسے کسی کی یاد ... بہت دُھندلا دیا تھا۔ بلکہ اکثر تو اسے یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ فاران کبھی اس کی زندگی میں کتنی اہمیت حامل ہوا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ عدیل کی محبت نے بہت خاموشی سے اس کے دل میں کچھ جگہ بنالی تھی کہ فاران کی یاد کو خود بخود اس کے دل سے نکل جانا پڑا تھا اور اس وقت اپنی امی سے فاران کی فیملی کے بارے میں پوچھتے ہوئے اس کے دل میں قطعی وہ جذبات نہیں تھے جو پہلے کبھی ہوا کرتے تھے۔

"ارے بیٹا بس کیا بتاؤں آج کل الطاف بھائی تو ذیشان کے پاس اسلام آباد میں مقیم ہیں اور راحیلہ آج کل زنیرا اور فاران کی وجہ سے کافی پریشان ہے بلکہ کچھ دنوں سے وہ زنیرا کے پاس ہی رہ رہی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔

"امی پلیز مجھے بتائیں ناں آخر ہوا کیا ہے، میرا تو دل ہولا جا رہا ہے۔" اجالا سچ مچ پریشان ہو گئی تھی۔

"تمہیں میں نے فون پر بتایا تو تھا کہ فاران نے اپنی فرم سے ایک سال کی چھٹی لے کر ایک فلم میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔" امی کی بات پر اجالا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں امی لیکن اس وقت تو بقول آپ کے زنیرا اور سب گھر والے بہت خوش تھے اور بات تھی بھی بہت بڑی اور حیرت انگیز...... سچ امی شیرازی جیسے ڈائریکٹر کی فلم میں کام کرنے کے لیے بڑے بڑے آرٹسٹ بے چین رہتے ہیں۔ میں نے تو خود اپنے سب جاننے والوں کو بڑے فخر سے یہ خبر سنائی تھی۔" اجالا نے اپنی امی کی بات پر کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔

"ہاں بیٹا شروع، شروع میں تو زنیرا بھی بہت خوش رہی پھر اخبارات میں فاران کی اپنی ہیروئن کے ساتھ خوب تصاویر شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ ہیروئن بھی فاران کی طرح بالکل نئی ہے۔ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر فلم کی پبلسٹی بہت شاندار طریقے سے کر رہے ہیں لیکن اجالا تصویریں کافی رومینٹک انداز کی ہوتی ہیں۔ زنیرا نے کبھی ہم میں سے کسی پر کچھ ظاہر نہیں کیا لیکن پچھلے دنوں راحیلہ میرے پاس آئی تو کچھ پریشان اور الجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جب سے فاران نے فلم میں کام کرنا شروع کیا ہے اس کی میرڈ لائف پر اس چیز کا بہت برا اثر پڑا ہے۔ ایک تو اس کا زیادہ تر وقت اب لاہور میں گزرتا ہے جس سے زنیرا اور بچے خاص طور پر روشانہ بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ اچھی خاصی ذہین بچی کا اس بار رزلٹ بھی بہت خراب آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ زنیرا، فاران کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی پوزیسو ہے، وہ فاران کی ہیروئن کے ساتھ ان تصاویر کو برداشت ہی نہیں کر پا رہی۔ بقول راحیلہ اس کو اتنی عقل نہیں آ رہی کہ یہ سب فلم کی ڈیمانڈ ہے، رول کا تقاضا ہے، اب ہیرو اپنی ہیروئن کو بہن تو بنانے سے رہا۔" اس بار امی نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اوہ......!" اجالا نے ایک گہری سی سانس لی۔ "میں زنیرا کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتی تھی لیکن وہ تو دوسری ناقص العقل عورتوں کی طرح بلاوجہ کی جیلسی اور بے تکے شکوک و شبہات میں گھر کر اپنے ساتھ ساتھ فاران کو شدید ذہنی ٹینشن دے رہی ہو گی۔ امی اس طرح تو فاران بالکل بھی ڈھنگ سے کام نہیں کر پائے گا۔ قدرت کی طرف سے اتنے بڑے دیے گئے موقع کو وہ یقیناً گنوا دے گا۔" اجالا نے افسوس کے ساتھ ساتھ تشویش کا بھی اظہار کیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو اجالا...... پچھلے دنوں زنیرا کو شاید اسی ٹینشن کی وجہ سے کافی تیز بخار بھی ہو گیا تھا لیکن فاران اس کے اصرار کے باوجود اس کے پاس نہ آ سکا کیونکہ شوٹنگ چل رہی تھی اور پروڈیوسر و ڈائریکٹر نے اجازت نہیں دی۔"

"امی وہاں سیٹ لگے ہوتے ہیں جن پر بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے، اب اگر ہیرو صاحب ذرا ذرا سی پریشانی پر شوٹنگ چھوڑ کر گھر بھاگنے لگا تو ہو چکی مکمل فلم...... اچھا تبھی آج کل راحیلہ باجی اپنی بھابی کے پاس اس کی دل جوئی کے لیے موجود ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کل میں فاران کے گھر جا کر راحیلہ باجی کے ساتھ ساتھ زنیرا سے بھی مل لوں۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ وہ فاران سے کیسے بدگمان ہو سکتی ہے جو اتنی چاہ سے اسے اپنے گھر میں لایا ہے۔" آخری جملہ کہتے ہوئے بہت عرصے بعد ایک خلش ایک کسک نے جیسے اس کے دل میں بے اختیار چٹکی کاٹ دی تھی... جیسے اس کے دل میں بے اختیار کچوکا سا دیا تھا۔

☆☆☆

زنیرا کی آنکھ مسلسل بجتے ہوئے فون پر کھلی تھی۔ راحیلہ باجی بچوں کو لینے اسکول گئی ہوئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد نہ جانے کیسے بے وقت... اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ شاید کسی دوا کا اثر تھا۔ اس نے کسلمندی سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اجالا تھی۔

"ہیلو زنیرا کیسی ہو تم...... مجھے پہچانا؟" اجالا کے اتنے اپنائیت بھرے لہجے پر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی ویسے بھی دماغ پوری طرح سے بیدار نہیں ہوا تھا۔

"سوری، میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔" وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہاں پہچان بھی کیسے سکتی ہو...... بھئی آٹھ نو سال بعد تو ہماری بات ہو رہی ہے۔" اجالا نے ہنس کر جیسے اسے کچھ یاد دلانا چاہا لیکن لاکھ سوچنے پر وہ بھی اجالا کو پہچاننے سے قاصر رہی۔

"اصل میں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس وقت بھی بخار ہے پلیز آپ سیدھے سادے طریقے سے اپنا تعارف کروا دیں تو مہربانی ہو گی۔" اس بار اس کا لہجہ کچھ روکھا سا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی آج کل بخار کی وجہ سے بھی اس کے مزاج میں کچھ چڑچڑا

پن سا آگیا تھا۔ اجالا کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔

''سوری زنیرہ، میں نے بلاوجہ ہی تم کو پریشان کیا۔ اصل میں، میں اجالا بول رہی ہوں۔ ابھی پرسوں ہی امریکا سے آئی ہوں۔'' اس نے جیسے زنیرہ سے معذرت کی تھی۔

''ارے اجالا آپ...... سچ میں آپ کو بالکل بھی نہیں پہچان سکی تھی۔ اِن فیکٹ آپ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کسی نے آپ کے آنے کا بتایا ہی نہیں۔'' زنیرا نے ایک ہی سانس میں بہت ساری صفائی دے ڈالی۔

''کوئی بات نہیں...... ویسے میں نے تمہاری طبیعت ہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ سنا ہے راحیلہ باجی بھی تمہارے پاس آئی ہوئی ہیں۔'' اجالا نے بہت خوش دلی سے جواب دے کر زنیرا کی شرمندگی کو کم کردیا۔

''ہاں، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، بچے پریشان ہو رہے تھے سو وہ ان کی دیکھ بھال کے لیے کچھ روز میرے پاس رہیں گی۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ فاران آج کل لاہور میں ہیں۔'' اس بار زنیرا کا لہجہ کچھ بجھا ہوا سا تھا۔

''ارے ہاں، زنیرا تمہیں بہت بہت مبارک ہو، ماشاءاللہ فاران کو اچانک ہی اتنی بڑی فلم مل گئی ویسے تمہیں پتا ہے کہ یونیورسٹی کے زمانے میں بھی ایک ٹی وی پروڈیوسر نے اسے اپنے ایک سیریل میں کام کرنے کی آفر دی تھی جو اس نے ریجکٹ کردی تھی کیونکہ وہ اس کا فائنل ایئر تھا اور وہ پڑھائی میں بہت بزی تھا۔'' اجالا نے بہت گرم جوشی سے اسے مبارک باد دیتے ہوئے فاران کو دی گئی ایک پرانی آفر کا بھی حوالہ دے دیا۔

''اجالا کاش وہ اسی زمانے میں شوبز جوائن کرلیتے لیکن اب اس عمر میں شادی کے بعد پتا نہیں کیوں وہ اس فیلڈ میں چلے گئے۔ آپ کو نہیں پتا اجالا کہ میں اور میرے بچے کتنے ڈسٹرب رہنے لگے ہیں۔ خاص طور پر روشی تو اُن کی دوری بالکل بر... برداشت نہیں کر پا رہی اور مجھے اسے سنبھالنا بہت مشکل لگ رہا ہے۔ اصل میں کبھی اس سے پہلے وہ... لوگوں سے اس طرح سے اتنے، اتنے دن دور رہے ہی نہیں۔'' اس کا لہجہ اتنا اداس تھا کہ ایک لمحے کو... اجالا کچھ بول ہی نہیں سکی۔

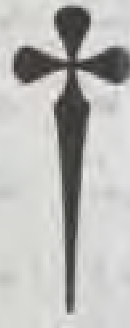
''چلو زنیرا ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے... آرام کرو، میں کل تم سے اور راحیلہ باجی سے ملنے آؤں گی ان کو بھی بتا دینا۔'' اجالا نے اسے ... سمجھانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بات کو مختصر... کے فون بند کردیا لیکن دل ہی دل میں اس نے ... کرلیا تھا کہ وہ فاران کی گھریلو زندگی کو ایسے بکھرنے نہیں دے گی اور اس کے لیے اس کا کل زنیرا سے ملنا ضروری تھا۔ پتا نہیں کس ناتے وہ فاران کے لیے اتنی پریشان ہو رہی تھی۔ سچی اور بے لوث محبت اسی کو تو کہتے ہیں جس میں بنا کسی طلب کے کسی کو چاہا جاتا ہے جو سود و زیاں سے بے نیاز ہوتی ہے، کسی کو پانے یا حاصل کرنے کی جستجو بھی ختم ہو جاتی ہے۔ صرف اس کو خوش دیکھنا ہی دل کو ایک سکون سا دے جاتا ہے۔ ان گزرتے سالوں میں اجالا کے خیالات اور اس کے احساسات میں بہت تبدیلی آگئی تھی، وہ جیلسی... جلنا اور کڑھنا پتا نہیں کب کا ختم ہو چکا تھا۔ تبھی تو اس وقت ایک بے اختیار سے جذبے کے تحت وہ فاران کے لیے فکرمند تھی پھر اس رات وہ امی سے دیر تک اسی موضوع پر بات کرتی رہی اور پھر پروگرام یہ بنا کہ بس صبح ناشتے کے بعد وہ لوگ زنیرا سے ملنے کے لیے نکل جائیں گے۔ رات کے تقریباً دو بج رہے تھے جب امی نے جھنجوڑ کر اجالا کو جگایا تھا۔

''اٹھو اجالا، جلدی کرو ہمیں فوراً فاران کے گھر جانا ہے۔''

زنیرا اور فاران کی داستانِ حیات
کا اگلا باب آئندہ ماہ پڑھیے

یوٹرن

شہناز وسیم





...وسم گرما کی تعطیلات سے پہلے ہر ماں کی طرح میں بھی بہت پہلے سے ہولنے لگتی تھی کہ اب دو ...ینے گھر کے تمام معاملات اپ سیٹ رہیں گے ...وں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور پھر مہمان داری الگ...... آپ نے بھی ضرور نوٹ کیا ہوگا کہ خاندان بھر کے بچے ایک، ایک دو، دو دن کے لیے رہنے آتے اور جاتے ہیں چھٹیاں انجوائے کرنے...... اس پر جب محمود نے

مجھے بتایا کہ پنڈی سے اُن کے ایک دوست اپنی بہن کے ساتھ آرہے ہیں اور ہمارے ہی گھر میں قیام کریں گے تو میں سخت پریشان ہوگئی پہلی بات تو یہ کہ میں جاب کرتی تھی...... بہ مشکل تمام گھر کا بہت سا کام نمٹانا اور پھر کھانا پکا کر جانا...... اس کی وجہ سے مجھے منہ اندھیرے ہی اٹھنا پڑتا تھا پھر بھی آفس سے آتے ہی گھر کے کاموں میں مصروف ہوجاتی۔ یہ سب کچھ میں اپنے گھر کی آسودگی وخوشحالی اور بچوں کے لیے کرتی تھی۔ بچوں کی چھوٹی موٹی خواہشات اور خواب پورے کرنے کے چکر میں مجھے اپنی خرابیٔ صحت کی بھی پروانہیں ہوتی تھی۔ دراصل ہر عورت کی طرح مجھے بھی اپنے گھر، شوہر اور بچوں سے بے حد محبت ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی ہے۔

میرے شوہر محمود اس معاملے میں بہت اچھے ہیں۔ چھوٹے موٹے کاموں میں میری مدد بھی کردیتے غرضیکہ بہت تعاون کرتے...... مگر جب انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ اُن کے دوست آرہے ہیں اور ہمارے ہی گھر قیام کریں گے تو میرا ردِعمل کچھ اچھا نہیں ہوا اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ دراصل ہم ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے دو کمرے...... ایک لاؤنج، اسٹور اور کچن وغیرہ، ایک کمرے کو میں نے ڈرائنگ روم بنایا ہوا تھا دوسرے کو بیڈروم...... لاؤنج نسبتاً بڑا تھا تو اس میں چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل ڈالی ہوئی تھی کونے میں ایک بڑی چوکی تھی جس پر میری ساس رات کو سوجاتی تھیں۔ میری بچی مینا اپنی دادی اماں کے ساتھ سوتی تھی۔ تینوں بیٹے رات کو ڈرائنگ روم میں کارپٹ پر بستر لگا کر سوجاتے تھے۔ سب گھر کے افراد تھے اس لیے کوئی تکلف بھی نہیں تھا مگر غیر لوگوں کے ساتھ اس قسم کی ایڈجسٹمنٹ سخت دشوار لگ رہی تھی۔ اسی لیے میں مہمانوں کی آمد کا سن کر کچھ الجھ سی گئی تھی۔ محمود نے بتایا کہ اُن کا جب بھی پنڈی جانا ہوا تو ان کے دوست حیدر نے ان کا بہت خیال رکھا۔ خیر جناب میرا احتجاج اپنی جگہ دھرے کا دھرا رہ گیا اور وہ لوگ آبھی گئے۔ حیدر پہلی ہی نگاہ میں مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا وہ ایک پکی عمر کا مرد تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری اور زمانے بھر کے تجربات تھے جبکہ اس کی بہن ثریا ایک سہمی ہوئی خاموش رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ بہت کم بولتی تھی جب میں کوئی بات کرتی تو جواب دیتی ورنہ خود سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ محمود نے اس موقع پر ان دونوں پر صورت حال واضح کردی تھی کہ میری مسز تو جاب کرتی ہیں اس لیے آپ دونوں کو تھوڑی پریشانی تو ضرور ہوگی اور یہ بھی کہ ہمارا گھر بھی بہت چھوٹا ہے لہٰذا تھوڑی سی تکلیف بھی اٹھانی پڑے گی۔ محمود کی بات پر حیدر نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

”کوئی بات نہیں یار، بھابی آرام سے آفس جائیں، ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ کھانے پکانے اور گھر کے دیگر کاموں میں ثریا اُن کی مدد کردیا کرے گی اور ویسے بھی یار ہم لوگ گھومنے پھرنے کے ارادے سے کراچی آئے ہیں، میں ذرا یہاں کا جائزہ لوں گا اگر یہ شہر سمجھ میں آیا تو پھر ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی فیملی کو یہیں شفٹ کرلیں، ثریا بھی یہاں کہیں ایڈمیشن لے لے گی فی الحال تو ہمیں سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے تھی سو تم لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔“ میں نے ثریا سے اپنے بچوں کا تعارف کرایا۔ ساس صاحبہ ایک ہفتے کے لیے اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر رہنے کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ خیر وہ دونوں فریش ہوکر کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر کو سوگئے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں ہی اُن کے لیے بستر کردیا تھا جہاں ہمارا ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ بچے سخت پریشان تھے اُن کی پسند کے سب پروگرام نکلے جارہے تھے محمود اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ بچوں کا موڈ دیکھ کر فیصلہ یہ ہوا کہ جب تک یہ لوگ ہیں ٹی وی کو وہاں سے لاؤنج میں سیٹ کردیں گے۔

اگلی صبح جب میں آفس جانے کے لیے تیار

ہورہی تھی تو حیدر نے ہمیں...... مخاطب کرکے کہا۔

”ہم دونوں ناشتے کے بعد باہر جائیں گے واپسی شام تک ہوگی لہٰذا کھانے پر انتظار نہ کیجیے گا۔“

وہ لوگ شام تو کیا بہت رات میں واپس آئے۔ باہر جاتے وقت ثریا عبایا پہنتی تھی اور ہاتھوں میں دستانے بھی، صرف آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ باقی چہرہ نقاب میں رہتا تھا۔ ایک ہفتے تک تو یہی معمول رہا کہ وہ دونوں صبح ناشتے کے بعد چلے جاتے اور رات کو دیر سے واپس آتے۔

”تم لوگ کہاں گھومتے رہتے ہو سارا دن؟“ میں نے ایک دن ثریا سے پوچھا تو ثریا کے بجائے حیدر نے جواب دیا۔

”میں ثریا کو کراچی سیر کرانے لایا ہوں تو بس سارا دن اسی سیر سپاٹے میں گزر جاتا ہے۔“ اس کی بات پر میں خاموش ہوگئی کچھ دیر بعد حیدر سگریٹ کا پیکٹ لینے نیچے چلا گیا تھا۔

”ارے ثریا تم کہاں، کہاں گئیں...... ویسے تمہیں ہمارا شہر کیسا لگا؟“ میں نے حیدر کے جانے کے بعد ثریا سے سوال کیا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

”میں کراچی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ بس بھائی جہاں لے جاتے ہیں چلی جاتی ہوں۔“

”اچھا شاپنگ وغیرہ بھی کی یا نہیں؟“

”نہیں، ابھی تو نہیں کی۔“ اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

ایک بات مجھے بہت ہی عجیب سی لگتی جب وہ دونوں دن میں کمرے میں ہوتے تھے تو پردہ کھینچ لیتے تھے یا پھر دروازہ بھی کبھی کبھی بند کرلیتے تھے۔ رات کو ثریا اور میں بیڈروم میں سوتے۔ بچے بھی ہمارے کمرے ہی میں ہوتے تھے۔ حیدر اور محمود ڈرائنگ روم میں سوتے تھے۔ یہ معمول پہلے دن ہی سے تھا۔ ثریا جب گھر پر ہوتی تھی تو کھانا پکانے میں میری مدد بھی کردیا کرتی۔ کبھی جھٹ پٹ سلاد بنالیتی کبھی رائتہ۔ دال بھی بہت ذائقے دار بناتی تھی میرے بچوں کو دال بے حد پسند تھی اور وہ اس سے دال کی فرمائش کرتے رہتے۔ وہ خوشی، خوشی بچوں کی فرمائش پر دال بنادیتی تھی۔

میری بیٹی مینا، ثریا سے زیادہ بے تکلف ہوگئی تھی۔ ثریا بھی بہت پیار سے اس کی پونیاں بناتی، اس کی باتیں سنتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بچوں کے ساتھ کھیلتی بھی تھی مگر کبھی کبھی وہ اچانک گیم ادھورا چھوڑ کر بیزاری اٹھ جاتی بچے بہت بدمزہ ہوتے...... میں نے نوٹ کیا کہ ثریا کچھ زیادہ ہی خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہے۔ میں دل میں شرمندہ ہوتی کہ گھر آئے مہمانوں پر میں زیادہ توجہ نہیں دے پارہی ہوں۔ اسی خیال کے تحت میں نے ایک دن ثریا سے کہا۔

”آج میری چھٹی ہے چلو میں تمہیں اپنی امی یا کسی دوست کے گھر لے چلوں۔“ وہ چپ چاپ میرا منہ دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا......؟“ میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

”وہ...... بھائی کی اجازت نہیں ہے۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”مگر کیوں......؟ ہم جلد ہی واپس آجائیں گے، میں تو صرف تمہاری تفریح کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔“ میں نے اصرار کیا۔

”دراصل میں بھائی سے بہت ڈرتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔“ وہ ہاتھ مسلتے ہوئے بولی۔

”ارے اس میں کیا مشکل ہے، میں خود حیدر سے پوچھ لیتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں ان سے نہ پوچھیے گا پھر بھی اجازت نہیں دیں گے، آپ رہنے دیں میں ایسے ہی خوش ہوں پھر مجھے خود بھی خواہش نہیں ہے کہ میں کہیں جاؤں۔“ وہ خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگی۔

”چلو نہیں جانا چاہتی ہو تو نہ سہی مگر مجھے حیرت ہورہی ہے کہ تم حیدر بھائی سے اتنا ڈر کیوں رہی ہو،

وہ خود تو تمہیں اتنا باہر لے کر جا رہے ہیں انہیں کوئی اعتراض تو یوں بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے گہری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی تو بہت اچھے ہیں، میرا خیال بھی بہت رکھتے ہیں...... بس میں خود ہی اُن سے بہت ڈرتی ہوں اسی لیے آپ کو منع کیا اور یہ کہ میں خود بھی کہیں جانا نہیں چاہتی میں ایسے ہی ٹھیک ہوں خوش بھی ہوں۔'' وہ رک رک کر بولی۔ مجھے اس کا لہجہ عجیب سا لگا جیسے وہ کچھ خوفزدہ ہو۔

''چلو خیر...... کوئی بات نہیں تم اپنا کام کرو، میں ذرا مشین لگالوں بہت سارے کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔'' وہ چلی گئی اور کمرے کا پردہ کھینچ لیا...... لیکن میں کافی دیر الجھن میں رہی مجھے لگ رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہے کچھ گڑبڑ ضرور ہے سوچا کہ میں محمود سے تذکرہ کر کے دیکھوں گی پھر ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران حیدر تو باہر دو تین مرتبہ ضرور گیا مگر ثریا گھر پر ہی رہی۔

ایک دن جب میں آفس سے گھر آئی تو ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ میری بچی بینا اور تینوں بیٹوں کے درمیان سخت لڑائی ہو رہی تھی۔ بینا زور زور سے چلّاتے ہوئے رو رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ میرے تینوں بیٹوں زلفی، رومی اور طیفی نے بینا کو مارا ہے۔ مجھے سخت غصہ آیا میں نے بیٹوں سے کہا کہ اصل بات بتاؤ کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ تم نے بہن کو مارا ہے اور پھر مجھے یہ بات بھی پسند نہیں آئی کہ میرے بیٹوں کے دل میں عورت کا احترام نہ ہو۔ بچپن سے یہ بات اُن کی فطرت میں شامل ہونی چاہیے کہ عورت قابلِ احترام ہے۔ میں نے نہایت سخت لہجے میں اپنے بیٹوں سے پوچھا۔

''تم لوگوں نے بینا کو کیوں مارا ہے؟''

''امی ہم لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے بیڈ پر لیٹے ہوئے تو بینا ہمارے درمیان گھس کر لیٹ گئی اور ٹی وی دیکھنے لگی، ہم نے اسے منع بھی کیا مگر یہ نہیں مانی اور ہم تینوں کے درمیان زبردستی لیٹ کر ٹی وی دیکھ...

''یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی جس... نے بہن کو مارا ہے۔ چھوٹی بہن ہے تمہاری... کہہ دیتے۔'' میں نے نہایت غصے سے کہا۔

''ہاں تو اور کیا!'' بینا ہچکیوں... بولی۔ ''کوئی ایسا ہوتا ہے میرے بھائی تو مجھ... نہیں کرتے۔ سب بھائی اپنی بہنوں سے... کرتے ہیں حیدر انکل کو دیکھو وہ ثریا آنٹی کو... کتنی بار گلے سے لگاتے ہیں، اپنے ساتھ... ہیں۔ انہیں پیار بھی کرتے ہیں اور وہ ان کے... بیڈ پر لیٹتی ہیں تو وہ انہیں کبھی نہیں مارتے۔''

''کک...... کیا؟'' حیرت سے میری آنکھ... پھٹ گئیں۔ بینا کی ہچکیاں تیز ہو گئیں۔ ''ثریا کے بھائی انہیں کتنا چاہتے ہیں اور......'' وہ... گریہ سے بول نہیں پا رہی تھی۔ ''اور میرے بھا... تو مجھے اپنے پاس بھی نہیں بیٹھنے دیتے، کیا ہوا... ان کے درمیان لیٹ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی اس... پر مجھے مارنا تو نہیں چاہیے تھا بھی اس بات پر... انکل نے ثریا آنٹی کو مارا؟ وہ دن میں کتنی دیر ان... ساتھ لیٹ کر ٹی وی دیکھتی ہیں، وہ دونوں بہن بھا... کبھی نہیں لڑتے تو پھر میرے بھائیوں نے مجھے... مارا؟'' وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ میں بینا کی... ضرور سن رہی تھی مگر میرے دماغ میں دھماکے ہو... تھے۔ میرا ذہن کسی اور ہی نہج پر سوچ رہا تھا۔

''یہ......؟ یہ کس طرح کے بہن بھائی... مجھے محمود کو بتانا پڑے گا کہ گھر میں کچھ نہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔'' بچوں نے بتایا کہ ثریا آنٹی کی طبیعت خراب تھی حیدر انکل انہیں ڈاکٹر کے پاس لے... ہیں۔ ''یا اللہ، یہ میرے گھر میں کون سا کھیل کھیلا... ہے۔'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر... حیدر اور ثریا واپس آ گئے میں نے غور سے ثریا کو... تو وہ فوراً کمرے میں چلی گئی۔ حیدر وہیں بچوں...

...لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ میں کچھ الجھی ہوئی سی کمرے میں گئی اور ثریا سے پوچھا۔

''تمہاری کیا طبیعت خراب ہے؟'' وہ ایک دم گھبرا گئی۔

''جی......؟ وہ...... میں...... ٹھیک ہوں اب...... بس ایسے ہی ذرا...... دراصل...... آپ...... آپ پریشان نہ ہوں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ بے ربط جملے بولتی رہی۔

''کیا ایسی کوئی بات نہیں......؟ میں نے تو صرف تمہاری طبیعت پوچھی ہے۔'' شاید میرا لہجہ کچھ سخت ہو گیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بھائی خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔'' وہ پیٹھ پھیر کر بیگ سے کچھ نکالنے لگی۔

''بھائی نہیں، میں پریشان ہو رہی ہوں، مجھے بتاؤ تمہاری کیا طبیعت خراب ہے؟'' میں نے مزید سخت لہجے میں پوچھا۔

''میں نے آپ سے کہا ناں کہ میں ٹھیک ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' حیدر اچانک کمرے میں آ گیا تو میں جھک کر کمرے سے باہر آ گئی۔ رات کو ثریا نے کہا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گی طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔ حیدر اسے کولڈ ڈرنک پلانے نیچے لے کر چلا گیا تو اُن کے جاتے ہی میں نے فوراً کمرے میں جا کر ان کی اٹیچی اور بیگ کھولا نہ جانے مجھے کس چیز کی تلاش تھی حالانکہ اخلاقاً مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر میں نے جلدی جلدی بیگ اور اٹیچی کو ٹٹولا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی آ گئی۔ کھول کر دیکھا تو اس میں سونے کے اچھے خاصے زیورات تھے۔

''یا اللہ سیر و تفریح کے لیے آنا تھا تو اس قدر زیورات ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ پہنا تو ایک دن بھی نہیں۔'' تھوڑی دیر بعد جب وہ لوگ واپس آئے تو میں سامان کو نارمل کر چکی تھی۔ گھر اتنا چھوٹا تھا کہ میں محمود سے گھر پر بات نہیں کر سکتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے میں نے محمود سے کہا۔

''ذرا نیچے اسٹور تک چلیں، ناشتے کے لیے انڈے، ڈبل روٹی لینی ہے بچوں کے لیے آئس کریم بھی لے آئیں گے۔'' نیچے کولڈ اسپاٹ پر میں نے ساری بات محمود کو بتائی اور اپنی تشویش سے بھی آگاہ کیا۔ پوری بات سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئے پھر کچھ دیر بعد کہنے لگے۔

''کیا کہہ سکتا ہوں میں خود حیران ہو رہا ہوں، بہر حال میں حیدر سے بات کروں گا۔''

رات میں ثریا حسبِ معمول میرے پاس آ کر لیٹ گئی اور فوراً ہی کروٹ بدل کر سو گئی۔ محمود نے مجھے دو کپ چائے بنانے کے لیے کہا جس دوران میں چائے بنا رہی تھی تو میرے کانوں میں محمود کی آواز آئی وہ حیدر سے پوچھ رہے تھے۔

''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں بھائی...... تکلیف تو آپ لوگ ہماری وجہ سے اٹھا رہے ہیں، بہر حال ہماری سیٹیں بک ہو چکی ہیں، کل ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔ اتنے دن کی خاطر مدارات کا شکریہ...... میں دراصل یہاں شفٹ ہونا چاہتا ہوں، اسی لیے حالات کا جائزہ لینے کے لیے آیا تھا۔ اب جا کر سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' اچانک ثریا بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی اور کونے میں لگے ہوئے واش بیسن پر جھک گئی اور الٹی کرنے لگی کچھ دیر بعد وہ سیدھی کھڑی ہوئی اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اُلٹی کے پریشر سے اس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے وہ بے دلی سے تخت کے کونے پر ٹک گئی اور دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

''کیا ہوا ثریا......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میں نے پاس جا کر پوچھا۔

''جی......'' اس نے نظریں چرا کر کہا۔ ''میں

ٹھیک ہوں آپ سوجائیں، رات بہت ہوگئی ہے، میں بھی سونا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ کمرے میں جا کر لیٹ گئی اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ بہت ساری الجھنوں کے بیچ ڈولتے ہوئے آخر کار رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ ہی گئی۔

دوسرے دن دوپہر میں ثریا اور حیدر چلے گئے میں نے سکون کی سانس لی ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی اور کے گھر میں رہ رہی تھی۔ محمود بھی کچھ الجھے، الجھے سے لگ رہے تھے۔

''آپ نے حیدر سے بات کی؟''

''اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی اس سے پہلے ہی اس نے اپنے جانے کی بات کردی پھر مجھے مناسب نہیں لگا کسی کے پرسنل میٹرز کے بارے میں بات کرنا مجھے عجیب سا لگتا ہے۔''

''چلیں خس کم جہاں پاک......'' میں نے شکر ادا کیا۔ اس واقعے کو ایک سال گزر گیا۔

☆☆☆

گھر اور دفتر کے مصروف لمحات میں ایسی پھنس کر رہ گئی تھی کہ بہت سارے امور پر دھیان دینے کا وقت ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ میرے فرسٹ کزن بجو (ساجد) کی شادی قریب تھی اور میری کوئی تیاری نہیں تھی۔ میں نے آفس سے ایک ماہ کی چھٹی لی۔ مینا کی انگلی میں چوٹ لگ گئی تھی اس کی مرہم پٹی بھی کرانی تھی۔ میں نے سوچا میری چھوٹی بہن نگہت جو ڈاکٹر ہے، دوپہر کو او پی ڈی میں ہوتی ہے وہیں سے مینا کی بینڈج بھی کرالوں گی اگر نگہت فارغ ہوگئی ہوگی تو اس کے ساتھ بازار چلی جاؤں گی ورنہ مینا تو ساتھ ہے ہی۔ نگہت ہم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بازار جانے کا سن کر تو اور بھی زیادہ خوش ہوئی اس نے ساتھی ڈاکٹر سے بات کر کے شارٹ لیو لے لی اور ہم بازار چلے گئے۔

جس دوران نگہت کپڑے کے تھان پر تھان نکلوائے جا رہی تھی اچانک میری نگاہ سامنے ... رہ گئی۔

''ثریا؟'' ثریا کو تو میں ہزاروں کے ... بھی پہچان سکتی تھی۔ ''مگر ثریا اور یہاں...'' ... تیزی سے اٹھی مگر اس سے پہلے کہ میں اس ... وہ رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ اس نے ... تھا مگر اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ایک اور خاص ... کہ وہ مجھے لڑکی کے بجائے ایک عورت کی ... کچھ تبدیلی تھی ضرور۔

''کیا ہوا خیریت تو تھی؟'' میں واپس آئی ... نگہت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ایک جاننے والی نظر آئی تھی ... جب تک میں وہاں پہنچی، وہ رکشے میں بیٹھ چکی تھی ...'' خیر ہم لوگ شاپنگ کر کے چاٹ، آئس کریم ... کھانے کے بعد گھر آئے۔

☆☆☆

شادی کے ہنگاموں میں جب ایک دن ... تیار ہو رہی تھی تو میں نے یونہی سوچا کہ ثریا کے بارے میں، میں ... محمود کو تو بتانا ہی بھول گئی۔ شاید وہ لوگ یہاں ہی شفٹ ہوگئے ہیں۔ شادی والے دن ... مینا کے بال سیٹ کرانے پارلر جانے کے لیے گھر سے نکلی تو دیکھا ثریا سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آ رہی ہے۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔

''ارے ثریا تم؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''تم یہاں کہاں؟''

''کیا اندر آنے کو نہیں کہیں گی مگر آپ تو ... کہیں جا رہی ہیں؟ تم کیسی ہو مینا؟'' اس نے جھک کر مینا کو پیار کیا۔

''ثریا آؤ، اندر آؤ میں مینا کے بال سیٹ کرانے جا رہی تھی مگر خیر کوئی بات نہیں کچھ دیر بعد چلی جاؤں گی اور یہ بچہ کون ہے؟''

''یہ میرا بچہ ہے۔'' ثریا ایک دم مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

''ارے، تمہاری شادی ہوگئی اور تم نے ہم لوگوں کو بلایا تک نہیں۔'' میں نے شکوہ کیا۔

''شادی......؟ شادی تو قسمت والیوں کی ہوتی ہے اور میں تو بہت ہی بری قسمت لے کر آئی ہوں بلکہ میں نے تو اپنی قسمت خود خراب کر ڈالی۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی میری ایک امانت ہے آپ کے گھر وہی لینے آئی ہوں۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''امانت......؟ کیسی امانت؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ثریا؟'' میں نے ذرا سرد لہجے میں کہا۔

''گھبرائیں نہیں، میری امانت مجھے یقین ہے کہ اسی طرح محفوظ ہوگی جیسی میں چھوڑ کر گئی تھی۔'' وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ بچے کو کارپٹ پر لٹا کر اس نے فوم کے صوفے کے اندر گہرائی تک ہاتھ گھسا دیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سفید کپڑے کی ایک پوٹلی باہر نکال لی۔ یہ وہی زیورات کی پوٹلی تھی جو اس دن میں نے ان کے بیگ میں دیکھی تھی۔

''ثریا یہ سب کیا ہے؟'' میں نے تھوڑا غصے سے کہا۔ ''تم تو بہت خاموش سی لڑکی تھیں سہمی ہوئی سی مگر آج میں تمہارا یہ کون سا روپ دیکھ رہی ہوں۔ ویسے مجھے پہلے بھی تم پر اور حیدر پر تھوڑا سا شک تو تھا مگر اب تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ سیدھی طرح بتاؤ اصل ماجرا کیا ہے اور اس بچے کا باپ کون ہے، کہاں ہے؟ اور یہ زیوارات کس کے ہیں اور یہ تم یہاں کس لیے چھپا کر گئی تھیں؟''

''گھبرائیں نہیں، میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔ میں جب آپ کے گھر آ کر رہی تھی تو مصلحتاً خاموش تھی کئی بار جی چاہا کہ آپ کو ہمراز بنالوں مگر ہمت نہ ہوئی اور پھر مجھے حیدر سے ڈر بھی لگتا تھا۔ حیدر میرے سگے بھائی نہیں تھے۔ وہ ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ نہ جانے کس طرح میں ان کے چنگل میں پھنس گئی انہوں نے مجھے بارہا یہ احساس دلایا کہ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں بس اسی بات کے نشے میں...... میں سب کچھ بھلاتی چلی گئی۔ میں ایک عزت دار گھرانے کی بیٹی تھی۔ ماں، باپ اور بہن بھائیوں کی بے حد لاڈلی...... مگر مجھے ایسا لگا کہ حیدر سے زیادہ مجھے کوئی نہیں چاہتا...... انہوں نے مجھے بہت سنہری خواب دکھائے کہ میں تم سے شادی کرلوں گا مگر ابھی میرے لیے کچھ رکاوٹیں ہیں، اِدھر میرے گھر میں بھی بڑی دو بہنیں تھیں۔ پہلے ان کی شادی ہوتی پھر میرا نمبر آتا۔ حیدر نے مجھے اصرار کر کے کئی بار باہر بھی بلایا۔ ایک دن حیدر نے کہا ثریا میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ میں فوراً سے پیشتر تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ابھی تو میری بڑی بہنوں کی شادی ہونی ہے اتنی جلدی میری شادی کیسے ہوسکتی ہے۔''

''ہوسکتی ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو...... میں نے ایک پلاننگ کی ہے تم گھر سے کچھ نقدی اور زیورات لے کر کسی طرح ریلوے اسٹیشن آجاؤ، ہم کراچی چلتے ہیں کچھ پیسوں کا انتظام میں بھی کرلوں گا۔ ہم وہاں کورٹ میرج کرلیں گے۔'' حیدر نے میرے سامنے اپنا پلان دہرایا۔

''مگر ہم کراچی میں رہیں گے کہاں......؟''

میں نے تشویش ظاہر کی تو انہوں نے محمود بھائی کا نام لیا اور کہا کہ ہم کراچی میں ان کے گھر اپنا بہن بھائی کا رشتہ بتا کر رہ لیں گے۔ جب میں حالات سنبھال لوں گا تو پھر انہیں اصل بات بتادوں گا۔ اس طرح میں ان کے ساتھ کراچی آگئی۔ میں ان سے روز اصرار کرتی کہ ہم جلد نکاح کرلیں اس طرح رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ گناہ ہے مگر نہ جانے انہیں کیا تامل تھا روز ٹال مٹول کرتے رہے میں جلدی نکاح کرنے کے حق میں اس لیے تھی کہ میری ایک قانونی حیثیت بن جائے اور پھر مجھے اپنے گھر والوں کا بھی خوف تھا۔

میری جن بہنوں کی شادی ہونے والی تھی ان کے جہیز کے زیورات اور اماں کی کمیٹی کے ایک لاکھ روپے بھی میں ساتھ لے آئی تھی۔ یہاں آکر مجھے لگا جیسے آپ کچھ مشکوک سی ہوگئی ہیں مجھے خوف آنے لگا کہ پتا نہیں آپ ہمارے بارے میں کس کس طرح سوچ رہی ہوں۔ میں نے حیدر سے کہا کہ وہ جلد کوئی فیصلہ کرلیں مگر وہ ٹال مٹول کرتے رہے اور اسی رات پہلی بار حیدر کی طرف سے بدگمانی کا پہلا خیال میرے دل میں آیا۔ رات کے وقت جب آپ ناشتے کا سامان لینے نیچے گئیں اور حیدر واش روم میں تھے تو میں نے کسی مصلحت کے تحت زیورات کی یہ پوٹلی صوفے کے اندر گھسادی۔ مجھے حیدر کی نیت پر شک ہوگیا تھا میں نے سوچا اس طرح شاید کسی مشکل وقت میں یہ زیورات میرا سہارا بن جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ فوم کے صوفے کے انتہائی اندر یہ زیورات محفوظ رہیں گے اور آپ کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔ حیدر دوسرے دن کی بکنگ کا کہہ کر مجھے آپ کے گھر سے لے گئے ہم ایک مضافاتی .... گمنام علاقے میں کچھ عرصہ رہے۔ میری طبیعت تو آپ کے گھر میں ہی خراب ہوگئی تھی بعد میں تصدیق بھی ہوگئی کہ میں ماں بننے والی ہوں، پیسوں کے بارے میں انہوں نے کہا کہ بینک میں رکھوادیے ہیں، ایک رات انہوں نے مجھ سے کہا کہ کچھ زیورات نکال کر دو مجھے پیسوں کی ضرورت ہے میں نے بیگ کھول کر کہا ارے اس میں تو زیورات ہیں ہی نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہاں چلے گئے؟ میں نے کہا مجھے نہیں پتا، انہوں نے مجھ پر بہت تشدد کیا اسی رات مجھے اندازہ ہوگیا کہ حیدر میرے ساتھ مخلص نہیں۔ ایک رات وہ ڈاکٹر کو دکھانے کا کہہ کر ساتھ لے گئے مجھے انتظار گاہ میں بٹھا کر وہ ایک کمرے میں یہ کہہ کر گئے کہ میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔ کافی دیر گزر گئی مریض بھی سب چلے گئے مگر حیدر واپس نہیں آئے تب ایک نرس نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں، میں نے بتایا میں شوہر کے ساتھ ڈاکٹر کو دکھانے آئی تھی۔ وہ اندر ہیں مگر اب تو انہیں اندر گئے کافی دیر ہوگئی ہے مجھے پریشانی ہورہی ہے نرس نے کہا اندر تو کوئی بھی نہیں ہے صرف ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں پھر اس کے بعد حیدر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ آپ میری پریشانی کا اندازہ کیجیے رات کا وقت ...... اجنبی شہر ...... کوئی ٹھکانا نہیں، ہاتھ میں پیسہ نہیں ...... میری کیا حالت ہوئی ہوگی ...... پھر اسی ڈاکٹر کے اسپتال میں، میں نے اس بچے کو جنم دیا ...... خداترسی میں مجھے ڈاکٹر صاحب نے اسپتال کے برآمدے میں پڑے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں ایک بے سروسامان عورت تھی کہاں جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کے آگے گڑگڑائی کہ اسی اسپتال میں کوئی کام دلادیں تاکہ میں اپنا بچہ پال سکوں مگر اب وہ کہتے ہیں جب تک تمہارا کوئی انتظام کہیں نہ ہو یا ملازمت نہ ملے تو برآمدے میں سو جایا کرو، آپ خود سوچیں زندگی گزارنے کے لیے کتنی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے کپڑے، برتن، بستر اور دیگر اشیا۔ مگر میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ اسپتال سے مریضوں کا بچا کھچا کھانا مل جاتا یقین کریں اگر یہ بچہ نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی ختم کرلیتی۔ میرے لیے اب زندگی میں کوئی کشش نہیں ہے، سوائے اس بچے کے۔ آپ نے دیکھا کس قدر پیارا ہے سب کہتے ہیں بالکل تمہاری طرح ہے۔'' میں نے مڑکر دیکھا مینا لاؤنج میں بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ میں نے ایک پُرتاسف سانس بھری۔

''دنیا اس بچے کے باپ کے بارے میں پوچھے گی تو کیا بتاؤ گی؟''

''کہہ دوں گی کہ مرگیا ہے۔'' اس نے نفرت سے کہا۔

''اور اگر کبھی وہ آگیا تو؟''

''وہ نہیں آئے گا، اسے آنا ہوتا تو پھر وہ جاتا ہی کیوں؟'' ثریا یہ کہتے ہوئے رونے لگی۔ ''اب آپ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ میں اپنے شوہر سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گی کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔''

''میں تو خود غیر محفوظ ہوں میرے یہ زیورات آپ اپنے پاس رکھ لیں، یہ یہاں زیادہ محفوظ رہیں گے۔'' پھر وہ چلی گئی۔ میں نے اپنی بہن نگہت کو فون کرکے ساری صورتِ حال بتائی تو وہ کہنے لگی۔

''بجو ......! اگر وہ عورت قابلِ اعتبار ہے تو پہلے محمود بھائی سے پوچھ لیں، ہمیں اماں کے لیے ایک عورت چاہیے۔ اب اماں سے کام نہیں ہوتا اور بیمار بھی ہوتی ہیں۔ میں اکثر اسپتال ڈیوٹی پر ہوتی ہوں یہاں اسے رہنے کا ٹھکانا اور کھانا کپڑا وغیرہ بھی مل جائے گا۔'' مجھے بھی ثریا پر رحم آرہا تھا میں دل سے چاہتی تھی کہ اس کی آزمائش ختم ہوجائے اسے کافی زوال چکی ہے۔ محمود کو بتایا تو وہ کہنے لگے۔

''ٹھہرو! پہلے پنڈی بات کرکے معلومات کرتے ہیں۔'' فون ملایا تو حیدر سے بات ہوتی رہی۔ اچانک محمود نے حیدر سے کہا۔ ''بھئی تمہاری بھابی ثریا سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''اوہ ثریا ...... اس کی تو ہم نے شادی کردی ہے وہ یہاں کہاں؟ ماشاء اللہ وہ اپنے گھر میں خوش ہے، شوہر بھی اچھا ہے، ماشاء اللہ دو پیارے پیارے بیٹے ہیں اس کے اگر کبھی میکے رہنے کے لیے آئی تو میں بھابی سے ضرور بات کرادوں گا۔'' حیدر نے شاطرانہ انداز میں بات گھمادی۔ پھر محمود نے مجھ سے کہا۔

''نگہت سے بات کرکے ثریا کو اپنے میکے میں شفٹ کرادو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ کسی بے سہارا کو چھت اور سہارا فراہم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔''

یوں ثریا اپنے بچے کے ساتھ میری اماں کے گھر شفٹ ہوگئی۔ گھر کے بیشتر کام اور اماں کی ذمے داری بھی اس نے سنبھال لی اور اماں اور نگہت کو بھی سہولت ہوگئی۔ اصولاً تو یہ قصہ یہیں ختم ہوجانا چاہیے تھا میرے خیال کے مطابق اس کی کہانی کا یہ اینڈ تھا مگر زندگی میں یوٹرن بھی تو آتے ہیں اس کے بغیر زندگی میں تھرل ہی نہیں آتا۔ اس قصے کا یوٹرن بھی بعد کے دنوں میں آیا۔ ثریا میری اماں کے گھر اپنے بچے کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہی تھی، ہم اپنے گھر میں خوش وخرم تھے، وقت دھیمی چال چلتے سرکتا ہی چلا گیا اور یوں تین سال بیت گئے۔ بچے بھی اب نسبتاً بڑی کلاسوں میں آگئے تھے نگہت کا بھی رشتہ طے ہوگیا اور شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ میں ایک ہفتے سے انفلوئنزا میں مبتلا تھی۔ جی ماندہ سا تھا۔ نگہت اور ثریا کو شادی کی کچھ شاپنگ کرنی تھی وہ بازار جانے سے پہلے بچے کو ہمارے گھر چھوڑنے کے لیے آگئیں۔ بچے کو ہمارے گھر میں سب بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے آنے سے سب خوش ہوگئے، وہ دونوں بازار چلی گئیں میں اپنے لیے ایک کپ کافی بناکر ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی کہ اچانک ڈور بیل بجی۔ محمود بھی اس دن گھر پر تھے تھوڑی دیر مجھے باتوں کی آواز آئی، دیکھا تو وہ حیدر کے ساتھ باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ اتنے دنوں بعد حیدر کو دیکھ میں چونک گئی مجھے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ خیر محمود اسے لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ بچے کھیل کے دوران اندر باہر آنا جانا کررہے تھے۔ میں نے بچوں کو سمجھادیا تھا کہ وہ ثریا آنٹی یا بچے کے بارے میں حیدر کو کچھ بھی نہ بتائیں۔ اگر وہ بچے کے بارے میں پوچھے بھی تو کہہ دینا کہ امی کی دوست کا بچہ ہے، وہ بازار گئی ہیں یہاں چھوڑ کر۔ ساتھ ہی میں نے فون کرکے نگہت اور ثریا کو بھی کہہ دیا کہ وہ گھر چلی جائیں، میں بچے کو بھجوادوں گی وہ دونوں سمجھ گئیں۔ کھانے کے دوران حیدر نے بچے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا میری دوست اسے میرے پاس چھوڑ کر بازار گئی ہے، یہ

میرے بچوں سے خاصا مانوس ہے یہاں مزے سے کھیلتا رہتا ہے۔ حیدر نے کئی بار بچے کو بہت پیار کیا اور کہا۔

"بہت پیارا بچہ ہے، اللہ اسے خوش رکھے۔" میں نے بہت غور سے حیدر کا چہرہ دیکھا۔ وہاں کچھ تھا ضرور...... شاید خون کی کشش، خوشبو یا کچھ بھی......

"تم نے شادی وادی بھی کی یا نہیں؟" کھانے کے دوران محمود نے پوچھا۔ حیدر نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"ارے یار! مائیں کہاں چھوڑتی ہیں...... ایک چھوڑ دو، دو شادیاں ہو چکی ہیں۔"

"دو، دو؟ وہ کیوں؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی ہوا یوں کہ تمہارے گھر سے جانے کے بعد میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا مجھے خاصی چوٹیں آئیں، ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے پر...... تو مہینوں لگ گئے علاج معالجے پر بھی لاکھوں خرچ ہو گئے میری دیکھ بھال کی وجہ سے امی بھی بہت تھک رہی تھیں۔ انہوں نے میری شادی کر دی اور پوتے کے خواب دیکھنے لگیں۔ ڈیڑھ سال بعد ہی اماں نے شور مچا دیا کہ میری دوسری شادی کریں گی پہلی بیوی اب تک پوتا نہیں دے سکی ہے اور دوسری شادی کرا کے ہی دم لیا۔ دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو اماں نے دوسری پر بھی بانجھ ہونے کی مُہر ثبت کر دی...... اور تیسری کی تلاش شروع کر دی۔ دوسری بیوی بڑی تیز تھی اس نے کہا اگر تیسری سے بھی اولاد نہ ہوئی تو......؟ ہمیں بانجھ کہنے سے پہلے اپنے بیٹے کا بھی طبی معائنہ کرا لو۔ خرابی اس میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری دوسری بیوی صحیح کہہ رہی ہے۔ میں نے اپنا مکمل چیک اپ کرایا تو یہ بری خبر سننے کو ملی کہ ایکسیڈنٹ کے بعد کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ میں اب باپ بننے کے قابل ہی نہیں رہا۔ بس یار کیا بتاؤں، اس دن سے کسی کا بھی بچہ دیکھتا ہوں، بے اختیار گود میں لے لیتا ہوں۔ اب یہ محرومی تو عمر بھر ساتھ ہی رہنے لیے تو یہ بچہ مجھے بہت اچھا لگا۔ اس پر ٹوٹ کر پیار آ رہا ہے۔ اللہ! اسے صحت اور عمرِ خضر عطا فرمائے اس کے ماں باپ کا کلیجا ٹھنڈا رکھے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا صرف ماں کا...... باپ کا نہیں محمود نے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔

"یار...... ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں یہ بچہ ہے تو اسی کا۔"

"ہرگز نہیں، میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی یہ قدرت کا انتقام ہے، مکافاتِ عمل ہے اسے ساری زندگی اس آگ میں جلنے دیں کہ اولاد کے ہوتے ہوئے بھی یہ اولاد کو ترسے۔ اس روئے زمین پر اس کی اولاد ہے مگر یہ اسے اپنا نہ سمجھ سکے کبھی بھی۔" میں شدید غصے میں تھی۔ محمود نے میری بات کاٹ دی۔

"مگر یہ بھی تو سوچو... حیدر ہی نہیں یہ بچہ بھی باپ کے ہوتے ہوئے باپ سے محروم رہے گا اسے بھی تو باپ مل جائے گا۔"

"ارے وہ تو باپ سے محروم تھا ہی اگر حیدر نہ آتا تو!" میں غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ "آپ بھی تو سوچیں، کس بے سروسامانی کی حالت میں ثریا کو ایک اجنبی شہر میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اگر نگہت، اماں اور ہم سب اس کی مدد نہ کرتے، سہارا نہ دیتے تو بھوکے بھیڑیے ایک جوان اور خوب صورت عورت کو کتنا بھنبھوڑ چکے ہوتے آپ کو اس کا بھی خیال نہیں آ رہا ہے اگر ثریا کی جگہ آپ کی کوئی بہن یا بیٹی ہوتی تو آپ کیا فیصلہ کرتے بس وہی فیصلہ کیجیے۔" محمود نے ہتھیار پھینک دیے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو جیسا تم نے سوچا ہے وہی کرو۔"

اب آپ لوگ ہی فیصلہ کیجیے کہ میں نے ٹھیک کیا ناں......؟ حیدر کو یہی سزا ملنی چاہیے تھی۔



جلتے رہے ہم کتنا

افتخار شوق

جنازہ اٹھنے میں کچھ دیر باقی تھی، لوگ ہر طرف اُمڈے پڑ رہے تھے۔ مختلف آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں، رونے اور بین کرنے کی آوازیں کانوں کو چھید رہی تھیں۔ ہر طرف آہ و بکا کا منظر تھا۔

لوگ اظہارِ افسوس کر رہے تھے کہ ہائے شادی کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بیوہ ہو گئی۔ اللہ نے اولاد بھی نہ دی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

فیصلے کا وقت آ گیا تھا۔ لوگ جنازہ اٹھانے

آگے بڑھے ہی تھے کہ اس نے للکار کر کہہ دیا کہ ابھی جنازہ نہ اٹھایا جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر آج بھی حالِ دل نہ کہا تو پھر کب...... آخر کب؟ دل کے دکھ اگر آج بھی نہ بتائے تو پھر کون سا موقع آئے گا؟

☆☆☆

خوب صورت مہکتی ہوئی لڑیوں سے آراستہ حجلۂ عروسی میں وہ کب سے سر جھکائے، آنکھوں میں خواب بسائے اس کی منتظر تھی اور وہ ماں بہنوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ان کی لچھے دار گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”بھائی اب شادی ہوگئی ہے تو ہمیں بھول نہ جانا۔“

”ہاں، ہاں فراز تجھے اندر جانے کی بہت جلدی ہے...... بیٹھا رہ میرے پاس ذرا دو گھڑی تجھ سے باتیں تو کرلوں، کیسا سوہنا لگ رہا ہے میرا شہزادہ۔“ ماں نے بلائیں لیتے ہوئے نہایت پُرمحبت انداز میں اسے اپنے سے لگالیا۔

”ارے آپا، شادی ہوگئی ہے تو کیا ہوا؟ وہ تو تم لوگوں کی خدمت کرنے آئی ہے، میں کون سا اسے سر پر بٹھا رہا ہوں ویسے ...... بھی ... وہٹیاں (بیویاں) نخرے اٹھانے کے لیے تھوڑی ہوتی ہیں یہ تو گھر بھر کی خدمت کرنے کے لیے آتی ہیں۔ تم دیکھنا میں کیسا سلوک کرتا ہوں۔“

ماں اس کی باتیں سن کر صدقے واری گئی۔

چار گھنٹے کے بعد بہنوں کو ہوش آیا تو نگری دروازہ رکوائی لے کر اندر جانے کی اجازت دی۔

وہ جو سر بستر پر رکھے گاؤ تکیے پر ٹکا چکی تھی آہٹ سے ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کمر اور گردن اکڑی جا رہی تھی مگر وہ ایک انوکھے احساس کے تحت خوشگوار موڈ لیے اپنے شریکِ حیات کے پیار بھرے جملوں کی منتظر تھی۔ جبھی اس کے کانوں میں گویا کسی نے پتھر توڑے تھے۔

”سن رہی ہو...... میری زندگی کا محور میری بہنیں اور بیوہ ماں ہے، کبھی چوں چرا کرنے کی کوشش نہ کرنا یہی میرا سب کچھ ہیں، ان لوگوں نے بڑے ارمانوں سے میرا بیاہ رچایا ہے۔ پہلے تمہیں میرے گھر والوں کو سکھ پہنچانا ہے اگر تمہیں یہ سب قبول ہے تو ٹھیک ہے ورنہ دو بول بولنے میں مجھے وقت نہیں لگے گا۔“

چٹانی لہجے کے ساتھ الفاظ تھے کہ نشتر وہ تو گویا ہوش میں آگئی تھی...... سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے جبھی ایک اور پتھر آلگا۔

”کچھ بولتی کیوں نہیں...... تم کیا سمجھ رہی ہو میں فلمی ہیرو کی طرح تمہارے ناز نخرے اٹھاؤں گا؟ یہ سجاوٹ بھی میرے دوستوں نے زبردستی کروائی تھی۔ سارا کمرا پھولوں کی پتیوں سے گندا کردیا، چلو اٹھو بستر صاف کرو۔“

وہ کچھ نہ بول سکی بس ٹکر ٹکر دیکھے چلی گئی پھر جیسے ہوش میں آئی اور جلدی جلدی اٹھ کر بستر جھاڑا اور صوفے پر رکھا سادہ سا شلوار قمیص اٹھا کر کپڑے بدلنے واش روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

گھر میں جوان موت پر کہرام مچا ہوا تھا۔ ماں بہنیں بین کررہی تھیں اور نشانہ اس کی ذات تھی۔

”ہائے...... سال بھر میں ہی میرے گبرو جوان کو کھا گئی۔ اللہ جانے اسے کیا روگ لگا کہ وہ دنیا چھوڑ گیا۔“

”ارے میرا ہیرے جیسا بھائی جس نے کبھی تنہا نہ چھوڑا آج ساتھ چھوڑ گیا...... اب ہم کیا کریں گی۔“ دونوں بہنیں مل کر دہائی دے رہی تھیں۔ شاید یہی قسمت کا لکھا کہلاتا ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن ولیمہ تھا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کی کزنز وغیرہ اسے تیار کررہی تھیں کہ بلاوا آ گیا کہ جلدی باہر آؤ، سب لوگوں کا اصرار تھا کہ دلہا

دلہن اکٹھے اسٹیج پر آئیں تاکہ تصویریں وغیرہ بن سکیں۔ تیاری میں کچھ دیر ہوگئی تھی اور جب اسے اسٹیج پر بٹھایا گیا تو فراز نے سب لوگوں کے سامنے اس کی اتنی بے عزتی کی کہ وہ سر ہی نہ اٹھا سکی، شادی کا دوسرا دن...... ابھی شوہر سے ہی شناسائی نہ ہو پائی تھی۔

”پہلے دن ہی میرا کہنا نہ مان سکی اس سے میں کیا امید رکھوں۔ ایسی نافرمان عورت میرے کس کام کی۔“ فراز کا جملہ تھا کہ تازیانہ...... وہ اپنا قصور ہی نہیں جان پائی۔

”ارے اگر پتا ہوتا کہ ایسے مزاج کی عورت ہے تو ہم اپنے بھائی کے گلے میں یہ طوق کبھی نہ ڈالتے۔“ اپنے گھر والوں کے آنے سے پہلے ہی وہ رو رو کر میک اپ خراب کرچکی تھی۔

اس پر ہی بس نہیں تھا اگلے دن جب مکلاوے کے لیے میکے جانے لگی تو اس کی ماں، بہنیں کہنے لگیں۔

”ہمارے ہاں یہ رواج نہیں کہ دولہا ساتھ جائے۔ ہاں اگر فرصت ملی تو ہم تمہیں لینے آجائیں گے۔ سنو تم جانے سے پہلے اپنا پرس ہمارے حوالے کرکے جانا سلامی کے پیسوں پر ہمارا حق ہے اور زیور بھی سب اتار کر جانا۔“ اور وہ نئی دلہن اپنے میکے میں اجڑی شکل اور اجڑے حلیے کے ساتھ آگئی۔

واپس آنے کے بعد بھی وہی سناٹوں بھرا استقبال تھا اور سرد رویے...... وہ اکیلی اور فراز اپنی ماں، بہنوں میں مگن...... اس پر ماں، بہنیں ہر آئے گئے کو خوش ہو کر بتاتیں۔

”شکر ہے ہمارا فراز زن مرید نہیں بنا...... ویسا ہی فرمانبردار اور ماں، بہنوں کا خیال رکھنے والا ہے۔“

اسے سلگانے کا تو کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا اور وہ جو ایف اے پاس اپنے آپ کو کسی حد تک بڑا سمجھدار سمجھتی تھی۔ ساری سمجھداری دھری کی دھری رہ گئی۔ تیسرے دن سے باورچی خانے کی ذمے داری اسے دے دی گئی اور وہ سارا وقت چولھے

ضروری معلومات

☆پوٹاشیم آمیز غذائیں...... فالج کی ڈھال ثابت ہوتی ہیں۔

☆پوٹاشیم کے اہم ذرائع کیلا، خوبانی، آڑو، آلو بخارا، کشمش، منقہ اور سبزیوں میں آلو، ٹماٹر، پھلیاں اس کے علاوہ دودھ، دہی مغزیات، گڑ کا شیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆پوٹاشیم کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن گردے کے امراض میں مبتلا افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے معالج کے مشورے سے اس کی محفوظ مقدار استعمال کریں کیونکہ گردے متاثر ہونے کی صورت میں جسم سے پوٹاشیم کا مکمل اخراج نہیں ہو پاتا۔ اس کے خارج نہ ہونے کی صورت میں گردوں کا فعل بری طرح متاثر ہوسکتا ہے۔

مرسلہ: سعدیہ رحمان، کراچی

میں سر دیے اُن کی فرمائشیں پوری کرنے میں لگی رہتی مگر پھر بھی گالیاں اور طعنے سننے کو ملتے۔

☆☆☆

کسی نے اسے ہوش دلایا۔

”چل صالحہ اٹھ، جنازہ تیار ہے۔ اپنے شوہر سے چل کر معافی مانگ اور تو بھی اسے جاتے جاتے معاف کردے۔“

تب اس نے سر اٹھا کر آواز والی سمت دیکھا۔ بڑی نند اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا رہی تھی تب وہ بپھر کر رہ گئی۔

”میں...... میں کس بات کی معافی مانگوں، میں نے کیا، کیا تھا اس کے ساتھ، معافی تو یہ مجھ سے مانگے...... اس نے جو میرے ساتھ ایک سال میں کیا، اللہ کسی دشمن کی بیٹی کو بھی یہ حالات نہ دکھائے۔“ وہ بول رہی تھی اور اس کی ساس اور نندیں اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ وقت ہے ان باتوں کا، ہمارا بھائی چلا گیا

اور اسے اپنے دکھڑے پڑے ہیں۔" چھوٹی نند سینہ پیٹ کر بولی۔

☆☆☆

"چلو کچھ کپڑے رکھ لینا ہم لوگ لاہور جارہے ہیں۔" اس دن فراز نے اس سے کہا تو وہ تھوڑا خوش ہوگئی۔

"ہنی مون کے لیے؟"

"کیا کہا......؟ ہنی مون؟ کس کا ہنی مون، کیسا ہنی مون خبردار جو آئندہ ایسی بے غیرت باتیں کیں۔ اماں کو لاہور کسی تعزیت کو جانا ہے تو انہوں نے ہی ترس کھا کر کہا کہ صالحہ اکیلی کیا کرے گی اسے بھی ساتھ لے چل ورنہ سارا وقت اس کے میکے والے ہمارے گھر میں آبسیں گے۔"

فراز کی بات سن کر وہ سناٹے میں آگئی، کیا بولتی کہ پہلے دن سے ہی وہ نافرمان اور بدزبان کہلائی گئی تھی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ فراز کے ساتھ وہ کہیں جارہی ہے۔ چاہے ماں' بہنیں ساتھ تھیں۔

تعزیت تو ایک بہانہ تھی۔ وہ تو ماں' بہنوں کو سیر۔ یں اور شاپنگ کراتا رہا اور وہ زبردستی ان کے ساتھ گھسٹتی رہی یوں لگتا تھا کہ وہ ان کی خادمہ ہو۔

اس پر بھی اس نے اپنی تمام ہمتیں مجتمع کی ہوئی تھیں اور حالات کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کرلیا تھا کہ چلو انتظار کرنے میں کیا حرج ہے مگر شاید فراز نے بھی تہیہ کیا ہوا تھا کہ ہر لمحہ حوصلہ شکنی کرنی ہے، بے عزتی کرنی ہے ہر لمحہ انا کو کچلنا ہے اس کے جذبات کو روندنا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ جس میں محبت نہ ہو، خلوص نہ ہو، عزت نہ ہو...... اذیت ناک ہے اور وہ یہ اذیت ناک رشتہ دل وجان سے نبھاتی رہی۔ وہ تعلق، وہ رشتہ جس میں صرف ذلت ہی ذلت ہو' اپنی ذات کی تحقیر ہو، نظرانداز کیے جانے کا دکھ ہو۔ اس رشتے کے قائم رکھنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ کوئی یقین نہیں کرے گا کہ کتنی ہی راتیں بے آرام گزریں اور کتنے ہی دن بے سکون گزرے اس کا اپنا آپ اتنا حقیر، اتنا نیچا کہ خود سے بھی اسے شرم محسوس ہوتی۔ فراز کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے کا کیا جواز تھا مگر کون تھا جو اس کے سوال کا جواب دیتا۔ کٹھن وقت گزرتا رہا۔

"کیا ہر لڑکی کی شادی شدہ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے، کیا یہ حسین خوابوں کی تعبیر ہے؟" وہ اپنے آپ سے پوچھتی مگر کوئی جواب نہ پاتی۔

☆☆☆

"چل اٹھ جاناں...... تجھے سنائی نہیں دیتا... مرگئی کیا میرے بھائی کے ساتھ، اسے وہاں بھی چین سے جانا نصیب نہ ہوا' چل اٹھ معافی مانگ بھائی سے۔" بڑی نند نے پھر زور سے گھُرکا...... سب کی نظریں اسی پر جم گئیں۔

"بیٹی ان سب کی خوشی کے لیے اور اپنے مرحوم شوہر کی خوشی کے لیے سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس جانے والے سے معافی مانگ لے اور یہ بھی کہہ دے کہ میں نے تجھے حق مہر بخشا...... میں نے تجھے سارے معاملات بخشے۔" روتی ہوئی ماں پیچھے سے اسے سمجھا رہی تھی اور وہ اُجڑی حالت میں عجیب پیچ کی کیفیت میں مبتلا یہی بڑبڑائے جارہی تھی۔

"کس بات کی معافی اماں...... کس بات کی...... میرا قصور کیا تھا؟" پھر وہ اپنا دوپٹا سنبھالتی اٹھی اور میت کے قریب جابیٹھی۔

"بے شک تم نے مجھے کوئی سکھ نہیں دیا مگر مگر جاؤ میں پھر بھی تمہیں معاف کرتی ہوں۔ یاد میں تمہیں معاف کرتی ہوں اور...... اور تم بھی میری ناکردہ خطائیں' میرے ناکردہ قصور میرے ناکردہ جرم معاف کردینا...... ہاں معاف کردینا۔"

جنازہ اٹھایا جارہا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح معافی، معافی کی گردان کرتی رہی۔





دوسرا رُخ

نگہت اعظمی

آج مجھے پھر اسپتال پہنچتے، پہنچتے دیر ہوگئی تھی۔ دونوں بچوں کو تیار کر کے اسکول پہنچانا میری ذمے داری تھی۔ دونوں بچوں میں ایک سال کا فرق تھا بڑا 1 prep اور چھوٹا 2 prep میں تھا۔ انہیں صبح جگانا اور اسکول کے لیے تیار کرنا جوئے شیر نکالنے سے کم مشکل نہیں تھا۔ احد کو جگا کر واش روم میں برش تھما کر اسجد کو جگانے کی کوشش کرتی تو احد برش ہاتھ میں تھامے خوابوں کی دنیا میں پہنچے ہوئے ہوتے۔ ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر ہوشیار کرتی تو اسجد دوبارہ ایک نیند اور لے لیتے ایک طرف تو دونوں صاحبزادوں کو

جگانے کا مشکل ترین مرحلہ درپیش ہوتا اور دوسری طرف شوہر نامدار کی جھنجلاہٹ بھری آواز دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستی۔

”یار کیا صبح، صبح چیخ پکار شروع کر دیتی ہو۔ یہ بھی خیال نہیں کہ کتنی رات کو سویا تھا میں۔“

”پھر کیا کروں، بچوں کو اسکول نہ بھیجوں؟“ میں شیرنی کی طرح دہاڑتی۔

”اماں ٹھیک کہتی ہیں کہ اتنی کم عمری میں بچوں کو اسکول میں داخل نہیں کروانا چاہیے تھا۔“ ان کے اس جملے پر میرا خون ابلنے کی حد تک گرم ہو جاتا لیکن میں مزید کچھ کہہ کر صبح ہی صبح جھگڑے کی ابتدا نہیں کرنا چاہتی اس لیے اسی ابلتے ہوئے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

شکر تھا کہ آج کل ساس صاحبہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس دبئی گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ بھی نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح پڑھتے، پڑھتے دو چار نصیحتیں ضرور ارشاد فرما دیتیں جو مجھے نصیحتیں کم اور سلگتے انگارے زیادہ لگتے۔

میرا قصور یہ تھا کہ میں ڈاکٹر تھی اور ہاؤس جاب کے دوران ہی میری شادی ہو گئی تھی۔ ملازمت بھی مجھے دونوں بچوں کی پیدائش کے بعد ملی تھی۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے اب دو سال ہو گئے تھے اور یہ ملازمت بھی بڑی تگ و دو کے بعد ملی تھی۔ اسپتال کسی پرائیویٹ تھا اور انٹرویو کے دوران مجھے بتا دیا گیا تھا کہ مجھے اس نوکری کو برقرار رکھنے کے لیے فرائض کس، کس طرح انجام دینے ہوں گے۔ اس میں پہلا فریضہ یہ کہ سینئر ڈاکٹر کے سامنے ہر وقت کیا حکم ہے میرے آقا کہہ کر سر جھکانا ہوگا۔ مریضوں کے ہر شکوے شکایت پر بسر و چشم مسکرانا ہوگا۔ چھٹیاں برائے نام کرنی ہوں گی۔ بچوں کا بہانہ بنا کر گھر میں نہیں بیٹھنا ہوگا، ہر ایمرجنسی کال پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہونا ہوگا، لیٹ ہرگز، ہرگز نہیں آنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

انٹرویو دیتے وقت تو میں انسانیت کی خدمت کے جذبے سے اس قدر سرشار تھی کہ مجھے یہ سب احکامات پھولوں کی طرح خوشنما اور خوشگوار لگ رہے تھے لیکن اب دو سال بعد میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ سینئر ڈاکٹر کا حکم پھانسی کا پھندا لگتا اور مریضوں کے شکوے، شکایتیں، آہیں، کراہیں نیم کی نمبولیوں کی طرح کڑوی اور تلخ لگتیں۔

آصف بزنس مین تھے وہ صبح دس بجے آفس جاتے اور رات گئے واپس آتے۔ اماں کے آصف کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور تھیں وہ سارا دن ان سے فون پر باتیں کرتیں یا ٹی وی پر ہر چینل سے آتے ڈرامے دو، دو تین بار دیکھ کر یاد کر لیتیں اور ان دونوں فرائض سے فرصت ملتی تو ستانے یا اپنے آپ کو تازہ دم رکھنے کے لیے گھر گرہستی اور بچوں کی تربیت پر ایسے، ایسے لیکچر دیتیں کہ مجھے گھر گرہستی اور تربیت کے نام سے نفرت ہو جاتی۔ لیکچر کو موثر بنانے کے لیے درمیان میں اپنی بیٹیوں کے سلیقے اور بہوؤں کے پھوہڑ پن کے بھی حوالے دیے جاتے۔

وہ کچھ عرصے کے لیے چلی جاتیں تو شوہر صاحب ساس کا کردار بھی ساتھ ساتھ ادا کرنے لگتے اور مجھے ان کے نہ ہونے کا احساس بھی نہ ہونے دیتے۔

☆☆☆

”رضیہ آئے تو اسے بتا دیجیے گا کہ دوپہر کھانے میں چائنیز اور رات کے لیے اروی گوشت کا سالن اور دال، چاول بنا لے۔“ میں نے گھر سے نکلتے ہوئے آصف کو دونوں وقت کا مینیو بتا دیا ورنہ اگر بھول جاتی تو جب دوپہر کو جلتی بھنتی گھر میں داخل ہوتی تو محترمہ رضیہ بیگم منہ ہاتھ دھو کر کنگھی چوٹی کیے ہوئے ڈائجسٹ پڑھتی ملتیں کہ میری بدقسمتی سے انہیں اردو پڑھنا آتی تھی اور وہ ڈائجسٹ اور رسالے پڑھنے کی بہت شوقین تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر ڈائجسٹ رکھ دیتیں اور انتہائی معصومیت سے پوچھتیں۔

”باجی کیا پکاؤں؟“

”تو تم نے ابھی تک کچھ پکایا ہی نہیں؟“ میں ہر ضبط کی آخری حد پر جا کر پوچھتی۔

”باجی آپ بتا کر ہی نہیں گئی تھیں۔ میں اپنی مرضی سے پکا لیتی تو آپ آ کر ناراض ہوتیں۔“ وہ غلط نہیں کہتی تھی۔ یہ بھی میرا قصور تھا۔

ایک آدھ دفعہ جب اس غریب نے اپنی مرضی سے کچھ پکایا تو میں بہت ناراض ہوئی تھی اس لیے کہ مجھے اور بچوں کو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیاہ فام ملغوبہ نما چیز کو کیا نام دیا جائے۔ میری ناراضی انہیں اتنی بری لگی تھی کہ اب میں چار بجے بھی گھر آؤں اور غلطی سے بتا کر نہ جاؤں تو وہ کچھ نہیں پکاتی تھیں۔ اس لیے بچوں کو تیار کرتے، کرتے میں دونوں وقت کا مینیو بھی سوچ لیتی تھی۔

”اچھا، اچھا کہہ دوں گا۔ اب تم جاؤ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔“ میری ہدایات پر آصف نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

دونوں اونگھتے ہوئے بچوں کو گاڑی میں بٹھا کر گاڑی اسٹارٹ کی تو یاد آیا کہ گاڑی میں گیس بہت کم ہے۔ بچوں کا اسکول کم از کم پانچ کلومیٹر اور میرا اسپتال دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ بچوں کے اسکول تک گاڑی جا سکتی تھی۔ انہیں اسکول پہنچا کر گیس اسٹیشن پہنچی تو وہاں بھی اچھی خاصی لمبی لائن تھی کیونکہ دو دن کے ناغے کے بعد گیس کھلی تھی۔

خدا خدا کر کے آدھے گھنٹے بعد میری باری آئی اور مجھے معلوم تھا یہی آدھے گھنٹے کی دیر میرے نامہ اعمال پر سیاہی پھیر دے گی کیونکہ آج کل میری ڈیوٹی گائنی وارڈ میں تھی اور گائنی وارڈ کی انچارج ڈاکٹر حور تھیں۔ ڈاکٹر حور کو دیکھ کر مجھے ایسے... والدین پر شدید غصہ آتا تھا جو بچوں کے نام رکھتے ہوئے مناسبت کا خیال نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر حور کے بارے میں ساتھی مرد ڈاکٹروں کی یہی رائے تھی کہ اگر ڈاکٹر حور کو جنت میں جگہ مل گئی تو ہم خدا کے حضور

غزل

دادرسی کی کوئی سبیل نہیں ہے
مسند پہ جو بیٹھا ہے وہ عدیل نہیں ہے

حکام اور عوام کی ڈگر کو دیکھ کر
لگتا ہے کوئی ملک میں عقیل نہیں ہے

خواہش ہے کہ اس کے لیے یہ در کھلا رہے
گو وہ کسی طرح میرا کفیل نہیں ہے

دو قومی نظریہ کی ہم نے باڑھ کاٹ دی
کوئی درمیاں ہمارے اب فصیل نہیں ہے

نقص امن ہوتا ہے جو تعریف نہ کریں
ایسا بھی وہ حسین اور جمیل نہیں ہے

کھاتا ہے مجھ سے زیادہ مگر لڑ نہیں سکتا
کیا کروں مرغا میرا اصیل نہیں ہے

بہتر ہے گزرے ڈولی کہیں اور سے اس کی
غصہ میرا ہُوا ابھی تحلیل نہیں ہے

آنا مطب میں اس کا ہے ملنے کا بہانہ
یہ میں بھی جانتا ہوں وہ علیل نہیں ہے

وہ مانگ کر تو دیکھے مجھ سے میری جاں ریاض
یہ دل میرا تیری قسم بخیل نہیں ہے

شاعر: ڈاکٹر ریاض احمد
مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

دست بستہ عرض کریں گے کہ "بار الہٰا تو ہم پر اتنا کرم کر کہ ہمیں اس جنت سے دور جہنم میں کسی نسبتاً ٹھنڈی جگہ پر بھیج دے کہ ہمیں مزید ان کے رخِ روشن کی زیارت کرنے کی تاب نہیں۔"

ڈاکٹر حور کی شکل پر جتنی سختی اور کرختگی تھی اُن کا لہجہ اس سے کہیں زیادہ کرخت اور پھر اُن کے طنز میں ڈوبے ہوئے جملے...... جنہیں سن کر انسان کو سوائے دریا میں ڈوب کر جان دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

میں ہانپتی کانپتی راستے بھر لاحول ولاقوۃ کا ورد کرتی اسپتال پہنچی تو ڈیوٹی روم میں ایسا سکوت طاری تھا جیسے حضرت اسرافیلؑ کے صور پھونکنے کے بعد ہوگا، سارا اسٹاف ڈرا سہما منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہا تھا۔

"ڈاکٹر حور شدید غصے میں ہیں، آج ہر لیٹ آنے والے کی شامت آئی ہوئی ہے۔" میرے داخل ہوتے ہی میری ساتھی ڈاکٹر شائستہ نے سرگوشی کر کے مجھے آنے والے وقت کے لیے تیار کر دیا۔

"مجھے پتا ہوتا کہ آج صبح ہی صبح .... یہ آفت نازل ہو جائے گی تو فجر کی نماز کے بعد دفع آفات و بَلیات کا وظیفہ پڑھ کر آتی۔" میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کھینچا اور جلدی سے وارڈ کی طرف قدم بڑھائے۔

"تو آپ آ گئیں۔ بڑی جلدی تشریف لائی ہیں۔" وہ ملک الموت کی طرح نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھیں۔

"وہ دراصل میری گاڑی میں گیس...... نہیں تھی اور گیس اسٹیشن پر بہت رش تھا اس لیے......" میں نے سوچ لیا تھا میں ہر قیمت پر سچ کہوں گی سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔

"ڈاکٹر شازیہ آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ میرے سامنے اس قسم کے بودے بہانے نہ پیش کیا کیجیے۔ یہ جو باقی لوگ وقت پر آئے ہیں یہ کیا کہیں باہر کے ملک سے آتے ہیں یا اُن کی گاڑیاں ہوا سے چلتی ہیں؟" ان کے جملے تھے کہ سنسناتے ہوئے جو سیدھے میرے دل پر لگ رہے تھے۔

"محترمہ آپ کی گائنی وارڈ میں ڈیوٹی ہے آپ پورا آدھا گھنٹا لیٹ تشریف لائی ہیں۔ آپ کو پتا ہے اتنی دیر میں لیبر روم میں کتنی پیشنٹ آ چکی ہیں؟"

"واقعی ہمارا خاندانی منصوبہ بندی کا ادارہ بالکل نکما اور ناکارہ ہے کوئی کام نہیں کرتا۔" میں خاندانی منصوبہ بندی والوں کو دل ہی دل میں بے شمار باتیں سنا کر اپنے لہجے کو حتی الامکان مٹھاس سے لبریز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

"میڈم میں نے ڈاکٹر فیروزہ کو فون کر دیا تھا کہ وہ میرے آنے کے بعد آف کرے۔"

"ڈاکٹر فی...... ی روزہ......" انہوں نے جس طرح چبا چبا کر فیروزہ کا نام لیا گر وہ غریب سن لیتی تو شاید اسی وقت پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لیتی۔

"آپ کو اندازہ ہے کہ وہ کس قسم کی ڈاکٹر ہیں۔ مجھے تو اُن کی ڈگری کے بارے میں بھی شکوک و شبہات ہیں۔ ان سے تو ہزار درجہ بہتر زرینہ اور شرمیلا ہیں۔ مجھے آپ جیسی جونیئر ڈاکٹرز سے زیادہ ان پر بھروسا ہے۔" انہوں نے اسٹاف کے لیے.. انسلٹ سی انسلٹ تھی۔ جی چاہ رہا تھا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ شرمیلا اور زرینہ بہت پرانی تجربے کار نرسز تھیں اور ڈاکٹر حور کی چہیتی اور منہ چڑھی بھی...... اسی لیے وہ جونیئر ڈاکٹرز کو کسی گنتی میں شمار نہیں کرتی تھیں۔

"اگر گائنی وارڈ میں زرینہ اور شرمیلا نہ ہوں تو آپ ڈاکٹرز کے ہاتھوں سارے آنے والے بچے اپنی ماؤں سمیت اس دنیائے فانی کی جھلک دیکھے بغیر ہی واپسی کا سفر اختیار کر لیں۔" وہ ویسے ہی زہریلے انداز میں طنز کے تیر چلا رہی تھیں۔ میں انتہائی معصومیت سے سر جھکائے کھڑی تھی مگر میرے دل میں یہ تمنا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی کہ

اے خدا کاش تو نے مجھے ایک قتل کرنے کی اجازت دے دی ہوتی تو پھر اسپتال کا سارا اسٹاف دیکھتا کہ میں ڈاکٹر حور کو کس شان سے قتل کرتی۔

”مجھے تو لگتا ہے ڈاکٹر حور کا تعلق چنگیز خان کی نسل سے ہے۔“ ڈاکٹر حور کے جانے کے بعد اپنی انسلٹ کو گھونٹ، گھونٹ اپنے اندر اتارنے کے بعد میں نے اپنے حساب سے بڑا معرکتہ الآرا جملہ کہہ کر سب کی طرف فخر سے دیکھا کہ شاید کوئی میرے اس جملے کی حمایت کر کے میرے دکھی دل پر مرہم رکھ دے۔

”غلطی تمہاری بھی ہے، تم روزانہ ہی لیٹ آتی ہو اور تمہیں پتا بھی ہے گائنی وارڈ میں ذرا سا لیٹ ہو جانے سے کتنے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔“ ڈاکٹر شائستہ نے میرے زخموں پر مزید نمک پاشی کی۔

”تم تو جانتی ہو......“ میں نے پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”میں سب جانتی ہوں، جاؤ جلدی سے وارڈ کی طرف بھاگو۔ ڈاکٹر حور اسی طرف جا رہی ہیں۔“ شائستہ کے اس ہولناک جملے پر میرے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔ میں تیر کی طرح کمان سے نکلی اور گائنی وارڈ میں جا کر دم لیا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر حور کو راستے میں وارڈ بوائے، سوپرز اور نرسوں کو ڈانٹنے کا سنہری موقع مل گیا تھا۔ میں جس وقت لیبر روم میں پہنچی تو ایک خاتون ڈیلیوری روم میں جا چکی تھیں۔ باقی خواتین نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ میں ان کے ساتھ نبرد آزما ہو گئی۔

”خاموش...... مجھے کسی کی آواز نہ سنائی دے۔“ انہوں نے لیبر روم میں داخل ہوتے ہی پرائمری اسکول کی ٹیچر کی طرح ہائے، ہائے کرتی ماؤں کو ڈانٹا۔ تینوں خواتین سہم کر خاموش ہو گئیں۔ لیبر روم میں گھٹی، گھٹی سسکیاں گونجنے لگیں۔

”تم دنیا کی پہلی عورت نہیں ہو، ساری عورتیں بچے پیدا کرتی ہیں، اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ بیڈ نمبر تین کی پیشنٹ کو دیکھ کر گویا ہوئیں جو انیس بیس سال کی لڑکی تھی اور پہلی مرتبہ ماں بن رہی تھی۔

انہوں نے سب کی فائلیں چیک کیں۔ ان پر ہدایات لکھیں اور کھٹ کھٹ کرتی ڈیلیوری روم میں چلی گئیں۔

”بڑی ہی کھڑوس ڈاکٹر ہے۔“ ان کے جاتے ہی بیڈ نمبر تین کی پیشنٹ نے میرے احساسات کی ترجمانی کی۔ ان کا رویہ مریضوں کے ساتھ بھی اتنا ہی تلخ ہوتا جتنا اسٹاف کے ساتھ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ڈاکٹر حور سے زیادہ قابل، مستعد، وقت کی پابند اور فرض شناس گائنا کولوجسٹ پورے اسپتال میں کوئی اور نہیں تھی۔ وہ ایک جن کی طرح کام کرتی تھیں اور اپنے اسٹاف سے بھی یہی توقع رکھتی تھیں۔

ڈاکٹر حور کے جانے کے بعد میں بھی مصروف ہو گئی۔ تینوں خواتین کو ڈیلیور کرواتے بارہ بج گئے تھے۔ ان سے فارغ ہو کر چائے پینے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک ایمرجنسی آ گئی۔ خاتون کو ساتواں مہینہ تھا اور اسے شدید قسم کا یرقان ہوا تھا۔ اس کی حالت بہت زیادہ سیریس تھی۔ میں چائے وائے بھول کر اس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ ڈاکٹر حور کو بھی بلوا لیا گیا۔ انہوں نے بڑی مہارت سے کیس سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی بچے کو نہیں بچا سکیں۔ ماں کی حالت بھی بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھی۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں شل ہو چکے تھے لیکن اس صورت حال میں بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آصف کو فون کر دیا تھا کہ وہ بچوں کو اسکول سے لے آئیں اور رضیہ کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ بچوں کو کھانا کھلا کر اور نہلا کر سلا دے۔ دوپہر کے تین بجے جب وہ خاتون ہوش میں آئیں تو ڈاکٹر حور کو مجھ پر رحم آ گیا۔ اتنی دیر میں دوسری ڈاکٹرز بھی آ چکی تھیں۔ وہ ان دونوں کو کیس سمجھا کر میرے ساتھ لیبر روم سے باہر آ گئیں۔

اُن کے روم میں حارث (چپڑاسی) اُن کے گھر سے آیا ہوا کھانا گرم کیے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو سے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

”بیٹھو، آج تم بھی میرے ساتھ لنچ کر لو۔“ انہوں نے حارث سے ایک اور پلیٹ منگوا کر آدھی بریانی اس میں منتقل کرتے ہوئے کہا تو میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ میری حیرت بجا تھی کیونکہ صبح جو اُن کا رویہ تھا اس سے مجھے لگ رہا تھا کہ اب انہیں میری فاتحہ کی بریانی کھا کر ہی چین آئے گا۔

”آج کا دن بہت ٹینشن والا تھا۔“ انہوں نے بڑی نفاست سے بریانی کھاتے ہوئے کہا۔

”جی...... جی ہاں۔“ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی کہ میں اس کے سوا کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتی تھی پھر ہم دونوں خاموشی سے بریانی کھاتے رہے۔

”پتا نہیں لوگ اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟“ اب وہ کمرے میں لگے ہوئے چھوٹے سے واش بیسن پر ہاتھ دھو کر دوبارہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ چکی تھیں اور کرسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے یہ نادر جملہ ارشاد فرمایا۔

”جی...... جی۔“ میں بوکھلا گئی پتا نہیں یہ سوال تھا یا کوئی سنسنی خیز خبر تھی۔

”ابھی پندرہ دن پہلے میرے بھائی کی شادی ہوئی تھی۔“ انہوں نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی سلسلۂ کلام جوڑا اور میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے ان کے پہلے والے جملے کو سوال سمجھ کر کوئی احمقانہ جواب نہیں دیا تھا ورنہ جو جواب میرے ذہن میں آ رہے تھے وہ میں ارشاد فرما دیتی تو شاید آج ہی آصف کو میری قبر کے لیے گورکن سے رابطہ کرنا پڑتا۔

”جی، میں آپ کے بھائی کی شادی میں آئی تھی۔“ میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ خدا نے اُن کے سامنے نمبر بنانے کا کیسا سنہری موقع عطا کیا تھا۔

”تم نے میرے بھائی کو دیکھا ہو گا کتنا اسمارٹ اور خوب صورت ہے۔“ ان کے اس جملے پر میں نے

بہت کوشش کی کہ ان کی ہاں میں ہاں میں ملاؤں لیکن کوشش کے باوجود میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ اپنے دلہا نما بھائی کو خوب صورت اور اسمارٹ کہہ رہی تھیں وہ کم از کم پچپن سال کے ضرور ہوں گے۔ اب پچپن سال کے دولھا کی خوب صورتی اور اسمارٹ نیس کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتی تھی۔

''سوچو ذرا ان کے سسرال والوں نے کتنا بڑا جھوٹ بولا ہم سے کہ لڑکی کی عمر تیس سال ہے جبکہ اب پتا چلا ہے کہ وہ محترمہ پینتیس سال کی ہیں۔'' وہ لڑکی والوں کے اس جھوٹ پر دکھ سے بے حال نظر آرہی تھیں۔

''تو کیا ہوا پھر بھی آپ کی بھابی آپ کے بھائی سے بیس سال تو چھوٹی ہوں گی۔'' پتا نہیں کیسے میری زبان سے یہ جملہ پھسل گیا۔ انہوں نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''تمہیں پتا ہے میرے بھائی بیس گریڈ کے آفیسر ہیں۔ اتنے بڑے سرکاری آفیسر کو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی اور ویسے بھی مردوں کی عمر کون دیکھتا ہے مثل مشہور ہے عورت بیسی کھیسی مرد ساٹھا پاٹھا۔'' ان کے لہجے میں غرور تھا، تکبر تھا یا دکھ تھا میں اندازہ نہیں کر سکی۔

''اب تو عورت بھی بیسی کھیسی نہیں ہوتی۔ اگر آپ پاکستان اور انڈیا کے ڈرامے دیکھیں تو لگتا ہے کہ جیسے اب عورتیں ساٹھی پاٹھی ہوتی ہیں۔'' میں دھیمے سے بولی تو وہ ایک دم زور سے ہنس دیں۔

''کیا ہوا؟'' میں ششدر تھی۔ میں نے شاید پہلی بار انہیں اس طرح ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

''تم نہیں سمجھوگی۔'' وہ ایک دم کرسی سے اٹھ گئیں۔

''میں گھر جارہی ہوں تم مجھے بیڈ نمبر چار کی پیشنٹ کی رپورٹ دیتی رہنا۔ وہ ابھی مکمل خطرے سے باہر نہیں ہے۔'' وہ میری طرف مڑیں اور مجھے یہ ہدایت دے کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد میری ڈیوٹی OPD میں لگ گئی۔ یہاں قدرے سکون تھا۔ مزے سے نو بجے جاتی اور تین بجے فارغ ہوجاتی۔ نہ ایمرجنسی کا نہ آپریشن نہ ڈاکٹر حور کے طنزیہ جملے۔

''ڈاکٹر حور کی بھاوج انڈیا چلی گئیں اور اپنا بچہ ان کے حوالے کر گئیں۔'' میں مریضوں سے فارغ ہوکر چائے پی رہی تھی تو ڈاکٹر فیروزہ نے آکر یہ خبر سنائی۔

''بچہ تو ان کے بھائی کا ہی تھا ناں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ میری زبان سے نکل گیا۔

''وہ لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ انہوں نے ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر ہی بچے کو لیا ہے۔''

''بچے کو کون پالے گا؟''

''ظاہر ہے ڈاکٹر حور ہی پالیں گی۔ اُن کے گھر میں وہ اور اُن کے بھائی ہی تو رہتے ہیں۔''

''حیرت ہے کوئی ماں اپنے بچے کو کیسے چھوڑ سکتی ہے۔'' مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

''وہ غریب گھر کی لڑکی ہے، انڈیا میں اس کی ماں اور بہن بھائی ہیں۔ ماں شاید مرنے کے قریب ہیں اور بہن بھائیوں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔''

''اسے چاہیے وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو پاکستان بلوالے۔''

''میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو یہاں بلوانا اتنا آسان نہیں اور بُلا بھی لے تو وہ بے چارے یہاں کیا کریں گے۔ یہاں انہیں کون سہارا دے گا؟ ڈاکٹر حور کو تو تم جانتی ہو کیسی پتھر دل ہیں ان کے بھائی کی پہلی بیوی نے بھی انہی کی وجہ سے ان کے بھائی سے طلاق لی تھی۔'' فیروزہ کو تو خدا نے موقع دے دیا کہ دل بھر کے ڈاکٹر حور کے خلاف زہر اگلے۔

''کتنا بڑا اندھیر ہے، ان لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو یہاں بلوالیں۔ اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کی کتنی تاکید کی ہے۔''

''اور یہ لوگ بڑے ظالم ہیں، یہ کسی قیمت پر ان لوگوں کو یہاں نہیں بلوائیں گے۔''

''فیروزہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' ڈاکٹر حور کی آواز سن کر میں سکتے میں آگئی۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ پردے کے پیچھے سے ہماری ساری باتیں سن رہی تھیں۔

''میں اور میرے بھائی انہیں بلانا ہی نہیں چاہتے، وہ غریب فقیر لوگ ہیں۔ یہاں آگئے تو اس بچے کے ذریعے ہماری دولت پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''پر یہ تو سراسر ظلم ہے۔'' میں خود کو یہ کہنے سے روک نہیں سکی۔

''کیا ظلم ہے؟'' ان کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہوگیا۔

''ایک ماں سے اس کے بچے کو جدا کرنا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''ہم نے اسے جدا نہیں کیا وہ خود اپنے بچے کو چھوڑ کر جارہی ہے۔'' موٹے نقوش، سانولی رنگت اور کرخت چہرے والی ڈاکٹر حور کا چہرہ کچھ اور کرخت محسوس ہورہا تھا۔

☆☆☆

چند ماہ بعد وہ اپنے بھتیجے کو لے کر اسپتال آئیں تو ہم سب بچے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ بے حد خوب صورت اور صحت مند بچہ تھا۔

''آپ کا بھتیجا تو بہت خوب صورت ہے۔''

''بالکل میرے بھائی جیسا ہے۔'' اُن کے لہجے سے بھائی کی محبت ٹپک رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ بھائی بہن ایک دوسرے کی ضد تھے۔

''یہ زبیر کی دوسری شادی ہے پہلی بیوی اس لیے الگ ہوگئی کہ وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔'' ان کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

''تو آپ الگ ہوجاتیں کم از کم آپ کے بھائی کا گھر تو نہ برباد ہوتا۔'' ڈاکٹر فیروزہ آج اپنے سارے پرانے بدلے لینے پر تلی ہوئی تھی اور ویسے بھی اس کی شادی ہونے والی تھی اور شادی کے بعد اسے لاہور چلے جانا تھا۔

''میں الگ ہوجاتی...... کیسے رہتی......؟'' انہوں نے حیرانی سے فیروزہ کو دیکھا۔

''آپ بھی شادی کرکے اپنا گھر بسالیتیں۔'' فیروزہ نے اس طرح مذاق اڑانے والے انداز میں کہا کہ مجھے بھی اس کا جملہ اور لہجہ اچھا نہیں لگا۔

''میں......شادی کرلیتی......؟ ہمارے معاشرے میں مائیں اور بہنیں اپنے بوڑھے بیٹوں اور بدصورت بھائیوں کے لیے بھی کم عمر اور خوب صورت لڑکیاں تلاش کرتی ہیں۔ میں خوب صورت بھی نہیں تھی اور میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں گھر میں سب سے بڑی تھی۔ سب سے ذہین تھی، کمانے والی تھی اس لیے والدین نے اپنا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا۔ مجھ سے چھوٹے چار بھائی تھے اور اُن چاروں بھائیوں کی تعلیم ختم ہوتے ہوتے میں شادی کی عمر سے آگے بڑھ چکی تھی اور بدصورتی اور پکی عمر ایک ایسا عیب ہے جو لڑکی کی ساری صلاحیتوں اور خوبیوں کو ڈس لیتا ہے۔'' آج پہلی مرتبہ ان کے لہجے کی تلخی مجھے بری نہیں لگ رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کے موٹے، موٹے نقوش اور سانولی رنگت کے پیچھے اس معصوم لڑکی کا چہرہ نظر آرہا تھا جو آنکھوں میں خواب سجائے انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی اور جس کے چاروں طرف تنہائی کا بنجر صحرا ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔

آج مجھے سمجھ میں آیا تھا وہ اتنی سخت گیر کیوں تھیں۔ اُن کا لہجہ اتنا کرخت کیوں تھا۔ جب کوئی عورت درد سے کراہتی تو وہ اسے تسلی دینے کے بجائے اسے جھڑکتی کیوں تھیں۔

یہ دنیا دینے اور لینے کے اصول پر کام کرتی ہے۔ دنیا والوں نے جو کچھ انہیں دیا تھا وہ وہی اسے لوٹا رہی تھیں۔



مکمل ناول



پارس

نمرہ احمد

دوسرا حصہ



پارس کی ابھی تک اس کی طرف پشت تھی۔

"اوہ.........کاکروچ......!" اس نے سر جھکائے، جوتے کی نوک سے پتے ہٹائے تو.... سرسرانے کی آواز آئی جیسے کوئی کیڑا تیزی سے آگے دوڑا ہو، وہ اداسی سے ہنسی۔ جنگل کے ویرانے نے اس کی ہنسی نے زندگی بھردی۔

"پتا ہے، میری اور رضوان کی پہلی بار ملاقات بھی ایک کاکروچ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

کہتی ہوئی پھر سے آگے بڑھنے لگی۔ ”رضوان...... آپ کیوں چلے گئے!“

فائز کے تسمہ لپیٹے ہاتھ ابھی تک فضا میں تھے، سانس بھی رکی ہوئی تھی۔ وہ اس کی دسترس سے دور ہونے لگی، تب بھی وہ نہیں ہلا، بھائی جی کا ذکر ہر شے پہ چھانے لگا۔ کوئی منتر سا تھا جو وہ پھونک گئی تھی۔

”بہت اکیلا کر گئے ہیں وہ مجھے، یہ شکوہ ان سے ہمیشہ رہے گا۔“ وہ اب اس سے چند گز دور تھی۔ اس کی آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں مڑی تھی، بس اپنی رو میں چلتی جا رہی تھی۔

”حالانکہ جانے والا جان کر ساتھ نہیں چھوڑتا، پھر بھی شکوہ اسی سے ہوتا ہے، پتا نہیں کیوں...... فائز؟“ وہ جیسے اس کو اپنے عقب میں محسوس نہ کرتے ہوئے رکی اور دوبارہ ”فائز“ پکارتے ہوئے مڑی۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے جھک کر بظاہر جوتے کو ٹھیک کرنے لگا تھا۔

”کیا ہوا؟“ پارس نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”کچھ چبھ گیا تھا، بس نکل آیا۔“ جوتے میں ایڑھی کی طرف انگلی ڈال کر کچھ نکالتے ہوئے وہ جبراً ذرا سا مسکرایا۔ پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا۔ گرہ بندھے تسمے پہلے ہی جیب میں ڈال چکا تھا۔

”ہوں......“ وہ سر ہلا کر واپس مڑ گئی اور اسی رفتار سے چلنے لگی جیسے اس کے ساتھ ملنے کا انتظار بھی نہ ہو جیسے ایک دفعہ بس رسماً پوچھا ہو۔ وہ اب جاگنگ کے بجائے شکست خوردہ سا دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ دوبارہ جیب میں پڑے تسمے کی طرف نہیں گیا تھا۔ جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا، بے بسی تھی، تذبذب بھی تھا اور مایوسی بھی۔

”آفس میں ملتے ہیں۔“ وہ اب بھی اس سے کافی آگے تھی۔ جب جنگل کے اختتام پہ رک کر مڑی پھر اس کا چہرہ بس لمحے بھر کے لیے دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ سر بھی نہ ہلا سکا۔ مسکرا بھی نہ سکا۔

”رضوان، آپ کیوں چلے گئے؟“

”رضوان، آپ کیوں......“

”رضوان......“

اگر وہ منتر تھا تو اس کا طلسم فائز کے پورے وجود پہ چھا رہا تھا اور اگر وہ جھوٹ کا جالا تھا تو وہ اس میں لپٹ جانے کو تیار تھا۔

☆☆☆

”تمہیں کیا لگتا ہے، اگر وہ یہ الفاظ نہ کہتی تو تم اسے قتل کر دیتے؟ میرا خیال ہے تب بھی تم ایسا نہ کرتے۔“ کافی کا کپ اٹھا کر گھونٹ بھرنے سے قبل تنویر صاحب نے بغور اسے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا اور پھر کپ لبوں سے لگایا۔

فائز کا کپ اس کے سامنے رکھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ دونوں تنویر صاحب کے آفس میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ تنویر صاحب گھونٹ بھرتے ہوئے اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، البتہ وہ الجھا الجھا سا اپنے کپ پہ نگاہیں جمائے، وہاں سے بہت دور لگ رہا تھا۔

”اگر وہ یہ نہ کہتی تو میں اس کا گلا واقعی دبا دیتا۔“ وہ لب بھینچے بولا۔ جیسے خود پہ غصہ آنے لگا ہو، تنویر صاحب نے مکھی اڑانے والے انداز میں سر جھٹکا۔

”فیضی، ایسا نہیں ہو سکتا، تم بہت کچھ ہو سکتے ہو، قاتل نہیں...... اسے مار کر تمہیں کیا ملے گا؟“

”بھائی جی کا بدلہ...... اور ہوٹل......“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

تنویر صاحب نے کپ میز پہ رکھا، ٹیک لگائی اور آنکھیں سکیڑے غور سے اس کے تاثرات دیکھے۔

”فیضی تم مری اپنے بھائی جی کے لیے آئے ہو یا ہوٹل کے لیے؟“

فیضان چونکا پھر اپنے کو سنبھال کر سر جھٹکا۔

”آف کورس بھائی جی کے لیے، ہوٹل کی بات سے میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر ہوٹل بھی تو ہمارا ہے، پارس نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔“

”غلط، ہوٹل رضوان اپنی زندگی میں ہی پارس کے نام کر چکے تھے، قانونی طور پر وہ تمہارا نہیں ہے۔“

”مگر چھ میں سے تین ہوٹلز بھائی جی نے اس کے نام کر دیے، ہم ان کے سگے بہن، بھائی تھے ساری زندگی ساتھ گزاری، اس جائیداد کے اہل ہم تھے وہ نہیں۔“ اس کا چہرہ پھر سے تمتمانے لگا۔ ”وہ اداکارہ ہے، جادوگرنی ہے، اس نے بھائی جی کو نہ معلوم کس طرح ورغلا کر ہوٹلز اپنے نام لگوائے مگر وہ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی، ڈیم اٹ۔“ اس نے غصے سے مٹھی میز پر ماری، رہ رہ کر خود پہ تاؤ آ رہا تھا۔

”کتنا اچھا موقع تھا، میں مار سکتا تھا اسے...... پھر اس کا گلا دبا کر لاش پہاڑی سے نیچے پھینک دیتا اور جیسے اس نے بھائی جی کا پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دیا تھا اس کا بھی نہیں ہونے دیتا مگر نہیں...... میں چھ فٹ کا آدمی اس کے ایک فقرے پہ ہار گیا۔“ وہ اٹھ کر بے چینی و طیش سے ٹہلنے لگا۔ ”پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے آخر؟ کیوں بھول گیا میں کہ وہ میرے بھائی جی کی قاتل ہے، کیوں میں نے لمحے بھر کو اسے معاف کر دیا...... آخر کیوں؟“ اس نے دیوار پہ مکا مارا......

تنویر صاحب نے تاسف سے سر جھٹکا۔

”اس ایک فقرے میں ایسا کیا خاص تھا جو تمہارا اتنا اٹل ارادہ بدل گیا فیضی؟“ اس نے کرب سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنکھیں موندیں۔ وہ اب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

”مان تھا اس میں، محبت تھی۔ جیسے وہ بھائی جی کو بہت مس کرتی ہو جیسے ان کے پاس جانا چاہتی ہو، بہت خالص لہجہ تھا اس کا۔“ اس نے آنکھیں کھولیں اور انہی زخمی نگاہوں سے تنویر صاحب کو دیکھا۔

”اور اس کے اس خلوص کے بعد تم دوبارہ سے کیوں سمجھنے لگے ہو کہ وہ رضوان کی قاتل ہے؟“

جواب میں بے بسی سے اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

”کیونکہ وہ خلوص، وہ مان، وہ لہجہ سب دکھاوا تھا، وہ اداکاری کر رہی تھی اور میں اس کے فریب میں آ گیا۔“

”صبح کی اس گھڑی، ویران جنگل میں اپنے فنانشل ایڈوائزر کے سامنے اسے اداکاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ بالکل بھی الجھے ہوئے انداز میں سوال نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کا لہجہ بہت نپا تلا، بہت محتاط تھا۔ جیسے گرم لوہے کی تپش کا اندازہ لگانے کو احتیاط سے انگلی کی پور اس سے چھوؤ اور چھوتے ہی واپس کھینچ لو۔ جیسے گرم لوہے پہ ضرب لگانے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

”کیونکہ...... ڈیم اٹ...... کیونکہ میں اس کا فنانشل ایڈوائزر نہیں ہوں۔ میں رضوان حیات کا اکلوتا بھائی ہوں اور یقیناً وہ یہ بات جانتی ہے۔“ اس نے شکست خوردہ انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ ”وہ میرے ساتھ کھیل، کھیل رہی ہے، وہ میرے اعصاب آزما رہی ہے، وہ یقیناً میری اصلیت جانتی ہے، وہ انتظار کر رہی ہے کہ کب میں اس کے سامنے آ جاؤں اور......“

”اور؟“ تنویر صاحب نے ابرو اٹھائی، گرم لوہے کو پھر ہلکا سا چھوا۔

”اور اس سے یہ کرسی چھین لوں، جس پہ بھائی جی مجھے بٹھانا چاہتے تھے۔“ وہ بے بسی و تنفر سے کہتا ان کے سامنے واپس آ بیٹھا۔

”رضوان اس کرسی پہ تمہیں بٹھانا چاہتے تھے؟ آر یو شیور فیضی؟“ انہوں نے اس کی کافی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا کپ پھر سے اٹھا لیا۔

فائز نے جواب دینے کے لیے لب کھولے اور ساتھ ہی نگاہیں کافی کے کپ پہ گرائیں۔ جھاگ بیٹھ چکا تھا اور سطح پہ بچی کھچی کریم اور کڑوے مائع نے

عجیب ہیئت اختیار کر رکھی تھی۔ جیسے براؤن، پنک اور سفید ٹیڑھی میڑھی سڑکیں ہوں اور وہ واقعی سڑکیں ہی تو تھیں، گزرگاہیں جن پہ بہتے مائع کے ہر قطرے میں کوئی صبح، کوئی شام، کوئی رات چھپی تھی۔

یادوں کی گزرگاہیں......

رضوان حیات نے کافی کا گھونٹ بھرا اور اس کی ساری بات پر جیسے سر ہلاتے ہوئے کپ میز پر رکھا۔ قلموں کے سفید ہوتے بال، بارعب مونچھیں مگر آنکھوں میں چھایا ایک باوقار، مہربان اور مشفق سا تاثر۔ اسٹڈی کی بلائنڈز جو رضوان کے عقب میں تھیں، آدھی کھلی تھیں اور اُن سے چھن کر آتی روشنی، ان کے اطراف سے نکل رہی تھی۔ ایسے میں ان کا چہرہ مزید تاریکی میں چلا گیا تھا۔

مہربان سی تاریکی......

''آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' اسٹڈی ٹیبل پر اُن کے مقابل، میز پر ہاتھ ملا کر رکھے آگے ہو کر بیٹھا فکرمند سا نوجوان بولا...... رضوان ہلکا سا مسکرائے۔

''تم ہوٹل سنبھالنا چاہتے ہو، اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لیے کیا ہوگی؟'' انہوں نے پیالی پرچ میں واپس رکھی...... کانچ سے کانچ ٹکرایا...... فکرمند نوجوان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے...... وہ بالآخر مسکرا دیا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ خوش ہوں گے پھر کب سے کام شروع کروں میں؟''

''کل سے کر دو بے شک!'' وہ محبت سے مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔

''اوکے۔'' وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

''مگر تم کس ہوٹل میں کام کرنا چاہو گے؟'' انہوں نے اپنی ادھوری چھوڑی فائل دوبارہ کھولی اور میز پر رکھی عینک آنکھوں پہ لگائی۔

''جانتا ہوں کہ مری والا ہوٹل آپ کا سب سے قیمتی ہوٹل ہے مگر پہلا ہوٹل اور ہیڈ برانچ تو لاہور والا ہی ہے ناں، اس لیے یہیں کام کرنا چاہوں گا ویسے......'' وہ جیسے سوچنے کو رکا...... ''آپ سیٹھی صاحب کو کہاں ایڈجسٹ کریں گے؟''

رضوان نے عینک کے اوپر سے اسے حیرت سے دیکھا۔

''سیٹھی صاحب......؟ ہمارے لاہور والے ہوٹل کے جی ایم؟ کیوں، وہ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میرے آنے کے بعد تو انہیں کہیں بھیجنا ہی پڑے گا ناں......'' اس نے اب کے ریلیکسڈ انداز میں کہتے ہوئے میز پہ رکھا جار کھولا اور ایک کُکی نکالا۔

''کیوں...... تم تو فنانس ڈیپارٹمنٹ سے شروع کرو گے ناں؟ ان کا اس سے کیا تعلق......؟''

''شروع؟'' بسکٹ آدھا منہ میں تھا کہ وہ رک گیا۔ ''مجھے شروع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جی ایم کی سیٹ سنبھالنے کے لیے تیار ہوں، امریکا سے ڈگری لے آیا ہوں، اب مزید انتظار کیسا......؟'' اس نے جیسے اس بات کو احمق بچے کی بے وقوفی سمجھ کر اڑایا۔ رضوان نے عینک اتار کر میز پر رکھی...... فائل پرے کی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''فیضی...... تم ڈائریکٹ جی ایم کیسے بن سکتے ہو؟ پہلے دن کوئی بھی باس نہیں بن سکتا بیٹے...... نیچے سے شروع کرنا پڑتا ہے۔''

''آپ تو پہلے دن سے ہی اپنے ہوٹلز کے مالک تھے۔'' اس نے آدھا کترا بسکٹ واپس رکھا اور خفگی سے بولا۔

''میں پہلے ہی دن ایک سیون اسٹار ہوٹل کا مالک نہیں بن گیا تھا۔ پہلے دن میں ایک ڈھابے کا منیجر بنا تھا، اس جگہ آنے تک مجھے تیس سال لگے ہیں، ترقی آہستہ، آہستہ ہی ہوتی ہے۔'' رضوان نے گہری سانس بھری۔

''مجھے آپ کی success story نہیں سننی بھائی جی۔'' وہ جی بھر کر بیزار ہوا۔ ''مجھے بتائیں کہ میں کب جی ایم بن رہا ہوں۔''

''تم سے زیادہ قابل اور بہتر گریڈز والے لوگ ہمارے پاس سالوں سے کام کر رہے ہیں اور وہ ابھی تک اس عہدے پر بھی نہیں پہنچ سکے جس سے اوپر کا عہدہ تم مانگ رہے ہو......''

''ویل، سمپل! کیونکہ وہ رضوان حیات کے بھائی نہیں ہیں اور میں آپ کا بھائی ہوں۔'' کرسی سے ٹیک لگا کر اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے نوجوان کے انداز میں اب خودسری در آئی تھی۔

''یہ اپروچ درست نہیں ہے فیضی...... اس طرح تم ایک اچھے ہوٹلیئر نہیں بن سکتے اور تمہیں تو مجھ سے بھی آگے جانا ہے بیٹے۔''

''مطلب آپ مجھے جی ایم نہیں بنانا چاہتے؟'' اس کے ماتھے پر بل تھے، آنکھوں میں ناگواری...... رضوان نے تاسف و ملال سے اسے دیکھا۔

''بات میرے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں ہے، بات اصولوں کی ہے جنہیں لے کر میں ہمیشہ چلا ہوں اور اگر ان پر عمل نہ کرتا تو آج یہاں نہ پہنچ سکتا۔ میرٹ، میرٹ ہوتا ہے فیضی......''

''میں پڑھا لکھا ہوں، باہر کی ڈگری ہے، آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے یا تو میں جاہل، بے ایمان آدمی ہوتا تو آپ کہتے، مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ مجھے میری قابلیت کے باوجود آپ ہوٹل کیوں نہیں سنبھالنے دے رہے ہیں؟''

''ہوٹل تم نے ہی سنبھالنا ہے فیضی...... میرے کون سے بچے ہیں جن کے نام میں کچھ کر جاؤں گا۔'' اُن کی آنکھوں میں بے حد دکھ ابھرا...... فیضان نے ہونہہ کہہ کر رخ پھیر لیا۔

''اور اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم پہلے کام کا مشکل وقت گزارو، محنت کرو پھر اونچے لیول پر آؤ جو شخص ایک ہی جست میں سیڑھیاں عبور کرنا چاہے وہ سب سے اونچے زینے پہ پہنچ تو جاتا ہے مگر آگے اسے خلا ملتا ہے۔ قدم قدم زینے چڑھو گے تو اوپر روشن راہداریاں ہی ملیں گی اور ان کو پانے کی خوشی بھی......'' وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہے تھے۔

''مطلب ابھی آپ مجھے اپنے شاندار ہوٹلز کے قابل ہی نہیں سمجھتے؟'' اس نے بدمزگی سے سر جھٹکا۔

''ارے، میں تو خوش ہوں کہ تم وہاں کام کرو گے، میں تو چاہتا ہوں تم کل سے کام سنبھال لو مگر......''

''مگر نچلے درجے کا کام......'' وہ طنزیہ بولا۔

''فیضی...... میں تمہیں چپڑاسی نہیں بھرتی کر رہا...... ایک اچھی پوسٹ دے رہا ہوں، تمہیں ترقیاں بھی جلد ملیں گی، تم شیئر ہولڈر بھی ہو گے، بہت جلد تم اس مقام پر......''

''جانے دیں...... مجھے تو لگتا ہے آپ مجھے اپنے بزنس میں شامل ہی نہیں کرنا چاہتے...... قبر میں ساتھ لے کر جانا ہے جیسے سب کچھ۔'' اٹھتے ہوئے آخری فقرہ وہ محض بڑبڑایا تھا مگر انہوں نے سن لیا تھا اور اُن کے چہرے پر زخمی تاثرات ابھرے...... آنکھوں میں گہرا ملال بھرا۔

''فیضی......'' انہوں نے اٹھتے ہوئے اسے پکارا مگر وہ سنے بغیر اسٹڈی سے نکل گیا۔ وہ آدھے کھڑے ہوتے ہوئے واپس بیٹھے۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر مسلتے انہوں نے سر سیٹ کی پشت سے لگایا آنکھوں میں چبھن سی تھی۔

دل کو مسلتا ہاتھ اب دھیرے دھیرے ٹھہر گیا تھا، بہت ضبط سے انہوں نے فائل واپس اٹھائی اور اسے دیکھنے لگے۔ عینک اٹھانا وہ بھول چکے تھے......

کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی، سڑکیں، گزرگاہیں، جھاگ، سب غائب ہو رہا تھا۔ وہ ذرا چونکا پھر تنویر صاحب کو دیکھا، وہ جواب کے انتظار میں تھے۔

''آف کورس، بھائی جی کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں ان کا بزنس سنبھالوں...... انہوں نے خود

مجھ سے یہ کہا تھا۔" وہ بہت اعتماد سے بولا۔
"ظاہر ہے، تم ان کے بھائی تھے۔" تنویر صاحب نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر آخری کڑوا گھونٹ بھرا...... چیک کر کے وہ ہاتھ کھینچ چکے تھے۔
فائز بنا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا، باہر آ کر وہ کاریڈور میں نہیں رکا اور اگر رکا تو پارس کے آفس کے سامنے......
شیشے کے دروازے سے وہ ایک کاغذ پہ کچھ لکھتی دکھائی دے رہی تھی۔ سر ذرا ترچھا کیے، تیز تیز قلم چلاتی، وقفے وقفے کے بعد انگلی سے آگے پھسلنے والے بال پیچھے کرتی، وہ صبح کی اداس، کھوئی کھوئی لڑکی سے یکسر مختلف نظر آ رہی تھی۔
فائز چند لمحے خاموش مگر سرد نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ پارس نے سر اٹھایا...... دونوں کی نگاہیں ملیں، فائز جبراً مسکرایا اور احتراماً سر کو جنبش دے کر واپس پلٹ گیا۔ پارس ایک نگاہِ غلط اس پر ڈال کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

فیروزہ مائی نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا...... کمرا خالی تھا البتہ بالکونی کا دروازہ نیم وا نظر آ رہا تھا۔ وہ قدرے ہچکچائی، چہرے پر تذبذب و ہیجان کے آثار تھے پھر جی کڑا کر کے اندر چلی آئی۔
بالکونی میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر پارس بیٹھی دور پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نہ کچھ تلاش کر رہی تھیں نہ کہیں گم تھیں، وہ بس اداس تھیں۔
"پارو...... بات تو سن......" فیروزہ مائی لہجے کو خوش اخلاق بناتی ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی۔
"کیا بات ہے؟" پارس نے نگاہوں کا رخ پھیرا اور اسے سنجیدگی سے دیکھا۔
"دیکھ...... میں تیری ماں ہوں، کوئی حق ہے میرا تجھ پر، ہاں......" وہ بہت مان، بہت استحقاق سے آگے کو ہو کر بیٹھی کہنے لگی۔
پارس اسی طرح ٹیک لگائے، سامنے دیکھتی رہی۔ شال کے اندر سینے پر لپٹے بازوؤں تک نے جنبش نہ کی۔
"اسی طرح میں شکیل کی بھی ماں ہوں، اس کی تکلیف بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔"
"تم صرف شکیل کی ماں ہو، امی۔"
"دیکھ، تو مجھ سے ناراض ہے، جانتی ہوں مگر میں نے ساری زندگی تیرا بہت خیال رکھا ہے، کیا تجھے یاد نہیں؟"
"مجھے کچھ بھولا ہی کب ہے؟ ہر چیز یاد ہے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔
"تو پھر یہ بات بھی یاد ہو گی کہ آج اگر تو اس ہوٹل کی مالک ہے تو میری وجہ سے۔" فیروزہ مائی کے لہجے سے خوش اخلاقی مفقود ہونے لگی اور اس کی جگہ دبے دبے غصے و بے بسی نے لے لی۔ "یہ میں ہی تھی جس نے اس بڈھے سے تیرے لیے ہوٹل لکھوایا تیرے مہر میں، یہ میں تھی جس نے تجھے آج اس مقام تک پہنچایا ہے، میرے احسان یاد رکھ پارو۔"
پارس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا...... اس کی نگاہیں دور پہاڑوں پہ جمی تھیں...... سرسبز پہاڑیاں، ان کے سروں کے گرد دائرے بنائے بادل، سرمئی آسمان...... خوب صورتی در خوب صورتی...... فسوں در فسوں...... راز در راز......
اس نے بیچ سے مانگ نکال کر گردن کے پیچھے جوڑا باندھ رکھا تھا۔ کانوں میں وہی بالیاں، سانولی پُرکشش رنگت پہ چھایا اضطراب، وہ سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ رضوان حیات نے نہ سمجھنے والی نظر اس پر ڈالی...... اور پھر اس کے ساتھ بہت استحقاق سے براجمان کرخت چہرے اور سونے کے ٹاپس والی عورت پہ جس نے سر پہ لیا دوپٹا کانوں کے پیچھے اُڑس رکھا تھا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے میں نے صرف آپ کو بلایا تھا مس......؟" پارس نے ہراساں ہو کر اپنی پلکیں اٹھائیں، میز کے اس طرف اپنی پاور سیٹ پہ بیٹھے وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آفس میں باہر کی ٹھنڈ کے برعکس، ہیٹر کی گرمائش اور آرام دہ ماحول تھا۔ بوجھ در بوجھ...... پارس کی پلکیں واپس گر گئیں۔
"بڑے صاحب...... میں خود ہی اس کے ساتھ چلی آئی، کام تھا جی مجھے آپ سے...... اب کوئی اور تو اس پورے ہوٹل میں میری بیٹی کی نہیں سنتا، سوچا آپ ہی سے بات کی جائے۔" آخر میں فیروزہ مائی نے اداس سی آہ بھری۔
رضوان کی آنکھوں میں تشویش ابھری۔
"کیا کوئی مسئلہ ہے؟ ہوٹل میں کچھ ہوا ہے؟" انہوں نے پھر سے پارس کو دیکھتے ہوئے سوال کیا، اس کی ٹھوڑی مزید سینے سے جا لگی۔
"بہت بڑا مسئلہ آ گیا ہے جی، اب آپ سے کیا چھپانا؟ بیٹی میری تو کچھ بتائے گی نہیں، میں ہی بتاتی ہوں۔" فیروزہ مائی بہ عجلت بتانے لگی۔ "میرا بیٹا شکیل، پارس کا اکلوتا بھائی...... (سر جھکائے بیٹھی پارس کی پیشانی پر بل پڑا) بہت مشکل میں آ گیا ہے جی، عرصہ ہوا روزی کمانے دبئی گیا تھا، قرضے لے کر ٹکٹ کا آسرا ہوا تھا، اب اتنے برس میں قرضے کی ساری رقم جمع کی کہ اس آدمی کو واپس کرے کہ اس کے گھر کے راستے میں ڈاکوؤں نے پستول تان کر سب چھین لیا، ہم پر تو جی قیامت ٹوٹ پڑی۔ برسوں کی محنت پائی، پائی جوڑ کر جمع کی گئی رقم...... سب کچھ برباد ہو گیا۔" فیروزہ مائی اب آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے بار بار اپنے نیلے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کر رہی تھی۔
"پولیس میں رپورٹ کروائی؟" رضوان حیات سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ گاہے بگاہے ایک خاموش نگاہ پارس پر بھی ڈال لیتے۔
"کرائی ہے جی اس نے مگر زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا ناں، اسے بھی تو زخمی کر گئے تھے ڈاکو...... اب وہاں دیارِ غیر میں اکیلا بیمار پڑا ہے۔" فیروزہ مائی کو جب لگا کہ وہ ہمدردی جگانے میں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئی تو کہانی میں ایک سب پلاٹ کا اضافہ کر دیا۔ پھر پُرامید نظروں سے رضوان صاحب کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہنوز سنجیدہ تھے۔
"کتنے پیسے تھے؟"
"پانچ لاکھ تھے جی۔" انہیں کام کی بات پر آتا دیکھ کر وہ باقی ماندہ آنسو جلدی جلدی پونچھ کر کہنے لگی۔ "آپ کی بڑی نوازش ہو گی صاحب، اگر آپ پارو کو اگلے پورے سال کی تنخواہ ایڈوانس اور کچھ اوپر قرض دے دیں، بس پانچ لاکھ چاہیے۔ ہم سارا قرض اتار دیں گے، ڈبل شفٹ کرے گی پارو۔"
"ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں، اب آپ جا سکتی ہیں۔" فیروزہ مائی کا چہرہ کھل اٹھا۔
"بہت بہت شکریہ...... بڑے صاحب۔" وہ جانے کے لیے اٹھی، پارس بھی ساتھ ہی اٹھنے لگی۔
"آپ نہیں۔" انہوں نے فقط اتنا کہا، پارس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے، اس کی پلکیں پھر گر گئیں وہ واپس بیٹھ گئی۔ فیروزہ مائی بنا پروا کیے باہر جا چکی تھی۔
چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ سر جھکائے بہ مشکل ہمت مجتمع کر کے بولی۔
"سر، آئی ایم سوری، وہ زبردستی ساتھ آ گئیں، میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی مگر......" وہ مزید نہیں بول سکی۔ حلق میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔ احساسِ توہین، بے بسی کمزوری، بہت سی زنجیریں اسے جکڑے ہوئے تھیں۔
"مجھے خوشی ہے کہ آپ کی والدہ ساتھ آ گئیں

ورنہ میں تو کبھی جان نہیں سکتا تھا کہ آپ اصل میں کون ہیں۔''

اس نے نگاہیں اٹھائیں، الفاظ سخت تھے مگر ان کا لہجہ اور چہرہ بہت پُرسکون اور نارمل تھا۔

''کیا وہ واقعی آپ تھیں جو کل لابی میں صفائی کے عملے کو ڈیفنڈ کرتے ہوئے کاکروچز کے بارے میں اظہارِ خیال کررہی تھیں؟ میں نے اپنے آفس میں آج جس لڑکی کو بلایا تھا، مجھے کہنے دیجیے کہ آپ وہ نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے متعلق میرے سارے اندازے غلط تھے۔'' وہ حیران تھے، متعجب تھے، مگر غصے میں نہیں تھے۔ ان کا پُرسکون انداز پارس کے تنے ہوئے اعصاب کو مزید ٹینس کرگیا۔

''سر... جیسا کہ میں نے کل کہا تھا، مجھے ہوٹل جس کام کی تنخواہ دیتا ہے، میں کل وہی کررہی تھی۔ وہ میرا ڈیوٹی ٹائم تھا مگر اس وقت میرا ڈیوٹی ٹائم نہیں ہے، ابھی میں اپنی جاب نہیں کررہی۔''

''کیا انسان کی پوری شخصیت ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کے ساتھ ہی بدل جاتی ہے؟ اتنی زیادہ بدل جاتی ہے؟''

پارس نے گہری سانس باہر کو خارج کی، اس کی ندامت اور خجالت اب مدافعانہ انداز میں بدلنے لگی تھی۔ فیروزہ مائی جاچکی تھی اور اس کا اعتماد واپس آرہا تھا۔

''سر یہ منحصر ہے کہ انسان کن حالات سے گزر رہا ہے۔ آپ اس کو منافقت کا نام دینا چاہ رہے ہیں شاید، ٹھیک ہے...... مگر میں اسے مجبوری کا نام دوں گی۔''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا یہ کمزور اور بے بس سا ایٹی ٹیوڈ صرف اپنی والدہ کی موجودگی میں تھا تو......؟'' وہ محتاط انداز میں بولے۔

''تو میں کہوں گی کہ یہ ارادتاً نہیں، عادتاً تھا۔ کچھ لوگوں کے سامنے آپ کبھی آواز بلند نہیں کرسکتے۔''

''یہ ادب تھا یا محبت......؟''

''مجبوری تھی، سر......'' اس نے قدرے اعتماد سے سر اٹھا کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''یہ منظر بہت دفعہ دُہرایا جاچکا ہے۔ ... سے اب تک، ہر تیسرے چوتھے مہینے اپنے employer کے سامنے بے عزت ہونا، قرضے کے لیے ہاتھ پھیلانا...... مگر بہت دفعہ کی دُہرائی کے باوجود بھی مجھے اس منظر کی عادت نہیں پڑسکی۔ ... دفعہ اتنا ہی زیادہ باعثِ شرمندگی ہوتا ہے جتنا ... بار ہوا تھا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے قرضہ مت دیں، ہوسکے تو مجھے نوکری سے نکال دیں مگر یہ قرضہ مت دیجیے گا۔ سمجھیں کہ میری ماں آپ کے پاس آئی ہی نہیں تھی۔''

رضوان حیات نے خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

''میں جاؤں، سر؟'' وہ اٹھتے ہوئے اجازت طلب کررہی تھی۔

''بی بی آج کھانے میں کیا پکانا ہے؟'' افضل بابا کی آواز پر ماضی کا فسوں، خوب صورتی ... راز...... سب سرسبز پہاڑیوں میں بکھر گئے۔ اس نے دھیرے سے گردن موڑ کر چوکھٹ میں کھڑے افضل بابا کو دیکھا، جو جواب کے منتظر تھے، فیروزہ مائی کب کی جاچکی تھی۔

''کچھ بھی بنالیں یا فیروزہ بیگم سے پوچھ لیں۔''

''جی بہت بہتر......'' وہ کہہ کر پلٹنے لگے پھر جیسے رکے، چہرے پر ہچکچاہٹ در آئی۔

''پارس بیٹی......'' وہ رکے۔

''جی کہیے، کوئی بات ہے جو آپ کو پریشان کررہی ہے؟'' پارس بغور اُن کا انداز دیکھ رہی تھی۔

''جی نہیں......'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے دُکھی بھی تھے مگر مجبور بھی تھے۔

''بس بڑے صاحب بہت یاد آتے ہیں۔'' انہوں نے نم ہوتی آنکھیں رگڑیں۔ پارس اداس سے مسکرادی۔

''وہ بھولے ہی کب ہیں افضل بابا؟'' بابا مزید کچھ کہے بغیر پلٹ گئے، پارس کی مسکراہٹ سمٹی، اس نے ذرا تشویش سے انہیں جاتے دیکھا۔ کچھ تھا جو افضل بابا کو پریشان کررہا تھا۔

☆☆☆

آفس میں معمول کا آرام دہ ماحول تھا۔ گلاس ڈورز کے اس پار پارس اپنی پاور سیٹ پہ بیٹھی، لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال دونوں کندھوں اور کمر کو ڈھانپے ہوئے تھے، آنکھوں میں وہی سپاٹ پن اور سنجیدگی تھی جو اس کا خاصہ تھا۔

دفعتاً انٹرکام کی گھنٹی بجی...... اس نے مصروف سے انداز میں اسکرین کو ہی دیکھتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔

''یس......؟''

''میم، میں ریسپشن سے فضہ بات کررہی ہوں۔''

''فضہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ماسوائے کسی بہت اہم کام کے آپ مجھے ڈسٹرب نہیں کریں گی؟'' اس نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''آئی ایم سوری میم...... مگر ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں، شجاع طاہر علی، کیا میں اُن کو آپ کے بلاک میں بھیج دوں؟''

پارس کی آنکھوں میں اضطراب در آیا۔ بھویں سکڑ گئیں۔ بے اختیار اس نے دانت سے نچلا ہونٹ کاٹا۔

''جی بھیج دیں۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا۔ چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات تھے۔ چند لمحے وہ مضطرب سی بیٹھی رہی پھر فون اٹھایا۔

اس کے گلاس ڈورز کے باہر ڈیسک پہ بیٹھی سیکرٹری کا انٹرکام بجا، اس نے پھرتی سے ریسیور کان سے لگایا۔

تمھیں کیا معلوم

بات بے بات ہنسنے والو
تمہیں کیا معلوم
اندر کی گھٹن کیا ہوتی ہے
سطحِ آب کی لہریں گننے والو
تم کیا سمجھو گہرائی کیا ہوتی ہے؟
اپنی آنکھوں کو ثروت کی تیز چمک سے چکا چوند کرنے والے
بھوکے لوگو......! تمہیں کیا معلوم بھوک کیا ہوتی ہے
زندگی کو ارزاں کہنے والے
ناشکرے لوگو! تمہیں کیا معلوم، زندگی کی قیمت
موت کی تلخی کیا ہوتی ہے، سانس کی ڈوری کیا ہوتی ہے
راتوں کو گہری نیند سونے والے
رت جگوں کی نفرت میں
کتنا کرب ہوتا ہے
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو

مرسلہ: سامعہ تبسم
کلام: سعد اللہ شاہ

''یس میم۔''

''ابھی شجاع طاہر نام کے ایک صاحب آئیں گے، انہیں اپنے پاس روکے رکھیے گا اور جب تک میں نہ کہوں، اندر مت بھیجے گا۔ کیا میری بات آپ کو سمجھ آگئی ہے؟'' سیکرٹری نے دروازے کے پار پارس کو دیکھا۔ جو اسے ہی دیکھ رہی تھی پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''جی بالکل، میم......!''

پارس نے ریسیور واپس رکھا اور لیپ ٹاپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر رخ موڑ لیا، یوں کہ باہر سے اس کی کرسی

اور سر کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ اسکرین کو دیکھتی اپنی ٹائپنگ کا سلسلہ وہیں سے جوڑنے لگی جہاں سے ٹوٹا تھا مگر اب ارتکاز بھی ٹوٹ چکا تھا۔

وہ جس طرح بیٹھی تھی، یہاں سے آسے دیوار سے لگا بک شیلف سامنے دکھائی دیتا تھا (اگر وہ سامنے رخ کر کے بیٹھتی تو یہ بک شیلف اس کی پشت پہ ہوتا) بک شیلف کے چمکتے شیشے میں باہر سیکرٹری بیٹھی نظر آرہی تھی۔ البتہ باہر سے دیکھنے پہ پارس کا عکس نظر نہیں آتا تھا۔

پارس نے دوبارہ ٹائپ کرنے کی کوشش کی مگر چہرے پر در آئی ہیجانی کیفیت، اضطراب، دبا دبا سا غصہ، ناگواری...... یہ سب جذبات مل کر جیسے اسے کام نہیں کرنے دے رہے تھے، وہ لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پر انگلی پھیرتی بے توجہی سے اِدھر اُدھر کی چیزیں دیکھنے لگی۔

قریباً دس منٹ گزرے یا شاید پندرہ، جب اسے شیشے میں جھلکتے عکس میں وہ آتا دکھائی دیا۔ ایڈمن بلاک ہوٹل کے ریسپشن والے پہلے بلاک سے خاصا دور تھا۔ پارس نے نظریں اسکرین پہ ہی رکھیں البتہ کن انکھیوں سے اسے باہر کا سارا منظر نامہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہلکا کیمل کلر کا سوٹ بنا ٹائی کے، آنکھوں کو دھیما تاثر دیتے گلاسز وہ سیکرٹری کی میز کو نظر انداز کیے، نرم مسکراہٹ لبوں پر لیے سیدھا پارس کے آفس کی طرف بڑھا۔ بظاہر اسکرین کو دیکھتی پارس کے اعصاب تن گئے مگر وہ آدھے رستے میں تھا جب سیکریٹری کھڑی ہوئی۔

''سر، پلیز آپ اندر نہیں جاسکتے، میڈم مصروف ہیں۔'' شجاع رکا اور حیرت سے اسے دیکھا۔

''مگر ریسپشن پہ مجھے کہا گیا تھا کہ میں آسکتا ہوں۔''

''جی سر، آپ میڈم کا انتظار کر سکتے ہیں، وہ جب فارغ ہوں گی آپ کو بلالیں گی، بیٹھیے۔'' وہ سامنے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خود بھی واپس بیٹھی۔ شجاع نے تذبذب سے شیشے کے بند دروازوں کے پار دِکھتی اس کی کرسی کی پشت کو دیکھا، پھر سست روی سے کرسی کھینچی۔

''آپ پلیز انہیں مطلع کر دیجیے کہ شجاع طاہر علی آئے ہیں۔''

''سر، اُن کو مطلع کیا جا چکا ہے مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں، وہ بے حد مصروف ہیں اور ان کا آرڈر ہے کہ جو کوئی بھی ہو، انتظار کرے۔'' پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتی وہ واپس کی بورڈ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

شجاع نے اچنبھے سے دوبارہ پارس کی سمت دیکھا پھر کلائی پر بندھی گھڑی کو اور پھر گہری سانس لے کر جیسے انتظار کرنے لگا۔

پارس کے تنے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے تھے۔ وہ کن انکھیوں سے مسلسل باہر بیٹھے شجاع پہ نظر رکھے، بظاہر پھر سے کام میں مصروف ہوگئی۔ اب کہ اس کو زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی اور جلد ہی ذہن کام پہ دوبارہ فوکس کرنے لگا۔

fear of unknown جب تک سامنے نہ آئے، انسان یونہی منظر بدلتا ہے۔ ایک دفعہ سامنا کر لو تو پتا چلتا ہے کہ وہ تو صرف ہوا کا جھونکا تھا، جس کی دور سے آتی آواز ڈراتی ہے، غراتی ہے مگر نہ اس کا کوئی وزن ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی زور۔

اس کے کی بورڈ پہ چلتے ہاتھ تیز ہو گئے تھے، وہ اب پہلے سے بہتر توجہ کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ البتہ گاہے بہ گاہے بک شیلف کے شیشے میں جھلکتا عکس بھی دیکھ لیتی۔

کتابوں کے اوپر چھپا وہ منظر ویسا ہی تھا۔ وہ بہت بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کی تصویر ہے جو قطار در قطار کتابوں کے اوپر کسی وال مورال کی طرح چسپاں ہے۔

پارس کا ذہن پھر بھٹکنے لگا۔ ایک کتاب سے دوسری...... دائیں سے بائیں بھوری، سیاہ، سبز، سرخ جلدیں...... سنہرے رنگوں سے لکھے ٹائٹل، ان دیکھی سیاہی سے لکھی اَن مٹ کہانیاں......

اس کی آنکھوں کے سامنے یادوں کا روڈ میپ، اپنے تمام تر سائن بورڈز کے ساتھ پھیلنے لگا......

''پارو...... پارو......'' وہ اس نیم روشن کمرے کے کونے میں میز ڈالے، کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی، بھوری، سیاہ، سرخ جلد والی کورس کی کتابیں، ٹیبل پر جلتا زرد لیمپ، لمبے بالوں کی چوٹی بنائے، سر جھکائے وہ منہمک سی قلم چلا رہی تھی جب باہر سے رافعہ اسے پکارتی اندر آئی۔

پارس نے آنکھیں ملیں تکان اتارنے کی ناکافی سعی، جھولتی لٹ بالی والے کان کے پیچھے اُڑسی اور پلٹ کر دیکھا۔ شجاع کی تیسرے نمبر کی بہن رافعہ دروازے میں کھڑی تھی۔

''ہاں رافعہ کیسی ہو؟'' وہ زبردستی ذرا سی مسکرائی۔

''بالکل ٹھیک، پتا ہے، بھائی پہنچ گیا برطانیہ......'' اس نے دوسری سانس ہی نہیں لی اور ''نئی خبر'' اگل کر میز کے کنارے پر آٹکی۔

''اچھا...... اچھی بات ہے۔'' اس کی جبری مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ آنکھوں میں مبہم سا تاثر تھا جیسے معلوم نہ ہو کہ اسے خوش ہونا چاہیے یا ناخوش......

''آج صبح پہنچا ہے، بس ایک منٹ کی کال کی، جلدی جلدی خیریت بتائی اور ہم سب کی خیریت پوچھی اور فون بند کر دیا۔ ہاں تمہارا ابھی پوچھا تھا۔''

''ہوں......'' وہ سر ہلا کر اپنے کھلے رجسٹر کو دیکھنے لگی۔ رافعہ بے نیازی سے بولے جا رہی تھی۔

''پتا ہے وہاں بہ اونچی، اونچی عمارتیں ہوتی ہیں، بھائی تو بڑا خوش ہے، کہہ رہا تھا کہ آرام سے سیٹل ہو جائے پھر خط لکھے گا اور فون بھی کرے گا۔ پیسے بھی واوا بھیجے گا۔ ہمارے تو دن پھر جائیں گے۔''

''آمین......!'' وہ رجسٹر کے صفحے کا کنارہ مروڑنے لگی جیسے رافعہ سے نگاہ نہ ملانا چاہتی ہو۔ جیسے اندیشہ ہو کہ اس کی نگاہوں کا تاثر تک وہ نوٹ کر کے بھائی کو بتائے گی۔

''اماں کہہ رہی تھی، پہلے گھر کا پلستر کروائیں گے۔ پھر نیا سامان ڈلوائیں گے، اوپر کا پورشن بھی نیا بنوانا ہے، بھائی کی جب شادی کریں گے تب تک وہ پورشن لش پش تیار ہوگا۔ ہائے پتا نہیں اب بھائی کسی گوری کو بیاہ نہ لائے۔ ویسے لے بھی آئے تو کوئی حرج تو نہیں۔ ہماری تو پورے محلے میں ٹور بن جائے گی۔''

''آہو......! جیسے گوریاں تو انتظار میں تھیں ناں کہ کب تیرا غریب، سوکھا سڑا بھائی غیر قانونی طریقے سے اُدھر آئے اور وہ اس پر قبضہ کر لیں۔'' فیروزہ مائی نے گزرتے ہوئے سن لیا اور دروازے سے گردن نکال کر تبصرہ کرتی یہ جا وہ جا۔

پارس نے قدرے گڑبڑا کر رافعہ کو دیکھا مگر اس نے تنفر سے ہونہہ کر کے سر جھٹکا۔

''لوگوں سے بھی ناں کسی کی خوشحالی ہضم نہیں ہوتی۔ جل ککڑے نہ ہوں تو۔'' وہ پارس پہ ایک گہری نظر ڈال کر بولی جیسے زیرِ عتاب صرف فیروزہ تائی نہ ہو بلکہ پارس بھی ہو۔

روشنی

حضرت ابراہیم تیمیؒ نے موسیٰ بن تیران کو اُن کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور ان سے اللہ تعالیٰ کے سلوک کے بارے میں سوال کیا۔

انہوں نے جواب دیا۔ ''جب سے مرا ہوں، اُمرا کی ضیافتوں کا جواب دے رہا ہوں اور ایک سوئی کے بدلے قید میں ہوں، جو میں نے مستعار لی تھی اور واپس نہیں کی تھی۔'' پھر میں نے دریافت کیا۔ ''کون سی قبروں میں روشنی ہے؟'' آپ نے فرمایا۔ ''دنیا میں مصیبت زدگان کی قبروں میں روشنی ہے۔''

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

"فکر نہ کرو، انشاء اللہ سب اچھا ہو جائے گا۔" وہ نرمی سے بولی۔ رافعہ کے لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ امڈ آئی۔

"ابھی تم دیکھنا، ہمارے دن کیسے پھرتے ہیں، جب نیا ٹی وی لے کر آئیں گے تو سارے ایرے غیرے ہمارے دروازے پر کھڑے ہوں گے، ڈرامے کے وقت، پر اب تو میں اِدھر کسی کو منہ بھی نہیں لگاؤں گی، ہونہہ...... جلتے ہیں سب۔" وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔

بک شیلف پہ ابھرے عکس میں ہلچل مچی تھی۔ پارس نے چونک کر دیکھا۔ باہر فائز آتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک فائل کھولے مصروف سے انداز میں چلتا ہوا اس سے پہلے کہ وہ اندر آتا، سیکرٹری نے اسے روک دیا اور وہی کچھ کہا جو وہ منتظر بیٹھے پہلے ملاقاتی کو کہہ چکی تھی۔ فائز ذرا حیران ہوا پھر اس نے کچھ کہا جس پر سیکرٹری نے انٹرکام اٹھایا۔

"جی......؟" پارس نے بزر بجنے پر ریسیور کان سے لگایا۔

"فائز صاحب کو کچھ ڈاکومنٹس پہ......"

"انہیں بھیج دیں۔" اس نے یہ کہہ ریسیور رکھ دیا۔ سیکرٹری نے سر ہلایا، فائز دروازہ کھول کر اندر آیا۔ شجاع کے چہرے پر الجھن تھی مگر وہ بیٹھا رہا۔

پارس اپنی گھومنے والی کرسی پر مڑی اور یوں چہرہ سامنے کو ہوا۔ باہر شجاع نے امید افزا نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ذرا سا آگے کو ہوا مگر وہ فائز کی طرف متوجہ تھی جو میز پر جھکا کھڑا، اس کے آگے فائل رکھ رہا تھا۔

"میم، میں نے اسے ریویو کر لیا ہے، آپ دستخط کر دیں۔" پارس نے ہولڈر سے سبز پین نکالا اور ایک کے بعد ایک دستخط کرنے لگی۔ فائز نے جھکے جھکے پارس کا چہرہ غور سے دیکھا پھر پیچھے مڑ کر شجاع کو پھر دوبارہ پارس کو۔

"میم، آپ مصروف تھیں، شاید مس سعیدہ نے آپ کو آگاہ نہیں کیا، آپ کے کزن شجاع ملاقات کو آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ریسیپشن پر بتایا تھا کہ وہ آپ کے کزن ہیں، کیا میں جاتے ہوئے انہیں اندر بھیج دوں؟"

دستخط کرتا ہوا پارس کا ہاتھ رکا، اس نے نگاہیں اٹھا کر فائز کو دیکھا، خاموش مگر گھورتی ہوئی نظر۔

"سوری میم!" وہ گڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھوں کا سحر اور جلال...... فائز نے سر جھکا دیا۔ پارس دوبارہ دستخط کرنے لگی۔

"تھینکس......" کام ختم ہوا، فائز نے فائل اٹھائی اور نگاہ ملائے بغیر باہر نکل گیا۔ البتہ جاتے ہوئے اس نے ایک گہری نظر شجاع پر ضرور ڈالی تھی۔

پارس دوبارہ ٹائپنگ جاری کرتی مگر اس دوران فون آ گیا۔ اسے ہوٹل کے ایک رہائشی بلاک کا وزٹ کرنا تھا، وہاں تعمیراتی کام جاری تھا اور اسے چیکنگ کرنی تھی۔ وہ اپنا پرس، فون اور گلاسز اٹھائے آفس سے باہر نکلی۔ گلاسز گریبان میں اٹکاتے ہوئے اس نے باہر بیٹھے شجاع کو دیکھا جو فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جی شجاع، آپ اِدھر کیسے...... خیریت؟" سپاٹ سنجیدہ لہجے میں وہ بولی۔ جیسے لمحے بھر کو رکی ہو اور جانے کی جلدی ہو۔

"جی میں...... آپ سے ملنے......" پون گھنٹے کے انتظار نے اس کو کافی ڈل کر دیا تھا۔

"کوئی آفیشل کام تھا آپ کو؟"

"نہیں، میں آپ کے گھر آنا چاہتا تھا، تائی...... تائی سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"شیور، وہ اس وقت گھر پر ہیں، آپ وہاں جا سکتے ہیں، مجھے ابھی کام سے جانا ہے۔ بائے۔" وہ بِنا جواب کا انتظار کیے آگے بڑھ گئی۔

شجاع نے بے بسی و مایوسی سے اسے جاتے دیکھا اور سر جھٹکا۔ ان کے درمیان خلیج نہیں تھی، خلا تھا۔

☆☆☆

مخروطی چھت اور ستونوں والا برآمدہ شام کی نیلی چھایا اور زرد بلب کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ دوپہر میں بارش ہوئی تھی اور مخروطی چھت کے کنارے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ ایسے میں فیروزہ مائی بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑی، موبائل پہ کوئی نمبر ملا رہی تھی، اس کے سامنے لہلہاتا سبز لان پھیلا تھا اور گیٹ کے باہر نشیب میں جاتی سڑک، اونچے پہاڑ اور کھائیاں سب نظر آرہا تھا مگر وہ ہر شے سے بیزار فقط فون کی طرف متوجہ تھی۔

"ہاں، ہیلو شکیل ہاں بیٹا، کیسا ہے تو؟" وہ بجھے چہرے کے ساتھ رابطہ ملنے پر پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک ٹھاک...... مگر تیرے حالات اچھے نہیں لگ رہے امی؟"

"نہ پوچھ میری...... شکیل بیٹا میری تو قسمت پھوٹی تھی جو اس کے رحم و کرم پہ پڑی ہوں، مرن جوگی، مجھے نوکرانی سے زیادہ عزت نہیں دیتی۔" وہ برآمدے میں آگے پیچھے ٹہلتی دبے دبے غصے سے بول رہی تھی۔

"نہ کر امی، تجھے اور وہ پارو، عزت نہ دے؟ بات دل کو لگتی نہیں ہے...... تیرے سامنے تو وہ چوں تک نہیں کرتی تھی۔"

"آہو...... اور اب بک بک بھی کرتی ہے، تو نے پارو کی زبان نہیں دیکھی، ایسے گھورتی ہے لگتا ہے سالم نگل جائے گی، مجھے تو اب بچی بہت ڈر لگتا ہے اس سے۔" فیروزہ مائی نے جیسے جھرجھری لی۔

"باتیں نہ بنا امی...... مجھے پتا ہے تو ایسی کہانیاں صرف اس لیے سناتی ہے تاکہ میں پیسوں کے لیے اصرار نہ کروں۔ میں ان باتوں میں نہیں آنے والا۔"

"شکیل، تو کیا کہہ رہا ہے۔" فیروزہ مائی صدمے سے ساکت کھڑی رہ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول نہ سکی۔ پھر وہیں برآمدے کی ایک سیڑھی پر نڈھال سی بیٹھ گئی۔ "بیٹے، میں نے تیرے لیے کتنے پاپڑ بیلے ہیں، کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں اور تو مجھ پہ الزام لگا رہا ہے؟"

"ہاں تو ہر وقت تو رٹ لگائے رکھتی ہے کہ دبئی بلاؤ، دبئی بلاؤ۔ وہاں عیش سے پڑی ہے، نوکر چاکر ہیں، اِدھر آ کر کیا کرے گی؟"

"تو آنکھوں کے سامنے تو ہو گا ناں، تیرے پاس ہوں گی، تیرا خیال رکھوں گی اور اِدھر کیا پڑا ہے۔ یہ پارو اب ویسی نہیں رہی۔ گن گن کر نوٹ دیتی ہے۔ کھانے پینے کی آزادی ہے بس مگر مرغی کھا کھا کر بھی انسان تنگ آ جاتا ہے۔ ساری دولت پہ سانپ بن کر بیٹھی ہے اور......"

"امی وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے، وہ پارس ہے، پارس۔ اس کے پاس رہنا ہی تیرے فائدے میں ہے۔ زور زبردستی اپنے لیے بھی نکلوایا کر اور میرے لیے بھی۔" وہ بے پروائی سے بول رہا تھا۔ فیروزہ مائی زچ ہو گئی۔

"کب سے بکے جا رہی ہوں، وہ نہیں دیتی۔ چند ہزار ہوتے تب بھی شاید دے دیتی مگر جتنے تو مانگ رہا ہے، وہ کبھی نہیں دے گی۔"

شکیل خاموش ہو گیا۔ چند ساعتیں شام کی نیلاہٹ میں ڈوبے برآمدے میں سناٹا رہا، پھر ائر پیس سے آواز ابھری۔

"پارو اتنی کیسے بدل گئی ہے؟"

"مجھے کیا پتا...... ہمیشہ ڈر رہتا تھا کہ اس کی زبان نہ کھل جائے کہیں۔ کالج ختم ہوا، تب بھی اعتماد آ گیا تھا مگر میرے سامنے مجال تھی جو چوں بھی کرے، میں آنکھیں دکھاتی تو وہ سہم جاتی، سر جھکا دیتی مگر کیڑے پڑیں اس بڈھے کی قبر میں، جب سے اس نے پارو سے شادی کی، اسے بدل کر رکھ دیا۔ اس کی زندگی میں ہی یہ مجھ سے زبان چلاتے

اور رعب جمانے لگ گئی تھی، اس کے مرنے کے بعد تو اور شیر ہو گئی ہے۔" فیروزہ مائی کو تو سامع درکار تھا۔ بولنے لگی تو بولتی چلی گئی۔

"ناں تو یہ پارو اکڑتی کس چیز پہ ہے؟ شوہر تو مر گیا اور بس ایک ہوٹل ہی نام کر گیا ہے۔" فیروزہ مائی اس کی کم عقلی پہ بلبلا اٹھی۔

"تو نے وہ ہوٹل دیکھا نہیں ہے، وہ بادشاہوں کا ہوٹل ..... اور ایک نہیں تین ہوٹل نام کر کے گیا ہے بڈھا۔"

"تین ہوٹل؟" شکیل حق دق رہ گیا۔

"ہاں، اس کے مرنے کے بعد وکیل آیا تھا، اسی نے بتایا تھا۔ میں نے خود دروازے کے پیچھے سے سنا تھا۔"

"ہوں...... تین ہوٹل...... اب تو کچھ سوچنا پڑے گا۔" وہ بات کرتے کرتے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ فیروزہ کو اچنبھا ہوا۔

"تو ہم کیا اچار ڈالیں گے اس کے ہوٹلوں کا؟"

"اچار ہی تو ڈالیں گے اور ہم ہی ڈالیں گے۔ تو بس آرام سے اُدھر رہ... اور مزید پارو سے پیسے مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جو کروں گا میں کروں گا۔"

"تو کیا کرلے گا؟"

"بس تو دیکھتی جا اماں۔" فون بند ہو چکا تھا۔ فیروزہ مائی نے حیرت سے موبائل کو دیکھا۔

"یہ شکیل بھی ناں، الٹی کھوپڑی کا مالک ہے۔ پتا نہیں کیا، کیا سوچتا رہتا ہے...... پر جو بھی سوچے گا، اچھا ہی سوچے گا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ البتہ جیسے بارش کے قطرے ابھی تک چھت کے کناروں سے ٹپک رہے تھے، ویسے ہی فیروزہ مائی کی پیشانی پہ تفکر کی لکیریں ابھری تھیں۔

☆☆☆

وہ سامنے لان کو دیکھتے ہوئے ذہن میں شکیل سے کی گئی باتیں دُہرانے لگی۔ رضوان حیات۔ ہاں ان سے شادی کے بعد پارو بدلنے لگی تھی۔

گھاس پہ بارش کے قطرے ابھی تک ٹھہرے تھے جیسے سبز چادر پہ ننھے ننھے ہیرے بکھرے ہوں۔ ان ہیروں کی منعکس کردہ روشنی میں تصاویر بنتی چلی جا رہی تھیں۔ فیروزہ مائی کی نگاہیں ان پہ جمی تو جیسے ان کے اندر تک سفر کرتی گئیں۔ تہ در تہ...... دور اندر تک......

بارش اب جا کر تھمی تھی اور اس چھوٹے سے لونگ روم میں صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی فیروزہ مائی کھڑکی سے باہر گرتے آخری قطرے دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہ بل تھے اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہی تھی۔

"...... اچھے بھلے پنڈی میں رہتے تھے، اپنا مکان تو تھا، وہاں تو پارو بھی نوکریاں کر لیتی مگر مت ماری گئی تھی میری، جبھی زیادہ تنخواہ کا سن کر ادھر مری آگئی اس کے ساتھ، ہا......" اس نے آہ بھری۔

"میں نے بھی سوچا تھا، ہوٹل والے چھوٹا سا پورشن دے رہے ہیں اور پھر اتنی تنخواہ اور خوب صورت جگہ...... مجھے کیا پتا تھا یہاں یہ ہڈیاں جمانے والی سردی ہو گی اور یہ بارش بھی، نہ دن دیکھتی ہے نہ رات، ہر وقت برسنے کو تیار، نرا عذاب ہے۔"

تولیے سے گیلے بال تھپتھپاتے ہوئے باہر آتی پارس نے اس کے الفاظ سن لیے تھے۔ اس نے سارے بالوں کو لپیٹ کر آخری دفعہ دبا کر پانی نکالا اور تولیا صوفے کی پشت پہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"خدا کی رحمت ہوتی ہے بارش، امی تم اسے عذاب تو مت کہو۔"

"زیادہ درس تدریس نہ شروع کر دیا کر۔ اپنا کام کر۔" فیروزہ مائی نے اسے جھڑک دیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ پھر گیلے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتی، آتش دان کے سامنے آئی اور اندر لگے ہیٹر کو ذرا سا تیز کیا۔

"تیرے صاب نے بتایا نہیں، کب دے گا پیسے؟"

"وہ نہیں دیں گے۔" وہ فیروزہ کی جانب پشت کیے آتش دان کے سامنے کشن رکھ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ ہیٹر کے قریب کر کے گرم کرنے لگی۔

"تو کل میرے جانے کے بعد وہ یہ کہہ رہا تھا؟"

"جی۔" وہ ذرا سے گرم ہوئے ہاتھ آپس میں رگڑ کر جیسے اندر جمے خون کو پگھلانے لگی۔ اس کی بالیاں کانوں میں نہیں تھیں اور گیلے بال پشت پہ پھیلے تھے۔ ہیٹر کی گلابی دہکتی روشنی میں اس کی سانولی رنگت جیسے روشنی منعکس کر رہی تھی۔

"ہاں تو تو دوبارہ بات کر، کہہ کہ ضرورت ہے۔ منت کر۔"

"اچھا کہوں گی۔"

"دیکھ پارو، میرے سامنے ٹالنے کے لیے نہ کہہ، سچ مچ ان سے بات کرنی ہے تجھے۔" وہ تیوریاں چڑھائے تیز لہجے میں بولی۔ "اُدھر میرا بچہ ہلکان ہوا جا رہا ہے اور اِدھر تو ہے جسے پروا ہی نہیں۔ حد ہوتی ہے خود غرضی کی بھی۔"

دہکتی روشنی میں چمکتا سانولا چہرہ جھک گیا۔ چند لمحے پہلے کا فریش سا احساس ماند پڑ گیا۔ اسی لمحے ڈور بیل نے جیسے مردہ ماحول کو زندگی بخشی۔ دونوں چونکیں۔

"امی باہر دیکھ لو۔ شاید وہ تمہاری نئی سہیلی ہو۔"

"آہو، اس کو بھی ابھی آنا تھا۔" فیروزہ مائی بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور باہر آئی۔ وہاں سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے چھتری بند کر کے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔

"ہاں جی، کس سے ملنا ہے؟"

"آپ مسز فیروزہ ہیں؟ مس پارس کی والدہ؟" اس نے شائستگی سے استفسار کیا۔

"مسز...... ہاں، میں ہوں۔ کیا کام ہے؟"

"میں رضوان صاحب کا اسسٹنٹ ہوں، یہ انہوں نے بھجوایا ہے۔" اس نے کوٹ کے اندر سے ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ......" فیروزہ مائی ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

"پانچ لاکھ ہیں، آپ گن کر تسلی کر لیں۔" اب کہ فیروزہ نے جھپٹ کر لفافہ پکڑا اور جلدی سے اسے کھولا۔

"کون ہے امی؟" پارس آوازیں سن کر اچنبھے سے پوچھتی آگے آئی تو سامنے کا منظر اپنی وضاحت خود کر رہا تھا۔ رہی سہی کسر فیروزہ مائی کے دبے دبے جوش سے کہے فقرے نے پوری کر دی۔

"بڑے صاب نے بھیجے ہیں، پورے پانچ لاکھ...... لے، جلدی سے گن کر اسے فارغ کر دے۔" اس نے اندر سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر پارس کو تھمائیں۔ وہ جیسے سانس تک لینا بھول گئی تھی۔

"رضوان صاحب نے......" اس نے نوجوان سے پوچھنا چاہا مگر الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔

"میں جاؤں، میم؟" وہ اس عجیب سی سچویشن سے ہٹنا چاہ رہا تھا۔

"ایسے کیسے، پیسے تو گن لینے دو۔ کسی کا کیا بھروسا؟" فیروزہ چمک کر بولی۔

"گن بھی سہی۔" پھر پارس کو ٹہوکا دیا۔

وہ شاک سے نکل کر شرمندگی میں ڈوب چکی تھی۔

"آپ جائیے، بہت شکریہ!" اس نے ندامت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے رخصت کر کے دروازہ بند کیا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا اور آنکھوں میں بے پناہ یاسیت تھی۔ "کیا سوچتے ہوں گے رضوان صاحب میرے بارے میں۔"

"بس کر، تُو، تو کہہ رہی تھی وہ نہیں دے گا۔ دیکھ اس نے تو فوراً بھجوا دیے۔ اب تو بس جلدی، جلدی قرضہ اتار دینا۔ پھر آگے بھی قرضہ ملتا رہے گا۔"

"بس کر دو امی۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ "ہم یہ پیسے نہیں رکھیں گے۔ میں یہ کل انہیں واپس کروں گی، ہم ....."

”چل ہٹ۔“ فیروزہ مائی نے گڈیاں واپس کھینچیں۔ ”میں خود گن لوں گی۔ آئی بڑی، واپس کرنے والی، ہونہہ۔“

”امی خدا کے لیے...... اتنا بڑا قرضہ...... میں کیسے اتاروں گی...... کتنے مہینے لگ جائیں گے بغیر تنخواہ کے...... ہم شکیل کو یہ سب بھیج دیں تو خود کیا کھائیں گے؟“

”تو تُو ڈبل شفٹ کر لینا، فارغ وقت میں کوئی اور نوکری کر لینا، اب زیادہ بحث نہ کر۔ ہٹ مجھے گننے دے۔“ وہ صوفے پہ بیٹھ کر پوری دلجمعی سے انگلی پہ تھوک لگا کر نوٹ گننے لگی۔ پارس بے بسی سے اس کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ یقیناً اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔

نوٹ گنتے ہوئے فیروزہ مائی نے ذرا کی ذرا نگاہ اوپر اٹھائی۔ پارس کی پشت پہ گرے بالوں کے سرے ٹپک رہے تھے۔ ننھے ننھے ہیروں جیسے قطرے...... ٹپ ٹپ...... گھاس پہ بکھرے ننھے موتی...... شام کا ڈوبتا ماحول......

کسی پرندے کی آواز بلند ہوئی تو فیروزہ مائی جیسے نیند سے ہڑ بڑا کر جاگی۔

وہ ابھی تک برآمدے کی سیڑھی پر ہی بیٹھی تھی۔ شکیل سے کی گئی گفتگو اور رضوان حیات کے بھیجے گئے پیسے، دونوں یادیں باہم گڈمڈ ہو گئیں تو وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہا ....“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”جو بھی تھا، بڈھا تھا اچھا آدمی۔“ خود سے کہہ کر، ستونوں، دیواروں اور گھاس پہ لدے قطروں کو سنا کر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ پیچھے مغرب میں ڈوبتا برآمدہ تنہا رہ گیا۔

☆☆☆

آج پھر صبح میں ان وادیوں پہ بارش برسی تھی، پہاڑیاں نہا دھو کر تازہ سبز نکل آئی تھیں۔ بل کھاتی سڑک ابھی تک گیلی تھی جس پہ پارس کی سیاہ چمکتی کار دوڑ رہی تھی۔

وہ کہنی آرم ریسٹ پہ ٹکائے، انگلی سے اپنی بالی کو چھیڑتی، کسی خیال میں کھوئی، باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر شیشے سے پہاڑ، بادل، گہری کھائی سب صاف دکھائی دیتا تھا...... مگر اس کی پُرکشش، اداس آنکھیں جیسے دور کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ان میں تکان بھی تھی، ٹھہراؤ تھا، راز تھے مگر خوشی نہیں تھی، خوشی کہیں بھی نہیں تھی۔

جانے کب یہ ہوا، کیسے ہوا کہ اس کی آنکھ کے کنارے سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا۔ نمی چہرے پہ پھسلتی گئی تو پارس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ڈرائیور سامنے دیکھتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا یا نہ ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ پارس نے پیچھے رکھے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالا اور اسے دو تہیں لگا کر آنکھ کا کونہ پونچھا...... پھر ذرا سا بھیگا ٹشو ہتھیلی میں دبا لیا۔ لمحہ بھر کے جل تھل کے بعد وہ دوبارہ سے کمپوزڈ ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی، پُرسکون...... پارس......

فون کی گھنٹی نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔ پارس نے بنا چونکے، آرام سے فون اٹھایا اور کان سے لگایا۔

”جی سفیعہ؟“ دوسری جانب اس کی سیکریٹری تھی۔

”میم، سوری میں آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ دراصل مسٹر شجاع طاہر کی کال آئی تھی۔“

پارس کے اعصاب تن گئے، وہ ذرا سی سیدھی ہوئی۔ آنکھ کے خشک کنارے کو چھوا۔ پھر مٹھی میں بند ٹشو کو دیکھا جیسے اس ایک قطرے کی بارش کی وجہ وہی ہو جس کا ذکر کیا جا رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے تھے وہ؟“

”آپ سے ملاقات کے لیے اپائنٹمنٹ لینا چاہ رہے تھے۔ میں آپ کا شیڈول چیک کرنے اور ان کو کوئی بھی slot دینے سے قبل آپ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کب ان سے ملنا چاہیں گی؟“

پارس نے گہری سانس اندر کو کھینچی، مٹھی ذرا سی کھول کر اندر مڑے تڑے ٹشو کو دیکھا اور کچھ بھی کہنے سے قبل وہ اس ٹشو کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، دیکھتی رہی...... یہاں تک کہ تہ شدہ ٹشو ایک تہ شدہ کاغذ میں تبدیل ہوتا گیا...... اور آس پاس کی ساری تفصیل بھی مٹ کر ایک نئی شناخت...... میں ڈھلتی گئی۔

ان مٹ کہانیاں...... لازوال یادیں......

رافعہ تیز تیز قدم اٹھاتی صحن عبور کر کے برآمدے کے سرے پہ آئی، اپنی مٹھی میں تہ شدہ کاغذ کو دیکھا اور پھر زور سے آواز لگائی۔

”پارو...... تائی...... کوئی ہے؟“

دوسری پکار کی نوبت نہیں آئی اور اندر سے وہ سلور بالیوں والی لڑکی آتی دکھائی دی جس کے چہرے پر عجیب سی فکر مندی تھی۔

”کیا ہوا رافعہ؟ اس وقت؟“ ساتھ ہی بالیوں والی لڑکی نے صحن میں چلچلاتی دھوپ کو دیکھا۔

”یہ لو...... تمہارا پیام آیا ہے۔“ رافعہ اسے دیکھ کر نخوت سے مسکرائی اور تہ شدہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”کیا؟“ الجھن سے پارس نے کاغذ تھاما مگر کھولا نہیں، بس سوالیہ نگاہوں سے رافعہ کا چہرہ تکنے لگی جس پہ اب ایک طنزیہ مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔

”اب ایسے تو مت کہو جیسے تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔ بھائی کو پابند تو کیا ہی تھا ناں تم نے، تبھی تو اس نے تمہیں خط لکھا۔ اب خود دیکھو، کیا اچھا لگتا ہے کہ ایک ہی لفافے میں ایک خط ہم سب کے لیے ہو اور ایک صرف تمہارے لیے۔“

پارس نے الجھی نگاہوں سے کاغذ کو دیکھا۔ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ ”یہ...... مجھے نہیں پتا اس نے کیوں لکھا...... شاید کوئی ضروری بات ہو۔“ مگر اس نے اب بھی اسے نہیں کھولا۔ جیسے سمجھنے سے قاصر ہو کہ اسے وہ کھولنا چاہیے یا نہیں۔

”آہو، بڑی ضروری بات ہے ناں۔“ اندر سے آتی فیروزہ کو دیکھ کر وہ مزید بلند آواز میں بولنے لگی۔ ”بھائی نے ہمیں تو خط نہیں لکھا، بس دو سطور میں خیریت پوچھ لی اور لے کر تیری بیٹی کو پورا معاشرتی علوم کا پرچہ لکھ دیا۔ تو بھی تو سن تائی کہ کیا لکھا ہے۔“ پارس نے ”تائی“ اور ”تیری بیٹی“ کے الفاظ پہ چونک کر پیچھے دیکھا۔ کڑے تیوروں سے گھورتی فیروزہ کو دیکھ کر اس کا رنگ سفید پڑتا گیا۔

”وہ کہتا ہے، تجھے یاد کر رہا ہے اور تیرے لیے ضرور واپس آئے گا۔ اور ہاں یہ بھی کہ تیرے لیے کیا بھیجے۔ میں کہتی ہوں بھائی کو گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور تو نے فرمائشیں شروع کر دیں؟“ رافعہ کمر پہ ہاتھ رکھے غصے سے بول رہی تھی۔ پارس نفی میں سر ہلاتی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ حلق سے اوپر نہیں آ پائے۔

”تو یہ بتا پارو! خط کتابت کا سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“ فیروزہ مائی غرائی تھی۔

”نہیں...... امی...... میں نے اسے کوئی خط نہیں لکھا، مجھے تو اس کا ایڈریس بھی نہیں پتا۔“

”مطلب تجھے اس کا ایڈریس جاننا ہے تاکہ تو یہ بے حیائی کے کام جاری رکھ سکے؟“ اس کی ہم عمر رافعہ یوں چلا رہی تھی جیسے وہ شجاع کی ماں ہو۔

”نہیں، میرا یہ مطلب......“

”اِدھر دے۔“ فیروزہ مائی نے خط کھینچا۔ بہت دفعہ کھولا اور پڑھا گیا خط اس نے واپس رافعہ کی طرف اچھالا۔

”اپنے شریف بھائی سے کہہ، آئندہ اس نے خط لکھا تو اس کی شرافت کا جنازہ نکال دوں گی۔ اب دفعہ ہو اِدھر سے۔“

”اپنی بیٹی کو کیوں نہیں روکتی جو بھائی کو اکسا کر......“

”تیری تو......“ فیروزہ مائی نے پیر سے جوتی

اتاری، رافعہ جھپاک سے باہر بھاگی۔

''اور تو...... کان کھول کر سن لے پارو......''

ہاتھ میں پکڑی جوتی اس نے پارو کی کمر پہ جڑ دی۔ وہ جو پہلے ہی شل کھڑی تھی، لڑکھڑا کر آگے کو گری اور منہ کے بل کچے پکے فرش پہ جا لگی۔ ہونٹ میں تکلیف کا سا ہوتا احساس اور گیلا پن، اسے سب کچھ محسوس ہوا تھا۔

''آئندہ میرے گھر سے خط کتابت کی تاں تو اچھا نہیں ہوگا۔ پہلے تو اس مرن جوگے سے چھت پہ ملتی تھی، اب وہ دفعان ہو گیا ہے تو خط شروع ہو گئے۔ آئندہ میں نے اس کا کوئی خط پکڑا تو جان نکال دوں گی تیری۔'' وہ بکتی جھکتی اندر چلی گئی۔ پارس نے ...... اپنا چہرہ اٹھایا تو گالوں پہ مٹی لگی تھی اور ہونٹ سے خون نکل رہا تھا۔ زیادہ نہیں، بس ایک قطرہ لڑھک کر ٹھوڑی سے ٹپکا تھا۔

ایک قطرے کی بارش......

''میں ان کو فرائیڈے کی دوپہر کا وقت دے دوں میم؟''

پارس بے اختیار چونکی...... پھر جیسے اس کی بات پر غور کیا، لب بھنچ گئے، پیشانی پر ناگوار بل ابھرا۔

''سنیعہ میں اگلا پورا ہفتہ مصروف ہوں، اس لیے انہیں دو ہفتے بعد کا وقت دے دیں۔''

''اوہ...... اوکے میم......!'' حیران اسسٹنٹ نے حیرت چھپا کر تابعداری سے فون بند کر دیا۔ پارس سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔ ٹشو اس کی مٹھی میں یوں دبا تھا کہ دکھائی نہ دیتا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں اب سپاٹ سی سرد مہری تھی۔ ٹھنڈا، بے تاثر سا احساس......

جیسے اسے ایک قطرے کی وہ بارش اور اس تمام توہین کا سبب بننے والا شخص ابھی تک یاد تھا۔ کس جذبے سے یاد تھا، یہ اس کی آنکھوں سے پتا نہیں چلتا تھا۔

☆☆☆

فیضان نے گردن اٹھا کر پتھریلی سیڑھیوں کو دیکھا۔ وہ کافی اوپر تک جاتی تھیں۔ اس نے ایک نظر بائیں طرف اونچی ہوتی سڑک پر ڈالی، جس کے اختتام پر پارس کا بنگلا تھا اور دوسری مخالف سمت ڈالی جہاں چند منٹ قبل پارس کی گاڑی گئی تھی۔

فیضان کے چہرے پر اطمینان تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ بھی جیسے وہ مطمئن تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گی اب وہ اپنا کام کر سکتا ہے۔ صبح سرسبز اور لہلہاتی سی اتر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ سب ہوا، پہاڑ، درخت گواہ تھے بھائی جی کی موت کے...... مگر کاش ان سب کو انسان کی بولی سمجھ آتی یا انسان کو ان کی اور یہ ہمیں اپنے ساتھ بیتنے والے تمام واقعات، دھوکے، سب بتا دیا کرتے۔ ہر شے صاف، صاف معلوم ہو جاتی، نہ لوگ جھگڑتے، نہ جھوٹ بولتے، نہ عدالت میں مقدمے جیتنے کے لیے وکیل ہائر کرتے، کتنا اسکون ہوتا، جب کوئی راز، راز نہ رہتا...... مگر شاید اللہ کو ان پتھر اور پتوں پہ انسان سے زیادہ بھروسا ہے، تبھی ان کی گواہی کو اس دنیا میں انسان کے سامنے بیان کرنے اور انسان کا اس کو توڑ موڑ کر اپنے فائدے کے لیے استعمال کر کے اس کی توہین کرنے سے بچانے کے لیے اس نے انہیں قیامت کے بڑے دن تک مؤخر کر دیا ہے کہ جس روز دنیا سے ''راز'' ختم ہو گئے وہ قیامت کا پہلا دن ہوگا۔

وہ قدم قدم سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اونچائی جیسے جیسے بڑھتی ہے، آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے، دماغ ذرا دھیرے دھیرے کام کرتا ہے، شاید اسی لیے کسی بلند مقام پر پہنچ کر بہت سے لوگوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں مگر اس کا دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

سیڑھیوں کے آخر میں لکڑی کا چھوٹا سا جنگلے نما گیٹ تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کنڈا اندر سے کھولا پھر اسے دھکیل کر پارک میں داخل ہوا۔

وہ کافی وسیع و عریض سا پارک تھا۔ درخت، پھول، بوٹے، بینچ ہر کونہ سجا تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو پارس کا گھر بالخصوص ٹیرس اور ٹیرس کا فرش تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اب اس کے گھر سے اونچے لیول پر آچکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پارک کے کیئر ٹیکر کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔

''آپ کتنے عرصے سے یہاں کام کر رہے ہیں؟''

''پانچ سال سے، سر......!'' وہ کہہ کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا کہ اس سوال کی وجہ جان سکے۔

''مجھے کچھ معلومات چاہئیں...... کیا آپ دے سکیں گے؟''

''کس بارے میں؟''

''پچھلے دسمبر میں ہونے والے ایک حادثے کے بارے میں۔'' وہ سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، جیسے کیئر ٹیکر کا ایک ایک تاثر اسکین کر رہا ہو۔

کیئر ٹیکر کے چہرے پر الجھن ابھری، بہر حال اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

''بتایئے، کون سا واقعہ؟''

''دسمبر میں یہاں سیڑھیوں سے ایک چالیس پچاس برس کا آدمی گر کر فوت ہوا تھا، شاید آپ کو یاد ہو اس نے ہڈ والی جیکٹ پہن رکھی تھی، اس کے بال...''

''آپ رضوان حیات کی بات کر رہے ہیں؟''

فیضان رک گیا پھر ایک گہری سانس بھری۔

''آپ رضوان حیات کو جانتے ہیں؟''

''انہیں کون نہیں جانتا، وہ رائل ہوٹل کے مالک تھے اور اپنی وفات سے دو ماہ پہلے سے اس سامنے والے گھر میں رہائش پزیر تھے۔'' ساتھ ہی بنگلے کی طرف اشارہ کیا...... فائز نے سر ہلا دیا۔

''انہوں نے کسی جوان لڑکی سے شادی کی تھی جو ان کے ہوٹل میں کام کرتی تھی، اکثر وہ دونوں اس پارک میں آیا کرتے تھے۔''

''کیا آپ کی ان سے سلام دعا تھی؟''

''بالکل، وہ بہت مہربان آدمی تھے، میں ذرا سا ان کے آگے پیچھے پھرتا اور وہ مجھے بھاری ٹپ دے کر جایا کرتے تھے، ہمیشہ مسکرا کر ملتے، مجھ سے پوچھتے کہ یہاں مجھے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ کبھی ہو تو میں ان کو بتاؤں۔'' کیئر ٹیکر دور افق کو دیکھتے ہوئے دکھ سے کہہ رہا تھا۔ ''اور اگر مجھے کوئی مسئلہ ہوتا تو میں واقعی ان کو بتا بھی دیتا، کچھ لوگ اتنے مہربان ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے مسائل بتاتے ہوئے انسان کو نہ شرم آتی ہے اور نہ ہی غیرت......''

فیضان نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں افق پہ دیکھا، جہاں اونچی پہاڑیوں نے خود کو بادلوں کی شال میں لپیٹ رکھا تھا۔ نیلا آسمان، سفید بادل، سبز پہاڑیاں، بھوری زمین، قدرت کا بہترین کلر کمبینیشن...... اس کی نگاہیں اس نظارے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ بادل رازوں کی طرح لگتے تھے، ہوا سے پتلے مگر سارا منظر چھپائے ہوئے...... اس نے ان کے پیچھے دیکھنا چاہا اور یکا یک جیسے نرم گالوں میں سوراخ ہونے لگے، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے پیچھے ایک اور منظر جھانکنے لگا۔ فیضی نے اس منظر کو پکڑنے کی سعی کی، ہاتھ نہیں بڑھایا، نگاہ بڑھائی، دور، بہت دور......

وہ لمبا، ٹین ایج لڑکا کبھی دائیں، کبھی بائیں بھاگتا، ریکٹ سے شٹل کاک دوسری جانب بھیج رہا تھا۔ دوسرا کھلاڑی اسی مستعدی سے اسے واپس کرتا...... ٹک ٹک...... شٹل کاک کے ریکٹ کی جالی سے ٹکرا کر ہوا میں غوطہ کھانے کی آواز اور ٹین ایج لڑکے کے تیز تنفس کی آہٹ...... بیسیوں لوگوں کے مجمع کے باوجود بیڈمنٹن کورٹ میں چھائے پن ڈراپ سائیلنس کو توڑ رہی تھی۔ میچ آخری اور سنگین مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر پوائنٹ پہ تالیاں

بجتیں...... شور اٹھتا، پھر خاموشی چھا جاتی۔
ریکٹ اچھالا کر چڑی کو مار کر ٹین ایج لڑکے نے فخریہ انداز میں فرنٹ رو کی طرف دیکھا، جہاں رضوان حیات بیٹھے تھے اور...اسے دیکھتا پا کر وہ دھیرے سے مسکرائے اور ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر تالی بجائی، ساتھ بیٹھے تنویر صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے اس عمل کی تقلید کی، فیضی مسرت آمیز سا کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔
مقابلہ کرنے کی ہمت اور جیت کا جذبہ انسان کو skill سے نہیں، لوگوں کی مورل سپورٹ سے ملا کرتا ہے، یقین اور مکمل یقین انسان کو ہارنے نہیں دیتا۔ وہ ہی نہیں سکتا، فیضی بھی نہیں ہارا...... وہ جیت کر ہی پہلی قطار کی کرسیوں کی جانب آیا۔
پسینے میں تربتر، ماتھے سے بینڈ اتارتا، ریکٹ رکھ کر وہ مسکراتا ہوا بھائی جی سے گلے ملا جو اُس کے لیے کھڑے ہو گئے تھے، علیحدہ ہو کر انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔
''بہت شاندار...... مجھے تم پر فخر ہے۔''
فیضی نے بنا آستین کی اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی، اسے اپنے پسینے میں بھیگے شانے کو تھپکتا بھائی جی کا ہاتھ بہت گرم لگا تھا۔ خیر...... یہ اس وقت اہم نہیں تھا۔
''مجھے لگا تھا آپ نہیں آئیں گے۔''
''یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ تمہارے میچ میں نہ آتا تو خود کو معاف نہ کر پاتا۔'' وہ مہربان انداز میں مسکرائے، لڑکے نے مصنوعی خفگی سے بھویں اچکائیں۔
''صرف میچ......؟''
''نہیں، صرف میچ نہیں، ہپی برتھ ڈے۔'' وہ پھر سے مسکرائے، انہیں یاد تھا مگر اُن کی مسکراہٹ میں نقاہت تھی، خیر یہ بھی اس وقت اہم نہیں تھا۔
''تھینک یو...... پھر کیا دے رہے ہیں آپ مجھے برتھ ڈے پر؟'' اس کے بے پروا، عجلت بھرے انداز پہ تنویر صاحب نے لب کاٹا اور نفی میں افسوس سے سر ہلایا مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ رضوان نے مسکرا کر شانے اچکائے۔
''جو تم چاہو......''
''تو پھر مجھے میری اپنی برانڈ نیو کار چاہیے، اٹھارویں سالگرہ پہ یہ میرا حق بنتا ہے۔''
''شیور ابھی چلو۔'' وہ تیار تھے۔
''رضوان بھائی، آپ ذرا آرام کر لیجیے، کراچی میٹنگ اٹینڈ کر کے سیدھا ائر پورٹ سے اِدھر آ گئے ہیں اگر تھوڑا سا......'' تنویر صاحب نے متفکر لہجے میں کہنا چاہا مگر لڑکے نے بگڑے تیوروں کے ساتھ انہیں دیکھا۔
''تنویر بھائی، میرا برتھ ڈے خراب مت کریں، مجھے کار لینی ہے تو ابھی لینی ہے۔''
''ہاں کیوں نہیں، ابھی چلتے ہیں، میرے بیٹے کی اٹھارویں سالگرہ ہے اور اٹھارویں سالگرہ ہر روز نہیں آتی۔'' انہوں نے فخر سے کہتے ہوئے اس کا شانہ پھر سے تھپکا، ہاتھ گرم تھا مگر یہ اہم نہیں تھا۔
تنویر صاحب متفکر سے اُن کو دیکھتے خاموش ہو گئے مگر جیسے غیر مطمئن ہوں۔
زیادہ دیر نہیں گزری، جب وہ کارز کے شوروم میں کھڑے تھے۔ وہ لڑکا ہر ایک کار کو آگے پیچھے سے دیکھتا، اس میں بیٹھتا، کوئی پسند آتی، کسی پہ تحقیر سے منہ بنا دیتا، تنویر صاحب ہاتھ باندھے ہوئے رضوان کے پیچھے کھڑے تھے۔ رضوان نقاہت سے مسکراتے ہوئے لڑکے کو تنقیدی انداز سے ہر شے کا جائزہ لیتے دیکھ رہے تھے۔
''مجھے یہ سرخ اسپورٹس کار پسند ہے۔'' بالآخر ایک کار کے پاس رک کر وہ ایک دم سے بولا۔ ڈیلر نے معذرت خواہانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''سوری سر، یہ بک ہو چکی ہے، اس کو آدھے گھنٹے تک شپ کرنا ہے۔''

"مگر مجھے یہی چاہیے۔" لڑکے کے ماتھے پر برہمی سے بل پڑے۔

"جی، سر ہم آپ کو جمعے تک یہ کار منگوا دیں گے، سیم کلر، سیم ماڈل۔"

"سیم نہیں، مجھے یہی چاہیے، آپ اُنہیں منگوادینا۔" وہ بیزاری سے بولا۔ رضوان کی مسکراہٹ پھیکی پڑی، وہ جیسے فکر مند ہو گئے۔

"کہیں اور سے پتا کر لیتے ہیں فیضی...... یا پھر جمعے تک انتظار......"

"مجھے نہیں کرنا انتظار...... میرا برتھ ڈے آج ہے، جمعے کو نہیں۔" لڑکا مشتعل ہو رہا تھا۔ رضوان کے چہرے پر افسوس ابھرا۔

"اچھا ٹھیک ہے، کہیں اور سے۔"

"آپ کو سمجھ نہیں آتا؟ کہیں اور سے نہیں دیکھنا میں نے، مجھے آج بس یہی کار چاہیے، ہم آپ کو ڈبل پے منٹ کر دیں گے۔" (ڈبل پے منٹ کے الفاظ پہ تنویر صاحب نے بے اختیار تھوک نگلا)

"سر، بات پے منٹ کی نہیں، کمٹمنٹ کی ہے، ورک ethics کی ہے۔ سہگل صاحب کے لڑکے کی کار ہے۔ پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔" ڈیلر بے چارہ پریشان ہو گیا تھا۔

"وہ ٹھیک کہہ رہا ہے فیضی، بات اخلاقیات کی ہے، اُن کی مجبوری کی ہے، آؤ ہم کہیں اور سے دیکھ لیتے ہیں۔"

"مائی فٹ......!" لڑکے کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ چکا تھا۔ "آپ مجھے کار لے کر دینا ہی نہیں چاہتے، آپ کو میرا احساس ہی نہیں ہے...... اتنا بھی نہیں سوچا کہ آج میرا برتھ ڈے ہے، آج تو مجھے کچھ لے دیں مگر پتا نہیں آپ کس کے لیے اپنی دولت سنبھال رہے ہیں، یو نو واٹ بھائی جی، مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ نہ کار، نہ آپ کی میری برتھ ڈے پارٹی میں شمولیت......" وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

رضوان بس کھڑے رہ گئے، اس دروازے کو دیکھتے رہ گئے جس سے وہ باہر نکلا تھا۔ اپنی سانسوں کی آوازیں گنتے رہ گئے، اُن کے چہرے پہ تکلیف تھی، درد تھا، ایک نہ ختم ہونے والا کرب مسلسل تھا مگر یہ اہم نہ تھا...... تنویر صاحب نے بس لمحے بھر کو یہ دیکھا اور فیضی کے پیچھے لپکے۔ وہ کار کے قریب تھا جب تنویر صاحب نے اس کو جالیا۔

"فیضی، تمہارے بھائی جی بیمار ہیں۔" کار کا دروازہ کھولتا لڑکا رکا اور مڑ کر اُن کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے انہیں؟"

"اُن کو کل سے بخار ہے اور......"

"بخار تو ٹھیک ہو جاتا ہے، مجھے بھی پرسوں تھا۔" لڑکے نے شانے اچکائے۔

"تم اٹھارہ سال کے ہو، وہ چالیس کے ہیں، وہ دو دن سے مسلسل کام کر رہے ہیں، صرف تمہاری سالگرہ کے لیے انہوں نے دو اہم ترین میٹنگز کینسل کیں۔ انہوں نے آرام بھی نہیں کیا اور سیدھے یہاں آ گئے، اور......"

"آپ ان کے ایمپلائی ہیں، ایمپلائی ہی رہیں، مجھے پتا ہے اچھی طرح کہ مجھے ان سے کیسے ڈیل کرنا ہے۔"

بادلوں کی کھڑکیاں بند ہونے لگیں، منظر چھپنے لگا، رازوں پہ پہرے لگنے لگے۔

"اس رات میں یہیں تھا جب یہ حادثہ ہوا۔" کیئر ٹیکر کہہ رہا تھا۔ فیضی چونکا...... اور پھر توجہ سے سننے لگا۔

"اس رات برفباری ہوئی تھی، پچھلی رات بھی برف پڑی تھی جس سے ہر جگہ سفید تھی، سیڑھیاں بھی برف سے اٹی تھیں، میں اندر تھا جب وہ لوگ آئے تھے، رضوان صاحب اور ان کی بیوی...... وہ ادھر سردی میں کافی دیر تک ٹہلتے رہے...... پارک سنسان تھا، اتنی سردی تھی کہ قلفی جم جائے، میں صرف اُن کی

...سے باہر آ کر بیٹھ گیا۔"

فیضان اب ماضی کی یادوں سے نکل کر پوری یکسوئی سے سن رہا تھا۔ کیئر ٹیکر یوں بتا رہا تھا جیسے اس کے سامنے فلم سی چل رہی ہو۔

"وہ دونوں...یہاں اس جگہ ٹہلتے رہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "کافی دیر رضوان صاحب خاموش تھے، ان کی بیوی بول رہی تھی، میں دور تھا، مجھے سمجھ نہیں آئی مگر وہ بہت تیز تیز بولے جا رہی تھی، جیسے انسان غصے میں بھڑاس نکالتا ہے، وہ کافی سوبر سی تھی، ایسے عموماً بولتی نہیں ہے مگر تب بہت مختلف لگ رہی تھی پھر رضوان صاحب تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھے، وہ ان کے پیچھے لپکی...... اب کہ وہ اونچا بولی تو مجھے سنائی دیا کہ وہ ان کو جانے سے روک رہی تھی مگر وہ سنے بغیر سیڑھیاں اترنے لگے اور تبھی اُن کی ہلکی سی کراہ سنائی دی اور وہ پھسلے۔"

"تب پارس کہاں تھی؟" فیضان نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ یہاں کھڑی تھی۔" کیئر ٹیکر نے سیڑھیوں کے آغاز سے ذرا فاصلے پہ ایک جگہ اشارہ کیا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ رضوان صاحب کو کسی نے دھکا دیا ہو؟"

"نہیں، وہ میرے سامنے گرے تھے، دوسری یا تیسری سیڑھی سے گرے تھے، وہ حادثہ تھا، ایک برا حادثہ...... ان کے جنازے پر بھی میں گیا تھا...... بیگم صاحبہ سے بھی ملا، اب آپ بتائیں آپ اتنے سوال کیوں کر رہے ہیں؟" فیضی اس کے سوال پر تکان سے مسکرایا۔

"میں ان کا ایک زمانے میں دوست رہ چکا ہوں، صرف متجسس تھا اُن کی موت کے بارے میں، آئی ہوپ آپ میری فیلنگز سمجھ سکیں گے۔" ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کیئر ٹیکر نے اس سے ہاتھ ملایا، فیضان مڑ گیا، کیئر ٹیکر اسے دیکھتا رہا، وہ سیڑھیوں کی طرف گیا اور دھیرے دھیرے زینے اترنے لگا۔ تیسرے زینے پر رک کر اس نے پلٹ کر کیئر ٹیکر کو دیکھا، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

فیضی سمجھ کر پلٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ کیئر ٹیکر اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے غائب ہو گیا پھر وہ اندر چلا آیا۔ اپنے چھوٹے سے کیبن نما آفس کا دروازہ بند کر کے اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی وہ مضطرب سا انتظار کرنے لگا۔ پانچویں گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔

"بولو......؟" ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"جیسا کہ آپ نے کہا تھا سر......... ایک نوجوان ابھی آیا تھا اور مجھ سے رضوان حیات کی موت کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"وہی جو آپ نے کہا تھا کہ مجھے کہنا ہے۔"

"گڈ......اور جو میں نے کہا تھا کہ نہیں کہنا؟"

"وہ میں نے نہیں کہا۔" کیئر ٹیکر کی آواز میں فخر در آیا۔

"ویری گڈ...... میں دوپہر سے پہلے تک تمہاری رقم ٹرانسفر کر دوں گا، اب مجھے مزید اس نمبر پر فون مت کرنا۔"

"جی سر......!" اس نے بخوشی کہہ کر فون بند کر دیا۔ کیئر ٹیکر واقعی بہت خوش اور مطمئن تھا۔

☆☆☆

"کیا آپ نے سب سمجھ لیا؟" پارس کرسی سے اٹھ کر پرس اٹھاتے ہوئے بولی تھی۔ فائز نے سر ہلاتے ہوئے میز سے اپنے کاغذات سمیٹے۔

"میں تمام ای میلز کر دوں گا، اس مہینے کی رپورٹ جس کا ذکر میں کر رہا تھا، وہ صبح آپ کی میز پر رکھ دوں گا۔ آپ پڑھ کر مجھے بتا دیجیے گا۔" اس نے اپنے بکھرے کاغذ باری باری فائل میں لگانے

شروع کیے، پارس جلدی جلدی اپنی چیزیں اٹھا رہی تھی، موبائل بیگ، کارڈز، فائز کے ہاتھ اتنی ہی سست روی سے چل رہے تھے۔

"اوکے! صبح ملاقات ہوتی ہے پھر۔" پارس نے پرس کہنی سے لٹکایا، کندھوں سے سیاہ شال ٹھیک کی اور فولڈر اٹھائے آفس کے گلاس ڈور کی طرف بڑھی۔

فائز نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی اور سست روی سے اپنی فائل بیگ میں ڈالنے لگا۔ پارس نے دروازہ کھولا، باہر نکلنے سے قبل ایک دفعہ مڑ کر دیکھا، فائز بیگ کی زپ بند کر رہا تھا، زپ پھنس گئی تھی جسے وہ ذرا احتیاط سے دوبارہ پیچھے کر کے چڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پارس باہر چلی گئی۔ اس کے نکلتے ہی فائز نے زپ تیزی سے بند کی مگر تب تک نہیں ہلا جب تک پارس کاریڈور میں دور غائب ہوتی نہ دکھائی دی.....

جیسے ہی وہ آگے مڑی فائز تیزی سے میز کے پیچھے آیا۔ اس کا ہاتھ بلا ارادہ سائیڈ ٹیبل سے ٹکرایا، رضوان حیات کی تصویر کا فریم سر کے بل گرا مگر وہ بنا رکے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا اور میز کی درازیں باری باری کھولنا چاہیں، تینوں درازیں لاکڈ تھیں، اس نے گردن اونچی کر کے میز کے پار دیکھا، شیشے کے دروازے کے آگے کاریڈور خالی تھا۔

وہ دوبارہ دراز کھولنے کی کوشش کرنے لگا، وہ مکمل طور پر بند تھیں، اس نے جیب سے ایک پن نکالی اور دو انگلیوں میں مخصوص مہارت سے پکڑ کر..... اوپر والی دراز کے کی ہول میں ڈالی۔ اب وہ کبھی کلاک وائز، کبھی اینٹی کلاک وائز پن کو ہلاتا وہ جیسے مکمل تکنیک کے مطابق اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پارس نے لفٹ میں قدم رکھا تو آپریٹر سیدھا کھڑا ہو گیا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

"گراؤنڈ فلور....." کہہ کر وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ دیوار سے لگی کھڑی ہو گئی، آپریٹر نے جی کا بٹن دبایا، لفٹ نیچے اترنے لگی۔

فائز نے لاک کا آخری چکر مکمل کیا اور دراز کھینچی وہ باہر نکل آئی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی، اس نے اندر موجود تمام فائلز باہر نکالیں اور میز پر رکھیں..... پھر گردن اونچی کر کے دیکھا کاریڈور خالی تھا۔

لفٹ گراؤنڈ فلور کی طرف گامزن تھی۔ پارس لفٹ کی چمکتی سلور لوہے کی دیواروں میں اپنا عکس دیکھتی خاموشی سے کھڑی تھی، لفٹ نے زمین کو چھوا اور دروازے "ہس" کی آواز کے ساتھ کھلے، آپریٹر مؤدب سا سر جھکائے ایک طرف کو ہوا، پارس باہر نکلی۔

فائز نے دراز پوری باہر نکال لی، یوں کہ پیچھے دراز کے اندر موجود کاغذ بھی نظر آنے لگے، اس نے ہاتھ اس خلا میں ڈال کر وہ سب کاغذ بھی نکالے اور میز پر رکھے، اب وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جیب سے ڈیجیٹل کیمرا نکالا، اس کا میکرو شوٹنگ موڈ آن کیا اور فائل کے صفحے پلٹتا تصویریں بنانے لگا۔

پارس تیز قدموں سے چلتی ہوٹل سے باہر نکلی روش عبور کر کے وہ گیٹ کے اندر کھڑی سیاہ کار تک آئی، ڈرائیور نے تیزی سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا..... اندر بیٹھتے ہوئے پارس نے گریبان پہ ہاتھ لگایا کہ عینک اتار کر آنکھوں پہ..... وہ رک گئی۔

اس کے گلاسز گریبان پہ نہیں اٹکے تھے۔ پارس نے ہاتھ سے گردن کو چھوا، الجھ کر سوچا۔ پھر پلٹ کر اوپر دیکھا۔

"ایک منٹ خان، میں کچھ بھول گئی ہوں۔"

"میں لے آؤں میڈم.....؟"

"نہیں، میں خود جاتی ہوں۔" وہ تیزی سے واپس پلٹی.....

کلک..... کلک..... کلک کی آواز کے ساتھ وہ دھڑا دھڑ تصاویر بنا رہا تھا۔ دو فائلز ہو چکی تھیں، تین ابھی باقی تھیں، وہ اب کاریڈور کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بس تصاویر بنانے میں مصروف تھا۔

پارس کاریڈور میں چلتی لفٹ تک آئی، اسی پل اس نے چار افراد کو لفٹ میں کھڑا دیکھا اور اسی پل لفٹ کے دروازے بند ہوئے، باہر سرخ حروف میں لفٹ کے اوپر جانے کا اشارہ نظر آ رہا تھا۔

"اوہ....." اس نے بے بسی سے بند لفٹ کو دیکھا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

فائز نے چوتھی فائل اب شروع کی تھی، اس کے چہرے پر پسینہ تھا، دل دھڑک رہا تھا مگر وہ تیز رفتاری سے سارا کام انجام دے رہا تھا۔

پارس سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، ایک فلور، دوسرا، تیسرا.....

فائز نے آخری فائل کے اختتامی صفحے ختم کیے ساری فائلز کو ترتیب دی اور دراز میں ڈالا، نچلی والی فائلز کو پہلے ڈالا پھر اوپر والی دراز واپس اس کی جگہ میں گھسائی اور یہ کرتے ہوئے وہ جھکا ہی تھا کہ کن انکھیوں سے اسے دروازوں کے پار کاریڈور میں سیاہ رنگ کی جھلک دکھائی دی تھی وہ دراز بند کر کے اٹھا نہیں، جھکے جھکے میز کی دوسری جانب گیا اور رضوان حیات کی تصویر اٹھاتے ہوئے سیدھا ہوا۔

اسے نظر آ رہا تھا کہ پارس دروازہ کھول کر اندر آ رہی ہے مگر اس کی طرف دیکھنے کے بجائے بظاہر بے خبر سے فائز نے تصویر سیدھی کی، ٹشو باکس سے ٹشو نکالا، اس کی سطح صاف کی اور اسے اس کی جگہ پر سیٹ کر کے رکھا۔

"آپ گئے نہیں؟" پارس کی حیران سی آواز پہ وہ چونک کر پلٹا پھر مسکرایا۔

"جی میڈم، میں جا رہا تھا مگر کاریڈور سے دیکھا کہ یہ تصویر جگہ پر نہیں رکھی تھی قریب آیا تو دیکھا، یہ زمین پر گری پڑی ہے، مجھے اچھا نہیں لگا، آپ کے بغیر آپ کے آفس میں داخل ہونا اچھی حرکت نہیں ہے مگر مجھے آپ کی ڈانٹ منظور ہے، اس تصویر کی بے حرمتی نہیں..... ایک عرصہ اس شخص کی دی ہوئی تنخواہ سے میرے گھر کا چولہا جلا ہے، میں احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔"

اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے پارس کو دیکھا وہ جیسے اسے دیکھ کر چونکی تھی مگر وضاحت سن کر اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے، اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ فائز اپنا بیگ سنبھالتا باہر نکل گیا۔

پارس قدم قدم چلتی اس تصویر تک آئی، اس کے گلاسز ساتھ رکھے تھے مگر اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ بس تصویر اٹھائی، دونوں ہاتھوں میں فریم پکڑے وہ اسے چہرے کے قریب کیے دیکھنے لگی۔

فریم کے چمکتے شیشے میں اس کا عکس نظر آ رہا تھا، مسکراتے ہوئے رضوان حیات کے چہرے پر مدھم سا اس کا چہرہ..... اور ان دونوں چہروں کے درمیان ایک تیسرا عکس ابھرنے لگا، سنہری جھلملاہٹ..... نیلے پانی پر چمکتی جھلملاہٹ..... عکس در عکس.....

سوئمنگ پول کا نیلا پانی سنہری دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دور سے پتا نہیں چلتا تھا کہ پانی جما ہوا ہے یا پگھلا ہوا..... شاید برف کے ٹکڑے اندر تیر رہے تھے۔ ہوٹل کے بلاکس کی چھتیں، گزرگاہوں کے اطراف، لان کی گھاس غرض ہر جگہ برف کی تہ تھی، دھوپ چار دن بعد نکلی تھی، کچھ مہمان پول کے گرد آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے، کچھ سردی میں گرمی کا مزہ چکھتے ٹہل رہے تھے۔

ایسے میں ایک سادہ شلوار قمیص پہنے اور ڈھیلا جوڑا بنائے، سلور بالیوں والی لڑکی اپنا بیگ اٹھائے اندر سے باہر آتی دکھائی دی۔ اس کی چال دھیمی اور چہرے پر تکان تھی جیسے ساری رات کی جاگی ہوئی اپنی شفٹ ختم کر کے گھر جا رہی ہو، وہ عمارت کے ساتھ ساتھ چلتی جا رہی تھی، جب ایک دم رکی۔

سوئمنگ پول کے ایک طرف کرسی پر جیکٹ اور ٹراؤزرز جیسے آرام دہ حلیے میں ملبوس رضوان حیات

اخبار پڑھ رہے تھے، ان کے دائیں طرف چھوٹی میز پہ جوس کا گلاس رکھا تھا، کافی فاصلے پہ ایک ویٹر بظاہر گملے ٹھیک کرتا، اُن کی طرف متوجہ تھا کہ کب وہ اشارہ کریں اور وہ حاضر ہو۔

پارس چند لمحے رک کر دیکھتی رہی پھر جھکے سر کے ساتھ چلتی اُن تک آئی۔

"سر......!" اس کی آواز دھیمی تھی، رضوان نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا پھر ہاتھ سے قریبی کرسی کی جانب اشارہ کیا، وہ بیٹھی مگر ایسے کہ آگے ہو کر کنارے پر ٹکی تھی۔

"آپ نے...... پیسے بھجوائے تھے سر......!"

وہ اب انہیں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی مگر ان اٹھی نگاہوں میں بھی جھکی نظروں جتنی ندامت تھی۔

"مل گئے تھے؟" وہ اخبار پڑھتے رہے، قلموں کے سفید بال، آنکھوں کا دھیما تاثر، وہ معمولی نقوش کے حامل تھے مگر پھر بھی گریس فل تھے...... بہت گریس فل......

"جی......" پارس نے ہمت مجتمع کی۔ "آپ نے وہ کیوں بھجوائے سر؟"

"کیونکہ آپ کو ضرورت تھی۔" ساتھ ہی انہوں نے صفحہ پلٹا۔

"سر مجھے...... مجھے کہنے دیجیے کہ میری والدہ نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، شکیل قرض کی رقم عرصہ ہوا ادا کر چکا ہے، نہ غنڈے تھے نہ ہی انہوں نے اسے زخمی کیا، یہ رقم وہ بس کاروبار میں لگا دے گا یا اُڑا دے گا اور میں پتا نہیں کتنے سال یہ قرض اپنے خون سے اتارتی رہوں گی۔"

"مجھ سے چھوٹے میرے دو بہن بھائی ہیں، سویرا اور فیضان۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں اعتراف اور انکشاف کر رہی تھی کہ رضوان حیات کسی خبر کو بہت انہماک سے پڑھتے ہوئے بولے، پارس رک گئی، لمحے بھر کو اسے لگا کہ انہوں نے یہ فقرہ اخبار سے پڑھ کر سنایا ہے۔

"اگر آپ ان دونوں سے رضوان حیات کے بارے میں پوچھیں تو وہ کہیں گے، ہمارے بھائی کی ایک مہربان، نرم دل، سچے، جلد اعتبار کرنے والے ایک احمق آدمی ہیں، وہ درست ہیں، میں مہربان بھی ہوں، نرم دل، سچا، جلد اعتبار کر لینے والا بھی ہوں مگر......"

انہوں نے اخبار لپیٹ کر پارس کو دیکھا اور ذرا سا مسکرائے...... "مگر میں احمق نہیں ہوں، نہ ہی کبھی تھا۔"

پارس بس انہیں دیکھتی رہی...... چپ الجھی ہوئی سی۔

"میں کسی کو پانچ ہزار دینے سے پہلے بھی تحقیق کراتا ہوں پھر چاہے پانچ لاکھ ہوں یا پانچ کروڑ میں کسی کی زبان پہ اعتبار کر کے نہیں تھما دیتا...... کیا لگتا ہے آپ کو، آپ کے میرے آفس سے نکلتے ہی میں نے آپ کے سارے خاندان کو، سوتیلی ماں، سوتیلے بھائی، بلکہ سوتیلی ماں کے بیٹے کو، اس کا جیل ریکارڈ، غیر قانونی دبئی جانا سب نہیں کھنگالا ہوگا! میں سب جانتا ہوں مس......" وہ مسکرا رہے تھے فاتحانہ نہیں، نرمی سے، سادگی سے۔

"تو پھر...... آپ نے کیوں دی ہمیں وہ رقم......؟"

"آپ کو ضرورت تھی۔"

"وہ...... ضرورت نہیں، لگژری تھی اور اس قرض کو میں لمبے عرصے بعد اتار سکوں گی، ہر ماہ تنخواہ سے ایک بھاری کٹوتی پھر لامحدود مدت کے لیے یہاں کام کرنا باؤنڈ ہو کر، میں تو سیونگ بھی نہیں کر پاؤں گی سر۔"

"اور یہی سب کچھ آپ کی والدہ کو بھی معلوم ہونا چاہیے۔" انہوں نے جوس کا گلاس اٹھایا اور سپ لے کر واپس رکھا، ٹھنڈا جوس، ٹھنڈا موسم، پول کا ٹھنڈا پانی......

"کیا مطلب سر......؟"

"میں نے وہ قرض آپ کو ذاتی طور پر دیا ہے؟ ان کی طرف سے نہیں، آپ کی تنخواہ سے وہ ادا نہیں ہوگا، دس سال بعد آپ مجھے یکمشت ادائیگی کریں گی تب تک آپ اپنی والدہ کو یہ تاثر دے سکتی ہیں کہ ادائیگی آپ کی تنخواہ سے ہو رہی ہے، یوں آپ اپنی ذاتی سیونگ بھی کر سکیں گی اور وہ آپ کو مزید کسی جگہ سے قرض لینے پر مجبور نہیں کر سکیں گی۔ پارس اگر میں آپ کو قرض نہ دیتا تو وہ آپ کو کہیں اور لے جاتیں، تب آپ کیا کرتیں؟" وہ خاموش ہو گئی۔ سب سمجھ آ گیا تھا، سوائے ایک بات کے......

"مگر آپ میرے اوپر یہ احسان کیوں کر رہے ہیں؟"

رضوان حیات نے ابرو اچکائے اور گلاسز اتار کر سائڈ ٹیبل پر اخبار کے ساتھ رکھے۔ پھر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"اس روز لابی میں آپ نے کہا تھا کہ لوگ ہمیں استعمال کرتے ہیں اور ہم اپنا دل بھی تو دھو لیتے ہیں...... مجھے آپ کی وہ بات اچھی لگی، میں خود کو اس سے ریلیٹ کر سکتا ہوں۔"

"نیور!" اس نے بے یقینی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "آپ کو کوئی استعمال نہیں کر سکتا، کبھی نہیں۔"

وہ حیرانی سے ہنسے، بلاشبہ وہ ہنستے ہوئے اچھے لگتے تھے۔

"میں تو ہر روز ایکسپلائٹ ہوتا ہوں، اس میں اتنی بے یقینی والی کون سی بات ہے؟"

"مگر...... پھر آپ مجھے ایکسپلائٹ ہونے سے کیوں بچانا چاہتے ہیں؟" اسے دکھ ہوا یا غصہ آیا تھا...... وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔

"میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں، آپ کو ابھی گزارنی ہے۔"

"میرا خیال ہے سر، انسان تب تک اپنی زندگی نہیں گزار چکا ہوتا، جب تک کہ اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائی جا رہی ہو، میری زندگی بھی اتنی ہی پڑی ہے جتنی کہ آپ کی۔" پارس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ مسکرا کر سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے رہے، بولے کچھ نہیں۔

"مگر میں نہیں مان سکتی کہ آپ جیسے ذہین اور مضبوط آدمی کو کوئی ایکسپلائٹ کر سکتا ہے۔"

"ہم جتنے مضبوط ہو جائیں پارس، رشتے ہماری سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں، ہم نہ ان سے بھاگ سکتے ہیں، نہ بھاگنا چاہتے ہیں، میں خود کو انہیں ایکسپلائٹ کرنے دیتا ہوں، یہ دیکھنے کے لیے کہ میری آخری حد کیا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے بھی کہ اُن کی آخری حد کیا ہے......"

وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی...... سارے الفاظ جیسے کھو گئے تھے، اس آدمی میں ایک عجب وقار و تمکنت تھی، سحر تھا۔

"اور دس سال بعد ادائیگی، سر......؟ مجھے تو اس بات کا کوئی چانس نہیں لگتا کہ دس سال بعد ہم ایک دوسرے کو ڈھونڈ بھی پائیں گے۔"

"and thats the whole idea"

وہ مسکرا کر کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، پارس نے بری طرح چونک کر انہیں دیکھا۔ یعنی وہ قرض واپس لینا چاہتے ہی نہیں تھے؟

وہ ان کو پکارنا چاہتی تھی مگر نہیں پکار سکی۔ رضوان حیات جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پُول کے ساتھ ساتھ چلتے دور جا رہے تھے، وہ بس انہیں دیکھتی رہی۔ پول کا پانی سنہری روشنی میں چمکتا رہا جیسے نیلے پتھر پہ سونے کے پانی کی تہ چڑھا دی گئی ہو...... جیسے آسمان کا عکس نیلے آئینے میں سنہری دِکھ رہا ہو......

پارس نے سر جھٹک کر فریم واپس رکھا پھر آگے آ کر اپنے گلاسز اٹھائے اور چند قدم دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ رک گئی۔ یوں جیسے آنکھ کے کنارے سے اس نے کچھ دیکھا، کچھ ایسا جو اسے کھٹکا ہو۔

وہ الٹے قدم واپس آئی اور میز کی درازوں کے پاس رکی، اوپر تلے کی تین درازیں بند پڑی

تھیں البتہ...... پہلی دراز کی درز سے کاغذ کا ٹکڑا جھانک رہا تھا جیسے فائل اندر ڈالتے ہوئے اس کا کنارہ پھنس گیا ہو۔

پارس نے دراز باہر کو کھینچی وہ کھل گئی اوپر والی فائل اس نے ٹھیک سے اندر کی اور دراز واپس بند کی پھر نچلی درازیں دیکھیں وہ لاکڈ تھیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں تشویش اتر آئی۔

"میں نے خود یہ دراز لاک کی تھی، یہ کس نے کھولی؟" وہ خود سے بڑبڑائی پھر بے اختیار سر اٹھا کر کاریڈور کو دیکھا، وہ اب خالی تھا، فائز کب کا جا چکا تھا۔

پارس نے تیزی سے ریسیور اٹھایا، ایک نمبر ملایا پھر آپریٹر سے کسی خواجہ طارق صاحب سے بات کرنے کی درخواست کی، قریباً پانچ منٹ بعد وہ اُن سے ہمکلام تھی۔

"خواجہ صاحب، میں مسز پارس رضوان حیات بات کر رہی ہوں۔"

"جی مسز پارس، کیسی ہیں آپ؟ کہیے، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے ذرا فائز حسن کے بارے میں معلومات لینی تھیں، وہ پہلے آپ کی یعنی لاہور والی برانچ میں کام کرتے تھے، اب میرے فنانشل ایڈوائزر ہیں۔" وہ بات کرتے ہوئے مضطرب سی بالی پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

"جی، پوچھیں۔"

"کیا آپ ان سے واقف ہیں؟ کس قسم کے انسان ہیں فائز صاحب؟"

"جی، میں انہیں جانتا ہوں، میرے انڈر کام کرتے تھے، بہت شریف اور دیانتدار ہیں، محنتی بھی بہت ہیں، اُن کے گھر میں ان کے علاوہ کمانے والا کوئی نہیں ہے، ان کی بہنیں......" وہ چند منٹ تک سنتی رہی، اس کے چہرے پر اطمینان اترنے لگا پھر بھی پیشانی کا ایک بل وہیں تھا کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ فائز صاحب اپنے پہلے باس کے لیے اپنے نئے باس کی جاسوسی کرنے کے اہل ہیں؟" اس نے "فیضان" اور "پارس" کو کوڈ ورڈز میں کہا۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔"

"اور میں یقین کرلوں خواجہ صاحب کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ اپنے مکمل ایمان کے ساتھ کہہ رہے ہیں اور یہ سب آپ کو فیضان صاحب نے کہنے کو نہیں کہا۔"

خواجہ صاحب بری طرح چونکے اور گڑبڑائے مگر اپنی آواز کو انہوں نے ہموار رکھا۔

"رضوان صاحب مجھ پر اعتبار کرتے تھے آپ بھی کر سکتی ہیں۔"

اس بات پر پارس کی پیشانی کا آخری بل بھی غائب ہو گیا۔ وہ ایک دم شانت سی ہو گئی۔ اس نے سمجھ کر سر ہلایا فون بند کر کے اس نے دراز کو دیکھا اور پھر اپنی چابی نکال کر اسے لاک کیا۔

"میں بھی paranoid ہوتی جا رہی ہوں۔ خود لاک کرنا بھول کر دوسروں پر شک کرنے لگی ہوں۔" خود کو خفا انداز میں مخاطب کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

کمرے میں مدھم روشنی تھی، لیپ ٹاپ کی اسکرین کی روشنی جو فیضان کے چہرے کو چمکا رہی تھی، وہ توجہ اور دھیان سے اسکرین پر کچھ پڑھ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے سر ہلاتا جیسے سمجھ آ رہی ہو پھر اس نے چند بٹن دبائے اور پرنٹر سے آوازیں آئی زوں زوں کی آواز کے ساتھ چند کاغذ پرنٹ ہو کر نکلے۔ اس نے یکے بعد دیگرے اُن کو پھر سے پڑھا اور ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

"سویرا آپا، آپ ٹھیک تھیں، تنویر بھائی کہیں نہ کہیں

ملوث ہیں۔" وہ ان کاغذات کو پڑھتا کہہ رہا تھا۔

"کیا مطلب...... ؟ اور تمہیں کیسے پتا؟" وہ جیسے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"رضوان بھائی کی موت سے اگلی دوپہر پارس نے اپنے اور بھائی جی کے مشترکہ اکاؤنٹ سے ایک بھاری رقم نکلوائی اور اسی دن وہ رقم تنویر بھائی کے اکاؤنٹ میں منتقل کی گئی۔ میں نے اس اکاؤنٹ نمبر کو چیک کیا ہے، جس کے نام کی ڈپازٹ سلپ مجھے ملی ہیں، یہ تنویر بھائی کا اکاؤنٹ نمبر ہے۔"

"اوہ...... مگر تمہیں ڈپازٹ سلپ کہاں سے ملیں؟"

"پارس کے ساتھ کام کرتا ہوں اور اس کی چیزوں تک رسائی اتنی مشکل بھی نہیں ہے۔" وہ اب پھر سے لیپ ٹاپ پہ کچھ بٹن دبا رہا تھا، پرنٹر آواز دینے لگا۔

"مگر اس نے تنویر کو پیسے کیوں دیے؟"

"یا تو وہ شروع سے اس کھیل کا حصہ ہوں گے یا بعد میں انہیں کچھ خبر ہو گئی ہو گی اور زبان بندی کی رقم ان کو دی گئی ہو گی۔"

"مگر فیضی...... پھر کیا پارس تمہاری اصلیت جانتی ہے؟"

اور یہیں آ کر فیضی الجھ گیا۔

"اگر تنویر بھائی اور پارس ملے ہوئے ہیں تو وہ جانتی ہو گی اور وہ ملے ہوئے ہیں مگر...... وہ نہیں جانتی...... اس کے انداز سے نہیں لگتا۔" وہ کنفیوزڈ تھا۔

"تنویر صاحب نے پارس کو پھر کیوں نہیں بتایا؟"

"یہاں آ کر آپا میں الجھ جاتا ہوں کیونکہ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ تنویر بھائی کی وفاداری کس کے ساتھ ہے، میرے یا پارس۔ یا وہ ہم دونوں سے ہی مخلص نہیں۔"

چند لمحے خاموشی رہی...... پھر سویرا آپا نے جیسے کر پر ہاتھ مارا۔

"یاد کرو فیضی، تنویر صاحب نے تمہیں بھائی جی کے مرنے کے فوراً بعد بتایا تھا کہ ان کے سر کی پشت پہ ایک نوکیلی چیز سے کیے گئے زخم کا نشان تھا۔"

"جی اور جب میں اِدھر آیا تو انہوں نے اس بات کو ٹالنا چاہا مگر میرے اصرار پہ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ اب بھی اسی بات پر قائم ہیں۔" وہ جیسے کچھ سمجھ رہا تھا۔

"وہ زخم تنویر صاحب کے علاوہ افضل بابا نے بھی دیکھا تھا، فیضی، اگر پارس نے تنویر صاحب کو tip کیا ہے تو افضل بابا کو بھی کیا ہو گا۔"

"ایک تو یہاں کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ پارس کی پارٹی کون ہے اور ہماری پارٹی کون ہے؟" وہ جھنجلایا۔ "خیر جب تک میں افضل بابا سے دوبارہ بات کرتا ہوں۔ آپ وہ کریں جو میں نے کرنے کو کہا تھا۔"

"یعنی تمہارے منصوبے کا دوسرا اسٹیپ۔"

"جی...... اب وقت آ گیا ہے کہ رضوان حیات کی بہن مری آئے اور اپنے بھائی جی کے قتل کی ایف آئی آر درج کروائے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا، وہ ابھی تک کامیاب جا رہا تھا۔

"بے فکر رہو، میں ویک اینڈ تک پہنچ جاؤں گی۔"

فیضی نے فون رکھا اور مسکرا کر ان پرنٹ آؤٹس کو دیکھا اسے لگا اس کے دشمن اپنی قبر خود کھود رہے ہیں۔

☆☆☆

افضل بابا نے دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا اور ذرا سا کھولا، پارس سنگار میز کے سامنے بیٹھی، جھک کر دراز میں کچھ رکھ رہی تھی۔ آہٹ پہ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں دیکھا جس کا عکس چوکھٹ میں کھڑے افضل بابا کو دکھا رہا تھا۔

"جی بابا؟" مڑے بغیر عکس کو دیکھتی وہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے دائیں بالی کا ہک کھولنے لگی۔

"کوئی شجاع طاہر صاحب آئے ہیں، میں نے انہیں لان میں بٹھایا ہے، آپ کو پوچھ رہے ہیں۔"

بالی کا کنڈا کھولتے اس کے ہاتھ رکے بلکہ

نیچے آ گرے، وہ اسٹول پہ بیٹھے، بیٹھے پوری پلٹی۔

"کیا...... کیا فیروزہ بیگم گھر پر نہیں ہیں؟"

"وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہیں۔"

"اچھا، میں آ رہی ہوں۔" وہ دھیرے سے واپس آئینے کی طرف مڑی، عکس میں افضل بابا پلٹ کر جاتے دکھائی دیے۔ پارس نے پھر سے بالی کے کُنڈے کو چھوا۔ وہ اسے اتارنا چاہ رہی تھی یا وہ اسے نہیں اتارنا چاہ رہی تھی۔

آئینے سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں ایک دم اضطراب اور بے چینی در آئی۔ غصہ بھی، بے بسی بھی، انتظار بھی مگر بے پروائی بھی...... وہ زندگی کے ان لمحوں میں سے ایک لمحہ تھا جب انسان بیک وقت متضاد کیفیات کا شکار رہتا ہے۔ وہ خوش بھی ہوتا ہے، ناخوش بھی۔ پریشان بھی اور ایکسائٹڈ بھی۔ وہ اپنی فیلنگز کو سمجھ نہیں پا رہا ہوتا...... مگر اندر کہیں اور وہ اپنی فیلنگز کو بالکل ٹھیک سمجھ پا رہا ہوتا ہے۔

اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے شعوری طور پر اَن مٹ کہانیوں کی تلاش کی...... جیسے جادوگر بچوں کے انگوٹھوں پر زعفران کی روشنائی لگا کر انہیں جن کو بلانے کا حکم دیتے ہیں، اس نے بھی بِنا آواز کے آئینے کو حکم دیا ہے کہ وہ کوئی یاد اس کے سامنے لے آئے جو شجاع سے ملنے سے قبل اس کو ڈھارس دے اور اس کے روئیے کو ری شیپ کرنے میں مدد دے۔

اور دائیں، بائیں اور بائیں کو دائیں دکھانے والے آئینے نے فوراً تعمیل کی۔

اس کی شفاف سطح پر بلبلے سے بنتے گئے جیسے کسی نے پانی میں پتھر پھینکا ہو اور ان سے بنتے دائروں میں ان مٹ کہانیاں پھر سے ابھرنے لگیں۔

وہ فون کا ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی، سولہ سترہ برس کی لڑکی جس کے چہرے پہ ہیجان و خوف تھا، اس کی بالیاں کانوں میں نہیں تھیں، نگاہیں بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتیں کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔

"تم میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

وہ دوسری جانب شکوہ کر رہا تھا۔ لڑکی کا ضبط جواب دینے لگا۔

"جواب؟ تمہارے خط کا......؟ شجاع پہلے میری بات کلیئر کر لو، میں نے تمہیں فون تمہارے خطوں کا جواب دینے کے لیے نہیں کیا بلکہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"مگر تم نے میرا حال تک نہیں پوچھا۔"

پارس نے بے چینی سے کھڑکی سے باہر دیکھا، بیرونی برآمدہ سنسان تھا اور دروازہ اندر سے بند... نہ جانے کب وہ دھڑ دھڑانے لگے۔

"شجاع...... تم...... تم کیوں مجھے خط لکھتے ہو؟"

"کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے۔" باہر جا کر وہ نڈر ہو گیا تھا یا شاید بے باک...... لڑکی کو ماتھے پہ پسینہ آنے لگا۔

"شجاع...... پلیز...... میں نے تمہیں کہا تھا کہ مجھے خط مت لکھنا اور تم پھر مجھے خط لکھنے لگ گئے ہو۔"

"میرا دل چاہتا ہے تم سے بات کرنے کو۔"

"تمہیں صرف اپنے دل کی پروا ہے، میری عزت کا کوئی خیال نہیں؟ تمہارا خط ملنے کے بعد چچی اور تمہاری بہنیں مجھے کیسی باتیں سناتی ہیں، امی اور شکیل میرا کیا حال کرتے ہیں، تمہیں کوئی احساس ہے؟"

"تم لوگوں کی باتوں کی پروا کیوں کرتی ہو...... تم بس......؟"

"میں لمبی بات نہیں کر سکتی۔ بس میری آخری بات سن لو، آئندہ مجھے خط مت لکھنا، کسی صورت نہیں، سنا تم نے؟" اور اس نے فون رکھ دیا۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پلٹ کر اس نے گھڑی کو دیکھا۔ دو ڈھائی منٹ کی کال کی تھی۔ بل میں کیا پتا چلے گا اور کون سا امی بل چیک کرتی تھیں۔ اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

پانی کی سطح پر بنتے دائرے غائب ہونے لگے۔

پارس نے بالی کا کُنڈا بند کر دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی، بالیاں اتارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بالوں میں ذرا سا ہاتھ پھیر کر ان کو سنوارتی باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

لان میں مغرب کا اندھیرا پھیلا تھا گہری نیلاہٹ...... دن کا سب سے زیادہ depressing وقت، جب خوش سے خوش انسان پر بھی قنوطیت اور اداسی چھا جاتی ہے، ایسی اداسی جس کا توڑ مکمل روشنی یا مکمل اندھیرا ہونے سے قبل ہو ہی نہیں سکتا۔

لان چیئر پر فیروزہ مائی ٹانگ پر ٹانگ جمائے بڑی نخوت سے مگر کرید کرید کر شجاع سے سوال کر رہی تھی جو جینز اور سوٹ شرٹ میں ملبوس مہذب انداز میں بیٹھا شائستگی سے جواب دے رہا تھا۔ پارس کو آتے دیکھ کر احتراماً اٹھا، فیروزہ مائی نے بھی اس کی سمت دیکھا۔

"دیکھو پارو، شجاع آیا ہے، اتنے سال بعد اسے ہمارا خیال آ ہی گیا۔" پارس سلام کہتی کرسی پر آ بیٹھی، تمکنت اور وقار سے، کمر سیدھی رکھے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے۔

"شجاع کہہ رہا ہے تجھ سے ہوٹل میں ملا تھا، تُو نے تو نہیں بتایا؟" فیروزہ مائی کے انداز پر وہ جیسے شرمندہ ہو گیا۔ پارس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"میں کب تمہیں ہر بات بتاتی ہوں؟ پہلے کبھی بتائی ہے؟" اب شرمندہ ہونے کی باری فیروزہ مائی کی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ کہنے لگا۔ آنکھوں کا وہی دھیما نرم تاثر جو دل پگھلا دے۔

"فائن تھینکس۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے، سر کو جنبش دی۔

"کیا کرتے ہو برطانیہ میں؟" فیروزہ مائی پھر سے پوچھنے لگی۔

"چھوٹا سا کاروبار ہے، اپنے اسٹورز کی ایک چین جو چند ایک شہروں میں ہے۔"

"بڑی ترقی کر لی تم نے مگر تعلیم مکمل کی یا نہیں؟"

"جی، ساتھ میں پڑھائی بھی مکمل کر لی تھی۔" وہ متانت سے جواب دے رہا تھا۔

"اور تمہاری ماں اور بہنیں...... اب کہاں ہوتے ہیں سب؟"

"دو بہنوں کی شادی ہو گئی تھی، دوا بھی امی کے ساتھ رہتی ہیں، وہیں لاہور میں۔"

"ہاں ہم سے کبھی ملنے آتے تو ہمیں پتا ہوتا، پیسے کی چکا چوند دیکھ کر تمہارے گھر والے تو سب بھول گئے تھے۔ محلّہ کیا بدلا، سارے رشتے ناتے توڑ دیے مگر خیر......" فیروزہ مائی نے ایک فاتحانہ نگاہ بنگلے پر ڈالی۔ "ہمیں بھی سوہنے رب نے بہت دولت دے دی ہے۔ پارس کے شوہر رضوان صاحب اور اس کے

روح کی غذا

یہ شادیوں میں میوزک کیسا عجیب و غریب بجتا ہے...... ڈھش...... ڈھش ٹک...... ڈھش ڈھش ٹک...... جس کے ردھم کی چوٹ دماغ پر لگتی ہے۔ سر میں درد کھانا کھانے سے پہلے اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ دو پلیٹ بریانی کھانے والا مشکل سے آدھی پلیٹ ہی کھا پاتا ہے۔ یوں کم کھانے میں زیادہ مہمان علیحدہ نمٹ جاتے ہیں اور یہ میوزک سن کر بس یہی دل چاہتا ہے کہ میزبان کو اپنا گفٹ دے کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی جائے...... جبکہ بعض تقریبات میں سارنگی کی ایسی میٹھی دُھن بجتی ہے...... چیوں...... چیوں...... چوں...... کہ سکون سا ملتا ہے۔ طبیعت میں طمانیت، شگفتگی ایسی چھاتی ہے کہ اگر شادی کے کھانے میں قلفی ہو تو ایک کی جگہ چار کھالی جاتی ہیں۔

(انجم انصار کے ناول محبت ہم سفر میری سے اقتباس)

مرسلہ: بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان

ہوٹلز کا تو علم ہوگا تمہیں۔''

''جی، انہیں بخوبی علم ہے۔'' پارس جو خاموشی سے سن رہی تھی، شجاع کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پہلی دفعہ مسکرا کر بولی۔ شجاع نے نفی میں سر جھٹکا۔

''علم ہے مجھے...... میں پچھلے سال آنا چاہتا تھا آپ کے پاس مگر تب معلوم ہوا پارس نے شادی کرلی ہے، سو میں رک گیا...... پھر رضوان صاحب کی وفات کا پتا چلا......'' پارس کے چہرے پر تکلیف اور اذیت ابھری...... وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے سوچا وہ عدت ختم کرلے تو میں مل لوں گا...... اور اب عدت ختم ہونے کے بعد اس مہینے سے جیسے ہی پارس نے سب سے ملنا شروع کیا، ہوٹل جانے لگی میں بھی چلا آیا۔''

''ہاں اسی وقت کا انتظار تھا مجھے...... رضوان کی ڈیتھ کے چھٹے مہینے میں نے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا تھا، جانتی تھی بہت سے لوگ اب ملنے چلے آئیں گے۔'' وہ پھر سے مسکرا کر بولی جیسے مسلسل شجاع کو جانچ رہی ہو۔

''اس کے بہن بھائی تو آئے ہی نہیں۔''

فیروزہ مائی کو بے موقع محل یاد آیا۔

''آئیں گے، ضرور آئیں گے، چھ ماہ سے انتظار کررہی ہوں، وہ سر کے بل آئیں گے امی۔'' وہ دھیرے سے بولی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، عجیب سی مسکراہٹ جو پارس کا خاصہ نہیں تھی۔

فیروزہ مائی کا فون آگیا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔

پارس اور شجاع تنہا تھے یا پھر مغرب کا نیلا اندھیرا۔

''کیسے آدمی تھے رضوان صاحب؟'' وہ ازراہِ تذکرہ پوچھنے لگا۔

''بہت اچھے......'' پارس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

''ڈیتھ کیسے ہوئی اُن کی؟''

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ آنکھوں میں چبھن اتری۔

''وہ...... سیڑھیوں سے گر گئے تھے۔'' اس نے اب کی بار دو حصوں میں فقرہ مکمل کیا۔ یہ فقرہ وہ ایک حصے میں مکمل کرہی نہیں سکتی تھی۔

''آگے کا کیا سوچا ہے تم نے؟''

''ہوٹل سنبھالوں گی اور رضوان کو یاد کروں گی ساری عمر...... بس۔'' پارس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے بظاہر بے پروائی سے شانے اچکائے۔

''کیا اب بھی تمہارے اندر تبدیلی کی خواہش نہیں ہے؟'' وہ بہت اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''پرانی باتیں مت یاد کراؤ شجاع...... میں سامنے اگر انہیں یاد کیا تو تمہاری طرف لمبا کھاتا کھلے گا۔''

''تم نے کہا تھا خط نہ لکھو، میں نے نہیں لکھا پھر کہا فون نہ کرو، میں تمہاری آواز سننے سے بھی محروم رہا...... میں نے ہمیشہ تمہاری خوشی مقدم رکھی۔''

''میں نے کہا ناں پرانی باتیں مت یاد کراؤ...... لمبا کھاتا کھلے گا ورنہ تمہاری طرف۔'' قدرے سختی سے آگے ہو کر اس نے تنبیہ کی۔ وہ خاموش ہوگیا مگر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا۔

''میں تمہیں بہت مس کرتا ہوں پارس۔''

''تمہیں میرا خیال تب کیوں آیا جب میں ایک امیر بیوہ بن گئی ہوں؟ آٹھ سالوں میں پہلے بھی میری یاد کیوں نہیں آئی؟ اسی وقت کیوں مجھ سے ملنے آئے ہو جب میں نے ہوٹل سنبھالنا شروع کیا؟'' وہ آگے ہو کر، سختی سے بولی اس کی آنکھوں میں طیش تھا، غصہ تھا اور ہر وہ جذبہ تھا جس سے آگ کی لپٹیں نکلتی ہیں۔

''میں تمہارے پاس کچھ بن کر آنا چاہتا تھا، میرے پاس اتنا کچھ ہونا چاہیے تھا کہ تائی مجھے انکار نہ کرپائیں مگر مجھے بہت دیر ہوگئی۔ جب تک میں آیا تمہاری رضوان حیات سے شادی ہوچکی تھی۔''

''اچھی کور اسٹوری ہے مگر نہیں، مجھے یقین نہیں آیا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی، گردن سیدھی رکھے، اس نے سرد شعلوں میں ڈوبی نگاہوں سے کرسی پر بیٹھے شجاع کو دیکھا۔ ''ہمارے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے۔ جب آنا چاہو، آجاؤ، ملنا چاہو مل لو مگر مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا...... میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔''

شجاع ساتھ ہی کھڑا ہوا۔ پارس جانے کے لیے پلٹی۔

''تم اب بھی وہی بالیاں پہنتی ہو جو میں لایا تھا۔ تب یہ اس لیے تھا کہ یہ تمہاری خود پہ خرچ کرنے والی پہلی کمائی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ اب کس لیے ہے جبکہ تمہارے پاس خود پہ خرچ کرنے کو کروڑوں روپیہ ہے؟''

پارس کے قدم زنجیر ہوگئے مگر وہ مڑی نہیں، نہ ہی کچھ بولی۔

شجاع چلتا ہوا عین اس کے پیچھے آرکا۔

''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا، سو روپے کی بالی کو پچاس کی کہہ کر لایا تھا یہ وہ پہلا اور آخری جھوٹ تھا جو میں نے تم سے بولا مگر یہ ایسا جھوٹ تھا جو اعتبار گھٹانے نہیں، بڑھانے کے لیے ہوتا ہے لیکن تم پھر بھی مجھ پہ اعتبار نہیں کرتیں۔'' وہ یہ کہہ کر ایک نظر اس کے بالوں سے ڈھکی پشت پر ڈال کر واپس پلٹ گیا۔ پارس سن کھڑی رہ گئی۔ سانس روکے، بالکل منجمد...... پھر اس کی آنکھوں کے کٹورے بھرنے لگے...... سیاہ سفید پیالے میں سرخی اور پانی ابھرا...... دو آنسو ٹوٹ کر گالوں پر لڑھکے۔

اس نے چہرہ موڑا...... شجاع گیٹ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

''پرانی یادیں مت دُہراؤ ورنہ تمہاری طرف لمبا کھاتا کھلے گا شجاع......!'' وہ بھیگی آواز میں خود سے بڑبڑائی۔

☆☆☆

تنویر صاحب کمپیوٹر پہ کچھ ٹائپ کررہے تھے۔ ان کے آفس کا شیشے کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ فیضان نے انگلی سے دروازہ بجایا۔ تنویر صاحب نے چونک کر سر اٹھایا پھر مسکرائے۔

''آؤ......'' ساتھ ہی عینک اتار کر ایک طرف رکھی اور سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گہری نظروں سے انہیں دیکھتا کرسی پر آ بیٹھا۔ وہ مسکرا رہا تھا مگر اس کا انداز یوں تھا جیسے تنویر صاحب کو پہلی دفعہ دیکھا ہو۔

''کہو، کام کیسا جارہا ہے؟''

''حیران کن حد تک کامیاب......''

''گڈ......'' وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ''رضوان کی موت یا قتل کا معما حل ہوا یا نہیں؟''

''بس قریب ہوں۔'' وہ ضبط سے مسکرایا۔

''تمہارے نزدیک culprit کون ہے؟''

وہ گرم لوہے کو چھو کر ہاتھ ہٹا دینے کا کام شروع کرچکے تھے۔

''پارس اور اس کا ساتھی۔''

''ساتھی......؟'' تنویر صاحب نے ابرو اٹھائی، وہ جیسے بالکل ٹھہر گئے تھے۔

''جی، اس کا ساتھی جو اس کے ہمراہ قتل اور قتل کے بعد کے تمام معاملات سنبھالتا رہا ہے، ہر غلط چیز کو ٹھیک کرنے کی ذمے داری اس کی ہے اور اس کے بدلے پارس نے اسے ایک بھاری رقم بھی دی ہوگی۔''

''ہوں، کون ہوسکتا ہے اس کا ساتھی؟'' وہ جواب کا انتظار کرنے کے بجائے اس کے چہرے پر جواب کھوج رہے تھے۔

''کوئی تو ہے، کوئی قریب کا آدمی......''

''پارس کا کزن شجاع طاہر تو نہیں ہے؟ آج کل بہت چکر لگ رہے ہیں اس کے۔'' فیضان ہنس دیا۔ وہ اس کے شک کا رخ پھیر رہے تھے۔

''ہاں، وہ بھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال، مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔''

''کہو......'' وہ متوجہ تھے۔ ذرا پُرسوچ بھی لگ رہے تھے۔

"سویرا آپا یہاں آگئی ہیں، آج وہ پارس سے ملنے جائیں گی۔"

"اوہ......" وہ واضح چونکے۔ "کب آئی سویرا؟"

"تین دن پہلے......"

"اور تم اب بتا رہے ہو؟"

"وہ ذرا کچھ قانونی کارروائی نمٹا رہی تھیں، اب سب سیٹ ہے تو پارس سے ملنے جائیں گی۔" وہ پہلی دفعہ فاتحانہ مسکرایا۔

"کیسی قانونی کارروائی؟"

"کچھ سرپرائز رہنے دیں تنویر بھائی۔" وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے ذرا کام ہے، چلتا ہوں۔" انہوں نے اسے نہیں روکا۔ وہ ذرا پریشان لگ رہے تھے، وہ کھلے دروازے سے باہر آیا اور ایک ستون کی آڑ میں رک گیا۔ اندر بیٹھے تنویر صاحب کو وہ نظر نہیں آرہا تھا وہ متوجہ تھے بھی نہیں۔ انہوں نے جلدی سے موبائل اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

فیضی بھی وہاں کھڑا، بظاہر اپنے موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔

"تنویر بات کررہا ہوں، ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔" اندر سے مدھم سی آواز آئی۔ فیضان کا سارا وجود کان بن گیا۔

"سویرا آرہی ہے، نہیں یہ مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی قانونی کارروائی کی بات کررہی ہے...... مجھے اپنے ذرائع سے علم ہوا ہے، آپ کو معلوم تو ہے کہ......" وہ آگے بڑھ گیا کہ کاریڈور میں چند ایک ایمپلائز آتے دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ جتنا اس نے سنا تھا، کافی تھا۔

☆☆☆

پارس موبائل کان سے لگائے مسکرائی، اس کی مسکراہٹ میں ایک انوکھی معصومیت اور اداسی تھی۔ وہ اپنی سنگار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔

"سویرا آرہی ہیں...... چلیں، یہ تو اچھا ہوا۔"

"مگر مسئلہ وہیں ہے...... وہ کسی قانونی کارروائی کی بات کررہی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کیا کرنے جارہی ہے مگر......" انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"آپ کے خیال میں وہ کیا کرسکتی ہیں؟" وہ جیسے سیریس نہیں تھی، ابھی تک مسکرا رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"مگر آپ کو کس نے بتایا کہ وہ آرہی ہیں؟" اس نے شاید تیسری دفعہ پوچھا۔

"میرے اپنے سورسز ہیں۔" چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ پارس مسکرادی۔

"میں سمجھ گئی، بے فکر رہیں، میں انہیں ڈیل کرلوں گی۔"

"بی بی!" افضل بابا نے دروازہ بجایا۔ پارس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"آپ کے مہمان آئے ہیں۔"

"آرہی ہوں۔" ساتھ ہی وہ فون میں دھیرے سے بولی۔ "وہ آگئی ہیں، میں چلتی ہوں۔" عجلت میں فون بند کرکے وہ باہر آئی۔ سیڑھیاں اتر کر لاؤنج کراس کرکے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر رکی۔ اندر سے فیروزہ مائی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر آگے آئی، جالی دار پردہ ہٹایا اور اندر قدم رکھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بہت مطمئن، بہت پُرتپاک مگر بہت پُراسرار مسکراہٹ تھی اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فیروزہ مائی کے سامنے والے صوفے پر موجود مہمان کو دیکھا...... اور پارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی، رنگ پھیکا پڑا۔

فیضان کی تفتیش نے اختیار کیا ایک نیا رخ...... مگر کیا؟ سویرا اور پارس کی ملاقات کا انجام کیا رہا۔ یہ سب ضرور جانیے مگر اگلے ماہ۔



دائیں سے عذرا رسول، انجم انصار اور نزہت اصغر





پاکیزہ رائٹرز کی جھلملاتی عید ملن

انجم انصار

پیاری بہنو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ محترمہ عذرا رسول اپنے شوہر جناب معراج رسول کی علالت کے باعث...... ہمہ وقت اپنے گھر میں ہی مصروف رہتی ہیں...... تقاریب میں بھی وہاں جاتی ہیں جہاں جانا بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ معذرت کرلیتی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی رائٹرز کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے...... اور وہ کافی دنوں سے یہ سوچ رہی تھیں کہ اپنی رائٹرز کو جمع کر کے ان سے باتیں کریں...... کچھ اپنی کہیں...... کچھ ان کی

سنیں...... مگر کسی نہ کسی وجہ سے تقریب ٹل رہی تھی...... اور پھر میرے بیٹے کے ولیمے کے پندرہ دن بعد عذرا رسول نے مجھے فون کیا اور کہا...... ”انجم اب اگر تم اپنی تمام مصروفیات سے فارغ ہو چکی ہو تو عید ملن کی ایک چھوٹی سی تقریب کرلیں۔“

میں نے کہا آپ کا جب دل چاہے کرلیں، سب پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی جانب جاچکے ہیں...... تب عذرا رسول نے از خود اپنی رائٹرز کو فون کیے اور...... اصرار ان کو مدعو کیا۔

اور آیئے اب آپ بھی میرے ساتھ...... ڈی ایچ اے کے سن سیٹ کلب میں چلیے...... وقت شام کا ہے، موسم کے تیور قدرے سخت ضرور ہیں مگر اندر ہال میں اے سی چل رہے ہیں، ہم گیٹ سے داخل ہو کر سبزہ زار پر چل رہے ہیں سامنے ہی خوب صورت زینہ نظر آرہا ہے، بس پچیس سے تیس سیڑھیاں آپ کو چڑھنی ہوں گی۔ ہاں، ہاں ریلنگ پکڑلیں اور جی اندر داخل ہوجائیں۔ سامنے ہی عذرا رسول پہلے سے موجود ہیں، گہرا گلابی سوٹ زیب تن ہے قمیص کی آستینوں اور دوپٹے کے کنارے پر گرین بیل ہے جس پر خوب صورت کام بنا ہوا ہے۔ ہنستی مسکراتی باتیں کرتی ہوئی عذرا رسول بے حد پیاری لگ رہی ہیں۔ سن سیٹ کلب کی آج کی شام واقعی بے حد خوب صورت ہے مگر رائٹرز کی ہمراہی میں خوب صورت ترین نظر آرہی ہے کہ ماشاء اللہ آسمانِ ادب کے ستارے جگمگاتے نظر آرہے ہیں۔ عقیلہ حق نے عبایا لینا شروع کردیا ہے اور وہ سیاہ عبائے میں ہیں، اختر شجاعت بھی عبایا لیتی ہیں وہ بھی سیاہ عبائے میں ہیں۔ چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی ان کی آنکھیں ان کے لبوں کے ساتھ ساتھ مسکرا رہی ہیں۔ عطیہ عمر برقع لیتی ہیں اور جب بھی کسی تقریب میں آتی ہیں ان کی صرف آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی ہیں مگر آج کی یہ تقریب مکمل خواتین کی ہے اس لیے عطیہ عمر کے چہرے پر نقاب نہیں ہے اور بے حد پیاری عطیہ عمر...... مجھے بے حد حسین لگ رہی ہیں۔ کچھ رائٹرز آگئی ہیں اور چند کا انتظار ہورہا ہے۔ اب آنے والی مصنفات ایک دوسرے کا احوال پوچھتے ہوئے اپنی اپنی کرسیاں سنبھال رہی ہیں...... عذرا کی دوست اور معروف ڈریس ڈیزائنر یاسمین رشید فیروزی سلک کے سوٹ میں ہیں جس پر براؤن کڑھائی نظر آرہی ہے، شگفتہ شفیق بھی آچکی ہیں اور ماشاء اللہ مکمل صحت مند ہیں...... اور ان کی ہنسی کی جلترنگ نے ان کی جانب متوجہ کیا وہ میرون اور آف وائٹ کامبی نیشن میں ہیں۔ عذرا رسول ہر آنے والی رائٹر کا خیر مقدم کررہی ہیں، نزہت اصغر پاکیزہ کے آفس میں ہیں، جہاں سے انہوں نے چند رائٹرز کو اپنے ساتھ لے کر آنا ہے...... لیجیے ان کا نام ہی لیا تھا کہ وہ بھی آگئیں...... ان کے ساتھ عذرا کی بھابی رضوانہ منظر ہیں جو ایک اچھی فوٹو گرافر بھی ہیں اور تقریب کی ساری دھندلی دھندلی تصاویر انہوں نے ہی اپنے کیمرے سے کھینچی ہیں۔ (جو ہال کے اندر اندھیرے کی وجہ سے ایسی آتی ہیں) رضوانہ سرخ کرتے اور کالے پاجامے...... اور کالے دوپٹے میں بے حد پیاری لگ رہی ہیں۔ نزہت اصغر کم سخن ہیں یعنی اگر آپ کوئی بات کریں گی تو جواب دیں گی ورنہ وہ آپ کے برابر دو گھنٹے بالکل خاموش بھی بیٹھ سکتی ہیں۔ آج ان کا سوٹ مجھے بہت اچھا لگا۔ کچھ لائٹ پنک کے ساتھ میجنٹا کامبی نیشن میں تھا...... (ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں) ناہید فاطمہ حسنین بھی نزہت اصغر کے ساتھ آئی ہیں جو فیروزی سوٹ میں تھیں جس پر سفید چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے ہیں۔ پیاری بہنو میں ہر بات کی تفصیل اس وجہ سے بھی بتا رہی ہوں کہ آپ تصور کی آنکھ سے سب کچھ اچھی طرح سے دیکھ بھی لیں اور لطف اندوز بھی ہوں۔ ناہید سب سے ملنے کے بعد نزہت کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ عرشیہ جنید بھی ان کے ساتھ آئی ہیں جو کاسنی پلین سوٹ میں بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ سیٹوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے تھی کہ عذرا کی دونوں سہیلیاں یعنی حمیرا اور شائستہ اعجاز ان کے دائیں اور بائیں موجود



دائیں سے ماہ پارہ تسنیم، شگفتہ شفیق، ناہید فاطمہ حسنین، ڈاکٹر ممتاز ضیا، عذرا رسول، منزہ سہام مرزا، انجم انصار، سائرہ غلام نبی، شائستہ اعجاز، رضوانہ پرنس اور عرشیہ جنید

تھیں...... حمیرا ماشاء اللہ بہت اسمارٹ ہیں اور ڈارک نیوی بلو سوٹ پہنے ہوئی تھیں جس پر وائٹ ایمبرائیڈری خوب صورت لگ رہی تھی۔ شائستہ اعجاز کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی...... وہ اپنے پرس میں شادی کے کارڈز بھی رکھ لائی تھیں۔ لائٹ پنک اور فیروزی سوٹ میں چشمہ لگائے...... پروفیسر سی لگ رہی تھیں...... اب انتظار ڈاکٹر ممتاز ضیا کا ہورہا تھا...... اور عذرا ان کو تو اتر سے یاد کررہی تھیں کہ بہت دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے...... لیجیے ڈاکٹر ممتاز ضیا بھی آگئیں، نارتھ ناظم آباد سے ڈیفنس تک کا سفر کم تو نہیں ہوتا...... جب کہ ویک اینڈ بھی ہو...... ممتاز ضیا نیوی بلو پرنٹڈ سوٹ میں تھیں اور اپنی بہن کے ساتھ آئی ہیں...... مستطیل سی ٹیبل کے آمنے سامنے کرسیوں پر رائٹرز بیٹھی ہوئی ایک دوسرے سے باتیں کررہی تھیں۔ یاسمین رشید کی کرسی ہما بیگ کے ساتھ ہے، میں نے ہما کو بغور دیکھا...... ناک میں ٹاپس کے برابر لونگ ان کو اچھا لگ دے رہی تھی۔ ہاں ان کے سوٹ کا کلر ڈارک میرون ہے...... ان سب رائٹرز کے درمیان باتیں شروع ہوچکی ہیں اور سب سے جاندار قہقہہ ان میں جس مصنفہ کا ہے وہ رضوانہ پرنس ہیں...... آج وہ مجھے خاصی سلم لگی ہیں بلکہ لڑکی لڑکی سی لگی ہیں بلیک سوٹ میں ماشاء اللہ رنگ بکھیر رہی ہیں۔ اب وہ عذرا سے کہہ رہی ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم کسی کی شادی کی تقریب میں جائیں اور کچھ نہ دیں، عذرا کہہ رہی ہیں جب میرے بیٹے کی شادی ہوگی تو تم دیکھ لینا کہ ایسا ہی ہوگا۔ (انشاء اللہ) لیجیے...... اب عذرا رسول نے بیروں کو کہہ دیا کہ لوازمات لگادیے جائیں تاکہ کھانا پینا شروع ہوجائے...... اور دیر سے آنے والے اس میں شامل ہوتے جائیں...... محفل پر باتوں اور قہقہوں کا رنگ کچھ اس طرح چڑھ رہا ہے جیسے کوئی سُریلی بانسری کی تان دھیمے دھیمے بڑھتی چلی جائے تو ایک سکوت سا چھا جاتا ہے۔ مجھے اپنے آس پاس یہ باتیں کرنے والی مصنفات حسینوں سے بڑھ کر حسین لگ رہی ہیں کہ جن کے قلم کی جنبش سے کتنے دل و دماغ سبق سیکھتے ہیں، سیراب ہوتے ہیں اور آگاہی کی بصیرت ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو پہنچتی جاتی ہے...... اور لیجیے...... محفل جوان تھی...... سب کی نظریں اٹھیں ایک خوب صورت ترین مہمان کی آمد ہوئی...... جی ہاں...... یہ منزہ سہام مرزا ہیں، دوشیزہ ڈائجسٹ کی روحِ رواں...... عذرا رسول کی دوست...... قلم کاروں کی

دوست...... ان کی آمد بہت اچھی لگی...... ڈائجسٹ، رسائل، خواہ کسی کے بھی ہوں سب کا مدعا ایک ہی ہے...... خیر کو پھیلانا اور شر سے بچانا...... منزہ فیروزی کاٹن کے سوٹ میں ہیں، سب سے ملیں اور سب کی خیریت پوچھی...... میرے برابر کی سیٹ پر ہماری مستقل تبصرہ نگار ماہ پارہ تسنیم بیٹھی ہیں جو براؤن اور وائٹ سوٹ میں ہیں، ٹی وی کے کوکنگ پروگرام میں بھی شرکت کرتی ہیں...... اب وہ رائٹرز سے کہہ رہی ہیں کہ کسی دن آپ لوگ ہمارے گھر آئیں میں آپ کو گجراتی کھانے پکا کر کھلاؤں گی...... اور آنے کے لیے سب تیار ہیں، اب وہ مزے مزے کے کھانوں کے نام لے رہی ہیں اور میں ردِعمل کے طور پر سب کے چہرے دیکھ رہی ہوں...... واقعی ذائقہ اگر لہجے میں جوش مارنے لگے تو سامنے والوں کے چہروں پر بھی نظر آجاتا ہے...... اب ہائی ٹی کے تمام آئٹم ٹیبل پر آچکے ہیں، کوئی حلیم کھا رہا ہے تو کوئی سینڈوچز...... کسی کو گرما گرم گلاب جامن پسند ہیں تو کسی کو پیسٹری...... ایک دوسرے کی پلیٹوں میں بھی ڈالا جارہا ہے، گرما گرم چٹپٹے سموسے تو واقعی لاجواب تھے...... اور بھی پتا نہیں کتنی بہت ساری چیزیں تھیں جنہیں چکھ لینا بھی مشکل تھا۔ چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس، سب اپنے اپنے ذوق کے حساب سے لے رہے تھے...... ابھی یہ سلسلہ جاری وساری تھا کہ چینل "ہم" سے وابستہ پرپل لانگ شرٹ میں سائرہ غلام نبی اپنی ایک پیاری سی پروڈیوسر کو ساتھ لے کر آگئیں...... عذرا نے بیروں سے کہہ کر ان کے لیے مزید چیزیں منگوائیں...... اس دوران عالیہ حرا، کا فون بھی آگیا کہ ابھی وہ گھر سے نکلی ہیں...... اور میں سوچنے لگی کہ یا اللہ یہ عالیہ حرا اتنی تاخیر سے نکلی ہیں تو آخر کب تک پہنچیں گی۔ ابھی چائے کا اختتام ہی ہوا تھا کہ عذرا نے کہا چونکہ یہ عید ملن پارٹی ہے اس لیے سب کے لیے میری جانب سے عیدی ملے گی۔ محفل میں شریک تمام رائٹرز کو فی کس پانچ سو روپے عیدی پاکیزہ ڈائجسٹ کی جانب سے دی گئی، جو رائٹرز اپنے ساتھ اپنی بہن یا بیٹی کو لائی تھیں ان کو گویا ڈبل عیدی ملی...... مغرب کا وقت ہونے والا تھا...... سب لوگ ہال سے نکل کر نیچے سبزہ زار میں کھڑے ہوگئے۔ اب سب اپنی اپنی گاڑیوں کا انتظار کررہے تھے کہ عالیہ حرا اپنی بیٹی کے ساتھ گیٹ سے اندر داخل ہوئیں...... "ارے اتنی جلدی تقریب ختم بھی ہوگئی۔" انہیں واقعی حیرانی سی تھی۔

"چندا...... یہ گھر کی تقریب نہیں تھی...... اور نہ میرج ہال کی شادی جو چار گھنٹے چلتی......" میں نے ہنس کر کہا۔

"باجی...... ٹریفک جام تھا...... تو کیا کرتی......" وہ واقعی حق پر تھیں۔ "میری تقریب سے کوئی مہمان یونہی سوکھا چلا جائے......" یہ عذرا رسول کو گوارا نہ تھا۔ عالیہ حرا کو زبردستی وہ اپنے گھر لے کر گئیں...... ان کے ساتھ دیگر رائٹرز بھی عذرا کے گھر گئیں۔ جہاں دوبارہ...... چائے پانی کیا گیا...... اور عالیہ حرا کو عیدی دی گئی۔ مجھے چونکہ ڈنر پر جانا تھا بیٹے کی شادی کے بعد دعوتوں کا جو ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ ابھی جاری وساری تھا اس لیے جیسے ہی میرا ڈرائیور آیا...... میں سب کو خدا حافظ کہہ کر گھر روانہ ہوگئی۔

اس لیے پیاری بہنو! اب آپ جلدی سے میرا شکریہ ادا کیجیے کہ بغیر ٹکٹ، بغیر سفر کیے آپ کو ایک شاندار سی عید ملن میں شرکت کروادی۔

سچ سچ بتائیں کہ مزہ آیا یا نہیں۔

اور اب اسی تقریب کا دوسرا رنگ دیکھیے۔

ایک یادگار تقریب

رپورٹ :ناہید فاطمہ حسنین

عذرا رسول کی دو مسڈ کالز دیکھ کر میں نے انہیں فون کیا۔ آواز سنتے ہی پہچانتے ہوئے پیار بھری ڈانٹ سے نوازا۔ "ارے بھئی ایسے فون کا کیا فائدہ جو تم اٹھاتی ہی نہیں ہو، اور ہاں یہ کتنے نمبر دے رکھے ہیں؟ کس پر فون کروں......؟ ابھی میں کوئی جواب دیتی کہ پھر عذرا کی آواز سنائی دی۔ "ہفتے کی شام سن سیٹ کلب میں ہائی ٹی پر آنا ہے تمہیں...... دیکھو آجانا، بہانہ کوئی نہیں چلے گا......" ان کی ڈانٹ میں بھی پیار ہوتا ہے۔



دائیں سے یاسمین رشید، ڈاکٹر ممتاز ضیا، عذرا رسول، شائستہ اعجاز، حمیرا طارق اور شگفتہ شفیق

"انشاءاللہ عذرا آپی ضرور......" میں نے مزید ڈانٹ سے بچنے کے لیے فوراً وعدہ کرلیا...... اس روز وہ بھی جلدی میں تھیں اور میں بھی...... ورنہ ہم لوگ جب بات کرتے ہیں تو وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔

دراصل عذرا کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی رائٹرز کو ساتھ مل بیٹھنے کے اکثر مواقع مہیا کرتی رہتی ہیں اور اس طرح وہ بے حد خوش ہوتی ہیں اگر ربّ نے انہیں نوازا ہے تو انہیں ایک سخی دل بھی عطا کیا ہے، اس ضمن میں وہ اپنی بڑائی یا خودنمائی کا کبھی اظہار نہیں کرتیں بلکہ ہر تقریب میں اپنی رائٹرز میں گھل مل جاتی ہیں۔

المختصر عذرا نے D H A. sun set club میں رائٹرز کو انوائٹ کیا تھا اور رائٹرز کی سہولت کے لیے یہ طے تھا کہ جو رائٹرز چاہیں وہ پاکیزہ کے آفس پہنچ جائیں وہاں سے نزہت اصغر سب کو لے کر کلب پہنچ جائیں گی۔ سبھی بہنیں جانتی ہیں نزہت اصغر دلکش کی ادارت سے وابستہ تھیں اور عذرا رسول کی بھابی ہیں۔

ہمارے آفس پہنچنے پر نزہت تیار تھیں اور ہم ان کی دوسری بھابی رضوانہ منظر کی معیت میں سن سیٹ کلب کے جیسمین ہال تک پہنچے جہاں تقریب کی دلہن یعنی عذرا رسول درمیان میں براجمان تھیں اور حسبِ معمول بے حد خوب صورت ڈریسنگ کی ہوئی تھی انہوں نے۔ (ماشاءاللہ) مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوکر بولیں۔ "ناہید مجھے تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہورہی ہے......" یہ سب ان کی محبت اور منکسر المزاجی ہے...... ورنہ میں کس قابل......!

میں فرداً فرداً تمام ساتھی رائٹرز سے ملی...... یوں لگ رہا تھا جیسے رائٹرز کی ایک کہکشاں ہے جو چمک کر اپنی بہار دکھا رہی ہے انجم آنٹی دوسرے نمبر کی نشست پر پیچ کلر کے کپڑوں میں بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔ انجم اور نزہت اصغر میں خاص بات یہ ہے کہ یہ دونوں بے حد سادہ لباس زیب تن کرتی ہیں میک اپ میں صرف لپ اسٹک کا استعمال جو اِن کے وقار میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ انجم اور نزہت دونوں میں ایک اور بات مشترک ہے کہ دونوں کھل کر قہقہہ نہیں لگاتیں بلکہ ہلکی مسکراہٹ سے کام چلاتی ہیں۔ انجم آنٹی کے ساتھ ہی عقیلہ حق بیٹھی تھیں سیاہ عبایا ان پر بہت جچ رہا تھا ان کے برابر اختر شجاعت، عطیہ عمر وغیرہ بیٹھی تھیں۔

تقریب کے اختتام پر اختر شجاعت نے سب رائیٹرز کو اپنی کتاب پیش کی (جزاک اللہ) عطیہ کی خاص بات یہ ہے کہ حجاب carry کرنے کے باوجود ان کی (ماشاء اللہ) بڑی بڑی نمایاں اور خوب صورت آنکھیں دور سے مسکرا کر کہتی ہیں۔ ''میں عطیہ ہوں''

ڈاکٹر ممتاز ضیا نے اپنی بہن سے ہمارا تعارف کروایا وہ دیر تک ہاتھ پکڑے میرے افسانے (دُھند کے اس پار جو حالیہ چھپا ہے) پر تبصرہ کرتی رہیں۔ ان کا انداز بہت اچھا لگا۔ تقریب میں شگفتہ شفیق، انجم انصار، عقیلہ حق، عطیہ عمر، ہما بیگ، ڈاکٹر ممتاز ضیا، اختر شجاعت، عرشیہ جنید، رضوانہ پرنس رضوانہ منظر، نزہت اصغر، سائرہ غلام نبی، یاسمین اسماعیل، وغیرہ موجود تھیں کچھ دیر میں دوشیزہ ڈائجسٹ کی منزہ سہام مرزا تشریف لے آئیں۔ عذرا نے اپنے برابر ان کی نشست مختص کی ہوئی تھی۔ منزہ ہماری بہت پرانی دوست ہیں ان کے بارے میں بتاتی چلوں بہت نرم خو اور ٹھہرے انداز میں گفتگو کرنے والی خاتون ہیں۔ ان میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ ان کی آنکھیں ان کے لہجے کے ساتھ ساتھ بولتی ہیں۔

سائرہ غلام نبی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کی آنکھیں ان کی ذہانت کا پتا دیتی ہیں۔ کھنکتا قہقہہ بھی ان کی پہچان ہے۔

باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور ہم سب عذرا کو سننے لگے عذرا بہت سادگی سے بِنا لگی لپٹی رکھے گفتگو کرنے کی عادی ہیں۔

گپ شپ کے دوران عذرا نے ایک سوال تمام رائٹرز کے سامنے رکھا اور جواب مانگا۔

ان کا سوال تھا کہ وہ اپنے بیٹے ذیشان رسول کی شادی میں ایسی کون سی روایت ہے جو وہ اختیار نہیں کریں گی یا دوسرے معنوں میں وہ توڑ دیں گی۔

مختلف رائٹرز نے مختلف آرا کا اظہار کیا لیکن اکثریت نے یہی کہا آپ یقیناً لفافہ نہیں لیں گی عذرا سب کے جواب لکھتی رہیں پھر مجھ سے بولیں۔ ''ہاں بھئی ناہید اب تم بتاؤ۔'' (یہ ان کا خاص انداز ہے وہ بہت روانی اور سادگی سے بات کرتی ہیں)

میں نے بھی اکثریت والا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو برتا اور جانا ہے اس کے مطابق تو میں بھی یہی کہتی ہوں کہ آپ ادارے کی سرپرست ہونے کے ناتے اپنی رائٹرز اور لوگوں کو کھلا پلا کر خوش ہونے والی شخصیت ہیں آپ لینے پر یا بدلے پر یقین نہیں رکھتیں اسی لیے آپ نو گفٹ نو منی کی روایت ڈالیں گی۔''

عذرا مسکرا کر خاموش ہو گئیں کچھ رائٹرز نے کہا کہ آپ مہندی، مایوں کی رسم نہیں کریں گی وغیرہ وغیرہ...... کچھ دیر بعد عذرا بولیں ''یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں مہندی، مایوں کی رسم کو فضول سمجھتی ہوں کہ یہ رسمیں ہرگز نہیں کروں گی لیکن میرا سوال تھا کہ شادی پر ایسا کیا کروں گی؟ اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ نو گفٹ نو منی'' پھر عذرا نے اس کی وضاحت میں کہا۔ ''اصل میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو سوچتے ہیں ارے بھئی فلاں کی شادی آ گئی کیا گفٹ دیں...... لہٰذا میں نے سوچا کہ میرے بیٹے کی شادی میری خوشی ہے میں اپنی خوشی کو دوسروں کے لیے بار کیوں بناؤں، میں چاہتی ہوں کسی کو دینے لینے کی کوئی ٹینشن نہ ہو سب ہنسی خوشی شریک ہوں کسی کے چہرے پر کوئی الجھن نہ ہو......'' حاضرین نے زبردست تالیوں سے عذرا کی بات کا خیر مقدم کیا۔ آخر میں عذرا نے تمام رائٹرز کو پاکیزہ ڈائجسٹ کی جانب سے عیدی بانٹی...... وہ اتنے خلوص سے دیتی جا رہی تھیں کہ کوئی منع نہ کر سکا۔ بے شک عذرا جی بے حد فیاض طبیعت کی مالک ہیں۔ بہترین ہائی ٹی کے بعد سب کا فوٹو سیشن ہوا اور یوں مغرب کے بعد ہم سب اس خوشگوار تقریب کی خوب صورت یادیں لیے گھر کو روانہ ہوئے۔

☆☆☆

آج کے بچے مستقبل کے معمار

شائستہ زریں

''آج کے بچوں کے مسائل کی کوئی حد ہی نہیں ارے میں تو کہتی ہوں یہ خود سب سے بڑا مسئلہ ہیں ایسے خودسر، بدتہذیب، نافرمان اور بے راہرو بچے نہ ہم تھے نہ ہمارے دور میں تھے۔ یہ تو کیا مجال کہ کبھی بڑوں کی بھی سن لیں بس اپنی من مانی اور آزادی سے مطلب ہے۔ ٹی وی، موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ ہی ان کی دنیا ہے۔''

''اور کیا، ہم تو فارغ وقت میں بچوں کے رسالے اور کہانیاں پڑھتے تھے، اور یہ بچے پڑھائی کے وقت بھی موبائل کی جان نہیں چھوڑتے نیٹ کی طرف الگ دھیان لگا رہتا ہے۔''

''یہ بھی نہ کریں تو بچے کیا کریں؟ آئے دن شہر میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں ان سب میں مصروف ہو کر یہ گھر میں تو بند جاتے ہیں، ہماری نظروں کے سامنے تو رہتے ہیں۔''

قارئین کرام! اس نوع کے کئی فقرے اکثر بچوں کے حوالے سے سننے کو ملتے ہیں۔ تب نومبر 1989ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں حقوقِ اطفال کے طے پائے جانے والے اس معاہدہ کا خیال آتا ہے جس میں 54 دفعات پر مشتمل ''عالمی اعلان برائے حقوقِ اطفال'' جاری کر کے حقوقِ اطفال کا تعین کیا گیا تھا اس معاہدے پر کئی ممالک نے دستخط کیے تھے حکومتِ پاکستان نے اس شرط کے ساتھ منظوری دی تھی کہ معاہدے کی تمام شقوں پر اسلامی قوانین اور اقدار کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اقوام متحدہ کے 1992ء کے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں ہر سال 20 نومبر کو عالمی یومِ اطفال منانے کا فیصلہ کیا گیا۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کا بنیادی موقف ہے ''ایک اچھی زندگی اور ایک خوش آئند مستقبل ہر بچے کا حق ہے''

اور بچوں کو یہ حق دینا والدین اور حکومت دونوں کی ذمے داری ہے۔ یوں بھی جب حقوق کی بات آتی ہے تو سب یہی کہتے ہیں بچے ہماری پہلی ترجیح ہیں بچے آس لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہے شامِ انتظار بھی میری نگاہ میں
کہنے کو التفات کی پہلی کرن میں ہوں

بچوں کو موردِ الزام ٹھہرانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اوروں کے بچے نہ سہی اِن کے اپنے بچے تو ان کی اپنی ذمے داری ہیں۔ جب بھی آج کے بچے موضوعِ سخن بنتے ہیں تو ذہن میں بہت سے سوال اٹھتے ہیں۔ ۲۰ نومبر کی مناسبت سے اس ماہ سروے کے لیے ہمارا موضوع بچے ہیں۔ ہم نے سروے میں شریک معزز خواتین سے معلوم کیا کہ

سوال ۱: گزشتہ کل کی بہ نسبت آج کے بچے زیادہ خودسر، بدتہذیب، نافرمان اور بے راہرو ہیں، آپ کے خیال میں اس کی بڑی اور اہم وجہ کیا ان پر حد سے زیادہ بھروسا کرنا ہے۔ ان کی جا و بے جا خواہشات کی تکمیل ہے یا آزادی دینا بالخصوص جدید ٹیکنالوجی کے استعمال میں غیر ضروری آزادی......؟

اس کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

سوال ۲: ماضی میں بچوں کے اخبارات و رسائل ان کا مشغلہ اور حصولِ معلومات کا بہترین ذریعہ ہوا کرتے تھے، آج یہ کام موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ٹیلیویژن سے لیا جارہا ہے۔ آپ کے خیال میں زیادہ مؤثر اور کارآمد ذریعۂ ابلاغ کون سا ہے؟ اور کیوں؟

سوال ۳: بچے قوم کا اثاثہ ہیں ان کے تحفظ کے لیے کون سے اقدامات ضروری ہیں؟

پروفیسر فائزہ احسان

(اسکالر)

۱: اس کی بنیادی اور بڑی وجہ ہماری سماجی و معاشرتی اقدار کی تیزی سے تبدیلی ہے۔ اب سے چند برس قبل تک رشتوں اور بڑوں کا احترام کیا جاتا تھا، جو اَب رفتہ رفتہ ختم ہوتا جارہا ہے اب کسی کا بھی لحاظ نہیں رہا۔ اس کی اہم وجہ پیسے کی فراوانی ہے جسے دین ایمان سمجھ لیا گیا ہے اخلاقی اقدار پسِ پشت چلی گئیں اب سب سے بڑی قدر پیسہ ہے۔ ساری دنیا جدید ٹیکنالوجی سے مستفید ہو رہی ہے کیونکہ وہ اس کا مثبت استعمال کر رہی ہے جبکہ ہماری نئی نسل اس کا علمی فائدہ نہیں اٹھا رہی اس کے غلط استعمال کی وجہ سے ان پر اس کے منفی اثرات مرتّب ہو رہے ہیں۔ اور بچے اخلاقی اقدار سے دور ہو رہے ہیں جبکہ مغرب میں سات آٹھ سالہ بچہ بھی بُک کلب کا ممبر ہے نیٹ کے ذریعے اپنے کمنٹس دیتا ہے۔ ان کا علم بھی وسیع ہے اور معلومات بھی۔ بچوں کو اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کے لیے دین کی بنیادی تربیت ضروری ہے جب تک ہم انہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے وہ ہر جگہ ہمیں دیکھ سکتا ہے...... وہ کبھی نہیں سنوریں گے۔ بچوں کے دل میں اللہ کی محبت اور خشیت پیدا کریں وہ کبھی گمراہ نہیں ہوں گے۔

۲: اخبارات و رسائل سے زیادہ اچھے اثرات مرتب ہوتے تھے۔ وہ زیادہ مؤثر ذریعۂ ابلاغ تھا اور ہے اس سے تربیت زیادہ بہتر ہوتی ہے اور معلومات بھی۔ یہ ہمارا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔ ہمارے یہاں بچوں پر جدید ٹیکنالوجی کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں، درست استعمال سے یہ بھی کارآمد ہو سکتی ہے بشرطیکہ والدین کو بھی اس سے آگہی ہو تب ہی وہ درست سمت میں بچوں کی رہنمائی کر سکیں گے۔

۳: والدین کی سب سے اچھی سرمایہ کاری وہ ہے جو وہ اپنے بچوں کی انسان سازی، تربیت سازی پر صرف کرتے ہیں۔ بچوں کو تحفظ دینے کے لیے انہیں دین و دنیا دونوں علوم کی تعلیم دیں۔ ہر اچھی بات پر بڑے پہلے خود عمل کریں اس کے بعد بچوں سے کروائیں۔

ش فرخ

(سینئر صحافی)

۱: ہم جس ٹیکنالوجی کو بچوں کے لیے نامناسب سمجھ رہے ہیں اسے استعمال کرنا ان کے لیے بے حد



ش فرخ

ضروری ہے جہاں تک غلط استعمال کی بات ہے تو جب بچے کی تربیت اچھی ہوگی تو وہ کبھی اس کا غلط استعمال نہیں کرے گا، جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے بچے بھی اس جانب مائل ہو رہے ہیں۔ انہیں صحت مند تفریح مہیا کریں تو وہ کبھی بے راہ رو نہیں ہوں گے۔

بچوں کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کے لیے کیا غلط ہے اور کیا درست، اور یہ کہ انہیں کس راستے پر سفر کرنا ہے شخصی آزادی بڑوں کی طرح بچوں کا بھی حق ہے، اس کا درست استعمال سکھانا بڑوں کا کام ہے۔ بچوں کی بات بھی سنیں انہیں اہمیت دیں تو وہ خودسر نہیں ہوں گے۔

۲: موبائل بہترین آلہ ہے، تمام جدید ٹیکنالوجی بلاشبہ معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔ پرنٹ میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم مگر وقت کے ساتھ ساتھ سب کے ذہن میں تبدیلی آتی ہے۔

پہلے جو معلومات بچے کتاب سے حاصل کرتے تھے اب وہی کمپیوٹر اور نیٹ کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں۔ میری نظر میں عہدِ حاضر کے بچوں کے لیے جدید ٹیکنالوجی زیادہ مؤثر اور کارآمد ذریعۂ ابلاغ ہے۔

۳: بچے ہمارا مستقبل اور اثاثہ ہیں۔ ان کی تربیت صحیح کی جائے تب ہی وہ آگے بڑھیں گے، معاشرے میں مثبت تبدیلی لائی جائے تو بچوں کو بھی تحفظ ملے گا۔

فردوس حیدر

(افسانہ نگار، ریکی ماسٹر)

۱: بچوں کو ہم نے خود ہی خودسر بنایا۔ ہم جو بو چکے ہیں وہی کاٹ رہے ہیں۔ والدین خود مصروف رہتے ہیں، بچوں کو وقت نہیں دے سکتے۔ اس لیے بچوں کا کوئی قصور نہیں۔ ہمیں انہیں گھر اور اسکولوں میں مثبت پروگرام میں مصروف رکھنا ہوگا۔ نصاب میں تبدیلی لانی ہوگی۔ ان کی رہنمائی کرنی ہوگی۔



فردوس حیدر

۲: جدید ٹیکنالوجی ضرور استعمال کرنی ہوگی لیکن رہنمائی کے ساتھ۔ بے شک یہ کارآمد ذرائع ہیں لیکن قلم کی حرمت سے بھی انکار ممکن نہیں، اچھے الفاظ کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اس لیے میں اخبارات و رسائل کو ان پر ترجیح دوں گی کہ وہ کسی بھی وقت پڑھے جاسکتے ہیں۔

۳: بچے قوم کا اثاثہ ہیں لیکن اس کی حفاظت کے لیے بڑوں کا سمجھدار ہونا بہت ضروری ہے پہلے بڑے اپنے آپ کو تو ٹھیک کریں، جب ہی وہ اس اثاثے کو تحفظ دے سکتے ہیں۔

تنویر عشرت

(ماہرِ نفسیات)

۱: بات یہ ہے کہ آپ نے بچوں کی جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے بڑے بھی تو اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور بچے بھی اپنے والدین کے بچے ہی ہیں ناں۔ مجھے آپ کی بات سے صدفی صد اتفاق نہیں، بڑے ہی بچوں پر بھروسا نہیں کرتے، بچپن ہی سے انہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتے ہر کام

اور فیصلہ ان کے لیے ہم خود کرتے ہیں ایسے میں ان میں خود اعتمادی کیسے پیدا ہوگی؟ ان کی صلاحیتوں پر ہمیں شک رہتا ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرسکتے کیونکہ ہم اپنے آپ کو اپنے والدین سے زیادہ قابل سمجھتے ہیں لہٰذا ہم ہر وقت اپنے بچوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح جو جائز آزادی ان بچوں کو ملنی چاہیے وہ بھی نہیں ملتی۔ جب بچوں کو ارادے کا اختیار نہیں دیتے تو وہ خود سے فیصلے کرتے ہیں تب ہم ان کے فیصلے کا احترام کرنے کے بجائے اسے نافرمانی کا نام دے دیتے ہیں۔ ہم آج کے بچوں کی بے جا خواہشات کو تو پورا کرتے ہیں لیکن ان کی جائز ضرورتوں کو پورا نہیں کر رہے مثلاً وقت پر کھانا کھلانا سلانا اور کھیل کے مواقع فراہم کرنا یہ ان کی ضرورت ہے، جب ہم بچے کی ضروریات کو پورا نہیں کریں گے تو وہ خود سر ہو جائیں گے، ہم رات کے دو بجے پزا تو آرڈر کردیں گے لیکن ان کو مغرب کے بعد گھر کا بنا ہوا صحت مند کھانا جو انہیں پسند ہے وہ نہیں دے رہے اور ضرورت کے بجائے بچوں کی بے جا خواہشات پوری کرکے خود کو اپنے والدین سے بہترین والدین سمجھتے رہے ہیں۔ جب بچوں کی بے جا خواہشات کو پورا کیا جائے گا تو وہ ضبطِ نفس نہیں سیکھ سکتے۔ آزادی اور آوارگی میں فرق ہے۔ آزادی میں مقصد اور منزل کا تعین ہوا ہوتا ہے جبکہ آوارگی میں نہیں، جدید ٹیکنالوجی کا استعمال اگر مقصد کے ساتھ ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن والدین خود اس ٹیکنالوجی کو بلا مقصد استعمال کر رہے ہیں تفریح اور وقت گزاری ہمارا مقصد ہے تو بچوں میں مثبت رویہ کیسے پروان چڑھے گا۔ قانونِ فطرت کا ہم خود خیال نہیں رکھتے وقت پر سونا، اٹھنا، کھانا، سچ بولنا حق قائم کرنا تو بچوں سے کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ بے راہ روی سے بچیں۔ اگر آج کے بچے بد تہذیب ہیں تو اس



تنویر عشرت

لیے کہ ہم بڑوں نے تہذیب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تہذیب کسی کتاب یا تقریر سے نہیں سیکھی جاتی یہ تو ہمیں بچوں کو عمل کرکے دکھانا ہوتا ہے ان مسائل کے سدِباب کے لیے مندرجہ بالا حقائق پر غور و فکر اور ہمیں اپنے رویّوں کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

۲: موبائل، انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور ٹی وی کو کمیونیکیشن کا مؤثر ذریعہ تو ہم کہہ سکتے ہیں لیکن کتنا کارآمد اور قابلِ اعتبار ہے اس کا انحصار بہت سے دوسرے عوامل پر ہے۔ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مواد کا معیار ہوتا ہے جبکہ موبائل، کمپیوٹر اور نیٹ پر موجود مواد کے معیار کی کوئی ضمانت نہیں۔ ابلاغ کا سب سے بہترین ذریعہ میری نظر میں فیس ٹو فیس ابلاغ ہے۔ جس میں والدین، اساتذہ، دوست اور دانشمند افراد کا بہت کردار ہے۔ سوشل میڈیا اور الیکٹرانک کمیونیکیشن ہمیں انسانوں اور انسانی جذبات سے دور کر رہے ہیں۔

۳: بے شک بچے قوم کا اثاثہ ہیں لیکن اس وقت جب ہم ان کی صحیح تربیت کریں۔ بچوں کا بچپن نہ

...یں اور انہیں کھیل کود کے مواقع دیں ان کی ...وریات کا خیال رکھیں، ان کو صحت مندانہ ماحول ...م کریں۔ اس ضمن میں والدین اور اساتذہ میں ...ور پیدا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ بچوں کو ...اشرے کا ذمے دار شہری بنانے میں اپنا کردار صحیح ...ور پر ادا کریں۔

افروز رضوی

(براڈکاسٹر، شاعرہ)

۱: اس کی بڑی وجہ گھر کا ماحول ہے جس میں ...یداری کا فقدان ہوسکتا ہے۔ جب انسان اپنے ...ب و دین سے دور ہوتا ہے تو اسے بہت سے ...یلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ اگر گھر ...ا ماحول عین دین کے مطابق ہوگا تو والدین کو ایسے ...سائل کا سامنا کرنا ہی نہیں پڑے گا، بچوں میں دین ...فہم و شعور موجود ہوگا اور وہ ہر اچھی اور بری بات ...یں تمیز کرسکیں گے۔ ان کے اخلاق و کردار بھی اچھے ...وں گے۔ آج کے ماحول میں سب سے زیادہ کمی ...ی چیز کی ہے۔ پھر نہ تو بچے کسی بے جا چیز کی ضد ...ریں گے نہ والدین کو پریشان ہونا پڑے گا جہاں



افروز رضوی

تک بات جدید ٹیکنالوجی کی ایجادات سے مستفید ہونے کی ہے تو اس کے لیے بچوں کا باشعور ہونا ضروری ہے، انہیں اپنی حدود کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ تمام چیزیں میری اسی پہلی بات کی آئینہ دار ہیں جو میں نے کہا تھا کہ گھر کا ماحول اور بچوں کی اچھی تربیت بہت ضروری ہے۔ ماں باپ کے قول و فعل میں تضاد ہو تو بچے بھی وہی کچھ سیکھتے ہیں جو دیکھتے ہیں کہ بچوں کی اچھی تربیت وہی کر سکتے ہیں جو خود اچھے تربیت یافتہ ہوں۔ گھر کی تربیت اور ماحول اچھا ہو تو گھر اور معاشرہ دونوں ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ گھر کے افراد سے ہی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

۲: مؤثر ذریعۂ ابلاغ تو سب ہی ہیں اور جدید ٹیکنالوجی کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن بچوں کو اپنی حدود کا علم ہونا چاہیے۔ ذرائع ابلاغ میں سے وہ ان چیزوں کو فوکس کریں جو ان کے لیے کارآمد ہوں اور ان چیزوں کو بالکل نظر انداز کردیں جو صرف ان کی اخلاقیات کو خراب کریں یا ان کے وقت کے زیاں کا باعث بنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب بچے ذہنی طور پر اچھے تربیت یافتہ ماحول میں پرورش پائیں گے، اس ضمن میں یہ بات کرنا بھی ضروری ہے کہ اخبارات و رسائل یا دوسری کتب پڑھنے کی عادت بچوں میں ضرور ہونی چاہیے۔ کتابیں انسان کی بہت اچھی دوست ہوتی ہیں۔ ان سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں جدید ٹیکنالوجی اپنی جگہ اہم سہی مگر اخبارات و رسائل کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جدید ٹیکنالوجی بجلی کی محتاج ہے اور بجلی ہے تو ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے اب بھی بہت سے پس ماندہ گاؤں ایسے ہیں جہاں بجلی کی سہولت میسر نہیں وہاں یہی اخبارات و رسائل معلومات کا مؤثر ذریعہ ہیں۔

۳: بچے قوم کا اثاثہ ہیں اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا آج کے بچے کل کے معمار ہیں۔
اس لیے ان بچوں کی ذہنی تربیت اور جسمانی نشوونما بے حد ضروری ہے۔ اور یہ کام ملک گیر سطح پر ہونا چاہیے، بچوں کے علاج معالجے کے لیے اچھے اور جدید اسپتال قائم ہوں غریب اور امیر دونوں کے بچوں کے لیے یکساں طبی اور تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ جدید ٹیکنالوجی کا حصول غریب طالب علموں کے لیے بھی ممکن بنایا جائے تاکہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے دور نہ رہیں اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے کے فعال فرد بن سکیں۔

اسما شبانہ
(اسکول پرنسپل)

۱: بچوں کے اس رویے کی بنیادی اور بڑی وجہ بے لگام آزادی ہے اور اس میں بچوں کے ساتھ ساتھ میں بڑوں کو بھی قصوروار سمجھتی ہوں کہ والدین نے انہیں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کی آزادی تو دے دی لیکن یہ جاننے کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ بچے کس طرح اس کا استعمال کر رہے ہیں؟ کس حد تک اسے اپنی معلومات کا ذریعہ بنا رہے ہیں؟ بچوں کو اس وجہ سے بھی چھوٹ مل گئی کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کے گھر کے بڑے انٹرنیٹ اور اس کا استعمال نہیں جانتے۔ یہی بات میں موبائل کے بارے میں بھی کہوں گی اب موبائل پر نیٹ کی سہولت بھی ہے اور کتنے ہی والدین ایسے ہیں جو نہیں جانتے کہ یہ ذرا سا موبائل کتنا مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے والدین کو خود بھی جدید ٹیکنالوجی سے باخبر رہنا ہوگا۔

۲: میں جدید ٹیکنالوجی کو برا نہیں سمجھتی لیکن اخبارات و رسائل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان


اسما شبانہ

کے توسط سے بچے اپنی اخلاقیات، اقدار اور نشست و برخاست کا سلیقہ سیکھتے ہیں، زندگی بسر کرنے کے اصول سیکھتے ہیں۔ بچہ جب اخبار پڑھتا ہے تو وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اخبار کیسے رکھا جاتا ہے؟ کہاں بیٹھ کر کیسے پڑھنا ہے؟ اس کے برعکس ٹی وی، موبائل انٹرنیٹ کا استعمال وقت کی قید سے آزاد ہے۔ اس کی وجہ سے بچوں میں ڈسپلن نہیں آتا وہ قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ پڑھائی کے دوران موبائل کی گھنٹی بجتی ہے بچے کی توجہ بٹ گئی اس نے میسج پڑھا دوست نے آن لائن ہونے کی فرمائش کی اب بچے کی توجہ انٹرنیٹ کی طرف ہو گئی، وہاں سے ملنے والی معلومات مستند ہے بھی کہ نہیں یہ بھی شک و شبہے کی بات ہے اس لیے مقابلتاً اخبارات و رسائل کو میں زیادہ موثر اور کارآمد ذریعۂ ابلاغ سمجھتی ہوں۔

۳: بچوں کو تعلیم کے اچھے مواقع فراہم کر کے ان کا حال ہی نہیں مستقبل بھی زیادہ بہتر طریقے سے محفوظ کیا جا سکتا ہے بچوں کی تعلیم بہت کوالٹی وائز ہو، اس پر توجہ دیں۔

بسمہ آصف
(مونٹیسوری پوزیشن ہولڈر)

۱: بچوں کے خودسر اور بدتہذیب ہونے کی بڑی اور اہم وجہ ان کی بے جا خواہشات کی تکمیل


بسمہ آصف

ہے۔ اس معاملے میں والدین کو سمجھداری سے کام لینا چاہیے اور بچوں کی ہر خواہش کو بنا سوچے سمجھے پوری کرنے کے بجائے انہیں احساس دلائیں کہ ہر خواہش کی تکمیل ممکن اور ضروری نہیں، والدین اپنی اولاد کا برا کبھی نہیں چاہتے۔ مانا کہ زمانے کے ساتھ چلتے ہوئے بچوں کو جدید ٹیکنالوجی سے دور نہیں رکھا جا سکتا لیکن کچھ حدیں قائم کی جا سکتی ہیں اور کرنی بھی چاہئیں، ان چیزوں کے استعمال کے لیے وقت مقرر کر دینا چاہیے تاکہ بچوں کی صحت اور پڑھائی متاثر نہ ہو۔ بچوں کے بعض وڈیو گیمز ایسے آ رہے ہیں جن کے توسط سے بچہ اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا ہو رہا ہے، ان کے ذریعے بچوں کو جرائم کے مختلف طریقے سکھائے جا رہے ہیں۔ اپنے بچوں کو بے راہ روی اور گمراہی سے بچانے کے لیے والدین یہ ضرور دیکھیں کہ کمپیوٹر پر ان کا بچہ کیا کر رہا ہے؟ کیا دیکھ رہا ہے؟ وہ اگر خود بھی کمپیوٹر استعمال کرنا سیکھ لیں تو نہ صرف یہ کہ اس کی تکنیک سے واقف ہو جائیں گے بلکہ بچوں پر بھی نظر رکھ سکیں گے۔

۲: میں تو خود اپنے بچپن میں نونہال، آنکھ مچولی اور تعلیم و تربیت بہت پابندی سے پڑھتی تھی جن سے عام معلومات ہی میں نہیں ذخیرۂ الفاظ میں بھی بہت اضافہ ہوتا تھا۔ مستند اسلامی اور ملکی تاریخی واقعات اور سبق آموز کہانیاں پڑھنے سے ہماری تربیت بھی ہو جاتی تھی آج کتب بینی کا رجحان ہی نہیں ہے، جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے بچے کتابوں سے دور ہو گئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں قصور ہم بڑوں کا زیادہ ہے کہ ہم نے اس طرف انہیں مائل ہی نہیں کیا۔ جدید ٹیکنالوجی کے ذرائع کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں اخبارات و رسائل کا نعم البدل نہیں ہو سکتے کہ انٹرنیٹ، موبائل اور میڈیا سے حاصل کردہ معلومات پریشانی کا باعث ہیں کہ ان کے توسط سے بچے قبل از وقت بہت سی غیر ضروری ایسی باتیں بھی جان لیتے ہیں جن سے ان کی معصومیت مسخ ہو رہی ہے اور وہ بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ قصوروار وہ والدین ہیں جو بچوں کو ان کے استعمال کی آزادی تو دے دیتے ہیں مگر ان پر نظر نہیں رکھتے۔

۳: بچے قوم کا سرمایہ ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ ضروری تربیت ہے کہ بچہ ابتدائی پانچ سال میں جو کچھ سیکھتا ہے وہ اپنے اندر سمو لیتا ہے اور پھر اسی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ بچے کو اچھی باتیں سکھائی جائیں گی تبھی وہ اچھے اعمال اختیار کرے گا۔

☆☆☆

قارئین کرام: تمام خواتین کی آرا کی روشنی میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

لڑکی دیوانی سی

اِک لڑکی دیوانی سی
شام ڈھلے آنگن میں
آس کے دیپ جلائے
خوشیوں کا رستہ دیکھ رہی ہے
پھولوں کے کِھلنے کا
موسم دیکھ رہی ہے
اِک لڑکی دیوانی سی

شاعرہ: ناہید بنتِ نور
مرسلہ: مسز ارشد آسی اتووالہ

گویا بچے قصور وار ضرور ہیں لیکن صد فی صد نہیں، خواہ معاملہ کچھ بھی ہو اصل قصور تو ہم بڑوں کا ہے جو تجربے کار اور سمجھدار ہوتے ہوئے بھی اپنے فرائض صحیح طرح انجام نہیں دے پا رہے۔ بچے قوم کا سرمایہ ہیں اس سرمائے کو بے مایہ بننے سے روکنے کے لیے عمدہ اخلاقی و ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی اچھی صحت، تعلیم، عزت اور جان کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ بچوں کے اغوا اور ان پر ذہنی، جسمانی اور جنسی تشدد کی وارداتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر یومِ اطفال پر بچوں کے تحفظ کے لیے بنائے جانے والے قوانین پر بہت اثر انگیز بیانات دیے جاتے ہیں، قراردادیں پیش کی جاتی ہیں جو اتفاقِ رائے سے منظور بھی ہو جاتی ہیں لیکن بچوں کے ساتھ درندگی کا سلسلہ ختم ہو کر ہی نہیں دیتا ابھی ننھی ننھی کلیوں کی ردائے عصمت تار تار ہونے کی خبر پر بیانات اور تبصروں کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ایسی ہی دوسری روح فرسا خبر موضوعِ سخن بن جاتی ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق......

پاکستان میں پچھلے چند برسوں کے دوران کمسن بچیوں اور بچوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے (سالِ رواں میں ان واقعات کی تعداد میں شرمناک بلکہ اذیت ناک اضافہ ہوا ہے) ایسے تمام بچے خوف اور نفسیاتی الجھنوں کے باعث خودکشی کر لیتے ہیں جبکہ بچوں کے حقوق کے عالمی معاہدے کے تحت ”جنسی استحصال، جنسی بدسلوکی اور جسم فروشی یا فحش تصاویر وغیرہ کی تیاری سے بچوں کو تحفظ دینا، بچوں کی فروخت، اسمگلنگ، اغوا کی روک تھام کے لیے اقدام حکومت کی ذمے داری ہے، کسی بچے کو تشدد، اذیت اور ظالمانہ سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی غیر قانونی طور پر گرفتار کر کے آزادی سے محروم کیا جائے گا۔

کیا صاحبِ اختیار اپنی ذمے داری نباہ رہے ہیں؟ ان بچوں کے ذہنی، جسمانی اور روحانی قتل کا قصاص کون ادا کرے گا؟ وہ بڑے جو عالمی یوم اطفال کے موقع پر بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے پہاڑ جتنے بیانات تو دے دیتے ہیں مگر ان پر عمل رائی بھر بھی نہیں کرتے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے اصلاً اور عملاً کیے جانے والے کاموں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر اور بچوں کے حقوق کی پامالی کے واقعات ان گنت ہیں۔ کسی کو احساسِ زیاں نہیں ستاتا کہ دنیا کے باغ میں ان پھولوں کے دم سے خوشبو اور اجالا ہے، وہ بچے جن کے دم سے گھروں ہی میں نہیں دلوں میں بھی رونق اور روشنی سی پھیل جاتی ہے۔ کبھی درندگی کا نشانہ بن کر جیتے جی مر رہے ہیں اور کبھی بہیمانہ سلوک کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔

روشنی کے یہ سفیر کب تک تاریک راہوں میں مارے جاتے رہیں گے؟

یہ محض ایک سوال ہی نہیں ہر صاحبِ دل اور چشم بصیرت رکھنے والے کے لیے لمحۂ فکریہ اور عہدِ حاضر کے ستم رسیدہ بچوں کی تاریخ کا المناک باب بھی ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! آیئے آج ہم سچائی سے اپنا محاسبہ خود کریں۔ ہم یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ہماری تو خوب عزت کی جائے مگر ہم کسی کی عزت نہ کریں۔ ہماری یہ خواہش کیوں ہوتی ہے کہ سب ہمارے حقوق کا خیال رکھیں اور ہم اپنا فرض بھی ادا نہ کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت غیبتوں، بہتانوں اور گمراہ کن باتیں کرنے میں ضائع کرتے ہیں۔ ہم سب سے اچھے ہیں اور دوسرے سب کم تر یا برے ہیں۔ یہ کلیہ تو اب فیشن کے زمرے میں بھی آ گیا ہے اور اشتہاری مہم کا بھی جزو بن گیا ہے۔ ہم فون کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی، ایسی افواہوں میں جان ڈال دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ آج آپ کو یہ چھوٹی سی پیاری سی بات اس لیے بتا رہی ہوں کہ بری اور غلط باتوں کے بجائے آپ اچھی باتیں آگے بڑھائیں اور نیکی میں حصے دار بن جائیں۔ والدین کا اپنی اولاد سے اور اولاد کا اپنے والدین سے محبت، شفقت اور احترام کا رشتہ ہوتا ہے اگر یہی بنیاد کمزور ہو جائے تو خاندان کو ٹوٹ پھوٹ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ مغربی معاشرے میں خاندان کی تباہی ہمارے سامنے ہے اگر باہمی محبت کمزور ہو گی اور ہر ایک اپنی ہی فکر میں رہے گا تو خاندان کی وحدت یقیناً پارہ پارہ ہو گی۔ دینِ اسلام سے وابستہ افراد کے باہمی تعلق کی بھی یہی بنیاد ہے یعنی اللہ اور رسولؐ سے محبت۔ قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ بار بار ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہماری آپس کی یکجہتی اور اخوت کی اصل بنیاد ہے۔ جب یہی بنیاد کمزور پڑ جائے تو کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی کہ ہم ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں یا آپس کے معمولی اختلافات کو پس پشت ڈال دیں۔ یوں تو ہم اپنی جھوٹی اور بے معنی باتوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑنے میں نہ دیر لگاتے ہیں اور نہ ہی ٹاک شوز میں اپنی آواز کو دبنے دیتے ہیں مگر کیا کبھی ہم نے اپنے آپ سے یہ پوچھا ہے کیا ہم اللہ اور رسولؐ سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی صحابہ اکرامؓ کرتے تھے یقیناً سب کا جواب نفی میں ہو گا اور یہی وجہ ہے کہ نفاق اور فرقہ پرستی سر اٹھائے کھڑی ہے اور ہم جانوروں سے بدتر ہو کر ایک دوسرے کو ایذا پہنچانے میں مگن ہو گئے ہیں۔ ہم سب سے اچھے ہیں اور دوسرے سب سے برے یہ خناس ہمارے دماغ میں فٹ ہو گیا ہے۔ ہم بالکل بھول گئے ہیں کہ یہ دنیا چند روزہ ہے اور اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ خدارا ہوش میں آ جائیں اس سے پہلے کہ ہمارے ہوش گم ہو جائیں۔

☆ یہ بات مجھے اپنی مصنفات سے بار بار کہنی پڑتی ہے کہ اپنے مسودے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ اپنے پاس رکھیں۔ مصنفات بہنیں ہمیں دھندلی، پھیکی اور کالے شیڈ کی فوٹو اسٹیٹ تحریریں بھجوا دیتی ہیں جن کو پڑھنے میں بے حد دشواری ہوتی ہے۔

☆ جن قاری بہنوں کے پاس میرا موبائل نمبر ہے وہ براہ کرم اپنی نظمیں، غزلیں اور بے تکے میسج مجھے نہ بھیجیں۔ موبائل میں ضروری میسج کیے جاتے ہیں ناکہ... وہ شاعری جو کسی کو اپنے عاشق کو بھی نہیں بھیجنی چاہیے۔ امید ہے میری پیاری بہنیں آئندہ خیال رکھیں گی۔

اس سے قبل کہ آپ کھٹے میٹھے خطوط پڑھیں آیئے پہلے ایک بار درود ابراہیمؑ پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانك انی كنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصور واروں میں سے ہوں۔

نوٹ: یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ یہ آیت، آیت کریمہ

کہلاتی ہے اوراس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں۔

☆☆☆

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی پیاری مصنفہ سلمیٰ اعوان جن کے سفرناموں اور افسانوں کو بے حد پسند کیا جاتا ہے ڈھیر ساری کتابیں لکھ چکی ہیں...... تعلیم کے شعبے سے منسلک ہیں ان کی نئی کتاب لہورنگ فلسطین کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ کو فلسطین کے صبح شام کا اندازہ بھی ہوگا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ امید کے روشن چراغ کس طرح راستہ دکھایا کرتے ہیں۔ کتاب کی قیمت صرف 475 روپے ہے۔ جس کو حاصل کرنے کے لیے اس ایڈریس سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ دوست پبلی کیشنز، پلاٹ نمبر 110 اسٹریٹ نمبر 15 سیکٹر 9/2-1، اسلام آباد۔

☆ ہماری مایہ ناز مصنفہ رفعت سراج کا معروف ناول شہرِ یاراں ان دنوں ایک نجی ٹی وی چینل پر بطور سوپ دکھایا جارہا ہے۔ جس کی ڈرامائی تشکیل بھی رفعت سراج نے ہی کی ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ معروف براڈ کاسٹر، مصنفہ اور ٹی وی کی نامور اداکارہ نیلوفر عباسی نے نیویارک سے ہمیں بتایا کہ ان کا جنوری میں کراچی آنے کا ارادہ ہے۔ (انشاء اللہ)

☆ ہماری بے حد پیاری مصنفات دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کی والدہ ان دنوں شدید علیل ہیں ان کی مکمل صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ مسز شمع حسین، ٹورنٹو کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کلی صحت عطا فرمائے، آمین۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز قیصر قدیر، کینیڈا بفضلِ خدا بالکل ٹھیک ہیں اور جلد اپنے عزیزوں کی شادی میں شرکت کرنے لاہور آئیں گی۔ (خوش آمدید)

☆ ہماری پیاری مصنفہ رفاقت جاوید کی طبیعت کچھ ناساز ہے اس لیے انہوں نے اسلام آباد سے کراچی آنے کا پروگرام ملتوی کردیا ہے۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ صائمہ قیصر ہاشمی، راول پنڈی کا گزشتہ دنوں پتّے کا آپریشن ہوا ہے۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری ایک مستقل قاری مسز شیریں، کراچی کافی عرصے سے بیمار ہیں ان کی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری حیدرآباد میں مقیم ایک مستقل قاری بہن صائمہ بی بی شدید پریشانیوں کا شکار ہیں ان کے لیے دعا کریں کہ اللہ پاک انہیں ہر مشکل سے بچا کر رکھے، آمین۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات کی طبیعت اب بفضلِ خدا ٹھیک ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مہ وش مشعل، پنجاب کے بھتیجا ہوا ہے۔ جس کا نام ذیشان ظفر رکھا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور لیاری کی معروف خاتون روبینہ اسلم کی پیاری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ (مبارک باد اور دعائیں)

☆ پاکیزہ کی معروف شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور ان دنوں بیمار ہیں اگر کسی قاری بہن کے پاس ہڈیوں کا گودا سوکھ جانے کا کوئی دیسی یا روحانی علاج ہو تو وہ آگاہ کریں۔ فریدہ بہن کی ٹانگوں میں بھی شدید درد رہتا ہے۔ یقیناً کوئی علاج ایسا ضرور ہوگا جس سے ٹانگوں کی ہڈیوں کا گودا ٹھیک ہوجائے۔ ویسے وہ آج کل تبدیلی آب و ہوا کے لیے کوہ مری گئی ہوئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر جن کی شناخت کپل آف فیصل آباد سے بہت زیادہ ہے کی اس ماہ شادی کی سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

☆ معروف اینکر اور مصنفہ شازیہ افتخار خان، لاہور میں اپنے نئے بنگلو میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ہماری مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی کے پوتے فیضان شاہد نے انٹر کامرس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ (مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی بھانجی کنزا تین سال کے بعد امریکا سے آرہی ہیں۔ (مبارکاں)

☆☆☆

✍ خالدہ نسیم، لندن سے۔ ”ضیا کی شادی کی مبارک باد۔ احوال پڑھ کر ہم بھی تقریب میں شریک ہوگئے۔ دولھا، دلہن کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ افسانوں میں عطیہ عمر، مصباح نوشین، شہناز صدیق اور رفاقت جاوید کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔ شیریں حیدر نے تتلی بہت اچھا لکھا ہے۔ صائمہ اکرم نے بھی اپنا موضوع خوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ عنیزہ سید، رفعت سراج اور قیصرہ حیات کے ناولوں کی اقساط پسند آئیں۔“ (شکریہ)

✍ ماہ پارہ تسنیم، کراچی سے۔ ”انجم آپ کے ہاں شادی میں آکر بہت اچھا لگا اور احوال پڑھ کر قارئین بھی اس تقریب میں یقیناً شریک ہوگئے ہوں گے۔ عظمیٰ کی منظر نگاری بہت اچھی ہے۔ اکتوبر کے شمارے کے تمام افسانے مجھے پسند آئے ہیں۔ سلسلے وار تحریریں کم ہونی چاہیے۔ عنیزہ سید کے ناول میں گو کہ کئی کہانیاں ہیں مگر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ رفعت سراج کی یہ قسط بھی اچھی رہی۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ”بہت عرصے بعد محفل میں شرکت کررہی ہوں۔ آپ کی بہو کو ٹائٹل پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ باجی آپ واقعی اپنی بہنوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ عظمیٰ ماشاء اللہ تم نے بہت اچھا لکھا ہے اور اس دفعہ کی پاکیزہ ڈائری بھی بہت اچھی لگی ہے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اب بور سا ہوگیا ہے۔ روحانی مشورے اچھے لگے۔ مجموعی طور پر اکتوبر کا شمارہ اچھا لگا۔“ (ہمیں بھی آپ کی پُرمحبت رائے اچھی لگی)

✍ زرین زبیر کوٹھاری، کراچی سے۔ ”کافی عرصے بعد رابطہ کررہی ہوں مگر پاکیزہ سے غافل نہیں تھی۔ پچھلے دنوں میری انگلی جل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ہاتھ میں کافی تکلیف رہی۔ پاکیزہ ہر ماہ ہی اچھا لگتا ہے اور اس ماہ تو بہت ہی اچھا لگا ہے۔“ (زرین بیٹا، تمہیں شوگر بھی ہے اس لیے اپنی انگلی کے زخم کا خاص خیال رکھنا۔ ہاں باقاعدگی سے پاکیزہ کے سلسلوں میں شرکت کیا کرو۔ اتنے لمبے عرصے کی غیر حاضری اب نہیں چلے گی)

✍ شہزادی، فیصل آباد سے۔ ”میں پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ہوں مگر اب مصروفیات کی وجہ سے تبصرہ بھیجنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ اپنے خوب صورت ٹائٹل کی وجہ سے پسند آیا۔ تینوں ناولوں میں مجھے سب سے اچھا ناول رفعت سراج کا لگ رہا ہے۔ گو عنیزہ سید بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ قیصرہ حیات میری پسندیدہ مصنفہ ہیں مگر معذرت کے ساتھ اس ناولٹ میں منفی صورتِ حال کافی لمبی ہوتی جارہی ہے۔ اس ناولٹ کی ابتدا بہت اچھی ہوئی تھی مگر بعد میں پتا نہیں اس کو کیا ہوگیا۔ صائمہ اکرم نے بہت خوب صورت طریقے سے اپنا ناول مکمل کیا۔ تتلی بھی اچھا لگا۔ خصوصی طور پر میں رضوانہ پرنس کی تعریف کرنا چاہوں گی۔ مجھے ان کے کیے ہوئے انٹرویوز بہت پسند آتے تھے۔ پچھلے شمارے میں ان کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ نمرہ احمد کا پارس بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ (پیاری شہزادی آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ سمیرا حمید فاروق، کراچی سے۔ ”میں مصروفیات کے باعث کافی دنوں غیر حاضر رہی۔ اکتوبر کا ٹائٹل واقعی بہت پیارا لگا اور میں اسے دیر تک دیکھتی رہی۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ آپ کے بیٹے کی شادی ہوگئی ہے اور یہ آپ کی بہو ہے۔ عظمیٰ آفاق اب تمہاری تحریروں کا انتظار رہے گا کہ تم واقعی بہت اچھا لکھتی ہو کہ تصویر کھینچ دیتی ہو۔ شیریں حیدر میری پسندیدہ مصنفہ ہیں اور ہر دفعہ کوئی چونکا دینے والی کہانی لاتی ہیں۔ تتلی بھی بہت اچھی لگی مگر اس کا انجام مجھے شروع سے ہی معلوم تھا۔ صائمہ اکرم کا مکمل ناول بے حد کامیاب رہا۔ نمرہ احمد کا مکمل پڑھ لوں تو رائے دوں گی۔ رفعت سراج کی قسط شاندار رہی۔ عنیزہ سید بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ سنجیدہ موضوعات پر رضوانہ پرنس بہتر لکھتی ہیں مگر دلچسپ موضوعات پر بہترین۔ آپ ان سے دلچسپ انٹرویوز کروائیں ناں جیسا کہ انہوں نے عذرا رسول کا کیا تھا۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

✍ عائشہ افضل، لاہور سے۔ ”میں نے دس سال کے بعد پاکیزہ دوبارہ پڑھنا شروع کیا ہے۔ اکتوبر کے شمارے کی دلہن بے حد پیاری لگی۔ خصوصی طور پر اس کے دانت اور ہونٹ تو بہت اچھے ہیں ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار والے لگر جب پاکیزہ پڑھنا شروع کیا تو اسی میں ناول سمیت چھ کہانیاں تو سلسلے وار ہیں۔ اب مجھ جیسی پڑھنے والی رسالے میں کیا پڑھے؟ انجم جی افسانہ اور ناولٹ مکمل شائع ہونے چاہیں اس کی قسطیں تو وہی لوگ پڑھ کر سمجھ سکیں گے جو باقاعدگی سے پڑھنے والے ہوں گے۔“ (آپ کی شکایت اور تجویز نوٹ کرلی ہے اور مجھے یاد آرہا ہے کہ آپ کو تو لکھنے سے بے حد دلچسپی تھی تو اب آئی ہیں تو اپنی تحریر کے ساتھ حاضری دیجیے ناں اور جناب جب آپ باقاعدگی سے پڑھنے لگیں گی تو یہی قسط وار پڑھے بغیر رہ نہیں پائیں گی)

راضیہ فوجدار، ساہیوال سے۔ ”انجم اللہ کے بعد میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تمہاری کتاب روحانی مشورے اور انمول خزانے کی دعائیں نہ صرف میرے لیے بلکہ بہت سے جاننے والوں کے کام آئیں۔ انٹرنیٹ پر بھی آپ کی کتابیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے طفیل آپ کو دونوں جہانوں میں سرخرو رکھے، آمین۔ میں اپنی بہنوں کو یہ بتانا چاہتی ہوں میں کینسر جیسے موذی مرض کا شکار تھی علاج اپنی جگہ پر تھا مگر میں نے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک گلاس پانی پر سورۂ فاتحہ اور درود ابراہیمی جتنا بھی پڑھ سکی دم کر کے پیتی رہی اور اپنے گھر میں ہی آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتی رہی۔ جس سے مجھے بے حد فائدہ ہوا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی نے لکھا تھا کہ وہ ایک ہفتے میں قرآن پاک ختم کر لیا کرتی ہیں۔ بفضلِ خدا میں بھی کر لیتی ہوں۔ قرآن پاک میں ہر مرض کا علاج ہے اور اس کے پڑھنے سے ہر پریشانی رفع ہو جاتی ہے اس لیے میری بہنوں مایوسی کو دل سے نکال دو آپ خواہ کتنی ہی پریشان، بیمار ہوں اس دائرے سے نکل آئیں گی، بے شک میرا رب ہر شے پر قادر ہے۔“ (راضیہ بہن مدتوں بعد تم سے رابطہ ہو رہا ہے اور مجھے دلی خوشی بھی ہو رہی ہے کہ اب تم ٹھیک ہو۔ تمہارا یہ خط امید کا روشن چراغ ہے جو مایوسی کے بادل کاٹ دے گا اور ہماری قارئین بہنیں یقیناً اس سے بہت کچھ سیکھیں گی)

فرزانہ رحیم، لاہور سے۔ ”باجی میں اور میرا بھائی دونوں بہت شوق سے پاکیزہ پڑھتے ہیں۔ اس کے ناول، افسانے ہمیں بے حد پسند آتے ہیں۔ پاکیزہ کے ٹائٹل بھی ایک سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں آپ کی بہو کی تصویر ٹائٹل پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا بھائی کہنے لگا کہ دلہن بن کر تو ہر لڑکی ہی خوب صورت نظر آتی ہے مگر اس دلہن کے دانت بہت خوب صورت ہیں اور یہ کسی بھی ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار میں بہ آسانی آسکتی ہے۔ ہاں ہم دونوں بہن بھائیوں کو سب سے خوب صورت تحریر شیریں حیدر کی لگی۔“ (اس محفل میں خوش آمدید۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اپنے بھائی سے کہنا دانت تو ہمارے بھی برے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار دلوا دو۔ خواہ مخواہ لکھنے پڑھنے میں اپنا دماغ مارتے ہیں)

مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ”اس ماہ کا ٹائٹل اور شادی کا احوال پسند آیا۔ اس ماہ جو افسانہ مجھے سب سے زیادہ پسند آیا ہے وہ شیریں حیدر کا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے بارے میں کس قدر معلومات دی ہیں انہوں نے۔ عنیزہ سید کا ناول خوب رواں ہے۔ رفعت سراج کی یہ قسط بھی شاندار رہی ہے۔ شائستہ زریں کے سروے میں ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے جوابات نے متاثر کیا۔ باقی مستقل سلسلے ٹھیک رہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”اداریے میں بات کہنے کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ میٹھی زبان سے ملک بھی فتح کر لیے جاتے ہیں۔ امانت کی گرہیں کھلنی شروع ہو گئی ہیں۔ کائنات کے دادا کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ بقر عید کی مناسبت سے عطیہ عمر اور رفاقت جاوید کے افسانے اچھے لگے۔ مصباح نوشین کے افسانے میں اللہ پر توکل کا اچھا سبق دیا گیا۔ قیصرہ حیات کے ناول میں محسن رضا کی آمد سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ شام شہر یاراں میں دانیال کا ٹھیک ہو جانا ایک معجزہ ہے۔ عنیزہ سید ہر کردار کو لے کر اچھی طرح چل رہی ہیں۔ شہناز صدیق اور راحت وفا کے افسانے بس مناسب تحریریں تھیں۔ صائمہ اکرم کی کہانی گمشدہ جنت میں انسانی رشتوں کے اتار چڑھاؤ نظر آئے مگر ہانیہ اور اسود ہاتھ ملتے رہ گئے۔ شیریں حیدر نے اپنی تحریر میں موبائل کے فائدے اور نقصان دونوں اچھی طرح سمجھا دیے ہیں۔ لڑکیوں کی ضد اور جھوٹی تعریفیں کس قدر نقصان پہنچاتی ہیں۔ نبیلہ ابر راجا کی مسکراتی تحریر اچھی لگی۔ اس ماہ کی بہترین تحریر نمرہ احمد کی پارس رہی۔ یہ ان کی گزشتہ تحریروں سے بھی بہت اچھی لگی۔ عظمیٰ نے ضیا کی شادی کا احوال بہت اچھا لکھا۔ ہر سطر میں بہن کی محبت نظر آرہی تھی۔ پڑھتے ہوئے ایسے لگتا تھا جیسے مہندی اور بارات میں ہم بھی شریک تھے۔ تمہاری امی سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔“ (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ”باجی میں بے شک فیصل آباد میں رہتی ہوں مگر آپ کے بیٹے کی شادی کا احوال پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں بھی وہیں موجود تھی۔ ہاں آپ نے تصاویر بے حد کم لگائیں۔ اس ماہ نمرہ احمد کا ناول پارس نمبر ون رہا ہے۔ شیریں حیدر اور صائمہ اکرم نے بھی اچھا لکھا۔ صائمہ کی تحریریں تو مجھے بڑی پسند آتی ہیں۔ دونوں ناول کی اقساط اچھی تھیں اور بہنوں کی محفل میں جا کر تو سب سے زیادہ لطف آیا۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

مسز سلیمہ کوثر، راولپنڈی سے۔ آپ کا خط بالکل ذاتی نوعیت کا سا ہے اس لیے اسے لگاتے ہوئے مجھے شرم آئے گی کہ مجھ میں وہ خوبیاں ہیں ہی نہیں جن کی تفصیل آپ نے لکھی ہے۔ بے شک مجھے اپنی تمام مصنفات عزیز ہیں مگر بیرون شہر یا ملک میں مقیم مصنفات کو کارڈز اس لیے نہیں بھیجے تھے کہ دوسرے شہر آنا جانا کوئی آسان کام نہیں ہوا کرتا مگر پھر بھی میری

مصنفات نے مجھے مبارک باد دی۔ عمیرہ احمد، نیلوفر عباسی، غزالہ فرخ، عنیزہ سید، عفیفہ محمد بیگ، سلمیٰ اعوان، شمع حسین اور اقبال بانو کے فون ریسیو کر کے دلی خوشی ہوئی تھی۔

رخسانہ امجد، ملکوال سے۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس ماہ آپ کی بہو کی تصویر ٹائٹل پر چھپی ہے۔ جب میں نے ٹائٹل دیکھا تو اسے فوراً سونمبر دے دیے۔ عظمیٰ باجی نے تو ویسے ہی شریک کر لیا۔ عظمیٰ باجی کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ بلیک اینڈ وائٹ تصاویر بے حد مدھم تھیں مگر میں خوشی خوشی دیکھتی رہی۔ شیریں حیدر نے بہت اچھا لکھا۔ ان کی تتلی بہت اچھی لگی۔ صائمہ اکرم کی تحریر نے بھی ماحول بجا دیے۔ قانتہ رابعہ کی تحریر سب سے زیادہ پسند آئی۔ میری مبارک باد پہنچا دیں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

مہوش مشعل، پنجاب سے۔ ”باجی میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے بتائیں گی کہ آپ کی بہو حنا نے شادی اور ولیمے میں جو زیورات پہنے تھے وہ سونے کے تھے یا ہیرے جواہرات کے تھے؟“ (پیاری بہن مہوش مشعل میری بہو نے شادی اور ولیمے میں نہ ہیرے جواہرات پہنے اور نہ ہی سونے کے زیورات۔ آج کل میچنگ جیولری کا فیشن ہے جو کپڑے کے رنگوں اور ڈیزائن کے حساب سے خاصی سستی بھی مل جاتی ہے۔ اب سونا، چاندی خریدنے کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اس لیے اب کسی کو بھی اپنی بیٹی کے جہیز میں ان چیزوں پر پیسہ خرچ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے)

عذرا بی بی، پنجاب سے۔ ”باجی میں آپ کے لیے، آپ کے بچوں کے لیے اور پاکیزہ کے لیے بہت دعائیں کرتی ہوں۔ میری بیٹی کہتی ہے کہ انجم باجی سے فون پر بات کر لیا کریں اور جب آپ سے فون پر بات ہو جاتی ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اکتوبر کے پاکیزہ میں سب تصویریں سب تحریریں اچھی لگیں۔“ (پیاری عذرا بی بی آپ سے بات کر کے یا آپ کی رائے پا کر مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ میری دعائیں بھی آپ کے لیے ہیں)

مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ”کافی عرصے بعد محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ اس دفعہ پاکیزہ کا سرورق بے حد پسند آیا واقعی آپ کی بہو بھولی بھالی اور پیاری سی لگی (ماشاء اللہ) عظمیٰ آفاق نے شادی کا احوال بہت دلچسپ لکھا ہے۔ اب ہمیں عظمیٰ کے ایسے ہی دلچسپ افسانے بھی چاہئیں۔ مستقل ناولز بہت اچھے جا رہے ہیں۔ عنیزہ سید نے تو جکڑ رکھا ہے۔ رفعت سراج کا امانت بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ شائستہ زریں کا سروے اچھا لگا۔ اس دفعہ کے افسانے سب ہی پسند آئے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

پروفیسر شیریں تسلیم، لاہور سے۔ ”پاکیزہ کا خوب صورت سرورق دیکھ کر ہی دل چاہا کہ تمہیں مبارک باد دوں۔ یہ تو ہونا ہی تھا پڑھ کر بہت مزہ آیا اور خوب صورت منظر نگاری کی وجہ سے ہم بھی اسی ماحول میں پہنچ گئے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ آپ سلسلے وار تحریریں کم سے کم رکھیں۔ صرف دو سلسلے وار ناولز جو قسط وار چلتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری تحریریں قسط وار نہیں ہونی چاہیے۔ شیریں حیدر میری پسندیدہ مصنفہ ہیں مگر ان کا یہ ناولٹ مکمل ناول کے طور پر بھی لگایا جا سکتا تھا۔ ساجدہ حبیب کب آئیں گی۔ اس ماہ کا جلترنگ بھی ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ بہنوں کی محفل اچھی لگی۔“ (آپ کی تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں کہ ہم تو آپ بہنوں کے مشوروں پر ہی چلتے ہیں۔ ساجدہ حبیب جلد آئیں گی چند روز قبل ان سے فون پر بات ہوئی تھی تو انہوں نے وعدہ تو کیا ہے اب دیکھتے ہیں کہ وہ کب تک پورا کرتی ہیں)

مصباح نوشین، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ”اکتوبر کا پاکیزہ جب آیا تو میں نے ٹائٹل دیکھ کر کہا کہ اس دفعہ کی لڑکی بہت پیاری اور معصوم سی ہے۔ بہنوں کی محفل پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ تو باجی کی بہو ہے۔ ہاں باجی آپ سے ایک شکایت ہے آپ نے شادی کے احوال میں تصاویر بہت کم لگائی ہیں۔ ہم عظمیٰ کے بچوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ عمیر اور عظیم کے ساتھ آپ کے شوہر کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ عظمیٰ نے واقعی بے حد دلچسپ احوال لکھا کہ پڑھ کر ہم نے بہت انجوائے کیا بلکہ یہ ٹائٹل اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔ ذکیہ بلگرامی کو سروے میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہم ان کا طویل انٹرویو پڑھنا چاہتے ہیں۔ عنیزہ سید، رفعت سراج کے ناول اچھے لگے۔“ (پیاری مصباح میرے بچوں کی تصاویر آئندہ دیکھ لیجیے گا کہ میری فیملی سے متعلقہ تصویریں لگتی ہی رہتی ہیں۔ ہاں ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو بھی آپ جلد پڑھیں گی۔ اس کے لیے ہم نے ذکیہ بلگرامی سے کہہ دیا ہے)

نور افشاں، کراچی سے۔ ”باجی جب سے پاکیزہ آیا ہے۔ میں ہر بار ٹائٹل دیکھتی ہوں۔ عظمیٰ باجی نے جو شادی کا احوال لکھا ہے وہ میں نے کئی بار پڑھا ہے مگر تصویریں کم تھیں۔ عنیزہ سید کا ناول ٹاپ پر جا رہا ہے۔ افسانوں میں شہناز صدیق، نبیلہ ابر راجا، عطیہ عمر اور رفاقت جاوید کے پسند آئے۔ صائمہ اکرم کی تحریریں بھی مجھے پسند ہیں۔ انہوں نے ابھی اچھا لکھا۔ آپ اپنا ناول یا ناولٹ کب دیں گی؟“ (پسندیدگی کا شکریہ، بہت جلد)

سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ”تقریب میں عدم شرکت کی ساری کسر احوال پڑھ کر پوری ہوگئی۔ رائٹرز بہنوں سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس اپنی جگہ برقرار ہی رہا مگر تصویریں دیکھ کر گزارہ کرنا پڑا۔ دولھا، دلہن بھی بہت پیارے لگے۔ عذرا رسول سے پچھلی بار یعنی عمیر کے ولیمے کی ملاقات نظروں میں گھوم گئی جب وہ مجھے ساتھ لیے سب سے مل بھی رہی تھیں اور ملوا بھی رہی تھیں۔ انہی کے ساتھ میری پہلی بار سکینہ فرخ اور رفاقت جاوید سے ملاقات ہوئی حالانکہ عذرا خود بھی پیاری ہیں مگر کھلے دل سے دوسروں کی تعریف بھی کرتی ہیں۔ میرے لیے تو انوکھی بات یہ تھی کہ مجھے انہوں نے سکینہ فرخ سمجھا تھا اور سکینہ فرخ تو بے حد پیاری ہیں۔ ہائے پرانی یادیں ہی تازہ کرلوں تھوڑی سی۔ نانی سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس بھی ہوا۔ آگے بھابیوں کی اور آپ کی ساڑی کی تعریف پڑھ کر دل سے بے اختیار ہائے نکلی۔ گھبرائیں مت میں کوئی آپ کو نظر نہیں لگا رہی بلکہ یہ ہائے تو اس لیے ہے جو میں اپنے لیے پورا نہ کرسکی اس بار میرا بھی بلیک انڈین ساڑی پہننے کا پروگرام تھا جو وائے افسوس کہ پورا نہ ہوسکا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔“ (چلو کسی دن ساڑی پہن کر میرے گھر آجاؤ)

تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد سے۔ ”انجم آپی آپ کے سمجھانے کا انداز بہت اچھا ہوتا ہے جیسا کہ رازوں کی حفاظت کے متعلق بتایا کہ ہمیں رازوں کی حفاظت اپنی پسندیدہ اشیا سے بڑھ کر کرنی چاہیے اور اداریے میں اپنی بات کم اور دوسرے کی بات غور سے سننے پر زور دیا یہ بات بالکل درست ہے کہ زبان کا استعمال کم اور کانوں کا زیادہ کرکے زیادہ سے زیادہ دوست بناسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرحومین کے لیے جو آپ سورۂ اخلاص پڑھنے کا کہتی ہیں یہ بھی بہت اجر وثواب کا کام خود بھی کرتی ہیں اور ہم سے بھی کرواتی ہیں اس طرح نیکیاں بٹورنے کا موقع ملتا ہے۔ بہنوں کی محفل میں اچھا وقت گزار کر باہر نکلی تو خوش ذائقہ میں مزے مزے کے کھانے کھانے کو ملے۔ آپی سندیسے کا مطلب ہوتا ہے پیغام مگر اس میں لطیفوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ امانت میں رفعت سراج صاحبہ نے تو رابی کی خوفناک حالت کا لکھ کر پڑھنے والوں کو خوف زدہ کردیا اس قدر بھیانک روپ...... یہ مہر جان اتنی ظالم کیوں ہیں یہ پردہ تو رفعت صاحبہ ہی اٹھائیں گی۔ دوسری طرف ستارہ کے ساتھ برا ہونے جارہا ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل میں ردا کے بھائیوں نے انوکھا ہی کیا کہ ماں تک کی بات کا یقین نہیں کرتے اور بھابی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ہر بار آس ہوتی ہے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوتا دیکھیں گے مگر نہ جی کہانی تو ابھی اور ہی روپ دکھاتی جارہی ہے۔ عید سے پہلے رضوانہ پرنس نے بہت خوب اینڈ کیا آزر پر پورا افسانہ پڑھتے ہوئے شدید غصہ آرہا تھا کہ اگر تانیہ اسی طرح کسی مرد کا ذکر کرتی کہ فلاں لڑکا میرے عشق میں کنوارا بیٹھا ہے تو آزر نے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینا تھا اور زندگی سے بھی چاہے وہ جتنا بھی براڈ مائنڈڈ ہوتا مگر افسوس کہ ہمارا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔ سدرہ عدن کی ایسے نہیں بنیا پاکستان پڑھ کر وہ زمانہ جو کہ ہم نے نہیں دیکھا مگر اپنے بڑوں سے سنا ضرور ہے یاد آگیا اگر آج کل کا جوان اس دور کے خون میں لتھڑے نوجوان کا حوصلہ محسوس کرے تو اب بھی پاکستان ترقی کی منازل طے کرسکتا ہے۔ نوشین ناز اختر کا آخری موقع میں بالکل سچ ہے کہ جہاں زبان دراز بہو اپنے لیے مشکلات کھڑی کرتی ہے وہاں خاموش اور صبر کا سمبل بنی بہو کو بھی سسرالی گھر میں جگہ بنانا مشکل ہوجاتا ہے۔ قانتہ رابعہ کی در رحمت کا لبِ لباب یہی تھا کہ ہم نے اسلامی تعلیمات اور مذہب سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ پیاری اماں اور چاندرات بیٹیوں کی ماؤں کو دو مختلف مزاج کے دامادوں میں بیلنس رکھنا کس قدر کٹھن ہوتا ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

شمسہ رضوان، گلستان جوہر سے۔ ”میری امی نشاط فاطمہ (جو تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہم سے جدا ہوگئیں اللہ انہیں جنت نصیب کرے آمین) وہ پاکیزہ کی ایسی قاری تھیں جن کا پاکیزہ گھر کے ہر مہینے کے سودا سلف کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور ہم پڑھتے کم تھے امی کی زبانی سنتے زیادہ تھے خاص طور پر انجم آنٹی کی تحریریں اس عید پر امی سے باتیں کرنے کی خواہش بہت بے چین کررہی تھی سکون نہیں مل رہا تھا کیا کروں۔ بک اسٹال پر بچوں کی اسٹیشنری کا سامان لینے گئی تو پاکیزہ عید مبارک پر نظر پڑی اور بے اختیار ایسا لگا جیسے امی نے کہا عید مبارک...... اگلے ہی لمحے پاکیزہ میرے ساتھ تھا گھر آکر سب سے پہلے جلترنگ اور بہنوں کی محفل پھر مجھے کچھ کہنا ہے جو پڑھنا شروع کیا تو ابھی قسط وار چھوڑ کر ہر چھوٹی بڑی چیز پڑھ لی اور حقیقت میں اتنا سکون ملا کہ بتا نہیں سکتی۔ پاکیزہ کی ہر تحریر ہر صفحے سے میری امی کی خوشبو آتی ہے۔ ہر رشتے کی اپنی اہمیت ہے اللہ ہر رشتے کو قائم رکھے (آمین) مگر ماں کی ممتا انوکھی ہی ہوتی ہے یہ لیٹر لکھتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے آنسو خود بخود رواں ہورہے ہیں پتا نہیں کیوں...... ستمبر کا شمارہ میرے ہاتھ میں آچکا ہے مگر جلترنگ اور پاکیزہ ڈائری کے علاوہ ابھی کچھ نہیں پڑھا۔ یہ اگست کے شمارے کی رائے گو کہ بہت دیر سے تحریر کررہی ہوں اس لیے محفل میں شامل ہو یا نہ ہو مگر پاکیزہ کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض بنتا

ہے جس نے مجھے روحانی سکون بخشا۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو اور آپ کی سب ٹیم کو صحت وزندگی اور ترقی اور ہر طرح کا سکون دے، آمین۔“ (پیاری شمسہ اب تم باقاعدگی سے اس محفل میں شرکت کیا کرنا مجھے دلی خوشی ہوگی)

بشریٰ، ابوظہبی سے۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے میں ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہت ہی لاجواب نصیحت ہوتی ہے اور بہنوں کی محفل کے شروع میں بھی...... امانت اور کہیں دیپ جلے کہیں دل اب بہت سی بہنوں کو اچھا لگ رہا ہے مگر اس میں بہت وائلنس ہے جس کی وجہ سے پڑھ کر گھبراہٹ زیادہ ہوتی ہے خاص کر اس دفعہ رابی کے طریقۂ انتقام سے، بہت سی باغی لڑکیوں کو نئی راہ ملے گی آخر اس میں توازن کیوں نہیں...... پاکیزہ پڑھنے والی ساری لڑکیاں میچور نہیں ہوتیں کچی عمر اور کم عمر لڑکیاں جو تجربے سے عاری ہوتی ہیں وہ اس کے منفی اثرات لے سکتی ہیں۔ قانتہ رابعہ، نوشین ناز اور سائرہ رضا تینوں کی تحریریں دینی نکتہ نظر کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں اس میں قانتہ کی تحریر بہترین تھی کہ بات کو وعظ کے انداز میں بیان کرنے کے بجائے ہلکے پھلکے انداز میں بہترین لکھا سائرہ رضا کا سلوشن نہ صرف موضوع بلکہ تحریر بھی حد درجہ بولڈ تھی اور یہ تحریر پاکیزہ کے لیے مناسب نہیں تھی کچھ باتیں آج کے بے حیائی کے دور میں بھی ڈھکی چھپی ہی اچھی لگتی ہیں۔ عنیزہ اور صائمہ اکرم کے ناول ڈھول بجارہے ہیں ماشاء اللہ تتلی میں یقیناً تتالیہ، سرمد کو پسند کرلے گی۔ مگر روحانی مشورے میں صبر کے فوائد کی مثال بہت ہی بہترین تھی۔“ (سائرہ کی یہ تحریر بہت سے قارئین میں بے حد پسند کی گئی، تبصرے کا شکریہ)

ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ”ضیا اور حنا کی شادی کا احوال عظمٰی کی زبانی بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرا یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی شادی میں شریک تھی۔ اللہ تعالیٰ ضیا اور حنا دونوں کو ہمیشہ دائمی مسرتوں سے ہمکنار کرے، آمین۔ مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح بہت پُراثر رہا۔ خدا ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ سلسلے وار ناول امانت میں رفعت سراج کے قلم کی جولانیاں اپنے عروج پر ہیں۔ کہانی میں اب دلچسپیوں کا گراف بڑھتا جارہا ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل میں قیصرہ حیات نت نئے انداز سامنے لارہی ہیں۔ شمیلہ کا کردار اب سر میں ہتھوڑے کی طرح لگنے لگا ہے۔ شام شہر یاراں فی الحال جگسا پزل بنا ہوا ہے دیکھیں کب حل ہو۔ دیگر تحریروں میں بات تو ٹھیک ہے مگر گردش لیل ونہار، عیب اور جان گئے جاناں بڑی زوردار تحریریں تھیں۔ تتلی کا اینڈ جیسا میں نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا مدتوں یاد رہنے والی عمدہ تحریر تھی لیکن سرمد جیسے مرد کیسے ہوتے ہیں جو قدم قدم پر اپنی تذلیل ہنس کر کرواتے ہوں کہاں پائے جاتے ہیں۔ شائستہ زریں ہمیشہ نت نئے موضوعات کے ساتھ پاکیزہ کو سجاتی ہیں ویل ڈن شائستہ جی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جو کام ہم اپنی چادر میں رہتے ہوئے کسی کا کرسکیں ضرور کرنا چاہیے لیکن یہ نہ ہو کہ آپ کسی کا کام کریں اور بعد میں اس پر احسان چڑھائیں اس سے بہتر ہے کام نہ ہی کریں۔ بہنوں کی محفل میں جاکر زندگی، زندگی لگنے لگتی ہے۔ امینہ عندلیب تو میری ہر دعا میں شامل ہیں۔ ربیعہ حسن نے ایک بہت اہم اور نازک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے۔“ (جی ہاں)

غزالہ عزیز، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کا ہر شمارہ آپ لوگوں کی محنت ولگن اور ذوقِ سلیم کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ شمارے کا معیار تو ہمیشہ سے ہی اعلیٰ ترین ہے۔ مکمل ناول، سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں کا انتخاب بھی بہترین ہوتا ہے۔ بالخصوص عنیزہ سید، رفعت سراج جیسی کہنہ مشق رائٹر کے ساتھ پاکیزہ میں ہر ماہ شامل تمام رائٹرز کی تحریر بہترین ہوتی ہیں۔ عنیزہ سید کا شام شہر یاراں اور صائمہ اکرم کا گمشدہ جنت بہترین جارہا ہے۔ ستمبر کے شمارے کے سلسلے وار اور منی ناول کے ساتھ ناولٹ بھی اس بار شاندار رہے۔ افسانوں میں دھوپ میں بارش، انمول خزانہ بہترین رہے۔ ناولٹ میں سائرہ رضا ہمیشہ کی طرح بازی لے گئیں۔ وہ رائٹرز میں ایک بہترین اضافہ ہیں۔ اس ماہ ستمبر میں بارش، برکھا، ساون کے حوالے سے سروے بہت اچھا رہا۔ تمام رائٹرز اور شاعرات نے اپنے تاثرات وتجربات کو خوب لفظوں سے سجایا۔ اسی طرح کے سروے شامل کرتی رہا کریں۔ باقی تمام سلسلے بھی بہترین ہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ)

ناہید فاطمہ حسنین، کراچی سے۔ ”ان بہنوں کی مشکور ہوں جنہوں نے اس قدر باریک بینی سے مطالعہ کرکے میرے ناول کے مختلف حصوں پر تبصرہ کیا۔ بہن فریدہ جاوید فری کا تبصرہ اس قدر پسند آیا کہ میں دیر تک آنکھیں پھیلائے اور باچھیں چیرے ان کے تبصرے میں گم رہی۔ فریدہ میں نے تمہارا دیا ایوارڈ اپنے دل کے سنگھاسن میں ایسے سجایا ہے کہ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ ربیعہ حسن کے خط میں سیلف ابیوز کا تذکرہ، رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں سوچنے لگی یہ کیا ایسا مسئلہ ہے جو ہم لکھ کر اجاگر کریں یا...... ہم اپنی اولادوں کو بیٹھ کر سمجھائیں کہ یہ ایک قبیح فعل ہے۔ رفعت سراج میری من پسند رائٹر ضرور ہیں لیکن امانت کے گنجلک کرداروں کی وجہ سے اب میں یہ ناول پڑھ نہیں پارہی۔ قیصرہ حیات کی کہانیاں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں پھر ان کا اسلوب بھی لیکن اس بار پڑھ کر وہ مزہ نہیں آیا۔ عطیہ کی کہانی بہت عمدگی سے لکھی گئی تھی۔ عطیہ چھوٹے بڑے

مذہبی مسائل کو بہت عمدگی سے اٹھاتی ہیں۔ خیانت ایک فلمی ٹچ دیتی کہانی تھی۔ عیب اچھے موضوع کی اچھی کہانی تھی سعدیہ کو یا حقیقت سے نظریں چار کرنے کا سبق، کسی اور پر منطبق ہوگیا اور سعدیہ اسی طرح تہی دست رہ گئی۔ زندگی کی سچی تصویر، سچ کی کشش کے ساتھ...... واہ۔ آنٹی جلترنگ بہت اچھا رہا۔ جلترنگ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ صرف انٹرٹین ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر ایک میسج رکھتا ہے۔ عظمٰی بھی بہت عمدگی اور خوب صورتی سے ڈائری سجاتی ہیں اور ان کی محبت نظر آتی ہے۔ انہوں نے شادی کا احوال بھی اچھا لکھا۔ سروے کے تمام جوابات پسند آئے۔ ایک بات واضح کردوں کہ صفحہ نمبر 229 میں نوشین کی ایک نظم ہائیکو چھپی وہ تین مصرعوں کی نظم تھی وہ ہائیکو ہرگز نہیں تھی۔'' (پیاری ناہید تبصرے کا شکریہ میں بے حد مشکور ہوں کہ تم نے شادی کا دلچسپ احوال بھی لکھ کر بھیجا ہے مگر اب بار بار لگانا مناسب نہیں لگے گا۔ انشاء اللہ آئندہ خوشیوں کے بارہا موقع آئیں گے)

امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ''جلترنگ پڑھ کر ہنسی آئی۔ اسکولوں میں یہی کچھ ہوتا ہے سب میں نہیں۔ الماس کے لیے پان، تمباکو، الائچیاں، قوام کی شیشیاں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ میں تو خود ایسے مزے مزے کے مشورے دیتی ہوں۔ اگر کوئی پاؤں ٹیڑھا رکھ کر چلتی ہے میں کہتی ہوں کہ موچی سے ٹیڑھا جوتا بنوالو۔ کسی کے پاؤں کالے سے ہوں برتن دھونے والا کالا صابن دے دو۔ گھاگ قسم کے لوگوں کو ایسے ہی گفٹ دینے چاہئیں۔ خاص طور پر جو دل دکھانے والے ہوں۔ جائے کے پیسے ٹیچرز نہیں دیتیں بالکل آپ نے سوفی صد لکھا انچارج بے چاری بولتی رہتی ہے پیسے دے دو آج پتی ختم ہے، چینی نہیں، ٹیچرز بڑے پیار سے کہتی ہیں کہ کوئی بات نہیں آج آپ اپنے پاس سے دس روپے کی پڑیا منگوالیں۔ پاکیزہ ڈائری بہت پسند ہے۔ باجی میں اکثر گنگناتی ہوں یہ سلسلہ آپ ختم کردیں کوئی اچھا شعر نہیں ہوتا۔ آپ اس کی جگہ دین سے متعلق اچھا سلسلہ شروع کردیں۔ روحانی مشورے سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے۔ شکر کی حقیقت اتنا اچھا لکھا اللہ تعالیٰ ہمیں ہر حال میں شکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ ہماری زبان پر کوئی گلہ نہ ہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، احسانات کا شکر ادا کرتے رہیں، آمین۔ پاکیزہ کی اپنی تمام پیاری قارئین، تبصرہ نگار، رائٹرز، شاعرات بہنوں کی محبتوں، دعاؤں کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ باجی انجم انصار کی محبتوں کے قرض تو مر کر بھی ادا نہیں کرسکتی۔ باجی نے ہمیں ایک گھر میں کیسے رکھا ہوا ہے۔ ہماری تمام بہنیں بے حد خوش مزاج، ملنسار، محبت، ہمدردی کے جذبات رکھتی ہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ بانٹنے والی، حوصلہ دینے والی ہیں۔ خوشیوں میں سب کی خوشیوں کا احساس کرتی ہیں نہ امارت نہ غربت سب کے دل پیار سے معمور ہیں۔ اللہ تعالیٰ میری تمام پیاری بہنوں کو سلامت رکھے، آمین۔ مدیحہ عدنان نے گوجرانوالہ کینٹ سے خصوصی خط لکھا۔ اپنا قیمتی وقت نکالا ورنہ آج کے دور میں کوئی اپنا نہیں پوچھتا۔ پیاری بہن اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ مجھے حوصلہ دیا دعائیں، پریشانی کا اظہار، پیاری بہن میں ان اذیت ناک مراحل سے گزری ہوں۔ اکیلے جانا آنا کبھی ایمرجنسی میں ایڈمٹ، کبھی آکسیجن، دو سال مسلسل اس کرب میں گزرے کئی بار تو ایسا ہوا کہ بس یوں لگا کہ موت سامنے ہے۔ ماں، باپ کی کمی ہر موڑ پر محسوس ہوتی ہے۔ ان دکھ کے لمحوں میں ماں باپ بہت یاد آتے ہیں۔ باجی انجم انصار کو تب پتا چلا ایک رات میری حالت بہت خراب ہوچکی تھی۔ میں نے انتہائی حوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ باجی انجم انصار میری کیئلی، نوشین ساجد لاہور کینٹ مسلسل رابطے میں دعاؤں کے انبار پھر آپ سب بہنوں کو معلوم ہوا یقین کریں سب اتنی پریشان ہوئیں دعائیں، حوصلے، فون پر رابطے، میسج آپ سب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے آج میں ماشاء اللہ بہت بہتر ہوں۔ کچھ تکلیف باقی ہے وہ بھی ٹھیک ہوجائے گی انشاء اللہ۔ معدے کا پرابلم چوبیس سال سے تھا۔ علاج سے ٹھیک ہوسکا۔ اپنی سب پیاری بہنوں کے نام زبانی یاد کرلیے ہیں اور ہر وقت میری دعاؤں میں ہیں جب تک یہ سانس ہے انشاء اللہ دعاؤں میں رہیں گی۔'' (گڑیا تم بھی سب کی دعاؤں میں ہو اور انشاء اللہ جلد کلی صحت حاصل کرلوگی)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں تم ہمیشہ ہی بہت کچھ کہہ دیتی ہو عزت دینے سے عزت ملتی ہے میٹھی زبان اور حوصلہ مندی بہت اچھی باتیں ہیں کاش لوگ اس بات کو سمجھ لیں۔ امانت اتنا متاثر نہیں کررہی کہ باتیں بہت عجیب سی بھی لگتی ہیں رابی جیسی پابندیوں میں جکڑی لڑکی نے مری جانا ہوٹل میں قیام اور اس پرآشوب زمانے میں بخیریت واپسی کیسے ممکن بنائی۔ مہرجان کی یادداشت چلے جانا بھی کچھ اچھا نہ لگا۔ عطیہ عمر نے اچھا لکھا۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل گوارا ہے۔ اب اختتام ہوجائے تو اچھا ہے۔ ہماری یادداشت (جو غلط بھی ہوسکتی ہے) کے مطابق روحیل نے ردا کو طلاق دے دی تھی پھر مصالحت کی کوشش کیسے ہوسکتی ہے (ایک طلاق دی تھی/ عنیزہ سید اچھا لکھ رہی ہیں مگر یہ بات عجیب لگ رہی ہے، میرال نے زرنگار بننا کیوں منظور کیا پہلے وہ مجبور رہی ہوگی مگر اب تو اس کے پاس آزادی کے مواقع ہیں اگر مہرزاد اس کو

برباد کرنا چاہتا تو کیا وہ ہوجاتی غالباً نہیں...... پھر اس ڈیل کا مقصد...... سحر عید قرباں میں عبداللہ کو بہت ہی برداشت والا شوہر دکھایا گیا ہے ایسا نظر نہیں آتا۔ شیریں حیدر کی تحریر سبق آموز ہے...... عیب میں سعدیہ کو جس آسانی سے ملازمت ملی اور فرم کے مالک تمام پرانے ملازمین کو چھوڑ کر ان پر مہربان ہوئے ذرا عجیب سا لگا اور انجام تو ماخوذ لگ رہا ہے معذرت کے ساتھ...... صائمہ اکرم کی گمشدہ جنت کا خوشگوار انجام ہوا۔ بہرحال اچھی تحریر تھی...... پارس پر تبصرہ اختتامی قسط پڑھنے کے بعد کریں گے۔ یہ تو ہونا ہی تھا میں عظمٰی نے جس منفرد اور دلچسپ انداز میں احوالِ شادی لکھا ہے اس سے ایسا لگا کہ جیسے ہم بھی اس میں شامل ہیں اور شرکت نہ کرنے کی کافی تلافی ہوگئی۔ شاباش عظمٰی چشم تصور میں ضیا ڈائپر بدلتے ہوئے اور حنا مسکراتے ہوئے ان کو دیکھتی بہت بھلے لگ رہے ہیں۔ شائستہ زریں کا سروے اچھا لگا۔ عذرا نے اپنی عید ملن پارٹی میں ہمیں یاد رکھا بہت خوشی ہوئی۔ اپنی پیاری بہنوں سے اور منزہ سہام مرزا سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ عذرا سے ایک شکایت ہے ہمیشہ کرسی صدارت پر بیٹھ جاتی ہیں اور بے چارے غریب غربا جو درمیان یا آخر میں ہوتے ہیں وہ بس ان کی صورت ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اب ہم نے اور کئی اور بہنوں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ سے درمیان میں کرسی صدارت رکھی جائے گی۔ واؤ ذیشان کی شادی بہت اچھا خیال ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اور معراج بھائی کو اس کی خوشیاں دکھائے، آمین۔ نیلوفر کے غم میں ہم سب شریک ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ اپنے شریک حیات کے لیے ہم سب ان کے احساسات جاننا اور پڑھنا چاہیں گے...... امینہ عندلیب تمہیں صحت یابی کی طرف بڑھتے دیکھ کر بہت خوشی ہورہی ہے۔'' (آپ پریشان نہ ہوں آئندہ کسی تقریب میں ہم آپ کو عذرا رسول کے برابر بٹھادیں گے آپ چونکہ تاخیر سے آئی تھیں اس لیے آپ کی سیٹ قدرے فاصلے پر تھی)

یاسمین گل، لاہور سے۔ ''سب سے پہلے بیٹے کی شادی کی ڈھیروں مبارک باد اور نیک تمنائیں۔ باجی میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا تھا۔ آپ نے جواب بھی دیا تھا جس کے لیے آپ کا بہت شکریہ...... باجی میں نے پہلے بھی اپنی شاعری بھیجی تھی مگر آپ نے جواب ہی نہیں دیا کہ قابلِ اشاعت ہے بھی یا نہیں۔'' (گڑیا پہلے بھی آپ کی نظم لگادی گئی تھی اس ماہ آپ کی دو نظمیں ملی ہیں وہ بھی شائع ہوجائیں گی)

نیر شفقت، ساہیوال سے۔ ''اگست میں راستے اور منزل پر ان سب بہنوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میری تحریر پسند کی۔ اسی حوصلہ افزائی کی بنا پر ایک اور افسانہ حاضر ہے۔'' (آپ کا افسانہ سانجھے دکھ قابلِ اشاعت ہے)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ ''انجم آپی جی تسی گریٹ او۔ پتا ہے کیوں؟ کیونکہ آپ ہر بار ہمیں زبردست طریقے سے گائیڈ کرتی ہیں۔ ہر بار محفل میں کوئی نہ کوئی ایسی بات یا نصیحت کرکے ہماری ٹیوننگ کرتی رہتی ہیں۔ کوئی عمل کرے نہ کرے الگ بات ہے۔ مجھے آپ کی یہ نصیحت دل کو لگی کہ ہم اپنے پرس میں ہر چیز حفاظت سے اس لیے رکھتے ہیں کہ یہ گم نہ ہوجائیں۔ پر ہم اپنے رشتوں کو جو خون کے ہیں ان کی پروا نہیں کرتے اگر ہم ان کا خیال قیمتی چیزوں کی طرح کریں تو وہ کبھی ہم سے دور نہ ہوں۔'' (زبردست)

سائرہ مشال، کراچی سے۔ ''اتنا اچھا اور معیاری رسالہ نکالنے پر سیلوٹ باقی کہانیوں کی کیا بات کروں بڑی ہو یا چھوٹی رائٹرز سب ہی اچھا لکھتی ہیں تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ویسے آپس کی بات ہے لفظوں کے جوڑ توڑ میں میں ویسے بھی کوری ہوں ہاہاہا...... خیر بہت ہوگیا مذاق اب ہم جو لکھیں گے سنجیدگی سے مطالعہ کریں (آہم) اکیس اگست کو پانچ بج کر پندرہ منٹ پر میری پیاری سی انجم آنٹی سے بات ہوئی فون پر، آنٹی آپ بہت اچھی ہیں خدا آپ کو لمبی عمر سے نوازے، آمین۔ (دعاؤں کے لیے ممنون ہوں، پہلی مرتبہ خط لکھا اور اتنا چنا منا سا...... ارے بھئی ذرا ہمارے ناولوں اور افسانوں کے بارے میں بھی تو رائے دو)

فرحت احمد، کراچی سے۔ ''باجی ستمبر کا پاکیزہ پڑھ لیا ہے، مختصر تبصرہ یہ ہے کہ تمام ناول، ناولٹ اور افسانے مع دیگر سلسلوں کے بے حد پسند آئے۔ خاص کر سرورق سوائے ایک دو افسانوں کے جو کچھ ہلکے لگے۔ باجی یہ خط میں اپنے ایک افسانے کے ساتھ بھیج رہی ہوں، پسند نہ آنے کی صورت میں کوئی بات نہیں۔'' (مگر افسانہ تو پسند آگیا)

مسز اقصیٰ عمران، لاہور سے۔ ''عطیہ عمر کا ناولٹ بھی آج کل کے اس بے حس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جہاں باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی جاتی ہیں۔ اچھی تحریر تھی۔ صائمہ اکرم کا منی ناول بھی اپنے اختتام کو پہنچا مگر ہمیں کچھ نیاپن چاہیے صائمہ جی...... اشیریں حیدر کا تتلی بھی ٹھیک رہا جس میں نتالیہ کو خدا نے بچالیا مگر سچ تو یہ ہے کہ موبائل فون اور فیس بک کے غلط استعمال نے اتنی بے راہ روی پھیلادی ہے کہ نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ جلترنگ میں مختلف پڑھ کر چہرے پر مسکراہٹ آگئی کیونکہ کچھ عرصے پہلے میری بھی گورنمنٹ اسکول میں جاب لگی ہے اور آپ کی

یہ تحریر ہو بہو گورنمنٹ اسکولز کی استانیوں اور وہاں کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اُف......! مجھے لگا بس آپ نے جیسے کسی گورنمنٹ اسکول میں ہی بیٹھ کر یہ تحریر لکھی ہو۔ ویسے ایک بات بتائیں؟ آپ کو یہ سب کیسے پتا......؟'' (ہاں آج سے پچیس سال پہلے میں نے بھی گورنمنٹ اسکول میں پڑھایا ہے اس لیے پرائیویٹ اور گورنمنٹ تمام اسکولوں کے ماحول سے واقف ہوں)

✉ کوثر اعجاز چوہدری، ملیانی ضلع قصور سے۔ ''میں پاکیزہ کی پندرہ سال سے دیوانی ہوں، بلھے شاہ کے شہر قصور کی رہنے والی ہوں، بنیادی طور پر شاعرہ ہوں۔ فریدہ جاوید فری اور فریدہ خانم سے بہت دوستی ہے وہ دونوں میری بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور آپی میں عنقریب اپنی کتاب مکمل کر کے شاعری کے میدان میں باقاعدہ انٹری دینے والی ہوں۔ بلھے شاہ کی نگری سے ایک بیٹی کو خوش آمدید کہہ دیں۔'' (پیاری گڑیا، خوش آمدید، آؤ گلے لگ جاؤ ٹھا کر کے، ہاں اگلے ماہ تمہارا بھرپور تبصرہ آنا چاہیے)

✉ شیریں ظفر، ملتان سے۔ ''انجم آنٹی آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ تمام بہنوں کی محفل سے نیٹ کرا اور اپنا خط چھپا دیکھ کر (پھولے نہ سمائے) دوڑ لگائی کہ عظمیٰ آفاق نے اپنے بھیا جی کی شادی کا جو احوال تحریر کیا ہے وہ پڑھ لوں۔ ابھی تک تو شادی میرے شہزادے کی کا احوال بھی تازہ ہے مگر یقین جانیں عظمیٰ نے اتنا پیارا لکھا کہ میں نے شادی کو خود محسوس کیا، مینیو بھی بہت پسند آئے اور فائر ورکس کا مظاہرہ بھی۔ امینہ عندلیب بہنوں کی محفل میں آپ کا خط پڑھا آپ کی بیماری کے بارے میں بھی کافی عرصے سے جانتی تھی اور انجم آنٹی کا آپ سے جو پیار ہے وہ بھی معلوم ہے مگر آپ پاکیزہ کی محفل اور بہنوں سے اتنا پیار کرتی ہیں مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انسان اتنا لونگ اور کیئرنگ ہو اور اتنی محبت زندگی کا زادِ راہ ہو تو یہ تکالیف کٹ جاتی ہیں۔ اللہ پاک آپ کو صحتِ کاملہ عطا کرے اور اس بیماری سے لڑنے کا حوصلہ بھی۔ (بے شک) مدیحہ عدنان کا مشورہ بہت پسند آیا ہم سب کو امینہ کو خالی خولی دعائیں یا میسجز کی جگہ کوئی عملی قدم بھی اٹھانا چاہیے۔ نمرہ احمد کا پارس سب سے پہلے پڑھا، دلچسپ ہے اور انداز پہلے سے ہٹ کر اچھا لگا۔ فائز ہی فیضان ہے۔ عنیزہ سید کا شام شہر یاراں اس بار قسط سپر تھی۔ مزہ آیا۔ مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ میر ال ہی زرنگار ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور کہانی کی بنت بہت ہی زبردست ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''پاکیزہ ملا جو آپ کے بیٹے ضیا کی دلہن حنا کے ساتھ سجا تھا ماشاء اللہ ضیا اور حنا کی جوڑی چاند اور سورج کی جوڑی لگ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے بیٹے اور بہو کی بھرپور خوشیاں دکھائے، آمین۔ عظمیٰ آفاق نے شادی کا منظر اس طرح سے لکھا کہ ہم بھی اس شادی سے انجوائے کر رہے تھے۔ مجھے کراچی میں رہنے والی رائٹرز اور قاری بہنوں پر رشک آتا ہے کہ کاش میں بھی کراچی میں ہوتی تو شگفتہ شفیق کی طرح شادی میں شرکت کرتی...... مجھے کچھ کہنا ہے آپ نے بے حد اچھا لکھا حمد و نعت ..... پڑھ کر سکون ملا یوں تو سبھی نے بہت اچھا لکھا مگر شیریں حیدر کا مکمل ناول تتلی اور نمرہ احمد کے پارس نے تو کمال کر دیا اتنا اچھا اور مزیدار ناول نمرہ احمد مبارک ہو ویلڈن شیریں حیدر اور نمرہ احمد میری طرف سے دونوں کو مبارک باد پہنچا دیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✉ ثوبیہ صدیق سیما، کراچی سے۔ ''آپ کے ادارے کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ نئے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ اسی لیے آج آپ کی محفل میں حاضر ہوئی ہوں اس امید کے ساتھ کہ شاید مجھے بھی موقع مل جائے۔ ایک افسانہ ارسال کر رہی ہوں حالانکہ میں نے لکھنا شروع کیا تو پہلا ناول لکھا جو 160 صفحات پر مشتمل ہے پھر ایک 500 صفحات کا ناول لکھا لیکن ابھی کہیں بھجوایا نہیں۔'' (گڑیا اس محفل میں خوش آمدید ابھی آپ کا افسانہ پڑھا نہیں ہے)

✉ شہلا نواز، لاہور سے۔ ''کچھ عرصے سے میں پاکیزہ سے دور رہی بس کچھ جمود طاری ہو گیا تھا لیکن اب ٹوٹ گیا ہے آپ نے مجھے بھلا دیا دکھ ہوا مگر آپ کا بھی کیا قصور اتنی ساری بہنیں جو ہیں مگر آپ رمضان المبارک میں بھی طاق راتوں میں بھی میری دعاؤں میں شامل رہیں۔ ضیا کی شادی کی بہت بہت مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ سے نوازے، آمین۔ پاکیزہ ابھی تھوڑا پڑھا ہے اب پہلے سا وقت نہیں رہا، ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں اتنا ٹائم نہیں ملتا حالانکہ ہنوز غیر شادی شدہ ہوں اب انشاء اللہ فارم میں آ گئی ہوں کوشش کروں گی کہ مزیدار سے تبصرے کیا کروں جیسے پہلے کرتی تھی۔'' (گڑیا میں منتظر رہوں گی، ہاں تمہاری پیاری سی تصویر مل گئی ہے)

✉ شاہینہ حسین، لندن۔ ہم جلد ہانڈی تالے والا وظیفہ روحانی مشورے کے کالم میں لگا دیں گے۔ میرے خیال سے میں اسے پاکیزہ میں چار پانچ مرتبہ تو شائع کر چکی ہوں بہرحال یہ صفحات آپ بہنوں کے لیے ہیں اور ہم اسے آئندہ ماہ ضرور لگا دیں گے۔

✉ عائشہ نور، شادی وال، گجرات۔ گڑیا اس محفل میں خوش آمدید پاکیزہ اور ہمیں پسند کرنے کا شکریہ آپ کی انٹری تو

ہو چکی ہے کہ اس ماہ آپ ہماری محفل میں شامل ہو گئی ہیں۔ آئندہ ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے۔ آپ کی شاعری کے بارے میں کچھ یاد نہیں آ رہا...... یوں کریں آئندہ تبصرے کے ساتھ اپنی دوسری نظمیں بھی ارسال کر دیں مگر الگ صفحے پر۔

✉ مسز سنبل ہم آپ کو ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا فون نمبر نہیں دے سکتے، اپنی طبیعت خرابی کے باعث انہوں نے ہمیں منع کر رکھا ہے۔ پاکیزہ کے لیے آپ کی رائے مجھے تبصرے کی صورت میں چاہیے۔

✉ برادرم شوکت، ڈیرا غازی خان۔ یہ بہنوں کی محفل ہے، اس میں بھائی حضرات کے خطوط نہیں لگائے جا سکتے۔

✉ کنول اصغر، کورنگی۔ فوزیہ احسان رانا اور دیگر تمام بہنیں جو ہمیں افسانے ارسال کرتی ہیں ان سب سے میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ آئندہ ماہ سے ہم ناقابلِ اشاعت افسانوں کی فہرست بھی شائع کریں گے۔ ویسے فوزیہ آپ کو تو میں فون پر بتا چکی ہوں کہ آپ کا ایک افسانہ قابلِ اشاعت ہے۔

✉ عتیقہ محمد بیگ، سیالکوٹ سے۔ ''مدیرہ پاکیزہ کا شکریہ کہ میری والدہ کے بارے میں خبر لگائی اور ان تمام قارئین کا شکریہ جنہوں نے تعزیت کی اور میرے ساتھ دلجوئی کا اظہار کیا۔'' (پیاری بیٹی عتیقہ ہم سب کے سکھ اور دکھ سانجھے ہیں اور تم تو میری بیٹی جیسی ہو...... تمہارے ناولٹ کے قابلِ اشاعت کی اطلاع میں پہلے ہی دے چکی ہوں)

✉ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''ناکامی اور کامیابی پر آپ کی مدلل باتیں سیدھی دل میں اتر گئیں۔ اسلامیات مضامین کے بعد رفعت سراج کی امانت پڑھ کر لمحات کو انجوائے کیا۔ امانت نے خاص پلٹا کھایا...... ڈاکٹر مہر جان کی دماغی حالت کی اس چویشن میں جانے اب کیا ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ روما اور رابی کے لیے راستے صاف ہو گئے ہیں۔ ستارہ کا ستارہ اب مدار میں گھومے گا...... اصیل خان اور گل جان کے بارے میں الجھاؤ برقرار ہے، شاہ عالم جیسے بزرگ خال خال پائے جاتے ہیں۔ عطیہ عمر نے حسبِ معمول درس دیا۔ قیصرہ حیات دلچسپی سے ناولٹ کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ شمیلہ کی حرکتوں پر بے حد غصہ آتا ہے کہ وہ کسی کے قابو میں بھی نہیں آتی، خیانت، مصباح نوشین نے خوب لکھی۔ ایک وفا شعار بیوی کی وفا اور عزت کی کہانی...... شام شہر یاراں کی کیا بات ہے، اس بار صفحات بہت کم تھے، یہ ظلم ہے، ایمان کی چپقلش پر عنیزہ سید کی وضاحت قابلِ عمل لگی۔ بہرحال اس کہانی نے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لی ہے، گردشِ لیل و نہار محبتوں کی تحریر تھی، رفاقت جاوید نے ایک ضدی اور انا پرست لڑکی کی تربیت اچھے انداز میں کی۔ عبداللہ کمال کا صابر مرد تھا، تتلی کا دوسرا حصہ انٹرنیٹ کی موجودگی اور فوائد سمجھا گیا۔ آخر کو وہی کالا دلدار بن گیا۔ راحت وفا نے چشمے کو موضوع بنا کر کارآمد تحریر لکھی، اب تو ہر دوسری لڑکی اس کے بغیر ادھوری ہے، صائمہ اکرم کی گمشدہ جنت اپنے خوب صورت اختتام کو پہنچی۔ نبیلہ ابر راجا کی جان گئے جاناں انتہائی فضول اور حقیقت سے قطعی دور تحریر لگی۔ پلیز ایسی بے مقصد اور بے معنی تحاریر لگانے سے گریز کیا کریں جو پاکیزہ کا معیار خراب کریں، نمرہ احمد کے پارس کی کیا تعریف کروں ویسے تو یہ تحریر جاسوسی ڈائجسٹ میں چھپنے کے لائق بھی مگر چلیں اس میں بھی سج گئی، نمرہ نے دلچسپ انداز میں شروع کی۔ اب فیضان کے رازوں سے پردہ اٹھانے کی ضرورت ہے، پارس کا کردار بھی مخفی ہے، پارس کا فرش سے عرش تک آنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ شائستہ کا سروے بھی لاجواب رہا۔'' (تبصرے کا شکریہ...... گڑیا ہر بہن کی پسند ناپسند مختلف ہوتی ہے آپ کو نبیلہ کی تحریر اچھی نہیں لگی دیگر بہنوں کو وہ بہت اچھی لگی اور ہمیں سب کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے)

☆ خطوط کی محفل میں سب سے اچھا خط آپ کو کس کا لگا۔ یہ ہمیں ضرور بتائیے گا اور یہ بھی کہ ہم دین کے صفحات میں کیا اور کیسی نئی تبدیلی کریں یا نہ کریں۔ اب آئیں ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔

یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔

یا ربّ العالمین تو مجھ سے، میری آل اولاد سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔ آمین ثم آمین۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

اے خدا میرے خدا تو خالقِ کون و مکاں
ذرّہ ذرّہ کررہا ہے تیری قدرت کا بیاں
کون سی شے ہے جو ہو پوشیدہ تجھ سے اے خدا
ہرطرف تیری نظر ہے ہر جگہ تو ہے عیاں
ذہن میں جو بات آئی ہے وہ چھپ سکتی نہیں
جانتا ہے تو سبھی کچھ، کچھ نہیں تجھ سے نہاں
اے خدا نظروں کی چوری بھی پکڑ لیتا ہے تو
ہم گنہگار شریعت بچ کے اب جائیں کہاں
بخش دیتا ہے اگر توفیقِ توبہ ہو نصیب
تیری ہی رحمت تلے آباد ہے سارا جہاں

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

نعتِ رسول مقبول ﷺ

طیبہ کی خاکِ پاک کا شیدائی ہے یہ دل
کتنی بلندیوں کا تمنائی ہے یہ دل
آباد کر رکھا ہے فقط آپ ﷺ نے اسے
ورنہ تو ایک خطۂ تنہائی ہے یہ دل
جھولی میں اس کی خاکِ شفا ڈال دیجیے
جویندۂ نشانِ مسیحائی ہے یہ دل
ہر سمت اس کو آپ ﷺ کا جلوہ دکھائی دے
گویا شہیدِ لذتِ یکتائی ہے یہ دل
شبنم کا قطرہ برتوِ خور سے فروغ گر
ناچیز لیکن آپ ﷺ کا شیدائی ہے یہ دل

شاعرہ: شبنم شکیل

مرسلہ: صبا نور، لیہ

کیسے پائیں گے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا۔
میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے، لوگ انہیں دوسری چیزوں میں تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

☆ میں نے اپنی رضا کو مخالفتِ نفس میں رکھ دیا ہے۔ لوگ اسے موافقتِ نفس میں تلاش کرتے ہیں۔
بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

☆ میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔
بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

☆ میں نے علم وحکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے۔ لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں۔
بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

☆ میں نے تونگری کو قناعت میں رکھ دیا ہے۔ لوگ اسے مال میں تلاش کرتے ہیں۔
بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

☆ میں نے عزت کو اپنی اطاعت میں رکھ دیا ہے۔ لوگ اسے بادشاہوں کے دروازوں پر تلاش کرتے ہیں۔
بھلا وہ کیسے پائیں گے؟ (مسلم)

مرسلہ: اینہ عندلیب، سلانوالی

درود شریف

اگرچہ ہزاروں افراد مختلف مقامات پر ایک ہی وقت درود شریف پڑھ رہے ہوں ان سب پر فرداً فرداً بیک آن درود کی توجہ کا منعکس ہونا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے اور نہ کوئی مشکل امر ہے، چراغ اگر چھوٹا ہو تو اس کی روشنی پھیلانے کے لیے اسے ایک کمرے سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں پہنچانے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن سورج کی شعائیں ہر جگہ بیک وقت یکساں طور پر بہ آسانی پہنچتی رہتی ہیں شرط صرف اتنی ہے کہ رخ سورج کی جانب ہو۔

شہاب نامہ سے اقتباس

مرسلہ: اُم ایمان، کوٹ چھٹہ

خواہش

کاش کوئی رات ایسی پاؤں
سپنے میں کعبۃ اللہ جاؤں
ساری رات طواف کروں
ساری رات قیام کروں
غلاف کعبہ کو میں چوموں
زم زم سے میں خود کو دھولوں
سجدے میں، میں یوں گر جاؤں
پھر نہ کبھی میں سر کو اٹھاؤں
تیرے ذکر سے روشن اپنے
روز وشب، دن، رات کروں
کاش یہ سپنا سچ ہو جائے
میرا بلاوا بھی آجائے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

تیرے نام

عید کی خوشیاں تیرے نام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
ہوش اڑائے جیون شام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
ہاتھوں میں مہندی کی آگ عرش سے اونچے تیرے بھاگ
پیار کے خالص تجھے پیام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
جو رنگ پہنے سج جائے، جو دیکھے ششدر رہ جائے
خاص ہو کوئی یا کہ عام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
روپ کا کندن دہکا دہکا حسن کا جادو مہکا مہکا
نین کٹورے بہکے جام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
بانہوں میں چوڑی کی کھن کھن، پیروں میں پائل کی چھن چھن
یکجا ہو جائیں راگ تمام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
پھول تیرے قدموں سے کھیلیں دوست بلائیں تیری لے لیں
چین ہوں حاصل تجھے دوام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
خوشبو تیرے سنگ سنگ گھومے بکھری لٹ پہ ماتھا چومے
اندھیارے ہوں دور تمام، کاش کہ اب کے ایسا ہو
دل سے نکلی ہر ہر آس پوری ہو اور بجھ جائے پیاس
عالی کے میٹھے پیغام، کاش کہ اب کے ایسا ہو

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

عید

درد دل کا بڑھا گئی ہے عید
بن ترے پھر سے آگئی ہے عید
تیرا چہرہ بھی بہہ گیا اس بار
مجھ کو کتنا رُلا گئی ہے عید
تیری باتوں کی تیری یادوں کی
گھر میں شمعیں جلا گئی ہے عید
دیکھ کے حال ہنستی ہیں سکھیاں
مجھ کو پاگل بنا گئی ہے عید
فاصلے تو مٹانے آئی تھی
فاصلے کیوں بڑھا گئی ہے عید
شعر لکھنے لگی ہے تمثیلہ
اس کو شاعر بنا گئی ہے عید

مرسلہ: تمثیلہ لطیف، جوڑھالہ

انٹرویو کارنر

پاکیزہ سے واسطہ چار ماہ پہلے ہوا۔ پہلے کبھی پاکیزہ کیا کوئی ڈائجسٹ نہیں پڑھا پر میری دوست جبیں ہاشمی نے پاکیزہ کی اور پاکیزہ کی ٹیم کی اتنی تعریف کی کہ میرا ایک کان ہی بند ہوگیا۔ دوسرا کان بند ہونے کے خوف سے میں نے دل پہ ہاتھ رکھ کے پورے ساٹھ 60 روپے کا رسالہ منگوایا۔ (کنجوس ہوں ناں) جیسے ہی پڑھنے بیٹھی پڑھتی گئی، پڑھتی گئی، پڑھتی ہی گئی۔ اب تو ایسا چسکا پڑا ہے کہ پورا مہینہ انتظار شروع...... کیا جادو کر دیا ہے اس ڈائجسٹ نے یار۔ اب تو ہم پورے کے پورے انجم انصار صاحبہ کے ہوگئے ہیں۔ واقعی یہ زبردست ہے میری طرح...... ہے ناں...... میں ثوبیہ ارشاد ہوں، میرا تعلق جام پور ضلع راجن پور سے ہے۔ گھر والے ثوبی کہتے ہیں۔ جبیں ہاشمی کی جان ہوں، میری عمر 25 سال ہے (اصلی والی) تعلیم بی اے ہے۔

پنجاب پبلک اسکول کی ہیڈ ہوں، ہم چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ ہم بہن، بھائیوں کا آپس میں بہت پیار ہے، خاص کر چھوٹی بہن میں میری جان ہے، لوگ کہتے ہیں کہ میری مسکراہٹ بہت اچھی ہے، پر جبیں کا کہنا ہے کہ تیری آنکھیں زبردست ہیں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ ہر کوئی مجھ سے خوش رہے۔ کسی کا دل نہیں توڑتی، میں بچپن سے ہر ایک کا خیال رکھتی ہوں۔ دوسروں کو سکون دیتی ہوں اور خود کو سکون گھر کے کونے والے چھوٹے کمرے میں ملتا ہے۔ کھانے میں جو بھی پکا ہو کھا لیتی ہوں، سادہ دل ہوں، سادہ دل لوگ پسند ہیں، کلر ریڈ، بلیک، سی گرین، اورنج پسند ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ دعا سے قسمت بدل سکتی ہے، اس لیے دعا مانگتے رہو۔ میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہوں۔ محبتیں بانٹنے والی لڑکی ہوں، اپنا دکھ کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔ دسمبر پسند ہے، دسمبر کی بارشیں اداس کر دیتی ہیں۔ بہار کا موسم بھی پسند ہے۔ پھول اور پھول جیسے بچے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ شعر و شاعری بھی پسند ہے۔ اپنی دوستوں سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آج میں جو کچھ ہوں اپنی ماں کی دعا سے ہوں۔ ہمارے والدین کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر رہے، آمین۔

غزل

رات کی تنہائی ہو اور آنکھ بھر آئی ہو
ہو سکتا ہے چپکے سے یاد اُن کی آئی ہو
غم دل میں پلتا ہے، کچھ لب سے نہیں نکلتا ہے
نام زباں پر لاتے نہیں محفل میں کہیں نہ رسوائی ہو
کچھ تیور اُن کے اکھڑے تھے کچھ تھوڑے ہم بھی اکڑے تھے
دیکھتے ہیں انا کی اس جنگ میں جانے کس کی پسپائی ہو
ہر زخم خود ہی سہتے ہیں، انجانی آگ میں جلتے ہیں
قہقہوں کی قبا اوڑھے ہیں، کہیں دکھوں کی نہ رونمائی ہو
کس سے دکھ کو بانٹیں ہم، کس کے کاندھے پر روئیں ہم
جب آگ لگانے والا ہی خود محو تماشائی ہو
جب لفظ ان کے بے باک ہوئے خلوص کے ناتے چاک ہوئے
اب شاید ہی اس دل کے آنگن میں کبھی ان کی پزیرائی ہو

کلام: شمائلہ سہیل، کراچی

اسے کیا کہیے

ایک موٹر کار والے نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح سامنے چلنے والی موٹی عورت کو بچا لے لیکن جب وہ ناکام رہا تو اس سے ٹکراتے ہوئے گاڑی روک لی۔ موٹی عورت بلبلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور چلانے لگی۔

"کیا تم میرے گرد گھوم کر نہیں جا سکتے تھے۔"

موٹر کار والا بولا...... "گھوم کر تو چلا جاتا مگر کیا کروں، اتنا پٹرول ہی نہیں تھا۔"

مرسلہ: ڈولی مسرت، دبئی

اے محبت

اے محبت
تجھے بددعا ہے کہ
کاش تجھے بھی
کسی سے محبت ہو جائے
تو دھوکا کھا جائے
ٹھوکریں کھائے
میری طرح اجڑ جائے
کسی کو دکھ نہ بتا پائے
پھر میں تجھ پر ہنسوں
تیرا ظلم یاد دلاؤں
تو نظر نہ ملا پائے
میرے قدموں میں گر جائے
اور رو کے معافی چاہے
پھر ہمیشہ کے لیے
اس دنیا سے چلی جائے
اور ہم جیسے دل جلوں کی
جان چھوٹ جائے
اور پھر کوئی نہ کرلائے

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور



جلترنگ

انجم انصار

میں کی کراں......؟

بات شاید دس بارہ سال پرانی ہوگی...... کراچی سے آئی ہوئی ہماری ایک مہمان اپنا بڑا سا پاندان ہمارے گھر بھول گئیں۔ میں نے انہیں فون کر کے کہا...... "خالہ جان آپ کی پٹاری کو میں کسی آتے جاتے کے ہاتھ کراچی بھجوادوں گی...... یہاں احباب میں کوئی اس شوق سے دلچسپی نہیں رکھتا ہے...... میرے لیے تو... آپ کی پٹاری کو سنبھالنا بھی مشکل لگ رہا ہے۔"

"میں نے اب پان کھانا چھوڑ دیا ہے۔" خالہ جان نے جواباً کہا۔

"تو کیا آپ اپنی بندوق اس لیے ہمارے گھر چھوڑ گئی ہیں کہ خود فائر نہ کر سکیں...... اور ہم اس کا ٹریگر دبانے میں لگ جائیں؟" میرا شکوہ برحق تھا۔

"ارے بیٹی احسان ماننے کا تو اب زمانہ ہی نہیں رہا ہے...... میں تو اپنا پاندان جان بوجھ کر تمہارے گھر چھوڑ آئی ہوں کہ تمہارے گھر کوئی پان کھانے والا آئے تو اسے کوئی پریشانی نہ ہو...... اور تمہاری بے عزتی نہ ہو۔"

"اس میں میری بے عزتی کہاں سے آ گئی...... اگر میں پان نہیں کھاتی، تو مجھے کس کتے نے کاٹا ہے کہ اپنے گھر میں پاندان سجا کر رکھوں۔" غصہ تو مجھے آنا ہی تھا۔

"اُفوہ...... فری کا پاندان ملنے پر بھی تم برہم ہو...... یوں کرو کہ اسے سجا کر تو رکھو پھر دیکھنا تمہیں کتنا اچھا لگے گا۔"

میں بھی ان خالہ کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ گئی اور وہ بڑا سا پاندان، کتھے، چونے، الائچیوں اور پان سے بھر لیا...... اور اپنے لاؤنج میں رکھ لیا۔ جاب کرنے والی فیملی کے ہاں تو مہمان یوں بھی آنے سے کتراتے ہیں کہ وہاں جا کر انہیں خود بھی کام کرنا پڑ جاتا ہے بلکہ بعض کو تو اپنے گھر سے زیادہ دوسرے کے ہاں کام کرنا پڑتا ہے۔ تو وہ پاندان...... میرے اپنے استعمال میں آنے لگا، شروع شروع میں تو پان ناشتے کے بعد کھانے لگی اور ایک دو ٹکڑے رات کے کھانے کے بعد لینے لگی مگر جب اس کا نشہ لگ گیا تو اپنی جاب پر جاتے وقت ڈبے میں دس پان کی گلوریاں بنا کر لے جانے لگی...... اور اس کے اثرات یہ نکلے کہ میرے دانت سرخ قندھاری انار جیسے ہو گئے کہ کتھے کا رنگ دائمی سا چڑھ گیا...... اور پھر رفتہ رفتہ منہ میں سوجن اور مسوڑھوں میں تکلیف ہونے لگی اور جب دانتوں کے علاج کا خرچہ ماہانہ بجٹ کو زخمی کرنے لگا...... تو غصے میں آ کر میں حیدرآباد والی نند کے ہاں اپنا پاندان قصداً چھوڑ آئی اور اس کے فون آنے پر...... ویسے ہی جملے ادا کیے جیسے جب خالہ جان اپنا پاندان میرے ہاں چھوڑ کر گئی تھیں تو انہوں نے میرے سر پر اپنی احسان کی ٹوپی دھرتے ہوئے کہا تھا۔ خیر میری لالچی نند خوشی خوشی مان بھی گئیں...... مگر اب پریشانی یہ ہے کہ میری ایک مہمان اپنا بیوٹی بکس میرے گھر بھول گئی ہیں اور میرے فون کرنے پر انہوں نے کہا ہے کہ بھابی اسے آپ استعمال کر لیجیے۔ بیوٹی بکس، پاندان کی طرح کھلتا ہے، اب میں روزانہ شام کو اس کے ہر خانے میں سے کچھ نہ کچھ نکال کر استعمال کرتی ہوں۔

میاں، بچوں نے پہلے مذاق اڑایا مگر اب وہ لوگ بھی عادی ہو گئے ہیں اور مجھے تو اپنا آپ بہت ہی اچھا لگ رہا ہے مگر میرے دل میں ایک خوف سا ہے...... اگر اس میک اپ کے اثرات...... میرے چہرے پر...... خدانخواستہ غلط ہو گئے تو میں یہ اپنا بیوٹی بکس کسی رشتے دار کو تو ہرگز نہیں دوں گی۔ (اتنا دل ہی نہیں ہے) تو پھر میں کیا کروں گی...... اس خوب صورت بیوٹی بکس

کا؟ آپ بتائیں ناں...... اسے کسی اندھے کنوئیں میں پھینکا جائے، سمندر کی لہروں کو گفٹ کیا جائے، عیٹی جیٹی کے پل سے خودکشی کروائی جائے یا پھر...... اپنی اس عزیزہ کے گھر واپس بھیجتے ہوئے کہا جائے۔

"لو بھئی اپنا بیوٹی بکس سنبھالو...... ہم سے کسی کا احسان نہیں سہا جاتا۔ بتایئے ناں...... ؟میں کی کراں......؟"

کیسے کیسے غم ہیں ہمارے

حقیقت یہ ہے کہ میں اتنی کوتاہ قد نہیں ہوں جتنا کہ لوگوں نے مجھے سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ میں فرناز عرف فرو...... چار فٹ سے چند انچ ہی کم ہوں گی مگر اب لوگوں کے لہجے اور آوازیں مجھے ڈسا کرتے ہیں، ایسے میں دل تو یہی چاہتا ہے کہ ناگن ڈانس رچا کر پلٹ کر ان سب کو میں ڈس لوں مگر ایسی بے غیرتی میں کہاں لا دکھتی ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے...... روزانہ المیہ گیت سن کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روتی رہوں۔

اب غصہ آنے کی تو بات تھی کہ امریکا سے آئے ہوئے کزن ہمارے گھر ٹھہرے ہوئے تھے اور عشق لڑانے دوسرے گھروں میں جایا کرتے تھے۔

"میرا بچہ آج کل اپنے لیے لڑکی دیکھ رہا ہے۔" ان کی والدہ...... ہمارے گھر ناشتے میں تین پراٹھے، لسی کا جگ ڈکار کر ہنس کر کہا کرتیں۔ جب گھر میں، میں موجود تھی تو انہیں باہر جانے کی ضرورت کیا تھی۔ مانا کہ وہ ساڑھے چھ فٹ کا تھا مگر جس کے پاس جو چیز ہو، اس کو اس چیز کی تمنا کبھی نہیں ہوتی، یہ میں نہیں دانشور کہا کرتے ہیں۔

میری بڑی آپا نے کہا تھا کہ گورے لڑکے، کالی لڑکی پسند کرتے ہیں، کالے لڑکے کو ہمیشہ گوری لڑکی کی چاہ ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے یہ سوچا ان کی آئیڈیل بھی یقیناً کوئی چھوٹے قد کی لڑکی ہوگی۔

تب میں نے سارے افسانے، ناول گھول کر پی ڈالے کہ کس طرح افسانوی ہیروئن، ہیرو کو ڈاج دے کر اپنے قابو میں کر لیتی ہے تب میں نے کوئی چیز اٹھانے کے بہانے اپنی سوا دو گز کی چوٹی (بے شک مصنوعی ہی سہی) اس کے چہرے پر دے ماری مگر وہ سخت پتھر تھا مجال تھی کہ چونک کر مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا (جیسے افسانوں کے ہیرو دیکھا کرتے ہیں) یا کبھی اپنے سینے پر ہاتھ باندھ کر، گاڑی سے ٹیک لگا کر اپنی مونچھوں تلے مجھے مسکرا کر دیکھا کرتا (حوالے کے لیے تمام ڈائجسٹوں کے افسانے دیکھے جا سکتے ہیں) میں اپنی کتابیں لے کر اس سے ٹکرائی...... اس نے کسی فلمی ہیرو کی طرح کتابیں بھی سمیٹ کر نہیں دیں بلکہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا اپنے کمرے میں گھس گیا اور میں نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے اور وہ کنارے تک بھی نہیں آیا۔ آخر تھک ہار کر پرانی فلموں کے اس نسخے پر عمل کیا کہ جب ہیروئن کالے لباس میں رقت بھرے لہجے میں، خوشبو بھرا خط ہیرو کے ہاتھ میں دے کر کہتی ہے۔

"آپ اسے میرے جانے کے بعد پڑھیے گا...... اس خط میں میری جان ہے۔" تب انہوں نے بھونچکا ہو کر ایک نظر میرے سراپے پر ڈالی اور دوسری نظر گلابی مہکتے ہوئے خط پر۔

"ارے چھوٹی تم بھی......" وہ لفافہ خط سمیت چرمر کر کے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے بولے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

اور مجھے ذرا بھی نہیں لگا کہ وہ امریکا سے آئے ہیں۔ ایک تو یہی صدمہ کم نہیں تھا کہ انہوں نے میرا خط نہیں پڑھا تھا مرے پر سو درے کہ چھوٹی بھی کہہ دیا تھا...... گڑیا بھی تو کہہ سکتے تھے اور رانی بھی تو...... اب میں ان سے کیا کہتی...... آخر وہ ساڑھے چھ فٹ کے تھے تو اس کا یہ قطعی مطلب نہیں تھا کہ ان کی زندگی میں کسی چھوٹی چیز کی جگہ ہی نہیں تھی یا میرا قد اگر بالفرض چھوٹا بھی ہے تو میرے خواب بھی بونے، بونے سے ہوں گے۔ شاہد امریکا سے اس لیے آئے تھے کہ پاکستان میں شادی کر کے اپنی دلہن کو بھی امریکا لے

جائیں گے۔ پورے خاندان کی لڑکیاں ہر روز چالیس پچاس سنگار کر کے شاہد سے ملنے آ رہی تھیں۔

میرا خط تو انہوں نے پڑھے بغیر ہی پھینک دیا تھا۔ نادان دل یہ سمجھا کہ شاید وہ سمجھے ہی نہیں ہوں گے۔

پھر بڑے ماموں نے شاہد کے اعزاز میں ایک گرینڈ پارٹی کی جس میں سارے خاندان کو ہی بلایا۔

میں بھی سب کی دیکھا دیکھی سلیولیس بلاؤز اور نیچی سی ساڑی پہن کر چلی گئی۔ بازوؤں اور کمر پر مہندی کی بیل بھی بنوا لی (فیشن کی الف ب سے تو میں بخوبی واقف رہتی ہوں) انڈین فلموں کی دیکھا دیکھی ناف پر ایک چمکدار سا نگ بھی چپکا لیا۔ مجھے اس رنگ میں دیکھ کر ساری کزنز ہنسنے لگیں...... ہی ہی...... ہو ہو...... یقیناً ان سب کو میری ساڑی اچھی لگ رہی تھی اور وہ دل میں کلس رہی ہوں گی کہ ایسا ڈریس وہ کیوں نہیں لائیں کہ ساڑی ایسا لباس ہے جو چھوٹی اور لمبی سب ہی لڑکیوں پر اچھا لگتا ہے۔

تقریب میں شریک تمام لڑکیاں اتنی ہی بنی سنوری تھیں کہ پہچاننے میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہاں جا کر علم ہوا کہ آج شاہد کی اماں اپنے بیٹے کے لیے دلہن کا انتخاب بھی کریں گی۔

راحیلہ، عنبر، شبانہ اور نورین نے اپنے اپنے پرس سے شیشے نکال کر اپنی لپ اسٹک ڈارک کرنی شروع کر دی اور میں ایک چھوٹے سے اسٹول پر کھڑی ہو گئی کہ اونچی ہیل کی سینڈل نے بھی کوئی تیر نہیں مارا تھا۔

دیگر شریکِ محفل شاہد کی ماما کو دیکھنے لگے جو اپنے چہرے کے کرخت کٹاؤ کے باوجود سب کو بہت نرم دل نظر آ رہی تھیں اور پھر شاہد نے بھی سب کو حیران کر دیا کہ اگلے جمعے کو وہ شادی کر رہے ہیں کہ ان کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں اور وہ اپنے ساتھ ہی اپنی دلہن کو لے کر جائیں گے ان کا جاب ویزا کچھ اس نوعیت کا ہے کہ جھٹ شادی ہوگی اور دلہن امریکا میں ہوگی۔

اب چند لمحوں کے لیے سب لڑکیوں نے اپنی، اپنی آنکھیں میچ لیں کہ اتنا لمبا سفر طے کرنا آسان کہاں ہوتا ہے اس سمے سب ہی کے چہروں پر قوسِ قزح چھائی ہوئی تھی۔

"آخر کس سے کرو گے شادی؟" لڑکیوں کی مائیں ایک آواز میں کسی نعرے کی طرح بولیں۔

"فرو سے۔" شاہد نے انتہائی چاہت سے کہا اور میں خوشی اور حیرت سے نڈھال ہو کر اسٹول سے نیچے لڑھک گئی کہ آخر میری کوئی نہ کوئی ترکیب ان پر کارگر ہو ہی گئی تھی۔

"اُف ہائے، توبہ...... آپ چھوٹی سے شادی کر رہے ہیں؟" کی آوازیں ملال کے ساتھ تعزیت بھی کرنے لگیں۔

"نہیں بھئی۔" شاہد کی اماں نے اکتا کر مجھے دیکھا اور یہ سب بھول گئیں کہ میں روز رات دو، دو گھنٹے ان کے پیر دابا کرتی تھی۔ ظالم کہیں کی!

"تو پھر کون سی فرو......؟" موٹی فرحانہ نے اپنا چہرہ یوں شرما کر اپنے دونوں موٹے، موٹے ہاتھوں میں چھپا لیا جیسے کہ لاٹری اسی کی نکل آئی ہو۔

ان کی اماں نے سرعت سے سو روپے کے نوٹ سے بیٹی کا صدقہ اتار کر واپس نوٹ اپنے گریبان میں رکھ لیا۔

"ڈیفنس والی فریال......" شاہد کی اماں نے اپنی نند کی بیٹی کی ڈائمنڈ بھری انگلیوں کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا جو سال میں چار دفعہ امریکا جاتی تھی جس کے پاس پہلے سے ہی وہاں کی نیشنلٹی تک تھی جس کے لیے امریکا کوئی عجوبہ بھی نہیں تھا۔

"ہونہہ...... رہے وہی لکیر کے فقیر...... اپنی کلاس سے اتر کر دیکھنا ہی نہیں آیا۔ تم سے اچھے یہ فلموں...... ڈراموں اور افسانوں کے ہیرو ہیں جو ماسی تک کو ملکہ بنا دیا کرتے ہیں۔" میں بڑبڑا رہی تھی...... اور حیرت کی بات یہ تھی کہ میری اس بات کی تائید میری ساری کزنز کر رہی تھیں...... یا ہم سب کا غم ہی ایک تھا...... ہائے......!

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆عرشیہ جنید.....کراچی
مانا کہ بزمِ حُسن کے آداب ہیں بہت
جب دل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی

☆نفیسہ آرا.....راس الخیمہ
مجھ سے مت پوچھ مرے حسن میں کیا رکھا ہے
سوز کو ساز کے پردے میں چھپا رکھا ہے

☆سائرہ مشال.....مقام نامعلوم
سبز جنگل کے پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت لے آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں
گم بھی ہو سکتے ہیں ہم تاریخ کے اوراق میں
مل بھی سکتے ہیں پر تازہ فسانوں میں کہیں

☆نگہت آصف.....اسلام آباد
کڑے سفر کا تھکا مسافر، تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کر لیں، ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

☆پروین افضل شاہین.....بہاول نگر
خواب کو اِک حقیقت سے کہیں جوڑ دیا
ہم تجھے چھوڑ نہیں سکتے تھے پر چھوڑ دیا
ہم تو دریا تھے کسی سمت تو بہنا تھا ہمیں
کیا خبر کس نے تیری سمت ہمیں موڑ دیا

☆نزہت جبیں ضیا.....کراچی
ہے اختیار میں تیرے تو معجزہ کر دے
وہ شخص میرا نہیں ہے اسے ہرا کر دے
یہ انتظار کہیں ختم ہی نہیں ہوتا
ذرا سی دور تو رستہ ہرا بھرا کر دے

☆ہما یاسمین.....راول پنڈی
غم کی طویل شب کی ہے رُوداد مختصر
خاموش شمعِ عمر ہوئی اِک فغاں کے ساتھ

☆صائمہ سجاد بخش.....کوہاٹ
فاصلے ضروری تھے رنجشیں مٹانے کو
پر قربتوں کا لمحہ بھی، زندگی کا حاصل تھا

☆فصیحہ آصف خان.....ملتان
کہاں کہاں سے مٹاؤں نقش تیرے
قابض ہے تُو دل کے گوشے گوشے پہ

☆سیما ممتاز عباسی.....لاڑکانہ
چلو عہدِ محبت کی ذرا تجدید کرتے ہیں
چلو تم چاند بن جاؤ، ہم پھر سے عید کرتے ہیں

☆کائنات عبدالحلیم.....میر پور خاص
کھلکھلاتی اب کے اپنی عید نہ تھی
پھر تیرے نہ آنے کی یہ امید نہ تھی

☆ماہ نور قیصر.....راول پنڈی
بے گھروں پہ کیا گزرتی ہے اس شہر میں
سرد راتوں میں کبھی تم گھر سے باہر دیکھنا

☆فرحت احمد.....گلشن حدید
کوچہ عشق میں اِک عمر پھرے خاک بسر
تب کہیں جا کے ہم اس آنکھ میں تصویر ہوئے

☆ارم کمال.....فیصل آباد
کس قدر انوکھا ہے رابطہ محبت کا
کب نہ جانے ہو جائے معجزہ محبت کا
اپنی ذات سے بھی وہ اجنبی سا لگتا ہے
جس کے ساتھ ہو جائے حادثہ محبت کا

☆فضہ بتول.....بہارہ کہو
سفر میں دھوپ تو ہو گی جو چل سکو تو چلو
سبھی ہیں بھیڑ میں، تم بھی نکل سکو تو چلو

☆غزالہ شاہد.....کراچی
اس شہر کے اجڑے دامن میں کچھ جیون کے دن بیت گئے
وہ راتیں گئیں، وہ باتیں گئیں، سُکھ ہار گئے، دکھ جیت گئے

☆غزالہ طارق.....سرگودھا
محبت خوب صورت خامشیوں کی دیپ مالا ہے
یہ وہ اقلیم ہے جس میں اجالا ہی اجالا ہے

☆ثوبیہ ظہور.....اٹک
طفولیت میں ہے انسان مبتلا اب تک
کسی بھی دور نے اس کو جواں نہ ہونے دیا

☆حنا عروج.....کراچی
ہماری شام کسی کی سحر پہ ختم ہوئی
ابھرنا، ڈوبنا خورشید کا برابر تھا

☆شائلہ خان.....رحیم یار خان
تری یاد آئی تو رو دیا، جو تو مل گیا تجھے کھو دیا
مرے مشغلے بھی عجیب ہیں، تجھے چھوڑ کر تجھے ڈھونڈنا

☆مسز زریں زبیر.....کراچی
کُتر کے جال بھی صیاد کی رضا کے بغیر
تمام عمر نہ اُڑتی، اسیر ایسی تھی

☆فرحت ضمیر.....راول پنڈی
متاع وہم اپنے ساتھ لے آیا ہوں اختر
مگر اجداد کی دانش کہیں رکھ دی ہے میں نے

☆شائستہ اعجاز.....کراچی
میرا ایمان ہی راضی بہ رضا رہنا ہے
ورنہ ایسی بھی نہیں بات کہ پتھر ہوں میں
ایک جھونکا جو مجھے چھو کے کبھی گزرا تھا
آج تک اس کے تواتر سے معطر ہوں میں

☆اریبہ ضیا.....سکھر
یہ چاندنی کہ جو تیرہ شبوں کی مہماں تھی
ترے وجود نے اس کو بہت اجال دیا
جواب ذہن سے سارے مٹا دیے اس نے
ہمارے ہاتھ میں بس کاسۂ سوال دیا

☆فاطمہ بلال.....کینیڈا
جس میں شفق، شفق ترا عکسِ جمال تھا
مجھ کو وہ گرد، گردِ مسافت بھی راس تھی
یا تیری اک جھلک بھی نہیں دور، دور تک
یا گام، گام پر ترے ملنے کی آس تھی

☆جبیں نیاز.....ملتان
شاید کہ چاند بھول پڑے راستہ کبھی
رکھتے ہیں اس امید پہ کچھ لوگ گھر کھلے
راتیں تو قافلوں کی معیت میں کاٹ لیں
جب روشنی بٹی تو کئی راہبر کھلے

☆نگہت غفار.....کراچی
ہوا سے جنگ میں ہوں، بے اماں ہوں
شکستہ کشتیوں پر بادباں ہوں
میں سورج کی طرح ہوں دھوپ اوڑھے
اور اپنے آپ پر خود سائباں ہوں

☆مسز تسنیم.....جہلم
چھو کر ہی آئیں منزلِ امید ہاتھ سے
کیا راستے سے لوٹنا، جب پاؤں چھل چکا
اس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مل چکا

☆ثروت سجاد.....برمنگھم
وہ مل تو جائے گا ارشد مگر ذرا ایسے
طلب میں اس کی زمانے کو ہارنا ہوگا

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



ہنٹر بیف

اشیا: گائے کا گوشت، ایک کلو۔ (بغیر چربی کا مُسلم ٹکڑا) نمک، حسبِ ذائقہ۔ گرم مسالا ثابت، حسب ذائقہ۔ ہری مرچ، چار پانچ۔ دو عدد لیموں کا رس، کچا پپیتا، (پسا ہوا) ایک کھانے کا چمچ۔ گرین سلاد، پودینہ، املی کی چٹنی اگر پسند ہو تو اس کے ساتھ ضرور سرو کریں۔

ترکیب: سالم گوشت میں نمک، کچا پپیتا اور لیموں کا رس اچھی طرح گود لیں اور چار سے چھ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں پھر پتیلی میں یہ گوشت ڈالیں، ہری مرچ اور گرم مسالا بھی ڈالیں اور پانی اس قدر ہو کہ گوشت ڈوب جائے اور ہلکی آنچ پر پانی خشک ہونے اور گوشت گلنے تک پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو گوشت کو پھیلی ہوئی ڈش میں نکال کر باریک باریک سلائس کرتے جائیں اور سینڈوچ بنا کر حسبِ منشا تازہ سلاد کے ساتھ نوش فرمائیں۔ اسے پراٹھے کے اندر رکھ کر رول بنا کر بھی کھا سکتے ہیں۔

ثمین عباس، کراچی

بیف پسندے

اشیا: بغیر ہڈی کا گوشت، (پسندے) پارچے کی صورت آدھا کلو۔ نمک، سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔ زیرہ سفید پسا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ خشخاش پسی ہوئی، دو کھانے کے چمچ۔ پسا ناریل، ایک چائے کا چمچ۔ گرم مسالا پسا ہوا، 1/2 چائے کا چمچ۔ لہسن، ادرک، پسا ہوا ایک ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز، (گولڈن کی ہوئی پسی ہوئی) ایک کھانے کا چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ پیاز، (فرائی کے لیے باریک کٹی ہوئی) دو عدد درمیانی۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ، چار سے چھ عدد گارنشنگ کے لیے۔

ترکیب: تمام اجزا دہی میں ملا کر پسندوں میں لگا کر فریج میں تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں تین چار گھنٹے کی میرینیشن کے بعد ایک دیگچی میں پیاز ٹرانسپرینٹ فرائی کریں پھر اس میں دو کپ پانی کے ساتھ پسندے ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر رکھ دیں آپ کُکر میں بھی پسندے دو تین کپ پانی ڈال کر پکا سکتے ہیں۔ جب پانی خشک ہو جائے گوشت گل جائے اور سالن تیل چھوڑنے لگے تو اتار لیں اور سرو کرتے ہوئے ہری مرچ ذرا سا تیل میں فرائی کی ہوئی اس پر سجا دیں اور ہرا دھنیا بھی کاٹ کر ڈال دیں اگر باریک، باریک ادرک کاٹ کر ڈال لیں تو اور بھی لطف آئے گا۔

فضہ بتول، بہارہ کہو

آسان اسٹیمڈ ران

بکرے کی دستی یا ران کو اچھی طرح دھو کر سرکہ لگا کر دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ دو، دو چمچ لہسن، ادرک کے پیسٹ میں نمک، سرخ مرچ، پسی کالی مرچ حسب ذائقہ مکس کریں۔ دو عدد درمیانی سائز کی پیاز گولڈن کر کے سوکھی سوکھی چورا کریں اور دو پیالی دہی پھینٹ کر سب میں ملا دیں اب اس آمیزے کو ران پر اچھی طرح لیپ دیں اور اگر ٹن فوائل ہو تو اس میں لپیٹ لیں یا پھر بڑے دیگچے میں ایسے ہی رکھ دیں اور ایک جگ پانی اس میں ڈالیں اور اسے ہلکی آنچ پر رکھ چھوڑیں۔ دو گھنٹے میں مزیدار اسٹیمڈ ران تیار ہے۔

ایلیا عباس...... لاہور

سندیسے

پاکیزہ بہنیں



ایک پیاری دعا اپنی بہن کے نام

☆ آنکھوں میں خوشی، لبوں پر ہنسی، غم کا کہیں نام و نشان نہ ہو۔ آپ کو جہاں کی ساری خوشیاں ملیں۔ ان خوشیوں کی کبھی شام نہ ہو۔ (آمین)

☆ دعا دستک کی طرح ہوتی ہے اور مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔

از: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

ارم جی......!

آپ کبھی... اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھنا۔ میں ہوں ناں آپ کی دوست، آپ کی سسٹر...... ایک نہیں ہم دو بہنیں ہیں۔ ہمیشہ ساتھ رہنا ہے ایک دوسرے کے کیونکہ آپ میری جند ہو۔ مجھے آپ سے محبت ہے، ہاں محبت ہے۔

ازطرف: جبیں ہاشمی، بھیرہ

نصیحت

اے شوخ و شریر لڑکی
مت حائل ہو میری راہوں میں
میں تو بہتے سمندر کا پانی ہوں
اور تو ٹھہری ہوئی اک جھیل......
میری منزل لا پتا ہے
تیری منزل جھیل
مت تلاش کر مجھے
کہیں تیرا وجود کھو نہ جائے

از: ارم کمال، فیصل آباد

کھٹے میٹھے پیغامات

☆ مریض، مجھے آواز آتی ہے لیکن آدمی دکھائی نہیں دیتا۔
ڈاکٹر: یہ کس وقت ہوتا ہے؟
مریض: جب میں موبائل پر بات کر رہا ہوتا ہوں۔

☆ جی بھر کر رونے دو مجھے اے دوست، ایک ہی لڑکی کا نمبر تھا میرے پاس جو مولوی کی باتوں میں آ کر ڈیلیٹ کر دیا۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

پیاری باجی کے نام

یارب اپنے پاس میری دعا امانت رکھنا
رہتی دنیا تک اسے سلامت رکھنا
میری آنکھوں کے سارے دیپ بجھا دینا
پر اس کی آنکھوں کے سارے خواب سلامت رکھنا

از: اینہ عندلیب، سلانوالی

یاد

تیری یادوں کی بارش کا
اِک قطرہ بھی
میرے دل کے ہر منظر کو
اس طرح بھگو دیتا ہے
کہ اس کا اِک اِک ذرہ
سنور جاتا ہے
نکھر جاتا ہے
تازہ دم ہو جاتا ہے

از: شائستہ ایم علی، حیدرآباد

روحانی مشورے

کاموں میں آسانی کی تین دعائیں

جو شخص ذیل کی آیت صبح شام سات سات مرتبہ پڑھ لے تو اس کے بہت بڑے بڑے کام اللہ تبارک تعالیٰ اپنے ذمے لے لیتا ہے اور وہ آسانی سے پورے ہوجاتے ہیں۔

حضرت ابوالدرداؓ نے فرمایا جو بندہ سات مرتبہ یہ دعا پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کے غم اور پریشانی کو ضرور دور کردے گا۔

حَسبِی اللہ لاالہ الا ھُو عَلیہِ توکلتُ وَھُو ربُّ العرش العظیم٥

ترجمہ: ''میرے لیے (تو) اللہ (حافظ وناصر) کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسا کرلیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے۔''

اسی طرح کاموں کی آسانی کے لیے حدیث میں یہ دعا بھی آئی ہے، لہٰذا ہر کام شروع کرنے سے پہلے یا صبح کے وقت مذکورہ بالا آیت سات مرتبہ اور ذیل کی دعا تین مرتبہ پڑھے۔

۲: اَللّٰھُمَّ الطف بی فی تیسیر کل عسیر فانّ تیسیر کلّ عسیر علیك یسیرٌ و اسئلك الیسر والمعافاة فی الدّنیا والاخرة

ترجمہ: ''خدایا! تو میرے تمام مشکل کاموں کو آسان کردے کیونکہ ہر مشکل کام کا آسان کرنا تیرے لیے آسان ہے۔ میں تجھ سے تمام امور میں آسانی اور دنیا و آخرت کی معافی کا طالب ہوں۔'' کوئی کام دشوار ہوجائے یا کوئی مشکل آن پڑے تو ذیل کی دعا پڑھے۔

۳: اَللّٰھُمَّ لَا سَھلَ الّا ما جعلتَہٗ سھلا وانت تجعلُ الحزْن اذا شئت سھلا٥

ترجمہ: اے اللہ! کوئی کام بھی آسان نہیں، بجز



ادارہ

اس کے جس کو تو آسان کردے اور تو جب چاہے سنگلاخ زمینوں کو بھی نرم وہموار کردے۔''

دین ودنیا کی درستگی کے لیے

رسول اللہ ﷺ دنیا و آخرت کی درستگی اور اصلاح کے لیے اس دعا کو پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَصلِح لِی دِینِی الذی ھُو عِصمَة امرِی وَاصلِح لی دنیا ی التی فیھا معاشی وَاصلح لیَ اخرتی التی فیھا معادی واجعل الحَیٰوة زیادة ...... لی فی کل خیر واجعل المُوت راحہ لی من کل شر٥

ترجمہ: ''اے اللہ! تو میرے اس دین کی اصلاح فرما جو میرے کام کی حفاظت کرنے والا ہے اور میری دنیا کی اصلاح فرمادے، جس میں میری روزی ہے اور میری آخرت کو ٹھیک کردے جہاں مجھے دوبارہ جانا ہے اور میری زندگی کو میری ہر ایک بھلائی کی زیادتی کا سبب بنادے اور موت کو ہر ایک برائی سے راحت کا سبب بنادے۔''

غور کیجیے...... کہ کتنی پیاری دعا ہے، قربان جائیے حضور اکرم ﷺ پر امت کو کیسی دعا سکھلا کر گئے کہ اس میں دین دنیا دونوں کی اصلاح، آخرت کی بہتری، زندگی بھلائیوں میں گزارنے کی اور موت کو سبب راحت بنانے کی، ان تمام چیزوں کی دعا مانگنا سکھلا گئے جو ہر مسلمان مرد و عورت، بچے اور بوڑھے کی ضرورت ہے۔ خود بھی اس دعا کو مانگیں اور ہر مسلمان کو سکھائیں۔ جتنوں کو آپ یہ دعا سکھلائیں گے ان سب کا اجر آپ کو ملے گا۔

تواضع وانکساری کے لیے دعا

تواضع، عاجزی اور انکساری یہ سب بہت ہی بڑی نعمتیں ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے پروردگار عالم اس کا درجہ بلند

فرماتا ہے۔ ہم سب یہ فیصلہ کرلیں کہ ''میں'' کچھ بھی نہیں ہوں، میری حیثیت، میرا درجہ کچھ بھی نہیں، میں عاجز، کمزور مخلوق ہوں، ایک ابلتے ہوئے بلبلے کی طرح ہوں، جب میرے جسم سے اللہ تعالیٰ کا ایک حکم (روح) نکل جائے تو میری لاش پڑی ہوئی رہ جائے اور پھر میں کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔ لہٰذا اتنے کمزور انسان کو کبر، غرور اور فخر کسی حال میں بھی زیب نہیں دیتا اور تواضع اور عاجزی ہی اس کو زیب دیتی ہے۔ اس لیے حدیث مبارکہ میں اسی تواضع کے لیے دعا مانگنا سکھایا گیا ہے۔

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا بنادے، ذلیل بنادے اور دوسروں کی نگاہ میں بڑا عزت والا بنا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں جتنا بھی بڑا رتبہ دیا ہو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھیں اگر ہم نے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھ لیا تو بہت سے جھگڑے ختم ہوجائیں، آج بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے اس لیے جھگڑا کرتا ہے کہ میں بڑا ہوں، میری بات مانو، حالانکہ اگر چھوٹے بھائی نے بات مان لی تو بڑے بھائی کو چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ مالک تیرا کرم ہے کہ تو نے چھوٹے بھائی کے دل میں میری محبت ڈال دی اور اس نے میری بات مان لی ورنہ میں کیا اور میری حیثیت کیا اور اگر آپ کی بات نہیں مانی تو سوچیے کہ کوئی بات نہیں وہ عاقل و بالغ ہے، میں فرعون تو نہیں ہوں کہ میں اپنی بات زور و قوت سے منواؤں۔

عورتیں بھی یہی سمجھ لیں کہ میں ساس ہوتے ہوئے، نند ہوتے ہوئے بھی ایک چھوٹی اور کمزور مخلوق ہوں اگر بیٹے کی ساس نے میرے گمان کے موافق میرا خیال نہیں رکھا یا کسی نے خبر دی کہ بہو نے آپ کی غیبت کی ہے چاہے وہ خبر سچ بھی ہو تو بھی یہ سوچیے کہ میں ایک کمزور مخلوق ہوں، میں یہاں بدلہ نہیں لوں گی، وغیرہ وغیرہ اللہ تبارک وتعالیٰ میری بہو کو ہدایت عطا فرمائے، اس طرح تواضع والی ساس دعائیں دے دیں تو.... انشاءاللہ تعالیٰ گھروں کے جھگڑے ختم ہوجائیں۔ اسی طرح شوہر دنیوی امور میں متواضع ہوجائے تو معمولی باتوں پر شیطان کو گھر میں جھگڑا کروانے کا موقع نہ ملے۔ شوہر اپنے آپ کو یہ نہ سمجھے کہ بیوی میری زرخرید باندی ہے یا اپنے پہلو میں دل نہ رکھنے والی ایک مخلوق ہے یا ایک غیر جان دار چیز ہے۔ جس طرح میں چلانا چاہوں اسی طرح چلے بلکہ یہ سمجھے کہ اگر اس نے سو میں سے چالیس باتیں نہیں مانیں تو ساٹھ تو مان لیں، یہ بھی مالک کا کرم ہے اور نہیں مانی تو کوئی بات نہیں کہ اس میں میری ہی اصلاح ہوگی کہ میرا نفس فرعون نہ بن جائے۔ اسی طرح ہر آدمی اپنے ملازم سے بھی یہ امید نہیں رکھے کہ سو فیصد میری بات مانے گا اگر ملازم نے تیز لہجے میں جواب دے دیا اور اس طرح کبھی ہوہی جاتا ہے تو اس پر صبر کرلے، بہر حال تواضع کے لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ یہ دعا مانگتا رہے۔

اَلیكَ رَبِّ فَحبّبنِی وَفِی نَفسِی لك رَبِّ فَذَلّلنِی وَفِی اعیُنِ النّاس فعظّمنِی وَ مِن سَیئ الا خلاق فجنّبنِی

ترجمہ: ''اے میرے رب! تو مجھے اپنی بارگاہ میں پسند فرمالے، اے میرے رب! تو اپنے لیے مجھ کو میری نظروں میں ذلیل رکھ اور دوسروں کی نظروں میں عزت والا کردے اور برے اخلاق سے مجھے محفوظ رکھ۔''

جس وقت تواضع کے تقاضے پر عمل کا وقت آئے تو ہمت سے کام لیں اور نفس و شیطان کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ زبان سے یہ کہلوا دیں کہ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ بعد میں نمٹ لوں گا، تم ہو کیا چیز؟ وغیرہ وغیرہ سے بچیں۔ کسی کے ایسے بول پر جس سے آپ کو تکلیف پہنچی یا آپ کی حیثیت کا خیال نہیں رکھا گیا غصے میں نہ آئیں بلکہ معاف کردیں اور یہ سوچیں کہ میرے نہ بولنے پر یا معافی مانگنے پر دو مسلمانوں میں جھگڑا ختم ہوجائے گا اور بڑھے گا نہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی لاکھوں رحمتیں مجھ پر اور سارے مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوں گی۔ اس لیے کہ دو مسلمانوں میں جھگڑا اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت ہی ناپسند ہے اور میرے تواضع اختیار کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ سے راضی ہوجائے تو یہ دنیا و آخرت کے لیے اور میری آنے والی نسلوں کے لیے سعادت ہے۔ ❖

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بچوں کی اچھی صحت کے لیے

ہومیو پیتھک علاج کی افادیت

ننھے منے پھول سے بچے کسے اچھے نہیں لگتے اور کیوں نہ لگیں یہ ہمارا مستقبل ہیں کیونکہ آج کے

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

دسمبر 2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______

پتا: ______

______

ان ہی پھول جیسے نرم و نازک بچوں کو کل مستقبل میں بھاری اور پُرخار ذمے داریوں کو سنبھالنا ہے۔ ان کی پرورش جتنی زیادہ احتیاط کے ساتھ صحت مند ماحول میں ہوگی یہ اتنے ہی اس قابل ہوں گے اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے۔

بچوں کی صحت کے متعلق جب ہم بات کریں گے تو اس کو ہم مختلف مدارج میں تقسیم کریں گے تاکہ بچے کی صحت ہم اچھے طور پر سمجھ سکیں۔

1۔ پیدائش سے پہلے
2۔ پیدائش کے بعد 3 ماہ تک
3۔ 4 ماہ سے 2 سال تک
4۔ پری اسکول بچے
5۔ اسکول جانے والے بچے

1۔ پیدائش سے پہلے

پیدائش سے پہلے عموماً بچے کی فکر اتنی نہیں کی جاتی یا اس کے متعلق اتنا نہیں سوچا جاتا جبکہ حمل ٹھہرنے کے بعد ہی بچے کے متعلق ضرور خیال کرنا

چاہیے۔ اس طرح نہ صرف ماں کی صحت کا خیال ہوگا بلکہ بالواسطہ بچے کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا اس کے لیے سب سے پہلے ماں کو ایک اچھا ماحول دیں، دین کی طرف راغب ہوں کیونکہ اس سے بچے کا ذہن اچھا ہوگا، ماں کے جسم میں اچھی تبدیلیاں ہوں گی جو بچے پہ اچھے اثرات مرتب کریں گی۔

ماں کی خوراک متوازن ہو اور اس میں آئرن اور کیلشیم والی غذائیں وافر ہوں تاکہ نہ صرف یہ کہ ماں کی ضرورت پوری ہو بلکہ ہونے والے بچے کی غذائی ضروریات بھی پوری ہوں۔ اس میں خون کی کمی نہ ہو، ہڈیاں اور دیگر اعضا صحیح رہیں۔

صاف ستھری ہوا میں چہل قدمی اور ورزش (ڈاکٹر کے مشورے سے) دورانِ حمل صرف اور صرف ہومیو پیتھک ادویات کا استعمال ڈاکٹر کے مشورے سے کریں کیونکہ یہ ادویات بچے پر کوئی برا یا کوئی سائیڈ افیکٹ نہیں کرتیں۔ بچے کی پیدائش میں آسانی کے لیے اور بسا اوقات آپریشن کے بغیر بھی زچگی ہومیو پیتھک ادویات سے ممکن ہے۔

2۔ پیدائش کے بعد

بچے کی پیدائش کے بعد ماں کے زخم، ٹانکے، درد، کمزوری وغیرہ کے لیے ہومیو پیتھک ادویات کا استعمال ماں اور بچہ دونوں کے لیے مفید ہوتا ہے۔ پیدائش یا اس کے کچھ عرصہ بعد ماں کو دودھ نہ آنے/کم ہونے کی شکایات عام ہیں۔ اس کے لیے ماں کو اچھا ماحول، اچھی غذا دی جائے اگر اس کے باوجود مسئلہ برقرار رہے تو ہومیو پیتھی میں اس کے لیے کئی ایک ادویات موجود ہیں۔

بچے کو پیدائشی یرقان کوئی خوف کھانے کی بات نہیں ہے۔ آج کل یہ بچوں میں بہت عام ہے اس



کے لیے بھی مؤثر ادویات ہیں جو 3 سے 7 دن میں اس کو بالکل ٹھیک کر دیتی ہیں۔ بچے کے پیٹ میں گیس/مروڑ

پیدائش سے 4 ماہ تک کے بچوں میں یہ شکایت بھی بہت عام ہے، یہ عموماً شام سے شروع ہوتی ہے اور رات کو انتہائی شدید ہوجاتی ہے۔ ماں باپ ہی کیا سارا گھر پریشان ہوجاتا ہے۔ سِکائی سے، دودھ دینے سے، گود میں لے کر چلنے/ٹہلنے سے، اوندھا لٹانے سے بچے کو وقتی آرام ہوتا ہے لیکن جب درد شدت سے ہو تو سارے حربے ناکام ہوجاتے ہیں۔ بچہ رو رہا ہوتا ہے اور اوپر کی طرف اپنی ٹانگیں کو اٹھاتا ہے۔ ہومیو پیتھک دوا کی ننھی منی گولیاں یا قطرے بچے کی اس تکلیف کے لیے بھی اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں اور منٹوں میں بچہ گیس خارج کر کے سکون کے ساتھ بے خبر سوجاتا ہے۔

قے/الٹی کرنا

بچہ اگر دودھ پینے کے تھوڑی دیر بعد پھٹے ہوئے دودھ کی طرح قے کرے، تھوڑی مقدار ہو تو کوئی خاص بات نہیں لیکن اگر بار بار کرتا ہے اور روزانہ اور دودھ پیتے ہی کرتا ہے تو پہلے دیکھیں کہ بچے کو آپ نے ڈکار دلوائی ہے کہ نہیں اگر نہیں تو اچھی طرح دلائیں۔ اپنے کندھے سے لگا کر آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپتھپائیں جب ڈکار آجائے تو اس کو سیدھا لٹائیں سر تھوڑا سا اونچا کر کے۔ اگر اس کے باوجود آرام نہ آئے تو ڈاکٹر سے رجوع کریں، پُرسکون ادویات موجود ہیں۔

دست

یہ بھی ایک بڑا عام مسئلہ ہے جو عموماً صفائی نہ

ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے یا دودھ کی وجہ سے۔
ماں اپنا دودھ پلانے سے پہلے اپنے نپل کو کسی صاف کاٹن کے کپڑے سے گرم پانی سے صاف کر لے اور اگر بچہ بوتل سے پیتا ہے تو اس کو دودھ دینے سے پہلے اچھی طرح صاف کرکے گرم پانی سے دھوئیں۔ اگر اس کے باوجود مسئلہ باقی رہے تو ڈاکٹر سے رجوع کریں تاکہ وہ دودھ کا تعین کرکے اس کے مطابق دوا دے (عام دودھ، ماں کے دودھ کی خرابی، کسی کھانے یا دوائی کی وجہ سے یا پاؤڈر والا دودھ بچے کو سوٹ نہیں کر رہا ہے، ماں یا بچے کو ٹھنڈ لگ گئی، کوئی انفیکشن وغیرہ) کان میں درد، نزلہ، بخار، کھانسی یہ بھی ان بچوں میں عام شکایات ہیں۔

3۔ 4 ماہ سے 2 سال تک

بچے کا وزن بڑھنا، اس کا قد بڑھنا، اس کا اوندھا ہونا، گھٹنوں کے بل چلنا، کھڑا ہونا، چلنا بھاگنا، بولنا، گردن کا ٹھہرنا، تالو کا بند ہونا، دانت نکالنا، دیکھنا، شناخت کرنا، سننا، بولنے کی کوشش کرنا، ہنسنا، یہ سب ایک نارمل بچے میں اس عرصہ میں آہستہ آہستہ شروع ہو جاتی ہیں اور اگر نہ ہوں تو یقیناً اپنے ہومیوپیتھک معالج سے رجوع کریں۔ وہ آپ کے بچے کو ادویات تجویز کرے گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں گے۔

4۔ پری اسکول بچے

(2 سال سے 5 سال)

یہ بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا زمانہ ہے جس میں ان کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ان کی تعلیمی تربیت کا بھی آغاز کر دیا جاتا ہے۔ اس میں اگر بچے صحیح طور پر اپنی کارکردگی نہیں دکھا پا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں (i) غذائی کمی ہے (ii) ان کا وزن کم ہے (iii) ان میں خون اور کیلشیم کی کمی ہے (iv) زیادہ لاڈ پیار نے ان کو بگاڑ دیا ہے۔ (v) بھوک کی کمی (vi) نیند کی بے قاعدگی (vii) پیٹ کے کیڑے وغیرہ (viii) بستر پر پیشاب کرنا۔ یقیناً ہومیوپیتھک معالج سے مل کر آپ اس کے حل کے لیے ایک اچھا مشورہ اور دوا تجویز کرا سکتے ہیں۔

5۔ اسکول جانے والے بچے

(5 سال سے اوپر)

یہ دور بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا وہ اہم دور ہے جس میں نہ صرف وہ سیکھتے سمجھتے ہیں بلکہ اس کی نقالی بھی کرتے ہیں۔ یہ دور اُن کی جذباتی نشوونما کے لیے بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔ یہاں آپ اپنے بچے کو ذہین اور ہوشیار بھی بنا سکتے ہیں اور ایک نفسیاتی مریض بھی۔ بچوں کی زندگی کا یہ جُزو ان کو زندگی کو سمجھنے کے لیے اپنے طور پر تجربات کے لیے اُکساتا ہے۔ وزن کی کمی، بھوک کی کمی، ضدی، پڑھائی سے بے رغبتی، اسکول سے جی چرانا یا کسی خاص مضمون سے نفرت یا چڑ (اسکول فوبیا) وزن کی زیادتی بہت زیادہ، ہر وقت کھاتے رہنا، پیٹ کے کیڑے، سر کی جوئیں، دانتوں کی خرابی، ٹانسلز، نزلہ زکام، دمہ کی تکالیف، قد نہ بڑھنا، سبق کا یاد نہ ہونا، حافظہ کی کمزوری، امتحان کا خوف۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کو حل کرنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ یہاں اس کے لیے والدین کو، استاد اور معالج سے مل کر بچے کے مسئلے کے متعلق پہلے بات کرنی ہوگی۔ پھر وجہ کا تعین کرتے ہوئے اپنے اپنے کردار کو ادا کرنا ہوگا۔ یاد رکھیں مسئلہ کچھ بھی ہو اور بظاہر کتنا ہی مشکل ہو، اس کا حل موجود ہوتا ہے

بشرطیکہ ہم اس کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرنا چاہیں۔ رونے سے، گھبرانے سے، پریشان ہونے سے یا اس مسئلے سے نظر چرانے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے بلکہ مزید تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھیں بچوں کی ذہنی و جسمانی نشوونما کے لیے ہومیوپیتھی میں ادویات موجود ہیں جو آپ کے بچوں کو:

1۔ بغیر کسی ضمنی اثرات و نقصانات کے فائدہ پہنچاتی ہیں۔
2۔ نہ صرف یہ کہ اس مسئلے کو حل کرتی ہیں بلکہ ..... دیگر بیماریوں کو بھی ٹھیک کر دیتی ہیں۔
3۔ بچوں کی قوتِ مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ جلدی جلدی بیمار نہیں ہوتے۔
4۔ کھانے میں خوش ذائقہ۔
5۔ دوا کھانا اور کھلانا دونوں آسان۔

ویسے تو کئی ادویات ہیں جو دورانِ علاج مختلف حالتوں/کیفیتوں/ میں جیسا کہ اوپر بیان کی گئی ہیں استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن ہم چند دوائیوں کے نام دلچسپی کے لیے دے رہے ہیں لیکن یاد رکھیں دوا بغیر ڈاکٹر کے مشورے کے استعمال نہ کریں۔

Bell, Bry, Cham , Calc. Phos, Fer. Met, Fer. Phos Colocynth, Ipecac, Cina, Lyco, Mag. Phos, Nat.Phos, Puls, Nux, Podo, China, etc.

کولیسٹرول

کیا ہے؟ کیوں بڑھتا ہے؟

جب یہ بڑھ جائے تو کیا کریں؟

آج کل کے موجودہ دور میں انسان نے اپنی تن آسانی کے لیے بہت ساری مشینیں بنائی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کا جسمانی مشقت کرنا کم



ہو گیا ہے اور ہماری ثقافتی روایت کے تحت جو کھانے استعمال ہوتے ہیں اور نئی نسل کے فاسٹ فوڈز (برگر و پیزا) ان میں بہت زیادہ نشاستہ اور چربی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نہ صرف ہمارے وزن میں بے تحاشا اضافہ بلکہ کولیسٹرول، شوگر، بلڈ پریشر اور دل کے دیگر امراض میں اضافے کا باعث بن رہی ہیں۔ ہر سال ہزاروں پاکستانی جن میں 40 سال سے کم عمر کے افراد بھی شامل ہیں دل کے دورے سے مر جاتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم یہ جانیں کہ کولیسٹرول کیا ہے؟

یہ ایک سفید موم جیسا چکنا مادہ ہے جو ہر انسانی جسم میں اس کا جگر کئی گرام کولیسٹرول تیار کرکے قدرتی طور پر خون میں شامل کرتا ہے۔ انسانی خون میں پائی جانے والی چکنائیوں میں کولیسٹرول، فاسفولپیڈز اور ٹرائی گلیسرائیڈز قابلِ ذکر ہیں۔ ان چکنائیوں میں کیلوریز کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔

غذا میں دو طرح کی چکنائیاں پائی جاتی ہیں۔
(ا) سیر شدہ سچوریٹڈ اور دوسری غیر سیر شدہ (اَن سچوریٹڈ)

سیر شدہ چکنائی سرخ گوشت، ڈیری مصنوعات، بیکری کی مصنوعات بعض نباتاتی تیلوں مثلاً پام آئل یا ناریل کے تیل وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ چیزیں کولیسٹرول بڑھانے کا سبب بنتی ہیں۔

غیر سیر شدہ چکنائیوں میں پولی اَن سچوریٹڈ

چکنائیاں بھی شامل ہیں۔ یہ ہمیں سورج مکھی، زیتون، مکئی، سویابین، کینولا کے تیلوں، نرم مارجرین، مچھلیوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ خون میں کولیسٹرول کی سطح کو بڑھانے کا سبب نہیں بنتیں۔

واضح رہے کہ ہر قسم کی چکنائی میں کیلوریز کی بہت زیادہ مقدار ہوتی ہے جو وزن بڑھانے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انسانی جسم کو کولیسٹرول کی ضرورت ہوتی ہے نئے خلیوں کے بننے میں اور ہارمونز کی تیاری کے لیے لیکن اس کی زیادتی مسائل پیدا کر سکتی ہے۔

کولیسٹرول:

کولیسٹرول خون میں پائی جانے والی ایک اہم چکنائی ہے۔ یہ جگر میں بنتی ہے، کئی گرام کولیسٹرول روزانہ ہمارا جگر تیار کرتا ہے لہٰذا ایسی غذاؤں سے پرہیز کرنا چاہیے جن میں سیر شدہ چکنائی کی مقدار زیادہ ہو۔ ایسی غذاؤں کے استعمال سے جگر میں کولیسٹرول کی مقدار بڑھ سکتی ہے اور یہ اضافی کولیسٹرول خون میں شامل ہو سکتی ہے۔

کولیسٹرول کی اقسام:

ا۔ ایل ڈی ایل

Low Density Lipoprotein

کولیسٹرول کی اس قسم سے خون کی نالیوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے کیونکہ یہ خون کی نالیوں کی اندرونی دیواروں میں جمع ہونے لگتا ہے، اس کو بلاک کہتے ہیں یہ خون کی نالیوں کو تنگ کرتا ہے جس کی وجہ سے نالیوں میں خون کا دوران ختم ہو جاتا ہے جو دل کے دورے کا باعث بن سکتا ہے۔ مرغن غذاؤں کے استعمال، پُرتعیش زندگی اس کے بڑھنے کے اسباب میں سے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک خراب کولیسٹرول ہے۔ اس کی نارمل حد 130 سے کم 160 سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔ ٹرائی گلیسرائیڈز

Tryglycrides

یہ بھی چکنائی کی ایک قسم ہے۔ مردوں میں اس کی نارمل حد 160-40 ملی گرام فی سو ملی لیٹر ہے۔ عورتوں میں اس کی نارمل حد 135-35 ملی گرام فی سو ملی لیٹر ہے۔ جب چکنائی اور شکر کا زیادہ استعمال کیا جائے تو خون میں یہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے، خون کو گاڑھا کرتی ہے اور لوتھڑا بناتی ہے۔ جس سے دل کو جانے والے خون کا بہاؤ کم ہوتا ہے۔

۳۔ ایچ ڈی ایل

High Density Lipoprotein

یہ کولیسٹرول کی وہ واحد قسم ہے جس کے بڑھنے کا تو فائدہ ہے یعنی اس کے بڑھنے سے دل کے دورے سے محفوظ رہتے ہیں اس لیے یہ ایک اچھی قسم کی کولیسٹرول ہے۔ یہ ورزش یا ورزشی کام کرنے سے بڑھتی ہے۔ مچھلی، تازہ ہری سبزیاں اور فروٹ خصوصاً رس والے پھلوں سے اس کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے، وٹامن سی بھی اس کو بڑھاتا ہے۔ 20 سے 25 منٹ کی دھوپ بھی اس میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔